جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

PDFBOOKSFREE.PK

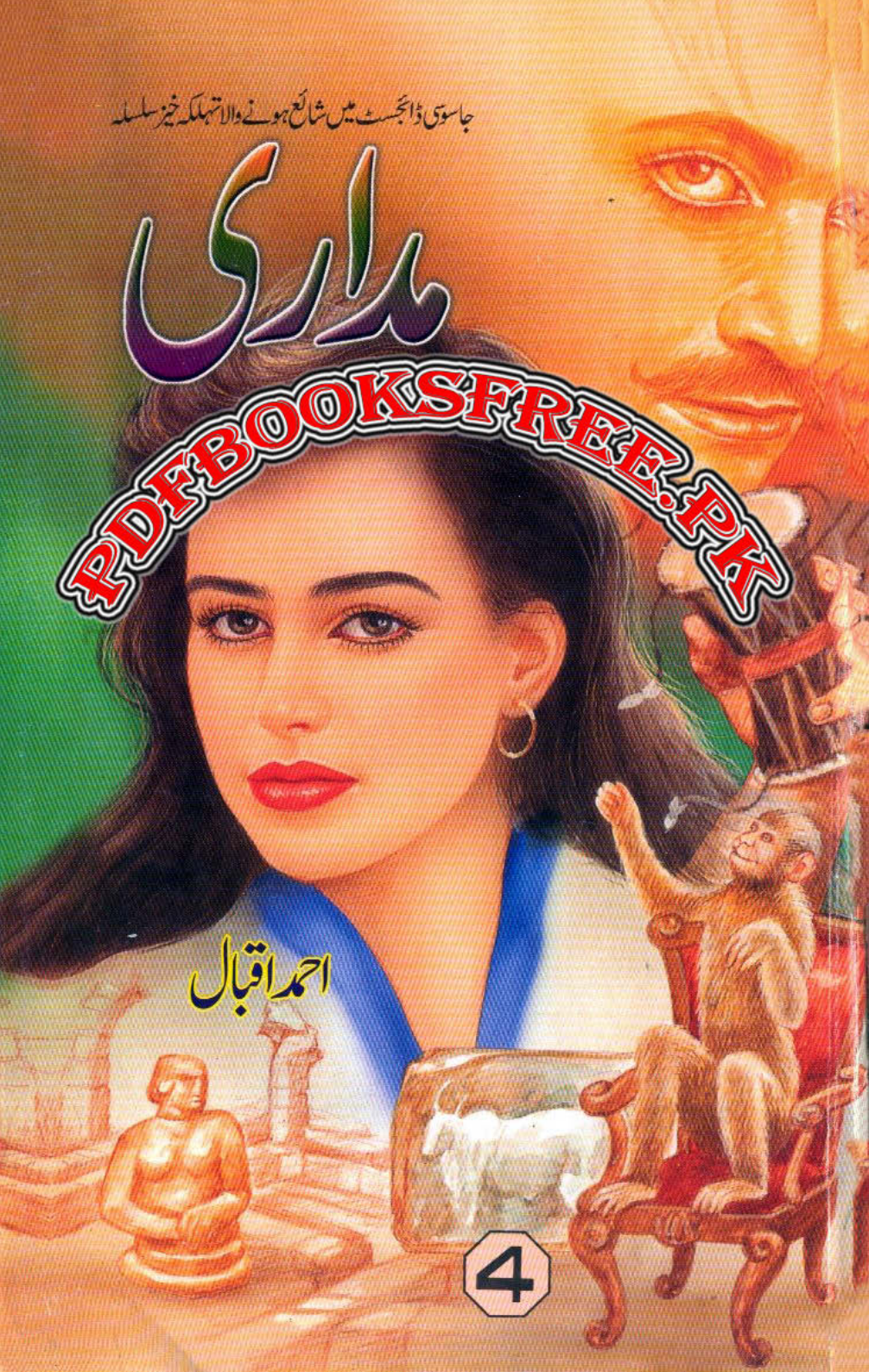

احمد اقبال

4

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

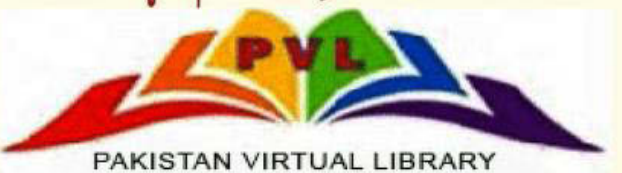

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

چوتھا حصہ

احمد اقبال

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ——— ۲۰۰۲ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۶۰ روپے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مجھے شرمندگی سے زیادہ دکھ ہوا۔ وہ ایک مظلوم نسل کا نمائندہ تھا۔ ایک نسل نے پاکستان حاصل کیا۔ اس نے کہا۔ ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے۔ اس ملک کو رکھنا مرے بچو سنبھال کے۔ مگر اس نسل نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس سے اگلی نسل نے سارے مقاصد اور نصب العین بھلا دیے۔ اب تیسری نسل کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ مستقبل کے معمار تھے۔ مگر انہیں پاکستان کا صرف ڈھانچا ملا ہے جو اخلاقی اور سیاسی' مذہبی اور معاشی طور پر دیوالیہ ہے۔ بوئے پیڑ ببول کے تو سیب کہاں سے کھائے۔ اب ان نوجوانوں سے کیا گلہ جو ستاروں پر کمند ڈال سکتے تھے مگر انہیں سکھایا گیا ڈاکے ڈالنا۔

میرے خیالات کی رو اس وقت منتشر ہوئی جب ایک کانسٹیبل نے لائٹ جلائی اور میرے لیے چائے رکھ کے چلا گیا۔ اس کے ساتھ بوسیدہ پاپے بھی تھے۔ میں نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔

عباسی ایک گھنٹے بعد پھر آیا "ایس پی غلام محمد صاحب آنے والے ہیں۔"

"مجھے بھی انہی کا انتظار تھا۔"

"آپ چائے پی کے حوالات میں چلے جائیں" وہ بولا۔ "ان کو یہ سب معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے آپ کو کسی قسم کی رعایت نہیں دی۔ کسی سے ملاقات نہیں کرائی اور آپ سے کوئی بات نہیں کی۔"

میں نے مسکرا کے کہا "جو بات سب کو معلوم ہے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "ایس پی صاحب سب سے کچھ نہیں پوچھیں گے' وہ صرف مجھ سے بات کریں گے۔"

"اور تمہارے ماتحت..... وہ اسی طرح تعاون کرتے ہیں۔"

"وہ تعاون نہیں۔ حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ ایس پی صاحب کا خیال ہے کہ میں بہت سخت کیرا فسر ہوں۔ میں نے مس شبنم کو بھی سمجھا دیا تھا کہ ساری گفتگو آف دی ریکارڈ ہوگی۔ یہ خالص اعتماد کی بنیاد پر ایک پرائیویٹ یعنی آپس کا ARRANGEMENT ہے۔"

"شاید تم نہیں جانتے کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے؟"

"عورت نہیں صحافی۔ یہاں وہ اسی حیثیت سے آئی تھی مگر میرا بھی کچھ تجربہ ہے اور کچھ مشاہدہ..... وہ جتنی خطرناک ہے اتنی ہی قابلِ اعتماد بھی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید میں معذرت کر کے اسے ٹال دیتا۔"

"تھینک یو عباسی۔ میں ایس پی صاحب سے تمہارے سخت رویے کی شکایت کروں گا کہ تم نے مجھے ایک فون تک نہیں کرنے دیا اور ابھی تک مجھے چائے بھی نہیں ملی۔"

وہ مسکرایا "اس کا فائدہ مجھے بھی ہوگا اور آپ کو بھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حوالات میں پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے انچارج صاحب کا بلاوا آگیا۔ ایس پی غلام محمد اس وقت پولیس کی وردی میں نہیں تھا اس لیے بڑی خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا "بیٹھیے شاہ جی۔"

میں پھٹ پڑا "آخر یہ کیا ہو رہا ہے ایس پی صاحب۔ کیا میرے خلاف فردِ جرم عائد کر دی گئی ہے۔ تفتیش اور دفاع کا حق دیے بغیر ہی مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں سر۔ تفتیش پوری ہوگی" وہ معنی خیز لہجے میں بولا "بعد میں دفاع کا حق بھی حاصل ہوگا آپ کو۔"

"پھر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے جیسے میں کوئی اخلاقی مجرم ہوں۔ مجھے حوالات میں ڈال دیا گیا ہے۔ چوروں ڈاکوؤں کے ساتھ۔ مجھے مسلسل ذہنی اذیت دی جا رہی ہے۔ میں کسی سے رابطہ نہیں کر سکتا۔ کوئی مجھ سے مل نہیں سکتا۔ ایک گلاس پانی تک نہیں دیا گیا مجھے۔"

"آئی ایم سوری۔۔۔ لیکن شاہ جی۔۔۔ قانونی اعتبار سے آپ کے جرم کی جو نوعیت ہے۔"

"جرم ہے۔۔۔ مائی فٹ۔ کیا لاشیں مل گئی ہیں؟ آلۂ قتل برآمد ہو گیا ہے۔ وجہ معلوم ہو گئی ہے کہ میں نے دو قتل کیوں کیے تھے؟ صرف ایک بیان کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا ہے۔۔۔ اور بیان بھی کس کا۔۔۔ انہی کے ذاتی ملازمین کا۔۔۔ کیسے فرض کر لیا ہے انہوں نے آخر کہ۔۔۔"

"دیکھیے شک کا اظہار تو کسی پر بھی کیا جا سکتا ہے اور ہم کسی کو روک نہیں سکتے کہ فلاں کا نام مت لو" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر ایک رپورٹ آپ میری طرف سے بھی لکھیں۔ مجھے شک ہے کہ انہی لوگوں نے لالچ میں قتل کیے ہیں یا ذاتی دشمنی میں۔ جنہوں نے میرے خلاف بیان دیا ہے' انہیں بیان دینے پر مجبور کیا گیا ہے' یہ میرے خلاف ہونے والی سیاسی سازشوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ معمولی سی بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی پر انچارج نے ریسیور اٹھایا "یس سر۔" وہ بولا۔ اور پھر ریسیور غلام محمد کی طرف بڑھا دیا "کال آپ کے لیے ہے سر!"

ایس پی کچھ دیر سنتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس کے ماتھے پر ہر شکن گہری ہو گئی۔ اس کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں میں وہی چمک آ گئی جو کسی شکاری کی آنکھوں میں شکار کو زیرِ دام دیکھ کے آتی ہے۔

"مبارک ہو" اس نے ریسیور رکھ کے کہا "لاشیں مل گئی ہیں۔"

میں نے ذہنی صدمے کے تاثرات کو چہرے پر عیاں نہیں ہونے دیا "تمہیں بھی مبارک ہو۔ اب تم جس سے چاہو اعترافِ جرم کرا لو۔ لاشیں کہاں ملیں؟"

"یہ سوال کر کے تم اپنی بے گناہی ثابت مت کرو" وہ سخت اکھڑ لہجے میں بولا "اس کے بعد تم پوچھو گے کہ ان کی موت کیسے واقع ہوئی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو ایس پی۔ ایک ٹیلی فون سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ میں لاشیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سہلایا "آج رات تم بہت کچھ دیکھو گے۔ آنے والے چند دنوں میں ہم دنیا کو بہت کچھ دکھائیں گے' تم دیکھتے جاؤ۔"

"میں دیکھ لوں گا ایس پی' تمہیں بھی۔"

"کیا یہ دھمکی ہے" وہ دہاڑ کے بولا "عباسی۔۔۔!"

عباسی جو میرے پیچھے کھڑا تھا اٹین شن ہو گیا "یس سر!"

"ابھی مجرم کو حوالات میں ڈال دو بلکہ بہتر ہوگا کہ اسے ہتھکڑی اور بیڑی لگا کے یہاں سے شفٹ کر دو۔ ورنہ یہاں آ جائیں گے اس کے لواحقین۔ وکیل اور اخبار والے۔ سب کو صاف انکار کر دو کہ چیئرمین صاحب یہاں نہیں ہیں اور نہیں معلوم کہاں ہوں گے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"یس سر۔ آپ فکر ہی مت کریں اس کی" عباسی نے پرانے پاپی تھانے داروں کے اسٹائل میں کہا "ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں موت کا فرشتہ بھی پوچھتا پھرے تو پتا نہ چلے۔"

"باقی سب سے میں نمٹ لوں گا۔" غلام محمد بولا "تم اس سے قتل کے معاملے میں پوچھ گچھ کرو۔"

"اس کی جورو کو بھی شاملِ تفتیش کر لوں سر؟"

"نہیں۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے کچھ نہ بتایا تو پھر دیکھیں گے۔"

"سامنے گھر والی ہو۔ ماں بہن ہو تو بندے پر محنت کم ہوتی ہے سر۔ عورت ایک چیخ مارتی ہے تو مردانگی کا غبارہ پھٹ جاتا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کر۔ یہ سب مجھے بھی معلوم ہے مگر تم اسے نہیں جانتے' وہ بہت چالاک اور مکار عورت ہے۔ اب تک اس نے سارے زمانے میں دہائی مچا دی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ اپنے شاہ صاحب خود بھی سیانے

ہیں۔ تم سے تعاون کریں گے۔" غلام محمد جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"صبح رزلٹ مل جائے گا آپ کو سر۔" عباسی نے مجھے ایک سفاک مسکراہٹ سے نوازا "ریکارڈ کی طرح بجے گا بندہ۔"

میری توقعات کا دار و مدار اب عباسی کے رویے پر تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تفتیش کی ایک رات کے تصور سے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ مجرم کے لیے اعتراف ہی آسان ہوتا ہے۔۔۔ وہ سب کچھ بتا کے اپنی جان چھڑاتا ہے۔ عدالت سے نمٹنے کا وکیل اور عدالت بھی ایک کے اوپر ایک ہے۔ لیکن جس نے قتل ہی نہ کیا ہو' وہ کیا بتائے گا کہ لاش کہاں ہے۔ آلۂ قتل اس نے کہاں چھپایا ہے اور قتل کیوں کیا تھا؟ اس کے پیچ کو مزاحمت کی طاقت مانتے ہوئے پولیس تشدد کے زیادہ پُرعذاب طریقے آزمائے گی اور انجام کار یا تو پولیس کو اعتبار آ جائے گا کہ ابھی تک مجرم مرا نہیں تو پھر بے قصور ہے ورنہ افسوس ہوگا کہ تفتیش ہی ادھوری رہ گئی۔

غلام محمد کے جانے کے بعد انچارج نے مجھ سے اکیلے میں بات کی اور کہا کہ وہ میری مشکل آسان کر سکتا ہے۔ قتل ایک کرے کوئی یا سات۔ ہم نہ چاہیں تو بڑی سے بڑی عدالت سے پھانسی کیا عمر قید بھی نہیں ہو سکتی۔"

میں نے انجان بن کے کہا "وہ کیسے تھانے دار صاحب۔"

"او جی اپنا تجربہ ہے۔ سارا کھیل ہوتا ہے ایف آئی آر کا اور ادھر ادھر کے اندراج کا۔ کچا کام ہو تو اچھا وکیل فرق نکال لیتا ہے۔ فرق ہم گواہی میں ڈال دیتے ہیں۔ ٹائم میں ڈال دیتے ہیں۔ تفتیش میں ڈال دیتے ہیں۔ آلۂ قتل بدل دیتے ہیں۔ ریوالور دوسرا ہوتا ہے۔ گولی کوئی اور نکل آتی ہے۔ لاش کی ڈائریکشن سے فرق پڑ جاتا ہے۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ گولی کسی نے سامنے سے ماری کہ پیچھے سے۔ بڑے طریقے ہیں جی۔"

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"کچھ نہیں جناب۔ آپ بس تعاون کرو ہم سے۔ ہم تعاون کریں گے آپ سے۔ ہم تو خود وکیل کو بتا دیتے ہیں کہ کون سا نکتہ اٹھانا ہے اور کیس کدھر سے کمزور ہے۔ ویسے وکیل بھی کوئی للو پنجو تو ہوگا نہیں آپ کا۔" وہ بولا "عباسی بندہ ذرا سخت ہے مگر میں اس سے بات کر لوں گا۔"

"کیا بات کرو گے تم؟"

"ایک تو آپ کے ساتھ سختی نہ ہو۔ بس بیان ہو جائے آپ کا۔ آپ ہمیں بتا دو ساری بات۔ پھر بیان بھی ہم لکھوا دیں گے۔ آئی بات سمجھ میں؟ آپ کے مخالف بھی مضبوط لوگ ہیں۔ پیسے والی پارٹی ہے۔ پھر بھی آپ ان کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ پہلا چانس آپ کو مل رہا ہے۔ اگر آپ سے بات پکی ہو جائے تو پھر اپنا بھی ایک اصول ہے۔ ان کو بول دیں گے کہ سوری۔۔۔ سودا ہو گیا۔۔۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"آئی سی۔۔۔ اصول پرستی اچھی چیز ہے۔"

"اس کے علاوہ جناب عالی! آپ کے ساتھ تو یہ کھیل چلتا ہی رہتا ہے۔ پتا نہیں کتنے قتل کے کیس ہر سیاست داں پر ہوں گے مگر وہ آج وزیر ہیں۔ وزیرِ اعلیٰ ہیں' کون پوچھتا ہے بعد میں۔ آپ بھی کسی دن کچھ بن جاؤ گے۔ انشاء اللہ' پھر ہمارا خیال کرنا۔"

"ضرور ضرور" میں نے کہا "مگر یہ سودے والی بات۔"

اس کا موڈ کچھ آف ہوا "کوئی' اتنے سیانے بندے ہو آپ۔ سودے کا مطلب نہیں سمجھتے؟ دنیا میں کوئی چیز ملتی ہے بلا معاوضہ۔ یہ تو زندگی کا سودا ہے۔ موقع گنوا دیا تو پھانسی پر لٹک جاؤ گے۔ جان ہے تو جہان ہے شاہ جی۔ ایک کروڑ بھی خرچ ہو جائیں تو کم ہیں آپ جیسے بندے کے لیے۔"

"ایک کروڑ۔" میں نے کہا۔

"یہ گارنٹی ہے ہماری کہ پندرہ دن میں ضمانت ہو جائے گی۔ سرکاری وکیل مخالفت نہیں کرے گا۔ ہم ریمانڈ لیں گے دو ہفتے کا۔ دو ہفتے میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آرام سے رہو گے آپ اسی طرح جیسے اپنے گھر میں" اس نے مجھے آنکھ ماری "بے شک گھر والی کو بھی بلا لینا۔ بس صحافی اور سیاسی لوگ نہیں آئیں گے اور ضمانت منظور ہونے کے بعد تو کوئی مسئلہ ہی نہیں' سمجھو کیس ختم۔"

میں نے بڑی فکرمندی سے کہا "مگر ایک کروڑ۔"

"او جی' کیا ایک کروڑ لگا رکھی ہے۔ پتا نہیں کتنے کروڑ رہ جائیں گے ادھر ہی۔۔۔" وہ خفگی سے بولا "اکٹھے نہ سہی' آپ اپنی تسلی کے مطابق تھوڑے تھوڑے دے سکتے ہو۔ چوتھائی ابھی۔ ایک چوتھائی ریمانڈ کے بعد۔ ایک چوتھائی چالان پیش کرنے اور باقی ضمانت کی منظوری پر۔"

میں نے کہا "اتنے تو میں نہیں دے سکتا۔"

"واہ یار۔ جان دینی منظور ہے' سب بتا دیا' سمجھا دیا۔ پتا بھی ہوگا کہ تفتیش میں کیا ہوتا ہے۔ بندہ ضائع بھی ہو جاتا ہے۔۔۔ اچھا کتنے دو گے؟"

میں نے سوچ کے کہا "ایک روپیہ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے شاید اپنی سماعت پر دھوکے کا گمان ہوا "کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا کہ ایک روپیہ دے سکتا ہوں میں۔ جو آج کل فقیر خیرات میں نہیں لیتا، تمہیں منظور ہے؟"

وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ اس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی اور دھمکی دی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مجھے تھانے میں آنے والے عام مجرموں کی طرح مارنے لگتا۔

میں نے کہا "تم شاید نشے میں ہو ورنہ یہ نہ بھولتے کہ میں کوئی عام آدمی نہیں، ایک سیاسی جماعت کا سربراہ ہوں اور میں کوئی شریف آدمی بھی نہیں ہوں۔ میری کمائی میں ایک مسلح فورس ہے جو تمہیں کہیں بھی ٹھکانے لگا سکتی ہے۔ تمہارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتی ہے۔ ایک دھماکا ہو گا اور تمہارے بیوی بچوں کا سراغ تک نہیں ملے گا۔ گرفتار تم نے مجھے کیا ہے۔ میری پارٹی کو نہیں۔ تم پر جان قربان کرنے والا کوئی نہیں ہو گا تھانے دار۔ میرے جانثار بہت ہیں۔"

وہ بلاشبہ ایک بے وقوف آدمی تھا جو سوچے سمجھے بغیر بہت کچھ بول گیا تھا۔ میری بات سن کے وہ ایک کروڑ ہی نہیں ساری اکڑفوں بھول گیا۔ اسے اچانک احساس ہو گیا کہ اس کے مقابل ایک خطرناک حریف ہے جو صرف دھمکی نہیں دیتا، اس پر عمل کر کے بھی دکھا سکتا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنی تھانے داری کے رعب کا بھرم رکھا اور مجھے عباسی کے حوالے کر دیا "لے جاؤ اسے اور صبح تک بات کرنا سکھا دو۔"

تھانے سے مجھے یوں لے جایا گیا جیسے میں کوئی خطرناک ڈاکو یا دہشت گرد ہوں۔ ایس پی صاحب کے حکم کی تعمیل میں مجھے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کے پچھلی طرف سے نکالا گیا اور ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ میرے احتجاج کی کسی نے پروا نہیں کی۔ عباسی کا رویہ بھی انتہائی توہین آمیز اور جارحانہ تھا۔

میں گاڑی کی پچھلی والی سیٹ پر تھا اور یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ پولیس کی جیپ یا آرمڈ کار نہیں ہے۔ یہ کوئی نئے ماڈل کی خاصی آرام دہ کار تھی۔ ایک مسلح پولیس مین میرے دائیں ہاتھ پر تھا اور دوسرا بائیں جانب۔ سب انسپکٹر فرید عباسی آگے بیٹھا تھا اور اس نے باتوں باتوں میں مجھ پر واضح کر دیا کہ اس گاڑی کے پیچھے بھی مسلح نفری سے بھری ہوئی جیپ چل رہی ہے۔ چنانچہ میرے جانثار مجھے چھڑانے کی کوشش میں صرف خودکشی کر سکتے ہیں۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میں نے کہا "یہ گرفتاری نہیں۔ اغوا ہے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو سب غیر قانونی ہے۔"

"اگر ثابت کر سکو تو اپنے وکیلوں سے کہنا کہ پولیس پر کیس کر دیں" عباسی نے غرا کے کہا۔

"تم کیا چیز ہو عباسی۔ میرے قانونی مشیر اور میری بیوی صبح تک انتظام کر لیں گے۔ تمہارے آئی جی صاحب اور ہوم سیکریٹری صاحب کیا جواب دیں گے۔ کیا وجہ بتائیں گے عدالت میں اس ریاستی دہشت گردی کی؟"

"کوئی عدالت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ دہرے قتل کے ایک مجرم سے تفتیش کرنے میں کون سی غیر قانونی بات ہے اور صبح ہونے میں تو بڑی دیر ہے ابھی۔ ایک پوری رات ہے بیچ میں۔"

گاڑی پون گھنٹے چلتی رہی یا شاید مجھے ہی ایسا لگا۔ ان گنت بار دائیں بائیں مڑنے کے بعد بالآخر گاڑی رک گئی۔ وہ جگہ کسی آبادی میں تھی یا ویرانے میں، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسی خاموشی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں بھی رہتی تھی۔ ٹریفک کا وہاں کوئی شور نہیں تھا اور جتنی دیر میں مجھے کار سے اتار کے اندر پہنچایا گیا وہاں سے کوئی موٹر سائیکل یا کار بھی نہیں گزری۔ آس پڑوس میں اگر کوٹھیاں تھیں تو وہاں وسیع احاطوں کے بعد بنائے جانے والے رہائشی کمروں کے دروازے بند ہوں گے۔ ائرکنڈیشنر اور ٹی وی چل رہے ہوں گے۔ چنانچہ مکینوں کے آپس میں بات کرنے کی آوازیں میرے کانوں تک کیسے آ سکتی تھیں۔

بالآخر ایک کمرے میں میری آنکھوں پر سے پٹی اتار دی گئی۔ پھر میرے ہاتھ آزاد ہو گئے اور پیروں سے بیڑیاں ہٹا لی گئیں۔ میں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور اس کمرے میں فرش پر بیٹھ گیا جو دیکھنے میں اسٹور روم لگتا تھا۔ آٹھ فٹ لمبے چوڑے کمرے میں بہت سا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اور ہر چیز پر گرد تھی۔

ایک سوکھے کالے اور تاڑ جیسے لمبے ہیڈ کانسٹیبل نے بزعم خود گرج کے کہا "خبردار جو چالاکی دکھائی۔ چاروں طرف بندے موجود ہیں۔ بھون کے رکھ دیں گے" اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک پتلی تھی اور کانپتی تھی۔

جب وہ دروازہ باہر سے مقفل کر کے چلا گیا تو مجھے یہ سب بہت عجیب اور خوف زدہ کرنے والا لگا۔

میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ پہلے خود میں نے اپنے آپ کو

اکیلا کیا تھا۔ جب میں ناصر عظیم سے شاہ عالم بنا تھا تو وہ سب رشتے بے وجود ہو گئے تھے جو میرے لیے خون کے رشتوں سے زیادہ اہم تھے۔ جن کے بغیر میں زندہ رہنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ذمے دار میں حالات کو ٹھہراتا تھا مگر میری مجبوری کا عذر کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھا۔ سب نے مجھے ہی قصوروار سمجھ لیا تھا اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ صرف ناصر عظیم کو اپنا سمجھتے تھے۔ شاہ عالم سے ان کا کوئی رشتہ یا تعلق نہ تھا اور نہ ہو گا۔ اچانک میں ان سب کے لیے اجنبی ہو گیا تھا جو میری زندگی کا حصہ تھے مگر وہ زندگی بھی میری نہ رہی تھی۔ چندا جس کے نام سے میرے دل کی ہر دھڑکن منسوب تھی، خواب فردا ہو گئی تھی۔ اس کی محبت یاد ماضی کا عذاب بن گئی تھی۔ وہ میرے خیالوں کی دسترس سے بھی دور، بہت پیچھے رہ جانے والے وقت کے غبار میں کھو گئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کے بغیر بھی میں زندہ ہوں۔ اتنے ہی جذبے، حوصلے اور عزم کے ساتھ مستقبل کی راہ پر گامزن ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ایسا ہوتا ہے؟ ناممکن اتنی آسانی سے ممکن ہو جاتا ہے۔ کیا اس نے واقعی مجھے بھلا دیا ہو گا؟ اسی طرح جیسے لوگ مر جانے والوں کو بالآخر بھلا دیتے ہیں۔ نہیں، جب میرے دل میں اس کی یاد کا زخم سلگ رہا ہے تو وہ سکون آشنا کیسے ہو سکتی ہے۔

میں نے فاروقی کو اور خان اعظم کو اور قمر کو یاد کیا۔ میری پیاری سی بھولی سی بے وقوف سی بہن۔ ذرا ذرا سی بات پر رو جانے والی مگر اندر سے بڑی حوصلہ مند۔ انتہائی مضبوط اور ذہین۔ بالکل اپنے کمینے بھائی کی طرح۔ پہلے تو وہ چاکلینڈ سے چاکلیٹ لانا ہی بھولتا تھا تو وہ روٹھ جاتی تھی، بھائی میں نہیں بولتی آپ سے۔ اب تو بھائی نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ وہ کتنا روتی ہو گی چھپ چھپ کے۔ اور ڈاکٹر کمال فاروقی اسے سمجھاتا ہو گا۔ وہ آئے گا، وہ ضرور واپس آئے گا قمر۔ میں جانتا ہوں اسے۔

آج ناصر عظیم کے بعد شاہ عالم کے رشتے بھی ٹوٹ رہے تھے۔ مجھ سے میرے اپنے سہارے چھن گئے تھے۔ دوست جدا ہو کے صف دشمناں میں شامل ہو گئے تھے۔ میں پارٹی کا چیئرمین نہیں رہا تھا۔ پارٹی پر باغی اور غدار قابض ہو چکے تھے۔ میں دہرے قتل کا ایک مجرم بنا دیا گیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں؟

یہاں کوئی بھی میری مدد کے لیے نہیں آ سکتا تھا۔ نہ رخشی جو میرے لیے غیر تھی مگر اس نے مجھے سب سے بڑھ کر تحفظ فراہم کیا تھا۔ بے شک اس نے اپنے مفاد میں ایسا کیا تھا مگر وہ مدد نہ کرتی تو آج میں اس قبر میں لیٹا ہوتا جہاں شاہ عالم کا ڈھانچا پڑا تھا۔ میرا رئیس سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میرے پارٹی ورکر اور وفادار ساتھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اشرف لاپتا تھا اور تیمور کسی اسپتال میں زخمی پڑا تھا۔

مجھ سے ملاقات کرنے کے باوجود شبنم اخلاقی طور پر پابند تھی کہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ کیا میرے غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ اس اخلاقی معاہدے کی پابندی ضروری سمجھے گی؟ میں نے اسے اپنی باتوں سے قائل کر لیا تھا کہ میں وہی شاہ عالم ہوں مگر یہ میری زندگی کا بدلا ہوا اور بالکل نیا روپ ہے۔ میری نئی زندگی اس زندگی کے برعکس ہو گی جو میں نے پہلے بسر کی۔ کیا وہ میری بات مان لے گی؟ بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں مگر یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے اس کا قائل ہونا بھی ایک پُرفریب چال ہو۔

دہرے قتل کا الزام مجھ پر ایک سازش کے تحت عائد کر دیا گیا تھا۔ اس کا مقصد ہی مجھے سیاسی منظر سے ہٹانا تھا تاکہ پارٹی پر میرے مخالفین کا قبضہ پکا ہو جائے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا کے قتل کی بات ہی میرے لیے ناقابل یقین تھی مگر رئیس سے ملے بغیر میں جھوٹ کو بھی جھوٹ سمجھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں واقعی قتل کر دیا گیا ہو۔ وہ جس قسم کے غیر قانونی کاروبار میں ملوث تھے، اس میں انسانی جان کی کیا قیمت۔ ایک مقصد حاصل کرنے کے لیے دو چار جانیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ جنگ میں سب جائز ہے۔

اگر خالد عثمان اور خادم مرزا زندہ تھے اور مجھے محض ان سے کاروباری تعلق ختم کرنے کی سزا دی جا رہی تھی تو پھر میرا اللہ ہی حافظ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے یہاں لا کے اس کوٹھری میں بند کرنے والے ہی ان کے آلۂ کار ہوں۔ وہ لوٹ کر ہی نہ آئیں یا آئیں تو اس وقت جب میری ہڈیوں کو یہاں سے ہٹا کے کسی گڑھے میں دبانا ضروری ہو جائے۔ اتنی بڑی انسانوں سے بھری ہوئی دنیا میں ایک شاہ عالم کا غائب ہو جانا کیا مشکل ہے۔ وہ آدمی بھی ایسا ہی تھا۔ کبھی ایک سے دو ہو جاتا تھا، کبھی اصلی نظر آتا تھا کبھی نقلی۔ پہلے بھی غائب ہو گیا تھا۔ پولیس پر کبھی آنچ نہیں آئی۔ وہ کبھی مجرم نہیں ہوتی۔ وہ بڑے سے بڑے سیاسی قتل کے معاملے کو دبانے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ شاہ عالم کیا چیز ہے۔

پُروحشت خیالوں کے ازدحام نے مجھے سخت مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں دروازہ بجا کے کسی کو بلانے اور شور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے کسی نے تالے میں چابی لگائی۔ پھر میرے سامنے عباسی کا مسکراتا ہوا چہرہ آیا۔

"سوری سر! آپ نے خاصا سخت ٹائم گزارا لیکن یہ سب ضروری تھا۔ آیئے میرے ساتھ پلیز۔"

اسٹور کے ساتھ ہی ایک بیڈ روم تھا۔ اس کی آرائش کا انداز پرانا تھا مگر مکینوں کی دولت مندی اور حسنِ ذوق کا مظہر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں رہنے والا کوئی نہیں۔ کوٹھی کے مالک شاید بیرونِ ملک تھے یا اس کے وارث یہاں رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہر چیز میلی میلی اور گرد آلود نظر آتی تھی۔

یہی حال ڈرائنگ روم کا تھا مگر اسے ابھی ابھی جھاڑ پونچھ کے بیٹھنے کے قابل بنادیا گیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک بوڑھا چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر آگیا۔ اس کا رویہ اور انداز ہی خانساماں اور بٹلر جیسا تھا۔

"یہ کوٹھی بھی سرکار نے میرے جیسے لوگوں کا مہمان خانہ بنانے کے لیے لی ہوگی" میں نے کہا "خصوصی تفتیشی سیل۔۔۔"

"آپ مجھے اس کا مالک سمجھ سکتے ہیں۔" وہ بولا "یہ الگ بات ہے کہ میں یہاں رہتا نہیں۔ اکیلا آدمی ہوں۔ اپنی ماں کے ساتھ اسی پرانے گھر میں رہتا ہوں جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔ وہ بھی ہم دونوں کے لیے خاصا بڑا گھر ہے۔ بیڈن روڈ پر۔"

میں نے کہا "گھر کے باقی لوگ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ والد اور بھائی بہن۔۔۔"

"والد کا انتقال ہوچکا۔ بہن بھائی اپنے اپنے گھر میں آباد ہیں۔ سب شادی کے بعد کی ذمے داریوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ مہینے میں ایک بار ماں کو دیکھنے بھی آجاتے ہیں۔"

"تم نے ماں کی وجہ سے شادی نہیں کی؟"

وہ ہنسنے لگا "آپ نے الٹا سمجھا۔ ماں کی وجہ سے ہی شادی کی تھی میں نے۔ خیال تھا کہ بہو ان کی خدمت کرے گی اور انہیں سنبھال لے گی۔ ماں کو بھی عام ماؤں کی طرح بڑے گھر کی بیٹی لانے کا شوق تھا۔ میں سب سے چھوٹا تھا چنانچہ لاڈلا بھی تھا۔ اسے بڑا فخر تھا کہ بیٹا تھانے دار ہے۔ بڑی تلاش کے بعد اسے بالآخر ایک لڑکی پسند آگئی مگر اس نے ماں کو بہت مایوس کیا۔ وہ ایک بہت بڑے پولیس افسر کی بیٹی تھی۔ اکلوتی اور نازوں میں پلی۔ اس کے شوق اور مشاغل مختلف تھے۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے بھی وہ نہ اچھی بیوی بن سکتی تھی اور نہ اچھی بہو۔ مزید یہ کہ والد محترم کے عزائم شروع سے مجھے گھر داماد بنانے کے تھے۔ اس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ ظاہر ہے اس سے اختلافات پیدا ہوئے۔ وہ باپ کے گھر جاکے بیٹھ گئی۔ ابھی تک بیٹھی ہے۔ اس بات کو بھی دو سال ہوگئے' یہ کوٹھی اسے جہیز میں ملی تھی۔"

"پھر تم اس کے مالک کیسے ہوگئے؟"

وہ تلخی سے مسکرایا "دراصل اس ناچیز کو خریدنے کے لیے میرے سسر نے ایک بے وقوفی کی تھی کہ کوٹھی میرے نام کردی تھی۔ گزشتہ سال وہ ریٹائر ہوا اور دو مہینے بعد ہارٹ اٹیک سے مرگیا۔ وہ ایک ائرلائن میں ہوسٹس ہے۔ آزاد اور خودمختار ہے۔ یہاں رہتی ہی نہیں۔ طلاق نہ اس نے مانگی اور نہ میں نے دی۔ خیر' چھوڑیں یہ ساری باتیں۔ مجھے بتائیں کہ یہ چکر کیا ہے؟"

"میرے ساتھ تو کوئی چکر نہیں ہے۔"

"میری تفتیش کا دائرہ دہرے قتل کے الزام تک محدود ہے" وہ بولا "میرا تفتیش کا اپنا انداز ہے۔ میں ہر ملزم سے دوست بن کے کہتا ہوں کہ وہ مجھ پر اعتماد کرے اور سچ بتادے۔ اگر اسے پھنسادیا گیا ہو' اس کے خلاف انتقامی کارروائی کا یا زور زبردستی اور بدمعاشی کا سلسلہ ہو تو مجھے صاف بتادے۔ اکثر جھگڑے وہی ہوتے ہیں۔ زر' زمین اور زن کے۔ خاندانی دشمنی کے یا پھانسی کا پھندا کمزور کی گردن میں فٹ کردیا جاتا ہے۔ کچھ قتل نشے میں ہوجاتے ہیں یا اشتعال کی کیفیت میں۔ میرا اندازہ ہے کہ اسی نوے فیصد ملزم مجھے حقیقت ایسے ہی بتادیتے ہیں۔ تھرڈ ڈگری کا طریقہ استعمال کئے بغیر اور وہ فائدے میں رہتے ہیں۔ بعض اوقات میں اصل ملزموں پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر رہتا ہوں۔ وہ میری دسترس سے اونچے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن میں بے گناہ کو کسی نہ کسی طرح بچالیتا ہوں۔ جو مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ انہیں میں انچارج صاحب کے حوالے کردیتا ہوں یا مجبوراً ان کا کیس سی آئی اے کے سپرد کردیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے انچارج صاحب کا بھی اپنا طریقہ ہے۔ انہوں نے مجھے آفر کی تھی کہ وہ مجھے بچاسکتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے ان کا طریقہ کیا ہے" وہ مسکرانے لگا۔

"وہ ایک کروڑ میں مجھے بے گناہی کی ضمانت دینے پر تیار تھے۔ میں نے ایک روپیہ پیش کیا تو خفا ہوگئے۔"

"یہ خالد عثمان اور خادم مرزا کون ہیں؟"

میں نے کہا "میرے بزنس پارٹنر۔ میرے بیرونِ ملک سے واپس آنے کے بعد کل ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ کاروباری مسائل اور معاملات طے کرنے کے لیے۔ رات بارہ بجے تک ہم ساتھ تھے۔ خادم مرزا کے گھر پر اس کے

باڈی گارڈ نے مجھ سے بدتمیزی کی۔ میں نے اسے واجبی سی سزا دی۔ میں مارشل آرٹ جانتا ہوں۔ ایک ہاتھ مارکے میں نے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ خادم کے ڈرائیور اور چوکیدار نے خادم کے کہنے پر مجھے قابو کرنا چاہا' وہ مسلح تھے۔"

"اختلاف کس بات پر تھا؟"

"وہی لین دین پر۔ خادم مرزا نشے میں تھا اور اس بات پر بہت مشتعل تھا کہ ہانگ کانگ اور سنگاپور سے واپس آنے کے بعد میں اتنا عرصہ روپوش کیوں رہا۔ میں نے ان سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ میں یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ جس قسم کے بزنس میں ہم سب برابر کے شریک تھے' وہ کوئی شریفانہ اور قانونی کاروبار نہیں تھا۔"

"تھا کا کیا مطلب؟"

"سارا جھگڑا اسی سے شروع ہوا۔ جب میں نے کہا کہ ان مخصوص حالات کی وجہ سے' جن سے میں گزر رہا تھا' میرے لیے ان کے کاروبار میں ساتھ رہنا ممکن نہیں۔ میرا سیاسی کیریئر داؤ پر لگا ہوا ہے اور میرے دشمن میرے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ مجھ پر قاتلانہ حملے بھی ہوچکے ہیں۔ میں انہیں کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا جس سے فائدہ اٹھاکے دشمن مجھے بلیک میل کریں۔ تمہیں میرے حالات کا علم تو ہوگا؟"

"میں تقریباً سارے اخبارات دیکھتا ہوں اور آپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات تواتنے دلچسپ اور سنسنی خیز تھے کہ کسی زبردست فلم کی کہانی لگتے ہیں۔"

"واقعات کا سلسلہ ابھی جاری ہے فرید عباسی" میں نے کہا "اصل بات یہ ہے کہ میں نے پارٹی کی تنظیمِ نو کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں سیاست کا انداز کچھ اور چاہتا تھا۔ وہ جس میں منافقت اور ریاکاری نہ ہو۔ جو عوام کی خواہشات اور ملکی حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ جس حمام میں سب ننگے تھے وہاں میں شرافت اور انسانیت کا لباس پہننا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ مجھے ایسا چاہنے کی سزا ملی۔ میں جن دوغلے اور بے ضمیر لوگوں کے غلبے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا' وہی آج پارٹی پر قابض ہیں۔ مجھے جسمانی طور پر آؤٹ نہ کرسکے تو یوں الگ کردیا کہ پارٹی کو ہائی جیک کرلیا۔ میرے مخلص ساتھی بھی باہر کردیے گئے۔"

"خالد عثمان اور خادم مرزا کا اس سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا؟" عباسی نے کہا۔

"نہیں۔ بس وہ میرے سیاسی اثر رسوخ کو استعمال کرتے تھے اور میں ان کے بیرونِ ملک کاروباری تعلق کا ذریعہ تھا۔ جب میں نے خود کو الگ کرنے کی بات کی تو انہیں اپنا کاروباری مستقبل تاریک محسوس ہونے لگا۔ میں ہی وہ پل تھا جس پر ان کے ناجائز دھندوں کی ساری ٹریفک گزرتی تھی۔ پہلے میری خادم سے تلخ کلامی ہوئی۔ وہ نشے میں حد سے بڑھ گیا اور مجھے دھمکیاں دینے لگا۔"

"مسٹر خالد عثمان اس وقت کہاں تھے؟"

"وہ اپنے گھر میں ہمارا انتظار کررہا تھا لیکن خادم کی نیت میں فتور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عثمان کے سامنے کوئی بات نہ ہو۔ دراصل وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے ہوئے تھے اور خاموشی سے اپنے اپنے رابطے بنارہے تھے۔ ایسی باتیں چھپانا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہوتا ہے مگر ان کو یہ خوش فہمی تھی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ جب جھگڑا بڑھا تو خادم نے اپنے چوکیدار' باڈی گارڈ اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ شاہ جی کا دماغ درست کردو۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور مارے گئے۔ میرا مطلب ہے تینوں باری باری آئے اور لیٹ گئے۔"

"ویری گڈ۔ کیا یہ بات ان کے علم میں نہیں تھی کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ مارشل آرٹ کے ماہر ہیں۔"

میں نے کہا "اتفاق کہہ لو اسے یا میری خوش قسمتی۔ پچھلے ایک سال سے میں ٹریننگ لے رہا تھا مگر اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ خادم مرزا نے دیکھا کہ معاملہ الٹ گیا ہے تو اس نے کہا کہ خالد عثمان کو بھی بات چیت میں شریک کر لیتے ہیں۔ ہم خالد عثمان کی طرف گئے اور طے کیا کہ ہوٹل جا کے اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ ہم آدھے راستے میں تھے کہ مجھے اپنی وائف کی کال موصول ہوئی۔ اس کی طبیعت اچانک کچھ خراب ہو رہی تھی اور اسے وہم ہو گیا تھا کہ یہ ہارٹ اٹیک ہے۔ مجھے فوراً واپس جانا پڑا۔ میں اپنے گھر اتر گیا اور ڈرائیور خالد عثمان اور خادم مرزا کو لے گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا' یہ مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو اچانک ایس پی غلام محمد نے گھر آ کے وارنٹ دکھایا اور ان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اب وہ کہتا ہے کہ لاشیں بھی مل گئی ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

"یعنی خالد عثمان اور خادم مرزا کا قتل ہی نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ عمداً روپوش ہیں اور واقعات کی بنیاد پر ان کے حکم کے غلاموں نے میرے خلاف قتل کا کیس بنا دیا ہے۔ ہفتے دو ہفتے یا مہینے بھر بعد وہ اچانک آ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو کاروباری دورے پر تھے۔"

"ایس پی صاحب اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتے" عباسی سوچ میں پڑ گیا۔

"اچھا تم معلوم کرو کہ لاشیں کہاں سے ملیں۔ انہیں کیسے قتل کیا گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں' صبح تک پتا چل جائے گا۔"

میں نے کہا "میرا ایک بہت عزیز دوست بھی ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور ــــ مجھے رخشی سے بھی بات کرنی ہے' اکیلے میں۔"

اس نے سوچ کے کہا "میں آپ کو اپنے موبائل سے کال کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں مگر پلیز ــــ میری پوزیشن کا خیال رکھیں۔ باہر پولیس کی نفری کھڑی ہے۔ ان کا خیال یہی ہے کہ اندر خصوصی تفتیش ہو رہی ہے۔ صبح مجھے ایس پی غلام محمد کو رپورٹ بھی دینی ہو گی۔"

"میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جس سے تمہاری پوزیشن خراب ہو۔"

"کیا میں اس ناجائز اور غیر قانونی کاروبار کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں" عباسی بولا۔

میں نے کہا "تم اندازہ کر سکتے ہو آسانی سے۔ راتوں رات دولت مند بننے کا کون سا نسخہ استعمال ہو رہا ہے۔ آسانی سے قارون کا خزانہ کیسے حاصل ہو جاتا ہے جو کامیابی کی راہ کی ہر رکاوٹ دور کر دیتا ہے۔ آپ لیڈر بن سکتے ہیں۔ سیاست داں بن سکتے ہیں' وی آئی پی ہو جاتے ہیں اور وی وی آئی پی سے زیادہ عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ ملکی قانون کیا چیز ہے۔ بین الاقوامی پابندی و قواعد و ضوابط آپ کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کے منہ سے یہ ساری باتیں مصنوعی لگتی ہیں کیونکہ آپ نے خود بھی اسی طرح کامیابی حاصل کی ہے۔"

میں نے کہا "اسی لیے میں نے تمہارے سامنے اعتراف بھی کر لیا ورنہ میں خود اپنے بزنس کو ناجائز اور غیر قانونی نہ کہتا۔ میں یہ سب چھوڑ دینے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔"

"معاف کیجئے گا جس مقام پر آپ آج ہیں' وہاں پہنچ کے کوئی بھی یہ فیصلہ کر کے اپنے ضمیر صاحب کو مطمئن کر سکتا ہے کہ اچھا بھئی آج سے سارے کام چھوڑے' اب شرافت کی زندگی گزاریں گے۔"

"تم ایسا کہنے میں حق بجانب ہو۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ آدھی زندگی گناہ میں گزار کے باقی آدھی ثواب کمانے کے لیے وقف کر دی۔"

وہ بولا "شعر و شاعری تو مجھے آتی نہیں۔ نو سو چوہے کھا کے بلی کے حج پر جانے کی بات سنی تھی۔"

"آج اس بلی کو دیکھ بھی لیا" میں نے ہنس کے کہا "میں اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ میری ابھی وہ عمر نہیں آئی جب یہ کہا جائے کہ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے۔ ساری عمر پاپ کمانے والے بھی موت کے خوف سے فکرِ عاقبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک ذہنی تبدیلی ہے۔ اس کا سبب بعض اوقات کچھ نہیں ہوتا چنانچہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور جب خدا توفیق دیتا ہے تو خیالات اور نظریات میں انقلاب خود بخود آ جاتا ہے۔ جو بات آج تمہیں مصنوعی لگ رہی ہے' کل حقیقت بن کے سامنے آ جائے گی۔ انشاءاللہ اور بشرطِ زندگی۔"

اس نے اپنا موبائل فون میری طرف بڑھایا "آپ نے ایک بہت عزیز دوست کا ذکر کیا تھا۔ کون ہے وہ؟"

میں نے کہا "وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ تم اسے جانتے ہو گے۔ رئیس خبیث کے نام سے مشہور ہے۔"

"وہ بدمعاش ــــ دس نمبریا ــــ؟" عباسی نے حیرانی سے

کہا "ہسٹری شیٹر۔"

"تم اپنی زبان میں اسے جو بھی کہو' میرے لیے وہ صرف ایک مخلص دوست ہے۔ میں اس پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا اپنے آپ پر۔ ویسے تو اب شریف کی تعریف ہی بدل گئی ہے مگر ہم جیسے لوگوں کے حلقۂ شناسائی میں کسی خاندانی یا روایتی شریف انسان کا کیا کام۔ وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔"

"خالد عثمان اور خادم مرزا کا بھی؟"

"نہیں۔ ان کی دوستی نہیں تھی مگر میری غیر حاضری میں وہ میرے نجی معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا" میں نے سوچ سمجھ کے گول مول جواب دیا "یہ اتفاق ہے کہ پرسوں وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔"

"پھر تو میں اسے بھی شاملِ تفتیش کر سکتا ہوں۔"

"وہ میرے بیان کی تصدیق کرے گا" میں نے کہا۔

"اس کا پتا بتاؤ' میں اسے بلوا لیتا ہوں" عباسی نے کہا۔

"تم اس کے بارے میں سب جانتے ہو۔ ایک ہسٹری شیٹر کا پتا مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ ویسے اس نے بدمعاشی کے سارے دھندے چھوڑ دیے ہیں۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔ اچانک آپ نے بھی سب غلط کام چھوڑ دیے اور آپ کے بچپن کے دوست نے بھی۔"

میں نے کہا "تمہیں یقین نہیں آتا۔"

"نہیں۔ مشہور یہی ہے اور غلط بھی نہیں ہے کہ چور چوری سے جائے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔"

میں نے کہا "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا نام مجرمان بستہ ب کی فہرست سے خارج ہوئے زمانہ ہو گیا۔"

"ہاں۔ ریکارڈ کی حد تک یہ درست ہے۔ اس کا نام کیسے خارج ہوا' یہ بھی سب جانتے ہیں۔ سفارش اور دباؤ کے تحت اسے شرافت کی سند عطا کی گئی۔ آپ بچپن کے دوست ہیں اس کے اور آپ کا اثر رسوخ بھی بہت ہے ماشاءاللہ۔ سب سے زیادہ کوشش آپ نے ہی کی ہو گی اس کے لیے۔"

میں نے کہا "مجھے اس سے انکار نہیں' ایک دوست کی حیثیت سے میں نے ہمیشہ چاہا کہ وہ کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث نہ ہو۔"

"فطرت کو بدلا نہیں جا سکتا شاہ جی۔ کوئی ڈرائی کلینزیا بلیچ کریم کوے کو بگلا نہیں بنا سکتی۔ اس کا نام مجرمان بستہ ب کی فہرست سے خارج ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے بدمعاشی چھوڑ دی ہے اور شریف آدمی بن گیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اب وہ پکڑا نہیں جاتا۔ اسے آپ کا تحفظ حاصل تھا۔ بیشتر سیاست داں غنڈے بدمعاشوں کو پالتے ہیں۔ پیشہ ور ڈاکوؤں اور قاتلوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "سب انسپکٹر فرید عباسی' تمہاری بات کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اس ملک میں یہی ہوتا ہے مگر رئیس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اسے حالات کے ردِعمل نے ایسا بنا دیا۔"

وہ طنز سے ہنسا "ایسا تو ہر مجرم کے بارے میں کہا جاتا ہے سر!"

میں نے کہا "وہ دل کا بہت اچھا ہے۔"

"صرف آپ کے لیے اور کوئی اس کے بارے میں ایسی رائے نہیں رکھ سکتا۔ خیر' اب پہلے میں اس سے بات کر لوں' اس کے بعد آپ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اگر وہ اپنے موجودہ ٹھکانے پر نہ ملے تو شاہ عالمی گیٹ میں رب نواز اسٹور کے پیچھے کانے خلیفہ کے اڈے پر ملے گا۔ آج سوموار ہے نا' عمران خان اور گرو اسکر کا مقابلہ ہو گا فائنل میں۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "اس بے تکی بات کا میں کیا مطلب لوں۔"

"جب تم جاؤ گے تو مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ ایسے یونیفارم میں مت جانا۔ مقابلہ دیکھنا اور بعد میں اسے کہنا کہ شاہ عالم نے بلایا ہے تمہیں فوراً۔ وہ اسی وقت تمہارے ساتھ چل پڑے گا۔ قتل اور تفتیش' وارنٹ اور گرفتاری کی بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"وہ سب میں دیکھ لوں گا۔" عباسی نے فون مجھے تھما دیا۔ "میں دس منٹ دوں گا تمہیں۔ اپنی وائف سے بات کر لو۔"

وہ باہر نکل گیا تو میں نے شاہ عالم ہاؤس کا نمبر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ سب انسپکٹر فرید عباسی کے ذاتی فون پر ہماری گفتگو ٹیپ نہیں ہو گی۔ رخشی کے بیڈ روم میں فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ دوسرا نمبر آفس میں لگے ایکس چینج کا تھا جس پر تمام سرکاری اور سیاسی یا کاروباری کالز موصول ہوتی تھیں اور آپریٹر کے ذریعے شاہ عالم ہاؤس کے ہر حصے میں کسی بھی ایکس ٹینشن سے بات کی جا سکتی تھی۔ تیسرا نمبر لاؤنج کے فون کا تھا۔ آج کل آفس بند تھا تو ایکس چینج میں بھی کوئی آپریٹر نہیں تھا۔ گھر کے پرانے ملازم جو اصل شاہ عالم کے زمانے میں چوکیدار' مالی' شوفر اور باڈی گارڈ وغیرہ تھے' رخصت کیے جا چکے تھے اور ان کی جگہ ابھی تک مجھے اپنے بھروسے کے ملازم رکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ صرف گلاب اور چنبیلی تھے جو اندر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارے کام سنبھال رہے تھے اور لاؤنج میں فون کی گھنٹی پر ان میں سے کوئی ریسیور اٹھاتا تھا۔

دوسری کال کا جواب بھی نہیں ملا تو مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ یہ شاہ عالم ہاؤس میں رات کے کھانے کا وقت تھا۔ اکیلی رخشی کھانے کی میز پر کیا بیٹھتی' نئی پریشانیوں نے اس کی نیند' بھوک' سب اڑا دی ہوگی۔ اگر اس نے کچھ کھایا بھی تو اپنے کمرے میں ہی منگوائے گی۔ گلاب اور چنبیلی کے لیے یہ کچن میں معصوفیت کا ٹائم تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ نہ رخشی اپنے بیڈ روم میں تھی اور نہ گلاب چنبیلی فون اٹھا رہے تھے۔

بات فوراً میری سمجھ میں آگئی۔ یہ دونوں فون منقطع کردیے گئے تھے۔ لائن کٹ جائے تو فون کرنے والے کو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے گھنٹی بج رہی ہے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی مگر اسے غیر متوقع نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ سیاسی انتقام کو انقلاب کا نام دینے والے سازشی عناصر نے جب بھی اقتدار پر قبضہ کیا ہے یہی طریق کار اپنایا ہے۔ ریڈیو' ٹی وی اور اہم سرکاری تنصیبات پر قبضہ' وزیراعظم یا صدر کی رہائش گاہ کا محاصرہ' ائرپورٹ اور تمام مواصلاتی رابطے منقطع۔ شہید ملت مرحوم لیاقت علی خان کو بھی اسی طرح تنہا اور بے یارومددگار کردیا گیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ سے سب فون کاٹ دیے گئے تھے یا بند کردیے گئے تھے۔ مجھ جیسے معمولی شخص کے ساتھ بھی تاریخ دہرانے کا عمل اسی مخصوص انداز میں جاری تھا۔ ابھی تک سب انسپکٹر عباسی نے میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بڑی ذہانت اور جرات کے ساتھ عنایت اور مہربانی کا سلوک کیا تھا مگر کیا پتا یہ بھی کوئی سمجھ میں نہ آنے والی چال ہو۔ اس دامِ ہم رنگ زمیں کو میری نظر دیکھ ہی نہ رہی ہو۔

دس منٹ میں سے تین منٹ گزر گئے تھے۔ مجھے عباسی پر غصہ آنے لگا۔ وہ خصوصی تفتیش پر مامور تھا۔ کیا اسے علم نہیں ہوگا کہ میرے سب رابطے منقطع کردیے گئے ہیں اسی لیے اتنی فیاضی کا مظاہرہ کیا اس نے کہ اپنا موبائل فون پیش کردیا۔ اسے معلوم ہوگا کہ اس فضول آلے کو یکطرفہ طور پر استعمال کرکے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دس منٹ بعد وہ معصوم صورت بنا کے آجائے گا۔ فون منقطع ہے؟ اوہ نو۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا لیکن ایسا ہے تو بہت غلط ہے' آئی ایم سوری۔

اچانک مجھے اس خفیہ فون کا خیال آیا جو زیرِ زمین پناہ گاہ میں لگا ہوا تھا۔ اس کی لائن الگ تھی اور یہ کسی غیر معروف نام سے لیا گیا تھا۔ میرا اپنا موبائل فون پولیس نے گرفتاری کے بعد تلاشی کے دوران میں ضبط کرلیا تھا۔ وہ میں رخشی کو دے آتا تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ شاہ عالم بھی کیا بے وقوف تھا کہ ایک موبائل فون بیوی کو فراہم نہیں کیا۔ خیر اب میں پہلی فرصت میں یہ کام بھی کروں گا۔

خفیہ خانے کا نمبر مجھے سوچنے سے یاد آیا۔ ایک بار یہ نمبر غلط ملا۔ میں نے پھر کوشش کی اور جب رخشی نے "ہیلو" کہا تو مجھے بیک وقت خوشی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔

میں نے کہا "رخشی۔ تم نیچے ہو' آخر کیوں؟"

وہ بڑی گھبرائی ہوئی تھی "شاہ جی۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ تم کہاں ہو آخر؟"

"ظاہر ہے میں پولیس کی تحویل میں ہوں۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ مجھے فون پر تم سے رابطہ کرنے کی اجازت دے دی۔ میں بہت دیر سے نمبر ملا رہا تھا مگر گھنٹی بج رہی تھی۔ ریسیور کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔"

"اوپر کا حال ہمیں نہیں معلوم۔ پہلے سارے فون ڈیڈ ہوگئے تھے۔ نہ میں تیمور سے یا اشرف سے رابطہ کرسکی نہ اخبار والوں سے۔ آخری فون پتا نہیں کس ہمدرد نے کیا تھا۔ اس نے کہا کہ شاہ عالم ہاؤس سے نکل جاؤ فوراً۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔"

"دیکھو' میرے پاس وقت کم ہے۔ جلدی سے بتادو کہ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"پتا نہیں کیوں مجھے اس کی بات کا یقین آگیا۔ وہ خود بھی بدحواس تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چھپ کے یہ اطلاع دے رہا ہے اور ڈر بھی رہا ہے کہ کوئی سن نہ لے۔ بس میں نے فوراً گلاب اور چنبیلی کو بلایا۔ سارے زیورات اور نقد رقم' کاغذات وغیرہ اٹھائے اور تہ خانے میں رکھ آئی۔ مجھے تو ہر لمحہ ڈر تھا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے چنبیلی سے کہا کہ فوراً نکل جاؤ۔ پہلے سیدھی جاؤ مس شبنم کے پاس۔ وہ بڑی مشہور صحافی ہیں۔"

"کیا۔؟ تم نے اسے شبنم کے پاس بھیج دیا؟ حد کرتی ہو تم بھی۔"

"اور کیا کرتی میں' میرے ذہن میں یہی ایک نام آیا۔"

"مگر وہ دشمن ہے میری" میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"آئی ایم سوری!"

میں نے کہا "نہیں رخشی۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے کمال کردیا۔ شبنم مجھ سے ملنے کے لئے تھانے پہنچ گئی تھی۔ میری گرفتاری کی خبر سب کو مل گئی ہوگی۔ شاید ضمیمہ بھی شائع

ہوجائے۔ یہ صرف تمہاری دور اندیشی سے ممکن ہوا۔"

میری تعریف نے اسے خوش کیا "گلاب سے میں نے کہا کہ تم جاؤ اور سراغ لگاؤ شاہ جی کے ایک دوست رئیس کا۔ اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں وہ مگر پتا آسانی سے نہ ملے تو ڈاکٹر کمال فاروقی کے پاس چلے جانا۔ ان کو معلوم ہوگا۔ رئیس سے کہنا کہ فوراً مجھ سے ملے۔"

"اوہ رخشی۔ یو آر گریٹ!"

"مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے یہ سب۔ شاہ عالم نے کبھی میری تعریف نہیں کی تھی۔ اس کے نزدیک میں ایک بے وقوف اور جاہل قسم کی عورت تھی۔ بعد میں تو عورت بھی نہیں رہی تھی۔"

"یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

"آدھے گھنٹے بعد کچھ لوگ ایک ٹرک میں بھر کے آئے۔ انہوں نے اوپر بہت توڑ پھوڑ کی۔ میں نیچے ساری آوازیں سن رہی تھی۔ معلوم نہیں ان کو کس چیز کی تلاش تھی۔ انہوں نے ساری الماریاں کھولیں۔ تالے توڑ دیے۔ سامان باہر پھینک دیا۔ ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ وہ گیراج میں بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے گاڑیاں برباد کردیں۔ جب کچھ ملا نہیں تو انہوں نے اپنا غصہ نکالنے کے لیے گاڑیوں کو آگ لگادی۔ خدا کا شکر ہے کہ آگ گھر کے اندر نہیں پھیلی۔ جب وہ چلے گئے تو فائر بریگیڈ والے آئے۔ شاید آس پڑوس میں سے کسی نے انہیں فون پر اطلاع دی ہوگی۔ اس وقت میں بھی باہر نکلی تھی۔"

"یہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی بے وقوف۔"

"میرا خیال تھا کہ فائر بریگیڈ والوں کی موجودگی میں کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے نقصان کا اندازہ لگایا۔ پانچ دس لاکھ۔"

"لعنت بھیجو پانچ دس لاکھ پر۔ تم ٹھیک ہو نا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جب فائر بریگیڈ والے جانے لگے تو میں پھر تہ خانے میں بند ہوگئی۔"

"بس ٹھیک ہے۔ وہیں رہو آرام سے ابھی۔ ہوسکتا ہے صبح تک رئیس تمہارے پاس پہنچ جائے۔"

"اور تم۔ تم ہو کہاں آخر؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں جھوٹ سامنے آجائے گا۔" میں نے کہا۔

"شاہ جی۔ ایک بات پوچھوں' کیا تم نے۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ ان دونوں کو کسی نے بھی قتل نہیں کیا۔ وہ زندہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی روپوشی بھی زیادہ دن چلنے والا کھیل نہیں ہے۔ پولیس ان کا سراغ لگالے گی۔ یہ مجھے زبردستی پکڑ کے بند رکھنے کی سازش ہے تاکہ پارٹی کے معاملات میرے کنٹرول سے باہر ہوجائیں اور میں کچھ بھی نہ کرسکوں۔ عدالتی STATUS QUE یعنی حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حکم کا سارا فائدہ انہیں ملا ہے ابھی مگر میں نمٹ لوں گا ایک ایک سے۔ عدالت میں دیر ہوسکتی ہے۔"

"یہ سارا کھیل ہی دیر کا ہوگا شاہ جی۔ جتنی دیر ہوگی اتنی ہی تمہاری پوزیشن کمزور پڑتی جائے گی۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر میں لڑے بغیر ہار نہیں مانوں گا۔ میں اتنی آسانی سے انہیں پارٹی کو ہائی جیک نہیں کرنے دوں گا۔"

"اچھا غصے میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھنڈے دماغ سے کام لو اور پہلے اپنے معاملات ٹھیک کرو۔" اس نے نرمی سے کہا "اس کے بعد جو چاہو کرنا۔ جلدی کیسی' ایک عمر پڑی ہے دنیا کو فتح کرنے کے لیے۔"

اس کے الفاظ نے مجھ پر جادو جیسا اثر کیا۔ میں پُرسکون ہوگیا اور میری مایوسی کے جذبات میں ٹھہراؤ آگیا "تم بھی اب سوجاؤ آرام سے۔ اور دیکھو' نیند نہ آئے تو وہ سب مت کرنا جو تم پہلے کرتی رہی ہو۔"

عباسی دو منٹ پہلے میرے سامنے آکے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے فون بند کرکے اسے دے دیا "تھینک یو عباسی!"

"مشہور اور معروف لوگوں کی بیویاں مجبور ہوتی ہیں" وہ بولا۔

"ان کے شوہر بھی بعض اوقات مجبور ہوتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کے انہیں نظرانداز نہیں کرتے۔ انہیں دنیا کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملتی۔"

"ایسا کم ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کی فرصت جذباتی جھمیلوں کی نذر ہوجاتی ہے۔ بیویاں مصنوعی سہارے تلاش نہ کریں تو کیا کریں۔ آپ کی بیوی کیا کرتی ہے؟ سکون آور گولیاں یا خواب آور۔"

"دونوں۔ بعض اوقات تیسری چیز شراب ہوتی تھی۔"

"ان سب کا ایک ساتھ استعمال مہلک بھی ثابت ہوتا ہے" وہ بولا "آپ مہمانوں کے لیے رکھتے ہوں گے گھر میں شراب؟"

"شاہ عالم خود بھی پیتا تھا" میں نے کہا۔

"آپ کی رنگین مزاجی کی داستانیں بھی عام تھیں۔ بیرونِ ملک آپ کے دورے کاروباری کم اور تفریحی زیادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے تھے۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن وہ سب شاہ عالم کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے' پرانا شاہ عالم۔ میرے خیالات اور نظریات میں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے کہ میں خود کو نیا شاہ عالم محسوس کرتا ہوں جس کا اپنے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں۔"

وہ بولا "مجھے خبر ملی ہے کہ کچھ لوگوں نے آپ کے گھر پر حملہ کیا تھا؟"

"مجھے ابھی رخشی نے بتایا ہے۔ وہ آٹھ دس لاکھ کا نقصان کر گئے لیکن میری بیوی بروقت چھپ کر جان بچانے میں کامیاب رہی۔"

"آپ کے خیال میں یہ کون لوگ تھے؟"

"اس وقت میرے دشمنوں کے دو خطرناک گروہ ہیں۔ ایک میرے سیاسی حریف اور وہ دوست جو آستین میں خنجر لیے پھر رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ سچ مچ مجھے شہید کیا جائے اور پھر میرا شاندار مزار بنایا جائے جس کی حسرت پوری نہیں ہو سکی تھی۔ دوسرے کاروباری حریف ہیں۔ ان کی ایک مافیا ہے جو کسی کو اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیتی اور جو ایسا سوچے اسے حقیقی خطرہ بننے سے پہلے عالم بالا کی جانب روانہ کر دیا جاتا ہے۔"

اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تو وہ اٹھ کے باہر چلا گیا اور پانچ منٹ بعد واپس آیا۔ "شاہ جی۔ آپ ادھر آئیں ذرا میرے ساتھ۔ تفتیش کے کمرے میں جسے ڈرائنگ روم بھی کہا جاتا ہے پولیس کی زبان میں۔"

میں تھوڑا سا گھبرایا "اچانک ایسی کیا بات ہو گئی عباسی!"

"ڈی آئی جی صاحب خود تشریف لا رہے ہیں" وہ بولا "یہ دیکھنے کے لیے کہ تفتیش کیسی جاری ہے یا پھر آپ کو شرف ملاقات بخشنے۔ ان کے پی اے نے وضاحت نہیں کی۔"

دوسرا سپاٹ دیواروں والا کمرا بالکل خالی تھا۔ اس میں صرف ایک لوہے کی کرسی رکھی ہوئی تھی اور بالکل سامنے والی دیوار پر تین سرچ لائٹس نصب تھیں۔ یہ جدید وضع کی اسپاٹ لائٹس تھیں جن کی سورج سے زیادہ خیرہ کن اور ناقابل برداشت روشنی کی لکیر سیدھی آنکھوں پر پڑتی تھی۔ میرے لیے اس اندھا کر دینے والی اور آنکھوں میں شیشے کے ذرات کی طرح چبھنے والی روشنی سے بچنا محال تھا کیونکہ دائیں اور بائیں بھی ایسی ہی بے رحم لائٹس تھیں۔ چہرہ گھمانے یا آنکھیں بند کرنے سے کسی بھی زیر تفتیش ملزم کی اذیت کم نہیں ہو سکتی تھی۔ تشدد کا یہ طریقہ شریفانہ سمجھا جاتا تھا۔

عباسی کے حکم پر مجھے لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ چمڑے کی ایک بیلٹ نے میرے سر کو کرسی کی پشت کے ساتھ ایسے لگا دیا کہ میرے چہرے کا رخ درمیانی سرچ لائٹ کی طرف رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ لکڑی کے بجائے لوہے کی کرسی کیوں استعمال کی جاتی ہے۔ ایک تو اسے سیمنٹ لگا کر فرش میں نصب کرنا آسان تھا ورنہ ملزم کے ساتھ کرسی کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی دو آدمی ضروری تھے۔ لیکن اس سے زیادہ لوہے کی کرسی کی افادیت بجلی کے جھٹکے دینے میں ثابت ہوتی تھی۔ یہ بدوضع کرسی الیکٹرک چیئر کی طرح دہشت ناک تھی' قاتل تھی۔

"کچھ دیر آپ کو یہ برداشت کرنا پڑے گا" عباسی نے سب پولیس والوں کو رخصت کرنے کے بعد کہا۔

"میں سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مجھے امید ہے کہ ڈی آئی جی صاحب کے سامنے بھی آپ کا بیان وہی ہو گا جو مبنی بر حقیقت ہے۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ دو گھنٹے کی سخت تفتیش کے بعد میں کیا معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"میری طرف سے بالکل مطمئن رہو۔ سچ بولنا میری بھی مجبوری ہے کیونکہ جھوٹ گھڑنا پڑتا ہے اور اس میں بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔ جو حقیقت ہے' وہ میں دس بار بھی بتاؤں گا تو سرمو فرق نہیں ہو گا" میں نے کہا۔

پولیس کا ایک کانسٹیبل پانی سے بھری ہوئی بالٹی رکھ گیا جس میں ایک پلاسٹک کا مگ تیر رہا تھا۔ عباسی نے ایک مگ بھر کے میرے چہرے پر پھینک دیا۔ میرے کپڑے بھیگ گئے۔ کرسی کے آس پاس پانی پھیل گیا۔ عباسی باہر چلا گیا۔

اب مجھے ڈی آئی جی صاحب کے انتظار میں ایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ پر گھڑی تھی مگر میری کلائی کا رخ دوسری طرف تھا اور میں بندھے ہوئے ہاتھ کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ تیز روشنی کے پیچھے میری آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھیں۔ پس منظر میں تاریکی تھی اور خلا تھا۔ میرا سر بھاری ہونے لگا تھا اور میرے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

دس منٹ بعد جو شاید دس گھنٹے سے زیادہ لمبے اور پرعذاب تھے' میں نے باہر کسی جیپ کے انجن کی آواز سنی جو غرا کے خاموش ہو گیا۔ پھر عباسی کی آواز مجھے اپنے بہت قریب سے سنائی دی "ابھی تک کوئی بھی کام کی بات معلوم

نہیں ہوئی سر۔ شاہ عالم کا ایک ہی بیان ہے کہ قتل کا الزام جھوٹا ہے اور قتل سرے سے ہوا ہی نہیں۔ اس نے ایک گواہ کا نام لیا ہے۔ وہ خالد عثمان اور خادم مرزا کو کل آدھی رات کے بعد ان کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔"

"وہ کون ہے؟"

"ایک سابق ہسٹری شیٹر ہے سر! یس۔ میں نے اسے 'بلایا ہے۔ انہیں زندہ دیکھنے والا آخری شخص وہی تھا۔"

میں نے کراہ کے کہا "پانی۔۔۔ پانی دو مجھے۔ اور یہ لائٹ بند کرو۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"او مائی گاڈ!" یہ آواز ڈی آئی جی کی تھی "عباسی۔ آر یو میڈ۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔"

"مجھے ایس پی صاحب نے حکم دیا تھا۔"

"کون ایس پی۔ غلام محمد؟ ہی از اے فول۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے؟" ڈی آئی جی خفا ہو گیا۔

"دہرے قتل کا ایک مجرم سر!"

"شٹ اپ۔ عباسی یہ ایک سیاسی جماعت کا سربراہ ہے۔ اس کے مراسم ہیں دوسرے سب سیاست دانوں سے اور یہ رکن بھی ہے اسمبلی کا۔ اس کے ساتھ تم عام مجرموں جیسا سلوک کر رہے ہو؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ شاہ جی کو الگ رکھا جائے۔ دیٹ از آل۔ یہ نہیں کہا تھا کہ الگ لے جا کے ایسے تفتیش کی جائے' مصیبت ڈال دیں گے اخبار والے اور سیاسی کارکن۔ اسمبلی میں ہنگامہ ہو جائے گا۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ایڈیٹ۔ اسے کھولو اور آرام سے لاؤ میرے پاس۔ کال اے ڈاکٹر۔"

"اس کی ضرورت نہیں سر۔ ہی از آل رائٹ۔"

آدھے گھنٹے بعد مجھے ڈی آئی جی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے مجھے موقع دیا گیا کہ میں ہاتھ منہ دھو کے فریش اپ ہو جاؤں۔ عباسی اپنی ڈپلومیسی کی کامیابی سے مطمئن تھا۔ اس نے میری سیاسی اور ذاتی اہمیت کے پیش نظر میرے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جس کا میں مستحق تھا اور دوسری طرف اس نے افسران بالا کے حکم کی تعمیل میں پوری تندہی سے تفتیش کی تھی۔ الزام اگر آیا تھا تو ایس پی غلام محمد پر جس نے مجھے عوام سمجھا جبکہ میں خواص میں شامل تھا۔ بے شک قانون' آئین کی حد تک سب کے لیے برابر ہے اور اس کا اطلاق بلا امتیاز ہونا چاہیے مگر عملاً صورت حال اس کے برعکس رہتی ہے۔ اسلامی مساوات کے دعوے دار خود بھی وی آئی پی کلچر کی مراعات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ڈی آئی جی سفاری سوٹ میں تھا۔ اس نے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ "آیئے شاہ جی۔ میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ ابھی آیا تو مجھے پوری رپورٹ ملی" وہ بولا۔

میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا "مجھے بے وقوف مت بنائیں۔ آپ جیسے نہ جانے کتنے ڈی آئی جی بھگت چکا ہوں میں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیسے آپ لوگ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ایک دوسرے پر الزام رکھتے ہیں اور خود کو بے قصور ثابت کرنے کی یہ اداکاری مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے خلاف سازش میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں یہاں نہیں تھا۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ آپ یہیں تھے۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں اس پر" میں نے کہا "یہ پولیس اور انتظامیہ کی ملی بھگت تھی کہ آج ایک بے بنیاد رپورٹ پر ایک معمولی سب انسپکٹر نے مجھ پر اتنا تشدد کیا۔ میں پوچھتا ہوں کیا میرے خلاف رپورٹ لکھوانے والے مجھ سے بھی زیادہ معتبر تھے۔ انہوں نے کہا اور آپ نے مجھے قاتل مان لیا۔ کسی وجہ اور ثبوت کے بغیر۔ مجھے اپنے وکیل سے قانونی مشورے کی اجازت تک نہیں دی گئی۔ مجھے حوالات میں عام مجرموں کے ساتھ ڈال دیا گیا۔ مجھے یہاں ہتھکڑی اور بیڑی لگا کے لایا گیا۔"

"ہتھکڑی اور بیڑی!" ڈی آئی جی کا پارا چڑھ گیا "عباسی! مجھے فوری EXPLAINATION چاہیے۔ یہ کیسے ہوا آخر؟"

"ایس پی غلام محمد صاحب کے حکم پر سر!"

وہ عباسی پر چلانے لگا "غلام محمد تمہیں حکم دیتا کہ انہیں قتل کے جرم میں پھانسی لگا دو تو تم تعمیل کرتے؟ تمہاری اپنی عقل کہاں چلی گئی تھی؟ کیا تم قانون سے اتنے ناواقف ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہتھکڑی اور بیڑی کسے لگائی جاتی ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو گی تو معطل تم بھی ہو جاؤ گے۔"

"آئی ایم سوری سر!"

"سوری کہنے سے کچھ نہیں ہو گا عباسی۔ شاہ جی رٹ دائر کر دیں گے پولیس کے محکمے پر۔ تمہیں صرف ان کا بیان لینا تھا۔ ان کی ایک پریس کانفرنس سے طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔"

میں نے اب پانسا پلٹ دیا "چلیں جانے دیں ڈی آئی جی صاحب۔ ایس پی سے آپ ضرور پوچھیں کہ اس نے اپنے قانونی اختیارات سے اتنا تجاوز کیوں کیا؟ آخر کیا دشمنی تھی اسے میری ذات سے کہ وہ اتنا پرسنل ہو گیا۔ اس بے چارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب انسپکٹر کو قربانی کا بکرا بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہزبلہ برعضو ضعیف۔ پکڑنا چاہیے اوپر والوں کو۔ نیچے والے تو مجبور ہوتے ہیں کہ تعمیل کریں۔ نہ کریں تو ان کی ناراضی مول لیں۔"

"میں آپ سے ذاتی طور پر معذرت خواہ ہوں کہ اتنی تکلیف ہوئی آپ کو۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"چلیں' میں اس معذرت کو قبول کرتا ہوں" میں نے فراخ دلی سے کہا۔

"کل آپ کی درخواستِ ضمانت منظور کرلی جائے گی۔ آپ ایک تحریری بیان دے دیں جو آپ نے کہا وہی لکھ دیں۔ اور وہ کون ہے عباسی' کیا نام بتایا تھا تم نے اس ہسٹری شیٹر کا؟"

"وہ ہسٹری شیٹر تھا ڈی آئی جی صاحب! اب وہ شریفانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا نام ہے رئیس۔ وہ خود کل رات بارہ بجے کے بعد خالد عثمان اور غلام مرزا کو ان کے گھر چھوڑ کے آیا تھا۔ اس نے مجھے فون پر اطلاع بھی دی تھی۔ یہ جو ڈرائیور اور باڈی گارڈ ہیں' جنہوں نے میرے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی' آپ ان سے پوچھیں ذرا سختی سے تو وہ بتا دیں گے یا گھر والوں کا بیان لیں۔ قتل کا کیس مجھے پھنسانے کے لیے بنایا گیا ہے۔"

"آپ کا موقف ہے کہ کسی کا بھی قتل نہیں ہوا اور مقتول خود روپوش ہو گئے ہیں؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی اور نے قتل کردیا ہو یا کرادیا ہو۔ حالات اور واقعات کی شہادت کو میرے خلاف استعمال کرنے کے لیے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا اسی کو کہتے ہیں۔"

"میں ابھی اس کے احکامات جاری کرتا ہوں" ڈی آئی جی نے کہا۔

"ایس پی غلام محمد نے مجھ سے کہا تھا کہ لاشیں مل گئی ہیں۔"

"REALLY؟" وہ چونکا۔

"فرید عباسی۔ کیا تمہاری موجودگی میں کسی نے فون کرکے اطلاع نہیں دی تھی۔ فون تھانہ انچارج نے سنا تھا۔"

عباسی بولا "یس سر۔ ہی از رائٹ۔ میں وہیں موجود تھا۔"

"مگر یہ سب مجھے نہیں بتایا گیا۔ کیا رپورٹ ہے DEAD BODIES کی عباسی؟"

"مجھے نہیں معلوم سر۔ پوسٹ مارٹم سے پتا چلے گا۔"

"دیکھو' فون کرکے پتا کرو۔ مجھے دس منٹ میں بتاؤ کہ لاشیں کب ملیں' کہاں ملیں' کس نے دیکھیں اور اب کہاں ہیں؟ رائٹ!"

"رائٹ سر!" عباسی نے سیلوٹ کیا' مجھے آنکھ ماری اور کمرے سے نکل گیا۔ ایک کانسٹیبل چائے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ شاید وہ ڈی آئی جی صاحب کا ملازم خاص تھا جس نے خانساماں کو اندر آنے سے روک دیا ہوگا۔ بہت بھوک لگ رہی تھی اور چائے کے ساتھ کھانے کے لیے اتنا تھا کہ میں پیٹ بھر سکتا تھا۔

"اب میں آتا ہوں دوسری طرف!" ڈی آئی جی نے چائے کا کپ اٹھاکے کہا "ان معاملات کی طرف جن کا تعلق آپ کے سیاسی کیریئر سے ہے۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ میں عدالتی احکامات میں دخل اندازی بھی نہیں کروں گا لیکن آپ کی پرسنل سیکیورٹی رسک کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ آپ پر قاتلانہ حملوں کی رپورٹ پر ہم پہلے ہی تفتیش کررہے تھے۔ چند دن پہلے رات کے وقت کسی نے آپ کے گھر پر فائرنگ کی۔ اس میں دو پولیس مین بھی شہید ہوئے تھے۔ تاہم قاتلانہ حملے کی نیت سے آنے والے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایک حملہ آور مارا گیا تھا۔ حملہ آور جس گاڑی میں آئے تھے وہ شناخت کرلی گئی تھی۔"

"لیکن آج تک پولیس نے کسی کو شک میں بھی گرفتار نہیں کیا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آج پھر میرے گھر پر نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کیا تھا؟"

اس نے سرہلایا "مجھے اس کی رپورٹ بھی مل گئی ہے اور میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا کہ ہم نے پہلے اس گاڑی کا سراغ لگایا پھر ان پر نظر رکھی جن پر ہمیں شک تھا۔ ہم ان پر ثبوت اور شہادت کے ساتھ ایسے ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے کہ وہ بچ نہ سکیں۔ ہم نے آپ کے گھر کے آس پاس خصوصی نگرانی کے انتظامات کیے تھے اور آج حملہ کرنے والوں میں چند افراد کی شناخت کے بعد ہم نے کچھ گرفتاریاں کی ہیں۔"

"یہ کارکردگی یقیناً قابلِ تعریف سمجھی جائے گی۔"

"گرفتار ہونے والوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو انہوں نے آدھے گھنٹے میں سب بتادیا جو ہمارے مفروضات سے مطابقت رکھتا تھا۔ پہلے بادشاہت تھی تو وراثت کی جنگ میں بیٹا اپنے باپ کو یا بھائی کو ٹھکانے لگا کے اقتدار حاصل کرتا تھا۔ اب کہنے کو جمہوریت ہے مگر اس میں بھی انداز وہی

ہے۔ موروثی سیاست ہے اور کرسی پر قبضے کی جنگ ہے۔ آپ کے خلاف سازش کرنے والوں کا مقصد بھی اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ آپ کو ہٹا کے پارٹی میں کسی اور کو چیئرمین بنایا جائے اور پھر یہ کہ نئی چیئرمین سارے عہدے انہی کو انعام میں بخش دے جنہوں نے اس کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا ہو۔ ہمارا اپنا بھی یہی اندازہ تھا جو درست ثابت ہوا۔"

میں نے کہا "پھر کسے گرفتار کیا آپ نے؟ ابھی تک میں نے کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا لیکن سازش کرنے والوں کے چہرے بے نقاب ہوچکے ہیں۔ میں جانتا ہوں ان سنپولیوں کو جن کو میں نے دودھ پلا کے پالا تھا۔ وہی پھن پھیلا کے مجھے ڈسنا چاہتے تھے۔"

"اقتدار کی ہوس ایسی ہی لعنت ہے" وہ بولا اور اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے بیٹھ گیا "ہم نے دو کو وعدہ معاف گواہ بنالیا اور انہوں نے سب بتادیا۔ کیسے آپ کی جگہ ایک بالکل آپ کی کاربن کاپی تیار کی گئی۔ ایک ایسے شخص کو سامنے لایا گیا جو ننانوے فیصد آپ کا عکس تھا۔ اسے کچھ دباؤ اور لالچ سے آپ کی جگہ لینے کے لیے تیار کیا گیا اور جب آپ باہر تھے تو اس سے ایک کال کرا کے آپ کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ میں وہ سب دہرانا ضروری نہیں سمجھتا جو تفصیل سے اخبارات میں آچکا ہے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی یا وہی بات کہ مرتا وہی ہے جس کی قضا آئی ہو اور قضا آپ کے اس ہم شکل کو خود کھینچ کے آپ کی جگہ لے آئی تھی۔ وہ مارا گیا اور آپ بچ گئے تو آپ پر براہِ راست قاتلانہ حملہ ہوا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر فائرنگ کرنے والا کرائے کا قاتل نہیں تھا۔ اس کی الگ کہانی ہے۔ اسے EXPLOIT کیا گیا تھا۔ یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اس کی بہن کی موت کے ذمے دار آپ ہیں۔ ابھی چھ مہینے پہلے شاہ عالم ہاؤس کی عقبی دیوار کے پاس سے ایک عورت کی لاش ملی تھی۔ اٹھائیس سال کی جوان لڑکی تھی جسے بے حرمتی کے بعد قتل کردیا گیا تھا۔ اس سانحے کے بعد صدمے سے باپ پاگل ہوگیا تھا اور اس نے خودکشی کرلی تھی۔ ماں کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ ان واقعات نے بھائی کے ذہن کو انتقام کے جنون میں مبتلا کردیا لیکن انتہائی کوشش کے باوجود لڑکی کے قاتل پکڑے نہیں گئے۔"

میں نے کہا "پکڑے نہیں گئے یا ان کا سراغ ہی نہیں ملا؟"

وہ کچھ سوچ کے معنی خیز انداز میں مسکرایا "میرا خیال ہے کہ سراغ نہیں ملا۔ اس نوجوان نے بہت ہنگامہ کیا۔ تار دیے چیف جسٹس کو' وزیرِ اعظم اور صدر کو۔ پریس کلب کے سامنے خواتین کی ایک تنظیم نے مظاہرہ کیا۔ وہاں اس نے اعلان کیا کہ چالیس دن میں اس کی بہن کے قاتل گرفتار نہ ہوئے تو وہ اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے خود سوزی کرے گا۔ آپ کے دشمنوں نے اسے استعمال کیا۔ وہ اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ مجرم آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ شاہ عالم ہاؤس کی دیواروں کے پیچھے یہ کھیل ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ایک سیاسی شخصیت کے خلاف کسی ثبوت کے بغیر پولیس کچھ نہیں کر سکتی۔ اتنی ہمت کس میں ہے کہ شاہ عالم کا نام لے۔ وہ بے وقوف نوجوان آگیا اس چکر میں۔ اسے بڑی چالاکی سے اسلحہ فراہم کیا گیا اور نشانہ بازی کی تربیت دی گئی۔ اس کے باوجود وہ ماہر نشانہ باز نہیں تھا اور ریلوے اسٹیشن پر کچھ شدتِ جذبات کے باعث اور کچھ ہجوم میں اس کا نشانہ چوک گیا۔ اس نوجوان کو طے شدہ پروگرام کے مطابق وہیں مار دیا گیا۔"

مجھے بہت دکھ ہوا "یہ ہے اس ننگِ انسانیت نظام میں ہونے والے ظلم کی ایک مثال۔ چار افراد کے ایک پورے خاندان کو شیطان اور بھیڑیے کھا گئے۔ قانون کی حکمرانی کے دعوے دار' جمہوریت کے چیمپئن' اسلامی عدل کا راگ الاپنے والے' ان سب کے گھروں کی چھت نہیں گری۔"

"آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔ ہم تو روز اس سے کہیں زیادہ بے رحمی' بے حسی اور شیطان کو شرمسار کرنے والے ظلم کی مثالیں دیکھتے ہیں۔ اس دوسری ناکامی کے بعد آپ کی رہائش پر حملہ ہوا۔ اس میں پروفیشنل لوگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ انہیں توقع تھی کہ پولیس رسمی سی مزاحمت کی کارروائی کے بعد اپنی جان بچالے گی۔"

"جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔"

اس نے میرے طنز کو نظرانداز کردیا "وہاں سخت مقابلہ ہوا اور ان پیشہ ور قاتلوں کو بھاگنا پڑا۔"

"اب تو ان کے بارے میں بھی پتا چل گیا ہوگا کہ وہ کون لوگ تھے اور انہیں HIRE کرنے والا کون تھا۔"

"آف کورس۔ وہ آج رات ہی گرفتار ہو جائیں گے۔ پولیس کی چھاپا مار ٹیم میں بہت اچھی کارکردگی کی شہرت رکھنے والے افسر اور جوان شامل کیے گئے ہیں۔ جو گرفتار ہوئے ہیں' انہوں نے سب بتادیا ہے۔"

"کون ہیں وہ سلطانی گواہ۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اتنی آسانی سے مان گئے اور دو گھنٹے میں آپ نے ساری کارروائی مکمل کرلی۔ اعترافِ جرم کرالیا۔ وعدہ معاف گواہ تیار کرنے اور ان سے تفصیلی بیان حاصل کرکے کچھ گرفتاریاں کرلیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور باقی لوگوں کو پکڑنے کے لیے خصوصی ٹیم بھی بنادی۔"

"دو گھنٹے بہت ہوتے ہیں شاہ جی" وہ بولا۔

"ایسی کارکردگی کی ناقابلِ یقین داستانیں آج تک ایف بی آئی اور اسکاٹ لینڈ یارڈ سے منسوب تھیں۔"

اس نے پہلو بدل کے کہا "ہماری پولیس بھی بہت کچھ کرسکتی ہے۔"

میں نے کہا "اگر کرنا چاہے۔ ورنہ ہماری تاریخ سیاسی قتل کی بے شمار وارداتوں کا ایک لامحدود سلسلہ ہے۔ جو شاید کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لوگ ہر قاتل کا چہرہ پہچانتے ہیں اور قتل کی وجہ جانتے ہیں مگر پولیس نے آج تک ایک بھی قاتل نہیں پکڑا۔ جو قتل کے الزام میں پکڑے گئے وہ قاتل نہیں تھے۔ جیسے آج میں پکڑا گیا تھا۔"

"شاہ جی۔ سیاسی قتل کی بات مت کریں۔ وہ سیاست دانوں کا کھیل ہے۔ اس میں وہ ہمیں بھی شریک کرتے ہیں زبردستی کیونکہ وہ حاکم ہیں اور محض نام کے پبلک سرونٹ۔ اصل میں تو ہم ان کے حکم کے غلام ہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"چلیں چھوڑیں' یہ دل جلانے والی باتیں۔ یہ بتائیں کہ شمس اور قریشی کیا کہتے ہیں اب؟ ظاہر ہے انہوں نے وعدہ معاف گواہوں کے بیان کو جھوٹ کہا ہوگا۔ یہ کہا ہوگا کہ وہ خریدے ہوئے لوگ ہیں۔"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا "میں سمجھا نہیں۔ کون شمس اور قریشی۔ وہ جو آپ کی پارٹی کے نائب صدر ہیں۔"

"ظاہر ہے وہی اس سازش میں MIND MASTER ہیں۔"

اس نے تلخی میں سر ہلایا "آئی ایم سوری۔ آپ کا اندازہ غلط ہے۔ سازش کے سرغنہ آپ کے دست راست تھے۔ آپ کی پارٹی کے سینئر نائب صدر' مسٹر تیمور!"

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا "تیمور! آپ نے تیمور کو گرفتار کیا ہے؟"

"وہ ابھی اسپتال میں ہیں لیکن ہم نے وہاں گارڈ متعین کردیے ہیں اور ان کے کمرے کو "سب جیل" قرار دے دیا ہے۔"

"ڈی آئی جی صاحب' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ امیر تیمور میرا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ساتھی ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

"سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ساتھی ہی سیاسی اقتدار کی جنگ میں پہل کرتے ہیں" وہ بولا "پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا پہلا ہاتھ انہی کا ہوتا ہے' عراق' ایران' افغانستان و پاکستان۔ ہر جگہ کسی کا تختہ الٹا گیا تو کیا ہوا۔ اسکندر مرزا' بنی صدر' ہیرک کارمل' کتنے دن اقتدار میں رہے؟"

"لیکن یہاں آپ غلطی کررہے ہیں۔"

"ہم جو کچھ کررہے ہیں ثبوت اور شہادت' حالات اور واقعات کی گواہی کو سامنے رکھ کے کررہے ہیں" ڈی آئی جی نے کہا۔

"نہیں۔ یہ سب کچھ اسی پلان کا حصہ ہے۔ آپ وہی کررہے ہیں جو پہلے سے طے تھا؟" میں نے مشتعل ہوکے کہا۔

"آپ اسی انتظامیہ کا حصہ ہیں جو مجھے بے سہارا اور ISOLATE کرنے کی قیمت وصول کرچکی ہے۔ آپ میرے دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہیں اور میرے دوستوں کو مجھ سے جدا کررہے ہیں۔ انہی پر فردِ جرم عائد کی جارہی ہے جو میری مدد کرسکتے تھے۔ کیوں کررہے ہیں آپ ایسا۔"

"شاہ جی۔ آپ زیادتی کررہے ہیں۔ پولیس کا یہی مسئلہ ہے۔ جب وہ کسی مجرم پر ہاتھ ڈالتی ہے تو آپ جیسے لوگ ہمارا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں کہ یہ تو ہمارا خاص آدمی ہے۔ آپ ہمیں کام کرنے دیں پلیز۔ جو حقیقت ہے سامنے آجائے گی۔ فیصلہ مجھے یا آپ کو نہیں' عدالت کو کرنا ہے۔"

"عدالت' عدالت میں کیا ہوگا؟" میں نے بات کاٹ دی "وہی ڈراما جس کا پلاٹ آپ کا ہے۔ کردار آپ کے ہیں اور پروڈکشن آپ کی ہے۔ جج مجبور ہوتا ہے شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے لیے اور شہادت آپ لوگ لاتے ہیں۔ جج کیسے کہہ سکتا ہے کہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے گواہی دینے والا جھوٹ بول رہا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔ مجھے تفتیش کے عمل میں آپ سے ہدایات نہیں لینی ہیں۔ آپ مجھے DICTATE نہیں کرسکتے۔ مسٹر تیمور بھی کوئی لاوارث اور بے وقوف آدمی نہیں ہیں۔ وکیلوں کا پورا پینل ان کا دفاع کرے گا۔ ملک میں سیاسی مقدمات جیتنے کی شہرت رکھنے والے وکیل آپ خود فراہم کرسکتے ہیں انہیں۔ ابھی صرف گرفتار کیا ہے انہیں۔ پھانسی کا حکم نہیں سنادیا ہے ہم نے۔"

"پھانسی کا پھندا تو ڈال ہی دیا ہے گلے میں۔ اب صرف تمہیں جج کے اشارے اور اجازت کا انتظار ہے۔"

"اس ملک کی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے کبھی کسی بے گناہ کو سزائے موت نہیں دی۔ تیمور صاحب بھی باعزت طور پر بری ہوجائیں گے۔ اگر وہ بے گناہ ہوں گے۔"

"اگر تم نے انہیں جینے دیا اس وقت تک۔" وہ بڑھا اور

بیمار آدمی تمہارے قاتلانہ عزائم کا کیسے مقابلہ کرسکتا ہے۔"

"THIS IS TOO MUCH" وہ کھڑا ہوگیا "میں آپ کو خبردار کرتا ہوں شاہ جی۔ ذرا پاکستان کی تاریخ کو ذہن میں تازہ کریں۔ مغربی پاکستان کے دو گورنرز' پاکستان کے دو صدر اور دو وزیراعظم اوزبہت سے ایسے لیڈر ہیں جو طبعی موت نہیں مرے۔ جب STATE کی مشینری حرکت میں آجائے تو حالات کے دھارے کا رخ کوئی نہیں پلٹ سکتا۔ نہ کوئی طرم خاں' نہ پریس اور نہ پبلک۔ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی بے بسی بھی ایک متنازع مسئلہ رہی ہے۔ پھر کیا تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ جی!"

میں اس کے لہجے میں چھپی ہوئی واضح دھمکی کو محسوس کرسکتا تھا۔ اس نے مجھے بتادیا تھا کہ شاہ جی' کسی گمان میں مت رہنا۔ اگر دو قتل تم نے نہیں کیے ہیں ابھی تک تو کل تمہارے کھاتے میں ڈالے جاسکتے ہیں۔ آج اور کل کے درمیان یہ رات ہے اور خالد عثمان یا خادم مرزا اگر زندہ ہیں اور روپوش ہیں تو کیا یہ ناممکن ہے کہ کل بیچ بیچ ان کی لاشیں مل جائیں اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ بھی ثابت ہوجائے کہ ان کی موت تشدد کا نتیجہ تھی۔ ان کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں یہ بتائیں گی کہ مارنے والا مارشل آرٹ کا ماہر تھا۔

"میرا ایک دوست اور بھی ہے' پارٹی کا سیکریٹری اشرف۔" میں نے کہا۔

"وہ اشرف۔ ہاں' وہ روپوش ہوگیا ہے۔" ڈی آئی جی نے جاتے جاتے رک کے کہا "اس کے خلاف شمس صاحب اور قریشی صاحب نے الگ الگ ایف آئی آر درج کرائی ہیں۔ ایک پارٹی آفس سے ریکارڈ چوری کرنے کی اور دوسری بدعنوانی' مالی بے ضابطگی اور خوردبرد کی۔ اس نے پارٹی فنڈ میں غبن کیا۔ جعلی دستخطوں سے چیک کیش کرائے' پارٹی کے نام پر عطیات وصول کیے اور ایک گاڑی لے گیا۔ پکڑا جائے گا وہ بھی۔"

ڈی آئی جی کے جانے کے بعد مجھے عباسی کا خیال آیا۔ اسے دس منٹ میں رپورٹ دینے کے لیے کہا گیا تھا کہ خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاشوں کے بارے میں خبر کس حد تک درست ہے۔ اس بات کو آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا مگر وہ لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ فون پر کچھ پتا نہیں چل رہا تھا چنانچہ سب انسپکٹر فرید عباسی گاڑی لے کر گئے ہیں اور کچھ پتا نہیں کہ وہ کب واپس آئیں گے۔

مجھے اس کوٹھی کے اندر رہتے ہوئے نقل و حرکت کی پوری آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ منقطع تھا۔ ایک بیڈ روم میرے لیے کھول کے صاف کردیا گیا تھا مگر اس کی باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں کیلوں کے ذریعے بند کردی گئی تھیں۔ گرلوں کے پیچھے لوہے کی گرل صاف نظر آرہی تھی۔ اس طرف سے میرے فرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کھڑکیاں بند رکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں باہر نہ جھانکوں اور یہ اندازہ کرنے کی کوشش بھی نہ کروں کہ مجھے کہاں قید میں رکھا گیا تھا۔ فرید عباسی نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایک کہانی بھی سنائی تھی مگر اسے نہ میں جھوٹ قرار دے سکتا تھا اور نہ سچ۔

دروازے باہر سے مقفل تھے اور مجھے یقین تھا کہ عمارت کے باہر برآمدے میں گیٹ پر اور احاطے کی بیرونی دیوار کو پولیس کی مسلح نفری نے گھیرے میں لے رکھا ہوگا۔

جو کچھ میرے ساتھ ہورہا تھا' اسے صرف پارٹی کے ناراض یا باغی عناصر کی کارروائی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ انہیں یقیناً دوسری سیاسی جماعتوں یا برسراقتدار حکومت کے کچھ لوگوں کی حمایت حاصل تھی جو شاہ عالم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو اپنے سیاسی مستقبل کے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے ہوں گے۔ شاہ عالم کی نجی زندگی میں اس کا کردار کیسا بھی ہو' اپنی ذہانت' پی آر اور جوڑ توڑ کے سیاسی حربوں کے باعث وہ آہستہ آہستہ کامیابی کے سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت سے نااہل بڈھے طوطے اور میدانِ سیاست کے تھکے ہوئے گھوڑے' رجعت پسند اور موروثی سیاست کرنے والے جو اپنے آبائی حلقوں سے منتخب ہونے کو کسی صلاحیت کے بغیر اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ آزاد امیدوار کہلانے والے بے پیندے کے لوٹے اور بدمعاشی میں سند جیسی شہرت رکھنے والے سب سیاست داں اب عوام کے بدلے ہوئے تیور دیکھ رہے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ نئی نسل کے باغی نوجوان یعنی ANGRY YOUNG MEN کہیں ان کا بوریا بستر گول ہی نہ کردیں۔ لحاظ' موت اور قوتِ برداشت کی بہرحال ایک حد ہوتی ہے اور عوام کے دلوں میں اندر ہی اندر پکنے والا عدم اطمینان اور ناراضی کا آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔

شاہ عالم نئی نسل کا نمائندہ تھا اور پرانی نسل کی بھیانک غلطیوں کو پوری طرح اپنے حق میں EXPLOIT کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ چنانچہ اس کی آواز الگ سنی جارہی تھی۔ اس کے ہمنوا تعداد کی طاقت حاصل کررہے تھے۔

کمرے میں ریڈیو' ٹی وی اور فریج موجود تھے۔ ایک اے۔ سی بھی کام کررہا تھا مگر ان آسائشوں کے باوجود میری اضطرابی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیفیت اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میری کامیابی کا خواب تعبیر ملنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ شاہ عالم کو اقتدار اور اختیار سے الگ کرنے کا فیصلہ بہت پہلے کرلیا گیا تھا۔ جب ایک کے بعد دوسرا شاہ عالم مقابلے پر آگیا تو اسے سیاسی موت مارنے کا دوسرا زیادہ موثر اور مکمل پلان سامنے لایا گیا۔ اسے تنہا اور بے یارومددگار کردو۔ پارٹی نہیں تو چیئرمین کیبا۔ اس کے خلاف کرمنل کیس کھڑے کردو۔ اس کے ساتھی اور حمایتی پکڑلو۔ اس کے رابطے ختم کردو۔ وہ سیاسی منظر سے ہٹے گا تو پریس اور پبلک اسے بہت جلد بھول جائیں گے۔ جب سیاست میں ریاستی دہشت گردی کا عنصر شامل ہوا تو بہت سے وضع دار پرانے سیاست داں' جو آزادی کی جنگ میں پیش پیش تھے اور قائداعظم کے رفقائے کار میں شمار ہوتے تھے' ملک اور قوم کے لیے ہر قربانی دے چکے تھے اور اپنے مقصد سے مخلص تھے اسی طرح الگ کردیے گئے تھے یا خود آنے والے وقت سے ڈر کے گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ انہیں اپنی جان سے زیادہ اپنی عزت عزیز تھی۔ اب ہم ان کی برسی مناتے ہیں۔ ان کے بارے میں ٹی وی پر جذباتی تقریریں کرتے ہیں اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں یا ان کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

میں نے دوبار کافی طلب کی جو مجھے اسی بوڑھے خانساماں نے فراہم کی۔ وہ بھی بہت پُراسرار چیز تھا۔ وہ زبان سے ہاں یا نہ بھی نہیں بولتا تھا۔ سرہلا کے اظہار نہیں کرتا تھا کہ اس نے بات سن لی ہے اور سمجھ لی ہے۔ وہ کسی گونگے بہرے کی طرح آتا تھا اور چلا جاتا تھا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کون کیا کررہا ہے۔ عباسی کہاں ہے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا زندہ ہیں یا واقعی ان کا خون میرے نام کی فردِ جرم میں شامل ہوچکا ہے۔ رئیس یہاں لایا جائے گا یا پولیس اسے پکڑ کے کہیں اور لے جائے گی۔ تیمور جو دل کا مریض ہے اسپتال میں ہی "طبعی موت" تو نہیں مرجائے گا۔ اس کے لیے اسپتال والے سرٹیفکیٹ بھی جاری کردیں گے کہ بالآخر اس کا بیمار دل جواب دے گیا۔ سرٹیفکیٹ' پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ ایف آئی آر۔ وعدہ معاف گواہ کا بیان۔ سب انسان کے ہاتھ لکھتے ہیں اور ہاتھ سب سے زیادہ مجبور ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ فکر مجھے رخشی کی تھی۔ کہتے ہیں کامیابی میں سب ساتھی بن جاتے ہیں' ناکامی کا پہلا جھٹکا ہی وفاداری اور ثابت قدمی کے دعووں کی بنیادیں ڈھادیتا ہے۔ ابھی تک رخشی نے مجھے اصل شاہ عالم کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانے میں مدد کی تھی۔ اس کا مفاد میری بقا سے وابستہ تھا۔ وہ شاہ عالم سے اتنی نالاں تھی کہ ہر قیمت پر اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ شاہ عالم کے جیتے جی یہ ممکن نہ تھا اور خود اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ شاہ عالم کو مار ڈالے یا جان کی بازی لگا کے عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے اس سے خلع حاصل کرسکے۔ شاہ عالم نے اسے بیوی کے نام پر اپنی کنیز اور پاؤں کی جوتی بنا کے رکھا تھا۔ اس کی عزتِ نفس کو اپنے سلوک سے اتنا مجروح کیا تھا کہ وہ زندہ درگور تھی۔ ایسے میں ایک اتفاق یا حادثے نے اس کی نجات کے اسباب پیدا کردیے۔ اس نے محسوس کیا کہ دوسرے شاہ عالم سے اسے سب کچھ مل سکتا ہے۔ عزت کی زندگی گزارنے کے لیے دولت اور جائداد۔ تحفظ اور آزادی۔ اپنی اور میری مجبوری سے مفاہمت کرتے ہوئے اس نے دنیا کے سامنے مجھے شاہ عالم مان لیا اور رفتہ رفتہ اس کا مجھ پر اعتماد بھی بحال ہوگیا۔

لیکن اب اسے اپنی اور میری زندگی میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو وہ کیا کرے گی؟ کیا وہ مجھے بچانے کے لیے ایک وفاشعار بیوی کے ڈرامے کو نبھائے گی۔ میری خاطر ہر سختی جھیل جائے گی اور مرنا پڑا تو مرجائے گی یا نہیں؟ وہ ایسا کیوں کرے گی؟ اس سے کہیں آسان یہ ہوگا کہ وہ میرا پول کھول دے۔ یہ بتادے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ اس نے جان کے خوف سے دنیا کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اس نے لب کھولے تو اس کی موت بڑی اذیت ناک ہوگی۔ پنڈورا بکس پھر کھل جائے گا۔ اس کی مجبوری کے عذر کو تسلیم کرلیا جائے گا اور جب وہ میری جعلسازی کی الف لیلہ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے سنائے گی تو میری' ناصر عظیم کی کہانی کا انجام تختۂ دار پر ہوگا۔ یتیم خانے سے نکلا ہوا لاوارث اور بے نام و نشان بچہ جس کا آئی کیو ایک سو تیس تھا اور جو وزیراعظم بننے کے خواب کو حقیقت کی تعبیر دینے کا سوچتا تھا۔ ایک لاوارث لاش قرار دینے کے بعد کسی بے نشاں مدفن میں رزقِ خاک ہوا۔

صبح تین بجے عباسی کے ساتھ رئیس نظر آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی صحرا کے اندھے کنوئیں میں گرگیا تھا۔ مگر اس وقت جب امید کی آخری کرن بھی دم توڑنے والی تھی' مجھے ایک دوست کے مہربان ہاتھ نے سہارا دے کر پھر اسی دنیا میں کھینچ لیا ہے جو مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اتنی دور کہ اس کی آرزو بھی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

رئیس مسکرا رہا تھا اور اس کے ساتھ آنے والا عباسی بھی مسکرا رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ بڑی روشن' حوصلہ افزا اور مبارک تھی۔ یہ مجھے زندگی کی نوید سناتی تھی اور ناامیدی کے اندھیروں میں جگمگ اجالے پھیلاتی تھی۔

ہم یوں گلے ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے تھے۔

"یار' بڑا اچھا ہوا کہ تو مل گیا۔"

اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کے مجھے دیکھا "قسم اللہ کی ہم تو پریشان ہوگئے تھے یار۔ کل سے تیری خیر خبر نہیں۔ اوپر سے آگئے اپنے تھانے دار بادشاہ یہ بتانے کہ تجھے پکڑ رکھا ہے انہوں نے۔"

میں نے کہا "رئیس۔ یہ انہی کی مہربانی ہے کہ تجھ سے ملاقات ہوگئی۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے عباسی کو سلام کیا "خیر ہووے بچھڑے ہوئے یاروں کو ملانے والوں کی۔"

میں نے کہا "یہ کہاں ملا عباسی۔ وہیں جہاں میں نے بتایا تھا؟"

عباسی صوفے پر بیٹھ گیا "ہاں۔ تمہارا دوست پورے پانچ ہزار جیت کے آیا ہے۔ بس تمہارا دوست تھا اس لیے میں نے گرفتار نہیں کیا۔"

"عالی جاہ۔ کیا کانٹے کی لڑائی تھی۔ مانتے ہوا پنے عمران خان کو۔ بیس منٹ میں گواسکر کو گو دینٹ گون کردیا۔"

"ایک تو یہ جوا ہے۔ دوسرے بڑا ظالمانہ کھیل ہے۔ تمہارا مرغا مقابلہ تو جیت گیا مگر قسائی کی چھری سے نہ بچ سکا۔ اتنا لہولہان ہوگیا تھا کہ انسدادِ بے رحمی والے دیکھ لیتے تو تم اندر ہوجاتے" عباسی نے کہا۔

"اوجی گستاخی معاف۔ آپ مرغوں کی کیا بات کرتے ہو۔ یہاں اندر انسانوں کے ساتھ کم ظلم ہوتا ہے؟" رئیس بولا۔

میں نے کہا "ہم بچپن کے دوست ہیں عباسی۔ لنگوٹیے یار ہیں۔"

رئیس ہنسا "قسم اللہ کی۔ آج بھی لنگوٹی اتار سکتے ہیں ایک دوسرے کی بیچ بازار میں۔"

عباسی نے افسوس سے سرہلایا "حیران ہوں میں اسی بات پر۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ ایک کے پاس جتنی عزت' شہرت ہے دوسرے کے پاس اتنی ہی بدنامی اور بے عزتی کا ریکارڈ ہے۔ ایسی دوستی کا نمونہ میں نے نہ دیکھا نہ سنا۔"

"حقیقی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے عباسی۔ اس کی بنیادیں صرف خلوص اور محبت' ایثار کے جذبے اور اپنائیت پر استوار ہوتی ہیں۔ دولت مندی اور غربت' شہرت اور دنیاوی رتبے' لمبی چوڑی ڈگریاں اور معاشرتی اونچ نیچ' ان سب کا دوستی سے کیا تعلق؟"

"یہی میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ کہاں ایک سیاسی لیڈر اور اسمبلی کا ممبر۔ کہاں ایک ہسٹری شیٹر۔"

رئیس نے اسے سیلیوٹ جھاڑا "سرکار۔ اپنا یہ لیبل اتر چکا ہے' ہم پہلے جو تھے وہ اب نہیں ہیں۔ شریف آدمی ہیں قسم اللہ کی۔"

"یہ سب مجھے مت بتاؤ۔ میں سب جانتا ہوں" عباسی بولا۔

میں نے کہا "آپ کو رئیس نے وہی بتایا ہوگا جو میں نے بتایا تھا۔"

"ہاں۔ آپ کے بیان کی تصدیق آپ کے دوست نے بھی کردی ہے شاہ جی لیکن ابھی ثبوت کا مسئلہ باقی ہے۔"

میں نے کہا "میرے خلاف الزام کا کوئی ثبوت ملا ہے؟ ڈی آئی جی صاحب نے تم سے دس منٹ میں ایک رپورٹ مانگی تھی۔"

"رپورٹ میں ہی ساری دیر لگی۔ مجھے خود جانا پڑا تمام سرکاری اسپتالوں میں اور ریکارڈ دیکھنا پڑا۔ پھر میں نے ایس پی غلام محمد کو جگا کے پوچھا کہ اب میں ڈی آئی جی صاحب کو کیا بتاؤں؟ لاشیں تو کہیں بھی نہیں ہیں۔"

میں نے مسرت سے کہا "یقیناً میرا خیال ٹھیک تھا۔ کیا فرمایا تمہارے اس ایس پی صاحب نے؟"

"وہ مجھ پر خفا ہونے لگا کہ تم بھی بالکل گدھے ہو۔ میں نے تو صرف شاہ جی کو ڈرانے کے لیے کہا تھا۔ اس کا ذکر ڈی آئی جی صاحب سے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تم خود بھگتو۔ میں صاف انکار کردوں گا۔"

"انکار کیسے کرسکتا ہے وہ؟"

"کرسکتا ہے شاہ جی۔ جھوٹ میرا شمار ہوگا کیونکہ وہ افسر ہے۔ تھانہ انچارج بھی اسی کی خوشنودی کے لیے کہے گا کہ ایسی تو کوئی کال موصول نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سب بتادیا ڈی آئی جی صاحب کو کہ اب آپ کی مرضی ہے۔ جھوٹ پر مجھے معطل کرنا چاہیں تو کردیں مگر وہ بھی سب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بس FORGET IT اپنا کام کرو تم۔ پہلے تو پکڑو رپورٹ لکھوانے والوں کو پھر معلوم کرو خالد عثمان اور خادم مرزا کہاں ہیں۔"

"پھر۔ کچھ پتا چلا؟"

"میں تمہارے یار کے ساتھ پہلے خالد عثمان کے گھر گیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں ملا۔" عباسی نے کہا "خادم مرزا کے چوکیدار نے رئیس کو دیکھا تو اس کی صورت کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے کہا کہ سنتری بادشاہ۔ ہمیں پہچانتے ہو نا۔ ہم کل رات تمہارے صاحب کو چھوڑنے آئے تھے تو تم سو رہے تھے۔ صاحب نے جگا کے کیا کہا تھا تم سے۔ بتا دوں وہ بھی۔ پہلے تو سالے نے انکار کیا مگر اپنے تھانے دار صاحب نے اس کی گردن پکڑی تو ہاتھ جوڑنے لگا۔ بولا کہ ہم تو نوکر ہیں سرجی۔ ہم سے صاحب نے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کا جو شوفر ہے...... اس نے کہا تھا کہ کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے کہ کل رات خادم مرزا صاحب کس وقت گھر لوٹے تھے اور کس کے ساتھ آئے تھے۔ چوکیدار نے مان لیا کہ وہ آج ایک بجے میرے ساتھ پہنچے تھے اور گاڑی سے اتر کے اندر چلے گئے تھے۔"

میں نے سکون اور اطمینان کا سانس لیا "چوکیدار کی گواہی سب سے اہم ہے فرید عباسی۔"

"آئی نو۔ میں نے اسے گیٹ سے ایسے اٹھالیا کہ اندر کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ تمہارے دوست کے حوالے کر دیا۔"

"ہم نے دبوچ لیا سالے کو اور کہہ دیا کہ آواز نکالی تو ساتھ ہی آخری سانس بھی نکال دوں گا" رئیس نے بڑے فخر سے بتایا۔

"خادم مرزا کا ایک بیٹا فوج میں کیپٹن ہے۔ میں نے گھنٹی بجائی تو وہی آیا۔ میں نے پوچھا کہ خادم مرزا کہاں ہیں تو بولا کہ مجھے نہیں معلوم۔ ڈیڈی بزنس مین ہیں اور وہ اپنا شیڈول مجھ سے ڈسکس نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ اچھا اپنی والدہ سے پوچھو۔ وہ اکڑفوں دکھانے لگا کہ آخر آدھی رات کے بعد کیا مقصد ہے ان کی نیند خراب کرنے کا۔ یہ پوچھ گچھ کس سلسلے میں ہے اور کسی قانونی اختیار کے بغیر یہ کیا HARSSMENT پھیلا رہا ہوں میں۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ وہ میری رپورٹ کرے گا اور پھر گیٹ بند کر کے چلا گیا۔"

"اس نے چوکیدار کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟"

"نہیں۔ وہ ادھر اُدھر تلاش کر رہا تھا مگر مجھ سے کیسے پوچھ سکتا تھا۔ گارڈ کو میں نے آوارہ گردی کے الزام میں بند کرادیا ہے اور تھانے والوں سے کہا ہے کہ اس کو کسی سے رابطہ نہ کرنے دیں۔ تھانے والے خود بتادیں گے کیپٹن صاحب کو کہ انہوں نے چوکیدار کو کہاں پکڑا تھا۔"

"خالد عثمان اور خادم مرزا زیادہ عرصہ روپوش نہیں رہ سکتے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ کل ہی سامنے آجائیں گے۔ مارے جائیں گے ان کے اشارے پر میرے خلاف رپورٹ لکھوانے والے مگر وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شک ظاہر کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اور شک بھی بلاوجہ نہیں تھا۔ پھر ان کے مالک خود چھڑالیں گے انہیں اور اس کارگزاری سے ہونے والے نقصان کی تلافی بھی کردیں گے۔ اچھی بات یہ ہے کہ آپ کے خلاف تفتیش طلب کوئی بات نہیں رہی۔ صبح آپ ضمانت پر رہا ہوجائیں گے۔ کیس آپ کے وکیل ختم کراتے رہیں گے۔ میں اب چلتا ہوں۔ تھکن اور نیند سے بُرا حال ہے میرا۔" عباسی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم تو یہاں رک سکتے ہیں نا عالی جاہ۔ اپنے یار کے ساتھ؟"

"تمہیں یہاں رکنا ہی پڑے گا۔ تمہاری گواہی سب سے اہم ہے۔ یہاں تم خود کو حفاظتی تحویل میں سمجھو" عباسی نے جاتے جاتے کہا۔

رئیس نے سر کھجایا "یہ کیا کہہ گیا جاتے جاتے۔ قسم اللہ کی فارسی تھی۔"

"مطلب یہ کہ یہاں تجھے حفاظت سے رکھا جائے گا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ساری زندگی جس نے اپنے سب سے گنہگار، سب سے کمینے اور ناکارہ بندے کی حفاظت کی پیارے، کیا اس سے زیادہ حفاظت کرسکتے ہیں میری یہ سوار خور۔ بھاڑے کے ٹٹو۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہہ یار۔ اچھے بُرے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ آخر عباسی جیسے لوگ بھی تو ہیں پولیس میں۔"

اس نے منہ پھاڑ کے جمائی لی اور پھر انگڑائی لے کر بولا۔ "قسم اللہ کی۔ بڑی سخت بھوک لگی تھی۔ سوچا تھا پانچ ہزار میں سے روغنی نان اور بُھنا...... مرغ لے کر اس کی طرف چلا جاؤں گا۔ سونے کے بُندے بھی خریدے تھے آج دن میں۔"

میں نے کہا "تو کس کی بات کر رہا ہے؟"

"اسی کی پیارے۔ تیری ہونے والی بھابی بالو شاہی کی۔"

"بالوشاہی۔ یہ نام تو پہلی بار سن رہا ہوں میں۔ آخری ہونے والی بھابی تو وہ تھی ایسا ہی کچھ نام تھا اس کا بھی۔۔۔ ہاں، رس ملائی۔"

"ابے وہ پرانی بات ہے۔ اس دن جب تو نے آدھی رات کو جگا کے بلایا تھا مجھے۔ اور مجھے جانا پڑا تھا ان دونوں سور کے بچوں کو اپنے ساتھ لانے کے لیے۔ تو وہ خفا ہوگئی تھی، اسے منانا ضروری تھا۔"

"دیکھ یہ بالوشاہی کا قصہ پھر کبھی سنوں گا" میں نے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ پہلے بھی یاروں کا بنا بنایا کھیل تو نے خراب کیا تھا۔ رس ملائی بھی تیری وجہ سے ناراض ہو کے گئی۔ منگنی کیا وہ تو سر توڑ جاتی میرا۔ اب تیرے پاس وقت نہیں ہے ہماری بات سننے کا بھی" وہ بگڑ گیا۔

میں نے کہا "رئیس۔ یہ میری دسویں یا گیارھویں ہونے والی بھابی ہے۔ اور مجھے پتا ہے کہ یہ بھی زیادہ دن چلنے والی نہیں ہے۔ بھابی میرے نصیب میں ہی نہیں ہے پیارے۔ اس سے پہلے والی سب یاد ہیں مجھے۔ کیسے کیسے نام رکھے تھے تو نے ان کے۔ ایک خوبانی تھی، اس سے پہلے فیرنی، ایک بریانی تھی۔ بڑی چٹپٹی لگتی تھی تجھے۔ کوئی بھی دو سو پاؤنڈ سے کم وزن کی نہیں تھی۔ ویسی ہی ہوگی یہ بالوشاہی بھی۔"

اس نے کسی خفت کے بغیر کہا "یار، تو جانتا ہے کہ اپن کو ایسی ہی اچھی لگتی ہیں۔ ہر طرف گوشت ہی گوشت ہو۔ جہاں ہاتھ لگاؤ اندر دھنس جائے۔ آدمی کو یوں لگے جیسے دھنکی ہوئی روئی کے نرم گرم ڈھیر پر پڑا ہو۔ یہ آج کل کی لڑکیاں، ہڈیوں پر چمڑی، ساتھ ہو تو اندھیرے میں بھی ایسے لگے جیسے قبر میں ڈھانچا ساتھ پڑا ہو۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "رئیس، یہاں میں نے تجھے کام سے بلایا تھا۔ میں ملوں گا تیری ڈھائی من کی بالوشاہی سے بھی بعد میں۔ معافی بھی مانگ لوں گا اس سے اور اس بار قاضی کو ساتھ لے کر آؤں گا مگر ابھی وقت کم ہے۔ تو مجھے ان کے بارے میں بتا، خالد عثمان اور خادم مرزا نے تجھے کیا بتایا؟"

اس نے پھر منہ پھاڑا "بتاتا ہوں یار۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے تھانے دار کو دیکھ کر۔ اور جب اس نے تیرے بارے میں بتایا تو قسم اللہ کی دنیا اندھیر ہوگئی تھی نظروں میں۔ خیر اب اللہ میاں نے ساری بلائیں ٹال دیں تو پہلے کچھ کھلا پلا۔"

"ابے یہ گھر نہیں ہے میرا۔ سرکاری مہمان خانہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں اگر چائے مل جائے۔"

اس پُراسرار بوڑھے خانساماں کی تلاش میں مجھے کچن تک جانا پڑا۔ اب میں زیادہ بے خوف اور پُراعتماد تھا۔ مجھے باہر موجود پولیس گارڈ کی پروا بھی نہیں رہی تھی جو ابھی تک خصوصی تفتیش کے لیے لائے جانے والے ایک خطرناک مجرم کی حفاظت کے لیے پوری طرح مستعد تھے۔ جہاں ڈی آئی جی صاحب بقلم خود تفتیش کی نگرانی کے لیے تشریف لائیں وہاں غفلت اور کوتاہی کا مطلب ہے برطرفی۔

بوڑھے خانساماں نے نیند سے جگائے جانے کا بالکل بُرا نہیں مانا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور چولہا جلانے لگا۔ میں نے اس سے معذرت کی۔ یہ کہا کہ مجھے کھانے سے بھی کچھ چاہیے۔ یہ بتایا کہ میں چائے میں دودھ نہیں پیتا مگر میرے ساتھ ایک مہمان ہے جو دودھ میں چائے پیتا ہے۔ اس نے جواب میں نہ سر ہلایا نہ منہ سے ایک لفظ کہا۔

میں نے کہا "بابا۔ کیا بات ہے، تم بہرے تو نہیں ہو۔ بولتے کیوں نہیں؟"

اس نے مجھے بڑی دکھی اور فریادی نظروں سے دیکھا اور پھر منہ کھول دیا۔ خون میری رگوں میں سرد پڑنے لگا۔ اس کے منہ میں زبان ہی نہیں تھی۔ معلوم نہیں کس جرم پر اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی۔ شاید یہ سزا اسے پولیس نے دی تھی یا کسی جلاد صفت جیلر نے اس کی گستاخ زبان کو ہمیشہ کے لیے قوتِ گویائی سے محروم کردیا تھا۔ شاید یہ کسی دشمن کی انتقامی کارروائی تھی۔ مجھ میں ہمت نہ تھی اور مجھے فرصت بھی کہاں تھی کہ میں اس سے کچھ پوچھوں۔ اگر پوچھتا تب بھی کیا ہوتا۔ وہ مجھے کیا بتاتا اور کیسے بتاتا؟

رئیس نے کہا "ابے کیا ہوا ہے تجھے۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں ملا تو رونے کی کون سی بات ہے۔ ہم بھوکے رہ سکتے ہیں یار۔"

میں نے اسے خانساماں کے بارے میں بتایا "وہ مجھے کوئی سزا یافتہ مجرم ہی لگتا ہے۔ آدمی نہیں چلتی پھرتی لاش ہے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی کوئی علامت ہی نہیں۔ کوئی جذبہ نہیں، نہ دکھ کا نہ سکھ کا۔ نہ غم کا نہ خوشی کا۔ نہ امید کا نہ مایوسی کا۔"

رئیس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا۔ "ان دونوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی مغز ماری ہوئی۔ سالے شرافت کی زبان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنا تو ایک اشٹائل ہے پیارے، جو گڑ سے مرے اسے زہر مت دو۔ میں نے بڑے آرام سے بٹھا کے چائے پانی کو پوچھا۔ یہ کہا کہ آپ مہمان ہو۔ جو حکم کرو حاضر کردیں گے۔ پیچھے کے پائے، ملا گنڈی کی کھوئے والی لسی۔ خان بابا کا چکن تکہ۔ ان کا تو درجۂ حرارت ہی کم نہیں ہو رہا تھا۔ پھر ہم نے اپنی قادری زبان میں کہا کہ دیکھو جی، اس وقت تم وہاں ہو جہاں سے موت کا فرشتہ ہی تمہیں لے جائے گا۔ اور کوئی ٹنڈے لاٹ کا پتر ہو یا پانے خان کا سالا۔ اپنے ساتھ توپ لے کر آئے یا ٹینک۔ تمہیں اس وقت تک نہیں چھڑا سکتا جب تک ہمارے یار سے اجازت کی پرچی لے کر نہ آئے۔ ہم خود اس وقت چھوڑیں گے جب ہمارے سارے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب مل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے گا۔ جہاں تم اس وقت ہو یہ جگہ سمجھ لو کہ دوسری دنیا میں ہے۔ اپنی دنیا میں تم بڑی چیز ہو۔ بڑی طاقت ہوگی تمہارے پاس۔ دولت کی اور بدمعاشی کی مگر یہاں تمہاری زبان نہ کھلی تو پھر ہمارا ہاتھ کھل جائے گا۔ وہ پھر بھی نہیں سمجھے۔ وہی اکڑفوں دکھاتے رہے اور دھمکیاں دیتے رہے۔ میں نے انہیں جیرے بلیڈ کے سپرد کیا کہ ذرا ان کو اسٹوڈیو کی سیر کراؤ اور بتاؤ فلمیں کیسے بنتی ہیں۔ واپس آئے تو سالوں کا دماغ کچھ ٹھکانے آگیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا خیال ہے اب؟ تمہارے گھر والوں کو بھی بلالیں شوٹنگ کے لیے؟"

"شوٹنگ کا مطلب تو سمجھ میں آگیا ہوگا ان کی" میں نے کہا۔

"سمجھ میں کیسے نہ آتا یار۔ اپنا اشٹائل ہی کچھ اور ہے سمجھانے کا۔ جب کیمرے دیکھے اور لائٹس دیکھیں' دو فلموں کے ٹوٹے دیکھے۔ میں نے بتایا کہ یہ بھی بڑی چیز تھے۔ شاید تم جانتے ہوگے۔ ہم نے فلم ریلیز کردی' ہر جگہ ویڈیو شاپس پر دس روپے میں دیکھی لوگوں نے۔ بعد میں ایک نے خودکشی کرلی تھی' دوسرا ملک چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ میں نے نام بتائے ان کے تو خالد عثمان کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسے پانی میں گلوکوز دیا اور اس نے جیب سے نکال کے کوئی دوا کھائی۔ خادم مرزا کی پتلون بھی ڈھیلی ہورہی تھی۔"

میں نے قہقہہ مارا "پیشاب خطا ہوگیا اس کا؟"

"بے گیلی نہیں ڈھیلی" رئیس بولا "اس کے بعد ہم نے ٹیپ ریکارڈر سامنے رکھا اور کہا کہ جو سوال پوچھا جائے' اس کا ایک ہی جواب ہونا چاہیے۔ اور وہ ہے صحیح جواب۔ بعد میں بیان بدلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ شکایت مت کرنا ہم سے کہ میں نے ایسا نہیں کہا تھا اور میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم ایسے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ جھوٹ سچ کی تصدیق ہوجائے گی اس لیے اپنے بیوی بچوں کا خیال کرو۔ تم خود تو مرنے والے ہو مگر ان کی عزت و آبرو مٹی میں ملا کے قبر میں جاؤ گے تو وہ ساری عمر تمہاری ہر برسی پر تمہیں گالیاں دیں گے اور کوسیں گے۔ وہ بُری طرح پھنس گئے تھے مگر سالے پھر بھی چکر دینے کا سوچ رہے تھے۔ میں نے وہ سب سوال کیے جو ضروری تھے۔ شروع سے آخر تک سب پوچھا۔ کیا بزنس ہے' کب سے چل رہا ہے؟ کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے؟ اس میں کتنے لوگ شامل ہیں۔ ان کے نام پتے اور فون نمبر کیا ہیں۔ مال کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ کس کا کتنا حصہ ہے۔ اور لین دین کیسے ہوتا ہے؟ ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے یار۔ اپن خود کم حرامی نہیں ہیں۔ ہم سے کیا حرامی پن کرے گا کوئی؟ قسم اللہ کی ساری بدمعاشی بھول گئے وہ۔ جو پوچھا بتاتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم نے کہا کہ چلو اسٹوڈیو میں۔ وہ گھبرا گئے' خالد عثمان تو لگتا تھا کہ مرجائے گا۔ میں نے کہا کہ یار' اسٹوڈیو میں بیٹھ کے یہ کیسٹ سنو اور پھر غور کرو کہ اس میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کتنا۔ ایک گھنٹے بعد انہیں الگ الگ بٹھا کے کاغذ قلم دے دیا کہ اپنا اور شاہ جی کا سارا حساب لکھ دو۔ تم کو کتنا لینا ہے اور کتنا دینا ہے۔ وہ کاروباری معاملات پر بات کرنے کے لیے تیرے ساتھ ہوٹل جارہے تھے۔ بریف کیس میں سب کچھ ساتھ لائے تھے۔ بریف کیس کیا تھے' کمپیوٹر تھے۔ کیا کہتے ہیں انہیں' ٹپ ٹاپ کمپیوٹر۔"

"لیپ ٹاپ کمپیوٹر" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں وہی۔ سب کچھ تو کمپیوٹر صاحب کے دماغ میں بھرا ہوا تھا مگر اس کے علاوہ بھی کچھ کاغذات تھے۔ ڈائریاں تھیں اور نوٹ بکیں تھیں۔ وہ سب ہم نے قبضے میں کرلی تھیں لیکن انہوں نے بڑا حرامی پن کیا یار' میں نے ان کو بٹھایا تھا ٹیپ سننے کے لیے' انہوں نے ٹیپ صاف کردیا۔ ریکارڈ کا بٹن دبا کے ٹیپ چلا دیا۔ ظاہر ہے ساری باتیں ختم ہوگئیں۔ جب انہیں الگ الگ بٹھا کے کاغذ دیا تو انہوں نے انکار کردیا۔ انہیں موقع مل گیا تھا آپس میں مشورہ کرنے کا۔ انہوں نے کہا کہ تم جو چاہو کرو' تم اور تمہارے شاہ جی' بعد میں ہم سب سے نمٹ لیں گے اور تمہیں پتا چل جائے گا کہ بدمعاشی کیا ہوتی ہے۔ تمہارے قبضے میں صرف دو آدمی ہیں لیکن ہمارے دو سو ہاتھ ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تم ان کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ بس یار' اس کے بعد اپنا تو دماغ گھوم گیا۔ میں نے جیرے سے کہا کہ پہلے تو ان کی کچھ شوٹنگ کرو۔ میں بندوبست کرتا ہوں ان کے گھر والوں کو بلانے کا۔ اچھا ہے ساری فیملی کی فلم بن جائے۔ ایک گھنٹے بعد ان کی حالت خراب تھی مگر وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں یار۔ ان کے پیچھے پوری مافیا ہے اسمگلروں کی۔"

"یعنی وہ تیری دھمکی سے ڈرے نہیں؟ تو ڈر گیا ان سے؟"

"ابے لعنت ڈرنے والے پر۔ قسم اللہ کی ایسے گیدڑ بھبکی دینے والے بہت دیکھے ہیں ہم نے۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ تیری جان بخشی کردیں۔ جو دھندا وہ کررہے ہیں' کرتے رہیں۔ ویسے تو ساری معلومات میرے قبضے میں تھیں۔ میں وہ بریف کیس اور کمپیوٹر ایف آئی اے کے حوالے

کردیتا تو ان کا بینڈ بج جاتا۔"

میں نے کہا "خوش فہمی ہے تیری۔ الٹا ایف آئی اے والے تجھے پکڑ لیتے اور ان سے معذرت کرتے۔ یہ جتنے قانون نافذ کرنے والے ادارے ہیں نا' ان سب کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ جب ایک عام آدمی جانتا ہے تو کیا اوپر والے نہیں جانتے مگر یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا تو نے۔ قانون نہ ہے اور نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتا ہے' خیر میں نے صبح ان کے گھر والوں کو بلا ہی لیا۔"

"کیسے بلالیا؟ اغوا کیا؟" میں نے کہا۔

"ابے نہیں یار۔ خالد عثمان کے گھر فون کیا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ یونائیٹڈ کرسچن اسپتال میں ہیں۔ اس کی بیوی اور بہو گھبرا کے تصدیق کیے بغیر دوڑیں۔ اسپتال کے گیٹ سے ہم انہیں اپنے ساتھ لے آئے جب خالد عثمان نے انہیں اسٹوڈیو میں دیکھا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ اپنی بیوی اور بہو کو دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے دیکھنے یا اس کی آواز سننے سے قاصر تھیں۔ اسٹوڈیو میں جیرے بلیڈ نے شوٹنگ کی تیاری شروع کی۔ عورتیں رونے لگیں اور چیخنے چلّانے لگیں۔ جیرا بلیڈ ان سے جس قسم کی گفتگو کر رہا تھا' وہ خالد عثمان کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پہلے تو کہا کہ لوجی تمہیں فلم میں چانس دے رہے ہیں۔ تمہیں کیا کرنا ہے' اپنا رول سمجھ لو۔ نمونے کے لیے ایک دو فلمیں دیکھ لو۔ تمہارے ساتھ مرکزی کردار ہوگا اس بندے کا۔ وہ سوا چھ فٹ قد کا اور دو سو پاؤنڈ وزن کا پہلوان ہے پورا۔ کالا حبشی پھر اس نے بہو سے کہا کہ۔۔۔"

میں نے کہا "چھوڑ اس تفصیل کو۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس نے کیا کہا ہوگا۔"

"خادم مرزا زیادہ سخت جان ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی فیملی نے سوال جواب شروع کردیے تھے اور گھر سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ انہیں شک ہوگیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہ پولیس کو فون کرے گی۔ پولیس کا تجھے پتا ہے۔ جائے واردات پر ایک گھنٹے میں بھی پہنچ جائیں تو سمجھو بڑی پھرتی دکھائی۔ صرف ایک مشتبہ فون پر وہ کہاں حرکت میں آتے۔ انہوں نے تسلی دے کے ٹال دیا ہوگا کہ بی بی' الٹے سیدھے فون ہمارے گھر بھی آتے ہیں۔ فکر کی کون سی بات ہے۔ خادم مرزا صاحب کو کیا ہوسکتا ہے۔ وہ کہیں مصروف ہوں گے اور آجائیں گے تھوڑی دیر میں گھر۔ نہ آئیں تو بتانا۔ دس منٹ بعد میں نے تھانے فون کیا اور کہا کہ میں خادم مرزا بول رہا ہوں۔ میری فیملی نے ابھی فون کیا تھا۔ عورتیں جلدی گھبرا جاتی ہیں۔ میں ایک بزنس میٹنگ میں پھنس گیا تھا اور آگیا ہوں گھر۔ ایک گھنٹے بعد ہم نے پولیس بھیج دی اس کے گھر۔ پولیس کی وردی میں چار بندے تھے اور جیپ بھی سرکاری تھی۔ عورتوں نے انہیں اندر بلالیا۔ تین بیٹیاں ہیں اس کی۔ سب کالج میں پڑھتی ہیں۔ ایک بیٹا ہے ڈاکٹر۔ پولیس سب کو لے آئی۔ خالد عثمان نے تو پہلے ہی سب لکھ دیا تھا۔ خادم مرزا فیملی کو دیکھ کے بھی اڑا رہا۔ مجبوراً ان کی کچھ شوٹنگ کرنی پڑی۔ بس ایک دو سین' پھر خادم مرزا مان گیا۔ اس نے کچھ لکھا اور پھر پھاڑ کے پھینک دیا۔ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا اور گالیاں بکنے لگا۔ ہم نے شوٹنگ روک دی تھی۔ اسے قابو کیا اور پھر شوٹنگ مکمل کی۔ اسے انجکشن بھی لگانا پڑا جس سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آیا تو اسے فلم دکھائی۔ وہ زاروقطار رونے لگا۔ ہم نے سمجھا دیا کہ بس اب شرافت سے ہماری بات مان لے۔ شاہ جی کے ساتھ حساب کتاب ختم۔ پھر پنگا لیا تو یہ فلم ریلیز کریں گے۔ ہم بے اصول بدمعاشی نہیں کرتے اور بلیک میلنگ بھی ہمارا کام نہیں اس لیے فلم محفوظ رہے گی۔ اس وقت تک جب تک شاہ جی محفوظ ہیں۔ کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ تم اپنا کام کرو' اسی طرح جیسے پہلے کرتے تھے۔ وہ پولیس کی وردی پہن کر جانے والے اپنے ہی لوگ تھے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "یہ سب اچھا نہیں ہوا رئیس۔"

"ہاں۔ اچھائی ہے اس دھندے میں۔ کون اچھا ہے۔ ساری برائی ہی برائی ہے پیارے۔ اور بدمعاشی کا توڑ بدمعاشی ہی ہوسکتی ہے۔ ان کی فیملی یہ سمجھ رہی ہے کہ ساری کارروائی سی آئی اے یا ایف آئی اے نے کی ہوگی۔ انہیں علم تو ہے کہ خالد عثمان اور خادم مرزا کس قسم کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی نے مخبری کردی۔ وہ اپنی بے گناہی کا یقین دلاتی رہیں اور یہ کہتی رہیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔"

"وہ فلمیں اب کہاں ہیں؟"

"میرے پاس۔ میرے ذاتی لاکر میں۔ اس کو میرے سوا کوئی بھی نہیں کھول سکتا۔ نہ کسی کو موقع ملا ان کی کاپی بنانے کا۔ وہ بس ایک ضمانت کے طور پر رکھی رہیں گی۔ ہمارے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا جس سے ہمیں حفاظت کی ضمانت حاصل ہوتی۔"

میں نے کہا "ان کی فیملی کو نہیں معلوم کہ خالد عثمان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور خادم مرزا بھی وہیں موجود تھے؟"

"نہیں۔ وہ ہم سے پوچھتے رہے اور ہماری منت سماجت کرتے رہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ وہ ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے مگر ہم نے کہا کہ قیمت صرف ایک ہے' دوبارہ شاہ جی سے پنگا مت لینا۔"

میں نے کہا "وہ دونوں اب کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں۔ کیا پتا گھر میں منہ چھپائے پڑے ہوں۔ ان میں اپنی فیملی کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ان کے ہاتھ پیر بندھ گئے ہیں۔ فیملی نے ان سے کہا ہوگا کہ خدا کے لیے شاہ جی سے تعلق ختم کرو۔ کون ہے یہ شاہ جی۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ شاید دبے دبے لفظوں میں یہ بھی بتایا ہو کہ انہیں کس طرح اغوا کرکے کہاں لے جایا گیا تھا اور ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ خالد عثمان اور خادم مرزا سخت عذاب میں ہوں گے کہ اب کیا کریں۔ مزید کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو فیملی کی رسوائی' ایسی رسوائی کہ سب کے لیے خودکشی کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ کچھ نہیں کرتے اور شاہ جی کی بات مان لیتے ہیں تو مالی نقصان۔ کاروبار کا بیڑا غرق۔ پھر ایسے لوگوں کا کیا بھروسا۔ بعد میں بلیک میلنگ پر اتر آئیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کچھ دن خاموشی سے انتظار کریں گے۔"

میں نے کہا "وہ مجھ سے ضرور ملیں گے۔ ان کے رویے سے کچھ ضرور ظاہر ہو جائے گا۔"

"دیکھ پیارے' سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ بات یہیں ختم ہو جائے۔ دشمنی کو لمبا کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔ جیو اور جینے دو مگر یہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اتنی آسانی سے ہار مان لیں۔ تو دیکھ ان لوگوں نے نام کیا رکھے ہیں' اپنے پرنس اور کنگ۔ باس اور چیف۔ یہ سب اثر ہے مجرموں کے بین الاقوامی گروہوں کا۔ وہ ایک دوسرے کو نام سے نہیں کوڈ سے شناخت کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ خبریں حقائق پر مبنی ہوتی ہیں مگر زیادہ شہرت ہوتی ہے ان کہانیوں سے جن پر فلمیں بنی ہیں۔ ناول لکھے گئے ہیں اور جاسوسی کہانیاں بنی ہیں۔ ایک طرف جیمس بونڈ جیسے کردار ساری دنیا میں مقبول ہوئے تو دوسری طرف ڈان' اب تو یہ حال ہے کہ چھوٹے چھوٹے بدمعاشوں کے گروہ بھی خود کو مافیا سمجھتے ہیں اور ان کا سرغنہ ڈان کہلاتا ہے۔"

"ایسے ناموں سے اصل نام پر بھی پردہ پڑا رہتا ہے۔" رئیس بولا "کیا خیال ہے' میں بھی دادا بن جاؤں؟"

"پہلے باپ تو بن جا۔"

"ابے یار' باپ تو آدمی شادی کے بغیر بھی بن جاتا ہے۔ میں دوسرے دادا کی بات کر رہا تھا۔ دادا' رئیس جس کے نام سے بدمعاش کانپتے ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھ رئیس۔ ابھی وقت ہے۔ زندگی کا راستہ بدل سکتا ہے تو۔"

وہ ہنس پڑا "ابے رہنے دے اپنی نصیحت بازی۔ کوئی اپنی زندگی کا راستہ چنتا ہے اور نہ بدل سکتا ہے۔ تقدیر کے ہاتھ میں ہے لاٹھی۔ جدھر چاہے ہانک دے۔"

"ایسا نہیں ہے یار۔ جانتے بوجھتے آنکھیں بند کرکے اس راستے پر چلتے جانا جس کا انجام کھائی پر ہو' اسے تقدیر نہیں کہتے۔"

"دیکھ پیارے۔ تیری اور میری زندگی جیسی بھی گزری کیا اس میں ہماری مرضی کو دخل تھا؟ نہ مرضی سے پیدا ہوئے نہ جیے۔ یہاں وہاں دریا کے دھارے میں بہنے والے تنکے کی طرح بھٹکتے ہوئے یہاں تک آگئے۔ آگے بھی وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔ آغاز تو ایک ساتھ ہی کیا تھا ہم نے لیکن تیرے ہاتھ پر قسمت کی لکیر میں عزت اور شہرت تھی ہمارے ہاتھ کی لکیر کالی تھی۔ ہمیں دوسری طرف لے گئی آج تو بڑا معزز اور شریف ہو گیا ہے اور ہم کہلاتے ہیں بدمعاش۔ مگر دیکھ تقدیر نے کیسے ایک دم تیری زندگی کی گاڑی کو دوسری پٹڑی پر ڈال دیا۔ تو نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا ایسا۔ جیسا ہو گیا۔ تیری مرضی کا کیا سوال۔ کسی اور کی زندگی جی رہا ہے تو۔ یہ ڈراما تقدیر کا نہیں تو کیا ہے؟"

میں نے کہا "رئیس میں نے برائی کا انجام اچھا کبھی نہیں دیکھا۔"

"ابے رہنے دے یہ کتابی باتیں۔ اپنے انجام کی فکر کر۔ ہم پر اتنے قاتلانہ حملے نہیں ہوتے جتنے تجھ پر ہو چکے ہیں۔ ہماری پولیس دشمن' پبلک دشمن' بدمعاش دشمن' مگر خطرہ زیادہ تیرے لیے ہے' خالد عثمان اور خادم مرزا جیسے شریف سے۔ دشمن تیرے زیادہ خطرناک ہیں۔ جتنے بدمعاش مارے جاتے ہیں اس سے زیادہ ہی قتل ہوتے ہیں سیاست داں۔ اب اللہ میاں نے جتنی زندگی لکھی ہے اس سے پہلے تو کوئی مار نہیں سکتا۔ اس سے زیادہ جینا نہ تیرے بس میں نہ ہمارے۔ کیا پتا کس کے نام کی گولی پہلے آئے گی اس لیے بس اپنے اپنے اشغال سے جیو پیارے۔"

میں نے عاجز آکے کہا "بند کر اپنی بکواس۔ خواہ مخواہ کی بحث۔ یہ بتا کہ ان لوگوں کا دھندا کیا ہے۔ اسمگلر تو ہیں یہ لوگ مگر کیسے؟ کیا مال اِدھر سے اُدھر کرتے ہیں۔ منشیات' ہیروئن وغیرہ؟"

"ابے نہیں۔ ان کا اونچا کاروبار ہے۔ یہ نوادرات باہر بھیجتے ہیں۔"

میں چونک پڑا "نوادرات' تاریخی نوادرات؟"

"ہاں۔ اور وہ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ آنتی کیٹ۔"

"این ٹیک۔۔۔ ANTIQUE" میں نے کہا۔

"ابے ہاں وہی۔ عجائب خانوں سے حاصل کرتے ہیں۔ خریدتے ہیں چوروں سے یا خود چراتے ہیں۔ ہر شہر میں ایک عجائب خانہ ہے۔ پشاور سے لاہور اور کراچی میں۔ ٹیکسلا' موہن جوداڑو اور ٹھٹھہ میں۔ ہڑپہ میں اور پتا نہیں کہاں کہاں۔"

مجھے سخت صدمہ ہوا "یعنی ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ باہر جا رہا ہے اور کسی کو معلوم ہی نہیں؟"

"یار' معلوم کیسے نہیں۔ مجھے اور تجھے آج پتا چلا ہے۔ وہ جو میوزیم والے ہیں' کیا ان کی ملی بھگت نہیں ہوگی اس میں؟ ان کا حصہ نہیں ہوگا اس میں؟ ایک پورا محکمہ ہے آثارِ قدیمہ کا۔ پتا نہیں کتنا مال تو وہ کھدائی کے دوران میں ویسے ہی غائب کر دیتے ہوں گے۔ ان بین الاقوامی چوروں کے ہاتھ بیچنے سے بڑی بھاری قیمت ملتی ہوگی انہیں۔"

میں نے کہا "ایسی چیزوں کی قیمت بھلا کون لگا سکتا ہے۔ ایک تاریخی سکہ یا مجسمہ بازار میں ملنے والی چیز تو نہیں۔ کسی کارخانے کی پروڈکٹ نہیں۔"

"جو مجھے معلوم ہوا ہے یار' وہ بہت عجیب ہے۔ نوادرات صرف چرائے نہیں جاتے' بنائے بھی جاتے ہیں۔ قدیم تاریخی چیزیں بنانے والے ایسے ایسے ماہرین ہیں کہ عام آدمی کو اصل نقل کا پتا نہیں چلتا۔ عام کیا خاص آدمی بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔ وہ تو بہت ہی خاص طریقے ہیں اور گنے چنے ایسے ماہرین ہیں جو فرق دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تو خود کوتوال ہی چور ہیں۔ پھر پوچھنے والا کون۔ عجائب خانوں سے اصل چیز غائب ہو جاتی ہے اور نقل اس کی جگہ رکھ دی جاتی ہے۔ باہر ان کی بڑی قدر ہے۔ خود میوزیم والے خرید لیتے ہیں اصلی چیز۔ نقلی وہ دولت مند خریدتے ہیں جن کو پہچان تو نہیں ہوتی مگر نوادرات جمع کرنا ان کا شوق ہوتا ہے۔"

"او مائی گاڈ! نہ جانے کب سے جاری ہے یہ سلسلہ۔ اور اس میں تو سب ہی ملوث ہوں گے' نیچے سے اوپر تک۔ یہاں کے چھوٹے چوروں کے لیے پانچ دس ہزار کی رقم بھی ضمیر فروشی کے لیے بہت ہے۔ وہ کچھ بھی فراہم کر دیتے ہوں گے۔ قدیم نسخے' مخطوطات' نایاب قلمی نسخے۔ تحفے اور تصاویر۔ ذاتی لائبریریوں میں محفوظ تاریخی دستاویزات۔ مثلاً علامہ اقبال اور قائداعظم کے خطوط یا ڈائریاں۔ ذاتی چیزیں۔ اس کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے رئیس۔ فرض کرو کسی کے ہاتھ وہ پستول لگ جائے جس سے قائدِ ملت کو شہید کیا گیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ پچھلے دنوں اخبار میں کچھ آیا تھا کہ لیاقت علی خان کے قتل کے سارے ثبوت' دستاویزات اور شہادتیں غائب کر دی گئی ہیں۔ ان کے خون آلود کپڑے اور ذاتی اشیا۔ ایسی چیزیں تو بہت ہیں۔ کسی کو اس رسی کا ٹکڑا مل جائے جس سے بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تھی یا اس بم کا حصہ جو ضیاء الحق مرحوم کے طیارے میں رکھا گیا تھا۔ ان چیزوں کی جذباتی اہمیت بھی ہے۔"

رئیس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا "ابے ہاں یار۔ یہاں تو صرف پیسہ چلتا ہے۔ میں نے کراچی میں ایک میوزیم تو کھارادر میں دیکھا تھا اور دوسرا بابائے قوم کے مزار پر۔ وہاں ان کے ذاتی استعمال کی چیزیں رکھی ہیں۔ علامہ اقبال صاحب کے گھر میں بھی ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو کیا معلوم کہ وہ اصلی ہیں یا نقلی؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ ایسا ہو چکا ہے۔ میں تو اس قوم کی اخلاقی حالت دیکھتے ہوئے بات کر رہا ہوں کہ یہاں ناممکن کچھ بھی نہیں۔"

اس اطلاع نے مجھے سخت مضطرب اور متفکر کر دیا تھا۔ "یہاں اپنے ملک میں بھی ایک پوری مافیا ہوگی جو ایسے چوروں کی مددگار ہوگی۔ اور پھر ان کا تعلق ہوگا بین الاقوامی مارکیٹ کے خریداروں سے۔ وہ بھی ایک مافیا ہوگی۔"

"کیا پتا نوادرات میں یہ لوگ اور کچھ بھی بھر دیتے ہوں مثلاً ہیروئن۔"

میں نے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ہیروئن سے ہمیں کیا۔ ہماری قومی دولت باہر جا رہی ہے۔ ہمارا تاریخی سرمایہ چوری ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا "ہم کیا کر سکتے ہیں پیارے۔ یہ چوروں کی نگری ہے۔ اس میں چوکیدار کی سیٹی بھی اب یہ نہیں کہتی کہ جاگتے رہو۔ چوروں کو اطلاع دیتی ہے کہ آ جاؤ۔ میدان صاف ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے پھر کہا "ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ کوئی مطلب ہے اس بات کا؟"

اس سے پہلے کہ میں رئیس کو مطلب سمجھاتا' ایک کانسٹیبل نے اندر آ کے کہا "سر جی۔ کوئی زنانی ملنے آئی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ سے۔"

"عورت کون ملنے آسکتی ہے صبح صبح" میں نے سوچا۔ رخشی یا شبنم؟ رخشی کا کسی سے رابطہ نہیں تھا اور اسے معلوم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ شبنم البتہ چھلاوہ تھی اور ہر جگہ پہنچ سکتی تھی۔

لیکن میں باہر گیا تو مجھے صبح کے دھندلکے میں رخشی نظر آئی۔ وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔ میں نے حیرانی سے کہا "تم۔؟"

"شاہ جی۔۔۔ میں کوئی اچھی خبر نہیں لائی ہوں۔" وہ بولی۔

○☆○

"کوئی اچھی خبر نہیں ہے میاں جی!" ڈاکٹر رانجھا نے اپنی ٹوپی کو سر پر جما کے آئینے میں ملاحظہ کیا۔

ہیر نے وہ خط میری طرف بڑھا دیا "لے تو خود پڑھ لے۔ نامراد نہ ہو تو۔"

نامراد اس نے مجھے نہیں کہا تھا' رئیس کو کہا تھا جو یہ خط چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"یار جانی!

تو ضرور ناراض ہو گا ہم سے مگر یار اپن بھی مجبور ہیں۔ تیرے سامنے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ تو ہمیں سمجھانے بیٹھ جاتا اور اپنی بولتی بند ہو جاتی۔ اپن اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ اپنا تو لائف کا اسٹائل دوسرا ہے۔ گھر میں بھی رہے نہیں۔ اپنی ساری زندگی سڑک پر گزری ہے۔ صبح سے شام تک باہر۔ ماں باپ اور بہن بھائی ہوں تو گھر اچھا لگتا ہے پیارے ورنہ قید خانہ۔ ہو سکتا ہے جب گھر والی آئے تو وہ بٹھالے گھر میں مگر کتنے دن۔ آدمی سالا رات کو بیوی کا ہو سکتا ہے۔ دن میں بھی اسی کا ہو جائے تو جورو کا غلام۔ تیرا کچھ اور معاملہ ہے۔ تو پڑھتا ہے اور پڑھاتا ہے۔ آگے بڑھنا چاہتا ہے اور ترقی کرنا چاہتا ہے۔ کسی دن ضرور وزیر اعظم بھی بن جائے گا۔ ہم تو بس جینا چاہتے ہیں آزادی سے اور بے فکری سے۔ اپنی دوستی پکی اور جب تک تو نبھائے گا ہم بھی نبھائیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں شاہ جی کے پاس چلا جاؤں۔ وہاں بڑی عیش تھی یار۔ صبح سے شام تک موج میلہ تھا۔ سارا دن گھومنا پھرنا اور تھانے داری کے مزے۔ جس اڈے پر جاؤ سلام کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے تھے۔ مال بھی جتنا چاہو وصول کر لو۔ وہ تو بس اپنا اسٹائل ہی ایسا ہے کہ کبھی جمع کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ بس ایک جوڑا ہو تن پر۔ اچھا کھانے کو مل جائے اور سیر تفریح ہو جائے۔ یہی کافی ہے۔ ہیرا پھیری کی ہوتی تو اپن بھی لاکھوں جوڑ لیتے۔ شاہ جی اسی لیے بھروسا کرتا تھا کہ اپنے دل میں لالچ نہیں ہے۔ تو غصہ ہو گا ضرور کہ یہ کیسی دوستی ہے آخر؟ مجھے تیرے دشمن کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے تو پیارے' جو تیرا دشمن وہ اپنا بھی دوست نہیں ہو سکتا۔ تو یہ سمجھ لے کہ وہاں رہ کے میں تیرا اور شادو کا زیادہ خیال رکھ سکتا ہوں۔ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو تمہیں بتا سکتا ہوں اور تمہاری مدد۔"

پورا پڑھے بغیر میں نے غصے میں خط کو پھاڑ کے پھینک دیا۔ اس کے پرزے پرزے کر دیے۔ میں نے رئیس کو ایک سو ایک گالیاں دیں۔ حرام زادہ' نالی کا کیڑا' لوٹ گیا نالی میں بات کرتا ہے دوستی کی۔ وہاں ذلیل ہو گا' جوتے کھائے گا شاہ جی کے ڈن رات اور فقیروں میں رہے گا۔ عزت کی زندگی سالے کو راس نہیں آئی۔ لعنت اس کی دوستی پر اور اس سے مدد مانگنے والے پر۔ میں اپنا اور شادو کا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔ سامنے آگیا تو اتنے جوتے ماروں گا۔ میرے چلانے پر ہیر رونے لگی۔ ڈاکٹر رانجھا بدحواسی میں ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل گئے۔ میں سخت مشتعل تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے شاہ جی سے جیتی ہوئی بازی آدھی ہار دی ہے۔ اپنی ساری خود اعتمادی کے باوجود میں اپنے آپ کو ادھورا اور اکیلا محسوس کرتا تھا۔ یہ میرے اعتماد کی شکست تھی۔ میں جس پر دنیا میں سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا وہی میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ تدبیر سے آدمی اپنی تقدیر بدلنا چاہے تو ٹھیک ہے مگر کسی اور کی زندگی پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ میں اپنے اور رئیس کے لیے ایک جیسا سوچتا تھا۔ ہم ساتھ رہیں گے' ایک ساتھ ترقی کریں گے۔ کامیابی کے راستوں پر ساتھ ساتھ آگے بڑھتے جائیں گے اور ساری خوشیاں سمیٹ کر آپس میں بانٹتے جائیں گے۔ میں نے کیوں فرض کر لیا تھا کہ میں زندگی کے جس افق کو چھونا چاہتا ہوں وہی اس کی منزل بھی ہو گی۔ اسے اپنی زندگی جینے کا حق ہے اور جیسا کہ وہ کہتا تھا' اس کی لائف کا اپنا اسٹائل تھا اور اسے وہی پسند تھا۔ زندہ رہنے کے لیے مقصدِ حیات کا تعین کرنا' اس کے حصول کی جدوجہد کے لیے زندگی کو نظم و ضبط کا پابند کرنا' محنت کرنا اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہنا' یہ سب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی۔ وہ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے مختلف تھا۔ اس کی خواہشات لامحدود نہیں تھیں۔ وہ قناعت پسند تھا اور اس اعتبار سے قلندر تھا کہ زندگی جس حال میں رکھے وہ خوش رہ سکتا تھا۔ ویسے بھی خوشی' ترقی اور کامیابی جیسے الفاظ کا مطلب سب کے لیے ایک نہیں ہو سکتا۔

میں بہت دیر غصے میں جلتا بھنتا رہا۔ اپنے آپ کو قائل کرنے کے باوجود کہ رئیس میری خواہشات کی بلند پروازی میں میرا ساتھ نہیں دے سکتا تھا' مجھے اس کے لوٹ جانے کا دکھ تھا۔ میں نے کون سا اسے قید کر رکھا تھا۔ جو چاہتا کرتا' جانا ہی تھا تو خدا کی بنائی ہوئی اتنی بڑی دنیا میں کہیں بھی چلا جاتا۔ لوٹ کر اسی قاتل نفرت غلامی اور بے غیرتی کی زندگی کو کیوں گلے لگا لیا جس کو اس نے لعنت کے طوق کی طرح گلے سے اتار پھینکا تھا۔

ماسی ہیر کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی "چل پتر چھوڑ' کب تک غم کرے گا اس نامراد کا؟"

میں نے چائے لے لی "میں نے تو اچھا ہی سوچا تھا اس کے لیے۔"

"سوچنے سے کیا ہوتا ہے ناصر۔ جانا تو سب کو اپنی اپنی قبر میں ہے۔ اپنے اپنے اعمال کے ساتھ۔" وہ بولی "کون لے جا سکتا ہے کسی کو اپنے ساتھ جنت میں بھی۔"

اس کی سیدھی سادی بات نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ زندگی کے سارے فلسفے کا نچوڑ تھا جسے اس نے ایک جملے میں پیش کر دیا تھا۔ "ٹھیک کہا تم نے۔ اس کے باوجود ماں باپ اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ اور دوستی بھی کیا ہوتی ہے۔ یہی کہ آدمی اپنے ساتھ دوسرے کو بھی خوشی دینا چاہتا ہے۔"

"وہ خوش نہیں تھا یہاں تو' ہم کیا کر سکتے ہیں؟" وہ اداس ہو کے بولی "ٹھیک ہے جہاں رہے' خوش رہے۔"

"میں ملوں گا اس سے۔ واپس نے آؤں گا اسے۔"

"کیا فائدہ ناصر! وہ پھر چلا جائے گا" وہ بولی۔

میں ہاشمی صاحب کے گھر پہنچا تو خلافِ معمول گھر میں خاموشی تھی۔ ان کی گاڑی پورچ میں موجود نہیں تھی ورنہ اس وقت ان کا شوفر کورٹ جانے کے لیے گاڑی کو پالش کر کے چمکا رہا ہوتا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اندر ایک نوکر نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

"صاحب کی طبیعت خراب ہے رات سے۔ وہ کورٹ نہیں جائیں گے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ چاہتا ہے کہ اس اطلاع کے بعد مجھے لوٹ جانا چاہیے۔

میں نے کہا "شادو کو بلاؤ۔ میرا مطلب ہے شاہدہ پروین کو۔"

"وہ ابھی سو رہی ہیں۔" نوکر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو جگاؤ" میں نے اونچی آواز میں کہا "یا میں خود جا کے اس کے بیڈ روم کا دروازہ بجاؤں۔"

پرواز

ایم اے راحت

وہ چلا گیا اور کچھ دیر بعد شادو خواب آلود آنکھوں کے ساتھ بال سمیٹتی اور جماہیاں لیتی نمودار ہوئی "دراصل رات کو بہت دیر سے آئے تھے۔"

"کہاں گئی تھیں تم؟" میں نے کہا۔

"ہم گئے تھے ایک پارٹی میں۔ وکیل صاحب کے کوئی دوست ہیں۔ ان کو ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا ہے۔ انہوں نے کچھ دوستوں کو ایک بڑے اونچے ہوٹل میں ڈنر دیا تھا۔ رات دو بجے آئے وہاں سے۔ پھر ہاشمی صاحب کی طبیعت بگڑ گئی۔"

"کیا زیادہ کھا لیا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ کھاتے وہ بہت کم ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ الرجی ہو گئی کسی چیز سے۔ الٹیاں آئیں دو بار۔ ڈاکٹر نے کہا فوڈ پوائزننگ ہے۔"

"ہاں۔ ایسے لوگوں کے دشمن بھی بہت ہوتے ہیں۔ دے دیا ہو گا کسی نے زہر۔ زیادہ کھانے کی عادت ہوتی تو ہو جاتا کام تمام۔"

اس نے خفگی سے کہا "ناصر۔ صبح صبح منہ سے منحوس بات نکالنا کوئی اچھی بات ہے؟ ان کا کوئی دشمن نہیں۔"

"اوہو۔ بڑی جلدی دوستوں سے بھی شناسائی ہو گئی اور دشمنوں کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا "کیا بات ہے؟ تمہارا موڈ اتنا خراب کیوں ہے؟ کس بات کا غصہ ہے؟"

میں نے کہا "شادو۔ رئیس خبیث واپس چلا گیا شاہ جی کے پاس۔"

اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا "کیا؟ واپس چلا گیا' آخر کیوں؟"

میں نے تلخی سے کہا "اس لیے کہ عزت اور غیرت سب کو راس نہیں آتی۔ ذلیل آدمی کو ذلت ہی پسند آتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"تم نے اسے روکا نہیں؟" وہ سخت دکھی ہو گئی تھی۔

"کیسے روکتا۔ وہ ایک خط چھوڑ کے رات کو ہی غائب ہو گیا۔"

"کہاں ہے وہ خط؟" شادو گم صم لہجے میں بولی۔

"میں نے پھاڑ کے پھینک دیا۔ پورا پڑھا بھی نہیں.... میں یہی بتانے آیا تھا تمہیں۔ اب میں جا رہا ہوں۔ آج ملوں گا اس سے۔"

"کہاں ملو گے؟ دیکھو وہاں مت جانا" شادو تشویش میں مبتلا ہو گئی "اور کیا فائدہ اس کا ناصر۔ وہ نہیں رہنا چاہتا تمہارے ساتھ تو کیا اسے زبردستی رکھو گے؟"

میں نے کہا "وہ گھر میں بیٹھنے والا نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔"

"ناصر۔ تمہارا ایسے پھرنا ٹھیک نہیں" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "آج ہاشمی صاحب بھی کورٹ نہیں جائیں گے تم واپس گھر جاؤ۔"

"کیا کروں گا واپس گھر جا کے...."

"تمہیں کچھ ہوش ہے۔ تمہارا امتحان شروع ہو رہا ہے پرسوں سے۔ تیاری کیا کی ہے تم نے... ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔"

"بھاڑ میں گیا امتحان۔"

"ایسا مت کہو۔ جاؤ دو دن میں کچھ دیکھ لو۔ تم کو میٹرک کا امتحان دینا ہے ناصر اور پاس بھی کرنا ہے۔" شادو نے کہا "میری بات سن رہے ہو نا۔ تھوڑی سی محنت کرو اور توجہ دو تو تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں۔ ابھی اور سب کچھ بھول جاؤ۔ مجھے بھی بھول جاؤ...."

"اب کوئی فائدہ نہیں شادو جی۔ ایسے پاس ہونا مشکل ہے۔"

"تم کوشش کرو۔ فرسٹ سیکنڈ ڈویژن کو چھوڑو۔ بس پاس ہو جاؤ۔ میٹرک کر لو گے تو آگے انٹر کا اور بی اے کا امتحان دو گے۔ اسی جگہ رک گئے تو کچھ نہیں کر سکو گے زندگی میں۔"

"مگر شادو...."

اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا "اگر مگر کچھ نہیں۔ تمہیں میری قسم۔ وعدہ کرو تم امتحان دو گے اور پاس ہو کے دکھاؤ گے۔"

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "صرف تمہاری قسم کھا کے میں پاس ہو جاتا تو امتحان دینا کیا مشکل تھا۔"

"پاس بھی ہو جاؤ گے تم۔ مجھے معلوم ہے" وہ بولی "با... سب کچھ بھول جاؤ ابھی۔ دس پندرہ دن کی تو بات ہے۔ ا... امتحان ختم ہونے سے پہلے میرے بارے میں سوچنا نہیں۔ رئیس کے بارے میں شاہ جی کے بارے میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تمہارے بارے میں اپنی م... سے کب سوچتا ہوں میں۔ وہ تو تمہارا خیال خود ہی آ... ہے۔ میرے روکنے سے کب رکتا ہے۔"

"ناصر۔ اب میں تم سے امتحان کے بعد ملوں گی" ا... نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

اس نے بڑے یقین سے اپنی بات دہرائی "مجھ سے... کی کوشش بھی مت کرنا۔ جس دن امتحان ختم ہو۔ سید... یہاں آ جانا۔ میں تمہیں دروازے پر انتظار کرتی ملوں گی۔"

"اور امتحان ہی نہ دوں میں.... پھر....؟"

وہ کھڑی ہو گئی "پھر میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔... نہیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور تم جانتے ہو نا مجھے۔ جب میں... تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا تو جان کی بازی لگا کے د... چھوڑ دیا تھا۔ اگر تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا...."

میں نے کہا "جب تم نے اپنی قسم دے دی تو پھر د... کیوں دیتی ہو۔"

وہ مسکرائی "آؤ۔ ناشتا کیا ہے یا نہیں؟ ہاشمی صا... جاگ رہے ہوں تو ان کی مزاج پرسی بھی کر لو۔"

ہاشمی صاحب اس وقت سو رہے تھے مگر ناشتا کرنے... بعد پھر دیکھا تو وہ اٹھ چکے تھے۔ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک... مگر ڈاکٹر کے مشورے پر انہوں نے ایک دن آرام کر... فیصلہ کیا تھا۔ میں نے ان سے زیادہ بات کرنا مناسب... سمجھا اور دس منٹ بعد اٹھ کے آ گیا۔

شادو کی قسم نے اچانک مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میر... مستقبل کے لیے اس امتحان کی کتنی اہمیت ہے۔ ڈیٹ... کے مطابق میرا آخری پرچہ امتحان شروع ہونے کے بیس... بعد تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ بائیس دن بعد میں شادو... ملنے جاؤں گا تو کیا دن ہو گا۔ پیدل چلتے ہوئے میں ا... خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہ تھی۔

میں اس وقت چونکا جب ایک گاڑی نے میرے... قریب آ کے بریک لگائے۔ سڑک پر ٹائروں کی رگڑ سے... پیدا ہوئی۔ میں بے اختیار ایک طرف ہو گیا۔ پھر گاڑ... دروازہ کھلا۔

پولیس کی وردی میں اترنے والے کو دیکھ کر میرا چونکنا اور خوفزدہ ہو جانا ایک فطری ردِعمل تھا....

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

پولیس تھانے اور کچہری کے چکروں سے مجھے وقتی طور پر نجات مل گئی تھی اور مجھے قانون کی گرفت سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا مگر لاقانونیت کے علمبردار اور جنگل کے قانون کے پیروکار اس معاشرے میں فرعون بے ساماں بنے ہوئے تھے۔ ان سے خدا کے سوا مجھے کون بچا سکتا تھا۔

سب انسپکٹر کے عہدے کا وہ شخص سیدھا میری طرف آیا تو یہ شک بھی نہ رہا کہ میرا ڈر بے سبب ہو گا۔ اسے جہاں اترنا تھا وہیں اس نے ٹیکسی روکی تھی اور اگر وہاں میں موجود تھا تو میرے علاوہ بھی لوگ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ انہوں نے کسی شادو سے عشق نہیں کیا تھا۔ اس عشق میں کسی شاہ جی کی غیرت کو نہیں للکارا تھا۔ اس کی بدمعاشی کے غرور کو سرِعام تماشائے ذلت نہیں بنایا تھا اور اس کے جرائم میں شریک اور ناجائز آمدنی میں برابر کی حصے دار پولیس سے پنگا نہیں لیا تھا چنانچہ چونکنے والا صرف میں تھا مگر یہ تو صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے لمحے میں اسے نظرانداز کر کے چل پڑا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔

"او بھائی جی۔ ایک منٹ بات تو سنو۔ کدھر بھاگ رہے ہو؟"

اس کے غیر تھانے دارانہ لہجے اور رویے پر غور کرنے سے پہلے اس کی آواز سنتے ہی مجھے سب یاد آ گیا اور میں نے خفت کے ساتھ حیرانی سے اسے دیکھا "تم؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری "ہوار، تم بھی کمال کے بندے ہو۔ میں نے اتنی دور سے دیکھ کے تمہیں پہچان لیا کہ یہ تو اپنا ناصر بابو ہے۔ پیدل کیوں جا رہے ہو؟"

میں نے ہنس کے کہا "اس لیے کہ ابھی تک میں نے اپنی گاڑی نہیں خریدی۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "ضرورت بھی کیا ہے۔ اپنی ہیں یہ ساری گاڑیاں جو سڑک پر نظر آ رہی ہیں۔ بس تم پسند کرو اور دیکھو میرے ایک اشارے پر رکتی ہے یا نہیں۔ ہم کوئی کچے یا جعلی تھانے دار ہیں۔"

میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ "بالکل نہیں۔ اصلی تے وڈے تھانے دار ہو تم۔ محمد نذیر صاحب لیکن تھانے دار کا بہروپ بھرنے والا تو تھانے دار نہیں ہوتا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی "ہوتا ہے جی۔ آپ کو کیا معلوم۔ ہماری طرح واسطہ پڑے تو پتا چلے۔"

تھانے دار محمد نذیر عرف جیرے بلیڈ نے اسے ڈانٹ لگائی۔ "اوئے تم سے پوچھا ہے کسی نے۔ آگے دھیان رکھو اور گاڑی چلاؤ۔"

گاڑی نے چند جھٹکے لیے اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے انجن پھر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ نیچے اتر کے اس نے بونٹ کھولا اور خرابی تلاش کرنے لگا۔

جیرے کی صورت پر ناگواری کے جذبات عیاں ہو گئے۔ "بہت چالاک ہو گئے ہو حرامی۔ آؤ یار وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دوسری گاڑی پکڑتے ہیں۔ یہ تو اب ٹھیک ہو گی نہیں، جب تک ہم بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"سب معلوم ہے مجھے" وہ بولا۔

گاڑی سے اتر کے اس نے ٹیکسی کا دروازہ لات مار کے بند کیا۔ "اوئے کیسی گاڑی لے کر آ گئے ہو سڑک پر۔ انجن ہے اس میں؟"

ٹیکسی ڈرائیور معصوم اور مظلوم بن گیا "سر جی! ابھی دو منٹ میں ٹھیک ہو جائے گی۔ گاڑی چلتی ہے تو خراب بھی ہو جاتی ہے۔ مشین ہے نا جی۔"

"اچھا! یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔ اس کا فٹنس سرٹیفکیٹ کب لیا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے؟ دکھاؤ اپنے کاغذات" جیرے نے غرا کے کہا۔

ڈرائیور کی شکل اتر گئی "کاغذات تو پورے ہیں جی...!"

میں نے کہا "چلو نذیر صاحب۔ چھوڑو اس غریب کی جان۔ اس کی تو ٹائمنگ ہی غلط ہو گئی۔"

جیرا میرے ساتھ چلنے لگا "او بھائی جی۔ پولیس کے فرائض میں مداخلت کرنا بھی جرم ہے، کیا سمجھے؟"

میں نے ہنس کے کہا "بالکل سمجھ گیا۔ بے چارے کو کرایہ تو ملا نہیں۔"

"کرایہ؟ ہم سے کرایہ لے گا..... بھائی جی کرایہ تو ہم لیتے اس سے۔ تمہاری وجہ سے سو روپے کا نقصان ہو گیا صبح صبح۔" وہ بولا۔

وہی ٹیکسی زوم سے ہمارے پاس سے گزر گئی۔ میں نے کہا۔ "اس نے ٹھیک کہا تھا کہ دو منٹ رک جاؤ۔"

وہ ہنسنے لگا "ہم دو گھنٹے بیٹھے رہتے ناصر صاحب تو گاڑی دو گھنٹے وہیں کھڑی رہتی۔ وہ لگا رہتا خرابی تلاش کرنے میں یا چلا جاتا کسی مکینک کی تلاش میں۔ خرابی کوئی نہیں تھی۔ انہوں نے یہی طریقہ نکال لیا ہے مفت کی بیگار سے بچنے کا۔ انجن کو کرنٹ دینے والا کوئی تار بیچ میں سے کاٹ کے ایک سوئچ لگا لیتے ہیں۔ سوئچ آن رہے تو گاڑی چلتی رہتی ہے، آف کرتے ہی بند۔"

"ویری گڈ۔ اچھا توڑ نکالا ہے یہ بھی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ تمہیں معلوم تھی یہ بات تو اسے بتاتے۔"

"کیا فائدہ۔ وہ ہاتھ جوڑ کے انکار کرتا۔ کہتا کہ ایسی بات ہو تو آپ کا جوتا اور ہمارا سر۔ سوئچ خفیہ جگہ پر لگاتے ہیں جسے مکینک ہی تلاش کر سکتا ہے پھر بھی جرمانہ تو وصول کیا جا سکتا ہے۔ عام طور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر کاغذات میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ کاغذات ٹھیک ہوں سارے تب بھی گاڑی میں کوئی خرابی ضرور نکل آتی ہے۔ بریک لائٹ کام کیوں نہیں کرتی۔ اشارے کی لائٹ کیوں خراب ہے۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو یہ کتنا خطرناک کام ہے۔ تمہاری وہ... بہن ہے غالباً۔ وہ غلط نہیں کہتی، جس دن پکڑے گئے۔"

"او بھائی جی، بورمت کرو صبح صبح۔ ابھی تک تو کسی نے پکڑا نہیں۔ کوئی پکڑا جاتا ہے یہاں اور جو پکڑا جاتا ہے، وہ چھوٹ بھی جاتا ہے۔ کبھی تھانے میں دو چار دن گزار کے، کبھی چار چھ مہینے جیل میں کاٹ کے۔ سب کو بچانے والا اللہ کے بعد قائداعظم کا فوٹو ہے۔ جو روشنی میں دیکھنے سے نظر آتا ہے ورنہ کونے میں سو یا پانچ سو کا ہندسہ دکھائی دیتا ہے۔"

"تم جن کے حصے کا مال کھا رہے ہو، انہیں ضرور پتا چل جائے گا کہ باہر کا کوئی آدمی اندر آگیا ہے۔"

"مال کم ہو تو پتا نہیں چلتا۔ پانی کا گھڑا خالی دکھائی دیتا ہے مگر سمندر کبھی خالی نظر آسکتا ہے۔" وہ بولا "پولیس کے افسر بھی مانتے ہیں کہ محکمے میں چند کالی بھیڑیں ہیں لیکن اصل بات یہ ہے بھائی جی کہ چند سفید بھیڑیں شاید ہوں گی۔ باقی سب کالی ہیں تو ان میں ہم جیسی کالی بھیڑ کا کیسے پتا چل سکتا ہے۔ نہیں یقین تو ادھر کھڑے ہوکے دیکھو، مداری کا کھیل" وہ بولا۔

ہم ایک چوک سے گزر رہے تھے۔ اس نے اچانک آگے بڑھ کر ایک ٹرک کو روک لیا جو سریا لاد کے لے جا رہا تھا۔ سریے کی لمبائی ٹرک کی لمبائی سے زیادہ تھی چنانچہ پچھلی طرف سے سریے خطرناک انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے اور جھٹکوں سے جھول رہے تھے۔ یہ قانون کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ میں کچھ فاصلے پر ایک دیوار کے ساتھ لگے ہوئے سائن بورڈ کے نیچے رک کر تماشا دیکھنے لگا۔ ٹرک ڈرائیور اور اس کا معاون نیچے اتر آئے اور چند منٹ میں مک مکا کے مذاکرات ختم ہوئے تو ٹرک پھر روانہ ہوگیا۔ جیرے نے ایک موٹر سائیکل روک لی۔ اس پر تین لڑکے سوار تھے۔ تیسرا شکار ایک کم عمر لڑکی تھی جو نئی کار چلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی نسبتاً عمر رسیدہ خاتون غالباً ماں تھی اور انسٹرکٹر کے فرائض بھی انجام دے رہی تھی۔ لڑکی کار چلانا سیکھ چکی تھی مگر اس کی عمر ڈرائیونگ لائسنس کے لیے کم تھی۔ دور سے ماں بیٹی کی پریشانی دیکھ کے میں نے دخل اندازی کا سوچا مگر اتنی دیر میں وہ جرمانہ ادا کر کے رخصت ہو گئیں۔

پندرہ بیس منٹ میں پولیس کی ایک جیپ گزری تھی جس میں کوئی بڑا افسر جا رہا تھا۔ جیرے نے اسے سلیوٹ کیا۔ موٹر سائیکل پر ایک ٹریفک سارجنٹ بھی گزرا۔ جیرے نے ہاتھ ہلایا تو جواب میں اس نے بھی سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ ٹریفک کے رش میں اسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ جیرے کی صورت پر غور کرتا۔

"کیا خیال ہے، چلیں؟" میرے قریب آکے اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا جو سرے سے موجود ہی نہیں تھیں "گزارے لائق آمدنی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "گزارہ تو کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ آمدنی کتنی بھی ہو۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "بات تو سولہ آنے سچ ہے مگر ابھی میں گزارہ کر رہا ہوں بھائی جی۔ دیکھونا" ایک کچے تھانے دار کے پاس بھی موٹر سائیکل تو ہونی ہی چاہیے، کانسٹیبل بھی سائیکل پر نہیں پھرتا۔"

میں نے کہا "اکثر تھانے داروں کے پاس گاڑیاں ہوتی ہیں۔ ایسی شاندار کہ شام کو فیملی کے ساتھ نکلتے ہیں تو خاندانی صنعت کار لگتے ہیں۔"

"مگر ڈیوٹی کے لیے تھانے دار کی سواری موٹر سائیکل ہے۔ اس میں بڑی شان ہے اور موٹر سائیکل بھی ہو ذرا بھاری بھر کم۔ پہلے آتی تھی ٹرائمف۔ واہ وا کیا شیر ببر کی دھاڑ جیسی آواز ہوتی تھی اس کی اور ہارلے ڈیوڈسن۔ ان کے سامنے یہ جاپانی گاڑیاں تو زنانہ سواری لگتی ہیں مگر ہاں جو بڑی بڑی گاڑیاں ہیں، سوزوکی ساڑھے سات سو سی سی والی۔ چار سلنڈر، چار سائلنسر والی۔ یا ساڑھے چار سو سی سی والی۔ سفید ہاتھی جیسی موٹر سائیکل۔ وہ بھی شاندار لگتی ہیں۔ اوپر لائٹ لگی ہو گھومنے والی اور سائرن ہو ایسا کہ سن کر ٹریفک رک جائے۔ ایسا رعب پڑتا ہے۔"

میں نے تنگ آکے کہا "یہ سب مجھے سنانے کا فائدہ؟"

"وہ... بھائی جی، آپ نے ہی گزارے والی بات کی تھی۔ ابھی دو چار سو روز پر ہی گزارہ کر رہے ہیں نا۔ آدھے گھنٹے میں اپنا کام ہو جاتا ہے تو لالچ میں نہیں پڑتے۔ بندے کو قناعت کرنی چاہیے ورنہ دو چار ہزار بھی ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے کیوں روکا تھا مجھے؟"

"دراصل آپ سے ملاقات تو ایک بار ہی ہوئی ہے" وہ بولا "لیکن میں تو اس دن ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ بندے ہو شریف۔ غلطی سے ادھر پہنچ گئے تھے یا وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ آپ کا دوست رئیس۔ آپا جی نے بھی بعد میں مجھے بتایا کہ معاملہ کچھ اور تھا۔"

"کچھ اور کیا؟"

"مطلب یہ کہ شوقینی کا نہیں تھا" وہ بولا "بعد میں تمہارے یار نے مجھے ساری بات بتائی۔"

"رئیس بعد میں بھی ملنے گیا تھا تم سے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دو بار ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ وہ بھی ایسی مٹی کا بنا ہوا ہے جس سے رب نے ہمیں بنایا تھا۔" وہ ہنسا "پتا نہیں تم جیسے آدمی کی اس سے دوستی کیسے چل رہی ہے۔"

"ٹھیک سمجھا تم نے۔ اس کی اور تمہاری دوستی بھی اچھی چل سکتی ہے اور دشمنی بھی" میں نے تلخی سے کہا "تمہیں پتا ہے وہ کہاں ہے؟"

وہ حیران ہوا "کہاں ہے؟ مجھے کیا معلوم... یہ بات تو میں تم سے پوچھنے والا تھا۔"

میں نے کہا "دراصل۔ وہ مجھے چھوڑ کے واپس چلا گیا ہے۔"

"کہاں... شادو کے پاس؟"

میں نے کہا "تم جانتے ہو شادو کو؟"

"رئیس نے سب بتا دیا تھا تمہارے اور اپنے بارے میں اور شادو کے بارے میں۔"

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا "تمہیں رئیس نے اس شخص کے بارے میں بھی بتایا ہوگا۔ رسیم کے بارے میں؟"

"اس کے متعلق مجھے پہلے ہی سب معلوم تھا بھائی جی۔ رئیس نے یہ بتایا کہ اس سے تمہاری دشمنی ہے۔ تم قتل کرنا چاہتے ہو اسے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا "رئیس جیسے نادان دوست ہی قتل سے پہلے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں گے مجھے۔ قاتل آزاد ہے۔ اس نے ایک نہیں دو قتل کیے تھے۔ ایک میرے دوست کا جو میرا ہم نام تھا اور دوسرا اس کی ماں کا۔ اس نے میرے دوست کے مکان پر قبضہ کر لیا، اسے یتیم قرار دے کر۔ رشوت دے کر اور سب سے جھوٹ بول کر اسے یتیم خانے میں داخل کرا دیا اور بعد میں مروا دیا۔ اس کی ماں کے زیور گہنے سب چھین لیے اور اسے بیچ دیا۔ بعد میں مار کے اسی مکان میں گاڑ دیا جس میں وہ قبضے کے بعد خود رہتا تھا۔"

"مجھے بہت دکھ ہوا تھا یہ سب جان کے۔ میں نے بھی رئیس سے کہا تھا کہ ایسے شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ قانون بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"اس کا بہنوئی پولیس انسپکٹر تھا۔ آج کل ایس ایچ او ہے" میں نے کہا "میں نے شور شرابا کیا تو اس نے مجھے ہی بند کرا دیا اور تھانے میں میرا وہ حشر کیا جو مجھے آج بھی یاد ہے۔"

"لیکن سزا تو ملنی چاہیے اسے" جیرے نے کہا "مجھے بھی اس کے ساتھ اپنا حساب برابر کرنا ہے۔"

"اپنی بہن کا حساب؟"

"نہیں۔ اس کے معاملات سے مجھے کیا۔ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اپنی مرضی سے لوٹ کے آگئی۔ کاروبار میں گھاٹا بھی ہو جاتا ہے۔"

"تمہارا کیا معاملہ ہے؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "بھائی جی۔ ایک تھانے دار شکار کی تلاش میں سڑک پر کھلا ہو تو اچھا لگتا ہے۔ اتنی دیر تک جوتیاں چٹخانا اچھا نہیں لگتا۔ تم کہاں جا رہے ہو آخر؟"

میں نے کہا "میں بینک جاؤں گا پہلے، پھر اپنے گھر۔"

"کوئی جلدی نہیں ہے تو بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ ساڑھے تین سو ابھی ابھی ملے ہیں، ہو جائے کوئی موج میلہ" وہ ہنسا۔

اس جیسے شخص کو یہ بتانا مناسب نہیں تھا کہ میری جیب میں پورے پچاس ہزار ہیں جو میں نے زرِ ضمانت جمع کرانے کے لیے رکھے تھے مگر ضمانت داخل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تو یہ رقم مجھے واپس بینک اکاؤنٹ میں ڈالنی ہے۔ میں نے کہا "بس ایسے ہی چند منٹ کا کام تھا۔"

"تو چلو، پہلے کام کر لو اپنا" وہ بولا "پھر چائے پیتے ہیں بھائی جی کسی فسٹ کلاس جگہ بیٹھ کے۔"

میں نے بینک میں پچاس ہزار جمع کرائے تو وہ بہت حیران ہوا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا "رقم کسی نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے لیے دی تھی۔"

"یہ وہی رقم ہوگی جو تم نے اپنی اور رئیس کی نقد ضمانت دینے کے لیے نکلوائی تھی" اس نے سرہلا کے کہا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہے، رئیس نے بتایا ہوگا؟"

"ہاں جی۔ یاروں سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہیے" وہ بولا۔

"میں نہیں، رئیس ہے تمہارا یار۔ میری تو تم سے یہ دوسری ملاقات ہے اور سچی بات یہ ہے کہ میں رئیس کی اور تمہاری ہیرا پھیری، چکربازی اور بدمعاشی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"بھائی جی، پسند کون کر سکتا ہے؟" اس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریستوران کا رخ کیا "پسند تو ہم بھی نہیں کرتے جو کام برا ہے وہ برا ہی رہے گا لیکن اچھائی بھی سب کو کیسے راس آسکتی ہے۔ دنیا میں سارے اچھے لوگ ہوں، یہ تو ناممکن ہے۔ کچھ فرشتے ہوں گے تو کچھ شیطان۔ کچھ انسان تو کچھ حیوان۔ کچھ خوب صورت تو کچھ بدصورت۔"

ایک پُرسکون سرد گوشے میں بیٹھ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پرسوں سے میرا امتحان شروع ہو رہا ہے اور مجھے تیاری کرنا ہے اس لیے جو کہنا ہے جلدی کہو۔"

"یہ جو وسیم ہے نا بھائی جی۔ یہ بڑا... ہے" اس نے بڑی روانی سے اسے ایک ناقابلِ بیان گالی دی۔

میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "ذرا آہستہ، آس پاس شریف لوگ بیٹھے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "آپ کو کیسے پتا چل گیا کہ صرف ہم بدمعاش ہیں اور باقی سارے شریف ہیں؟ صورت سے تو ہم زیادہ معزز لگتے ہیں۔ چہرے دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ باقی لوگ مجھے اصلی تھانے دار اور تمہیں... ہاں، تمہیں کسی بہت بڑے اور اونچے خاندان کا سمجھ رہے ہوں گے۔ خیر بھائی جی، مطلب کی بات کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ اس نے میرے ساتھ فراڈ کیا' پورے پچاس ہزار کا۔ آپ تو سیانے بندے ہو' اندازہ کرلیا ہوگا کہ مجھے شوق ہے پولیس میں جانے کا۔ خدمتِ خلق کے لیے نہیں' کمائی کے لیے بھی نہیں۔ کمائی تو ہر جگہ ہو جاتی ہے اگر موقع ملے۔ پولیس کی نوکری کے بغیر ہی گزارہ ہو رہا ہے۔"

"اچھا گزارہ ہو رہا ہے" میں نے کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ پولیس کی وردی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے اور اختیارات بھی اتنے ہوتے ہیں کہ آدمی چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"مثلاً بے گناہوں کو پکڑنا' دشمنوں کی ایسی تیسی کرنا۔"

وہ ہنسنے لگا "یہ تو سب ہی کر رہے ہیں جی۔ میں بھی بندہ بشر ہوں' یہ نہیں کہہ سکتا کہ مال بنانے کا شوق نہیں تھا۔ کوٹھی' کار' کیش' کاروبار اور کڑیاں' یہی ہے لائف۔ پانچ کاف اپنے بھی تھے۔"

اس کی بات نے مجھے مسکرانے پر مجبور کردیا "سکھوں کے پانچ کاف مشہور تھے اب تک۔ کنگھی' کچھ' کڑا' کرپان اور کیس۔"

"وہ سب پرانی باتیں ہیں بھائی جی!" وہ بولا۔

"خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔"

"نوجی' سارے پیسے والے گنجے ہی ہوتے ہیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ مال آیا تو بال گئے۔" وہ بولا "لیکن میرا معاملہ کچھ اور بھی تھا۔ میں عیش ضرور کرتا مگر اس کے ساتھ ہی میں چاہتا تھا کہ کچھ کام بھی کروں۔ معلوم تو آج بھی ہے مجھے کہ کون کیا حرامی پن کر رہا ہے۔ پولیس میں رہ کے زیادہ پتا چلتا کہ کون ملک سے غداری کر رہا ہے۔ کون ماؤں' بہنوں کو بیچ رہا ہے' کون فرشتوں کے روپ میں شیطان ہے۔ یہ جو معزز ڈاکو اور چور لٹیرے بنے ہوتے ہیں' قوم کے لیڈر اور محافظ' ان سے بھی نمٹتا۔"

"تم کیسے نمٹتے؟ تمہیں فرصت ہی نہ ملتی اور جو پڑا ہو کوٹھی' کار' کیش' کاروبار اور کڑیوں کے چکر میں' اس کا دھیان کسی اور طرف جاتا بھی نہیں۔ یہ فضول بات ہے" میں نے کہا۔

"نہیں بھائی جی۔ ایسا نہیں ہے" وہ بولا "مال تو بہت مل جاتا ہے چھوٹے چوروں سے۔ آپ نے دیکھا' ابھی پندرہ منٹ میں ساڑھے تین سو کن سے کمائے تھے میں نے۔ وہ ملک اور قوم کے نہیں' سب اپنے دشمن تھے۔ وہ جو تین لڑکے موٹر سائیکل پر تھے' ایکسی ڈنٹ ہو جاتا تو خود ہی مرتے نا اور وہ چودہ سال کی لڑکی جو کار چلانے آگئی تھی ایسی ٹریفک میں۔ نقصان ہوتا اس کی گاڑی کا۔"

میں نے کہا "جان دوسرے کی بھی جا سکتی تھی۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "قانون کی خلاف ورزی پر میں نے ان سے جرمانہ وصول کرلیا۔ میں نہ لیتا' کوئی اور لے لیتا۔ چالان ہوتا تو عدالت وصول کرتی مگر سرکاری خزانے میں شاید پھر بھی ایک پیسہ نہ جاتا۔ پتا ہے وہاں بھی بڑا گھپلا ہوتا ہے۔ خیر بھائی جی' یہاں تو ہر قدم پر ہر موڑ پر' ہر گلی محلے میں' سڑک پر اور بازار میں چھوٹے چور ہیں۔ دو نمبر مال بیچنے والے۔ ملاوٹ کرنے والے۔ دھوکے باز اور جیب کترے۔ رشوت خور اور ناجائز کام کروانے والے۔ ان سب کی سزا یہی ہے کہ ان کو پکڑو۔ ان کی کمائی چھین لو یا آدھی آدھی کرلو۔ ان کو نہ پکڑا جاسکتا ہے اور نہ سب کو جیل میں ڈالا جاسکتا ہے لیکن یہ جو بڑے مجرم ہیں ان کا خانہ خراب کرنا ضروری ہے۔"

"تمہارے اس عجیب و غریب فلسفے کے مطابق بڑے مجرم کون ہیں؟" میں نے کہا "اور تم ان کا خانہ خراب کیسے کرسکتے ہو؟"

وہ سوچ میں پڑگیا "یہ جو نوجوانوں کو منشیات کا عادی بنا رہے ہیں' قومی قرضے ہڑپ کر رہے ہیں' ملکی خزانے کو کھا رہے ہیں۔ ہماری پیداوار دشمنوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں اور پیسہ باہر کے بینکوں میں ڈال رہے ہیں' پاکستان کا نام ساری دنیا میں بدنام کرنے والے بے ایمان تاجر اور بردہ فروش۔ انسانوں کی خرید و فروخت کرنے والے۔ نقلی دوائیں بنانے والے اور دشمنوں کے ایجنٹ۔"

اب میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگیا تھا۔

"دشمنوں کے ایجنٹ؟ کون سے دشمن؟"

"پاکستان کے دشمن اور کون؟ اور مسلمانوں کے دشمن ....

ان کا خاتمہ ضروری ہے۔"

میں اس غیر سنجیدہ حال مست' بظاہر عیش کوش نظر آنے والے بے وقوف اور جاہل سمجھے جانے والے نوجوان کے جذبات اور اس کی سوچ سے بے حد متاثر ہوا۔ "کیسے ہوگا ان کا خاتمہ؟"

"یہ مشکل سوال ہے بھائی جی لیکن.... میرا خیال ہے کہ ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ قانونی طریقے سے ذرا مشکل ہے کیونکہ قانون بے چارہ بڑا مجبور ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ سانپ تو سانپ ہی ہوتا ہے اور بچھو کے بارے میں کیا پوچھنا کہ بچھو زہریلا ہے یا نہیں۔ اسے مار دینا چاہیے۔ قانون تو کہے گا کہ ثابت کرو یہ بچھو ہے۔ ثابت کرو کہ یہ زہریلا ہے۔ ثابت کرو کہ یہ انسان کو ڈنک مارنا چاہتا تھا اور اس سے انسان کی جان جاسکتی تھی۔ یہ تو بیٹھا تھا ایک تاریک گوشے میں اور کسی کو کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا پھر تم نے اس کو کیوں مارا؟"

میں نے کہا "مثال اچھی دی تم نے مگر یہ ملک اور قوم کے بچھو تم کیسے مار سکتے ہو۔ اگر وہ چھپے بیٹھے ہیں تو ان کا پتا لگانا ہی مشکل ہے اور پتا چل گیا تب بھی سیکڑوں' ہزاروں بچھو تمہیں مل کے ہلاک کردیں گے۔"

"یہ تو ہے" وہ بولا "اسی لیے تو کہا ہے میں نے کہ کام مشکل ہے مگر سارے نہ سہی' دس بیس.... سو پچاس بچھو بھی مار دیے جائیں تو سمجھو آپ نے اپنا کام کردیا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ ایک خفیہ تنظیم بنالوں۔ اس میں میرے جیسے پاگل ہوں جو یہی کام

کریں۔ چن چن کے انہیں ٹھکانے لگائیں۔ جہاں بھی موقع ملے۔ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے کہ یہ کام کس نے کیا۔ کہیں ایک منافق لیڈر مار دیا۔ کہیں ایک منشیات فروش' کبھی کوئی جعلی مزدور لیڈر تو کبھی شرپسند مولوی۔ آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو ایک واردات کا دوسری سے' آپس کی دشمنی کا نتیجہ لگے اور سراغ کوئی نہ ملے۔"

میں نے کہا "تم پاگل ہو۔ کرتے کیا ہو' سوچتے کیا ہو۔"

"ٹھیک بولا آپ نے بھائی جی" وہ ہنسنے لگا "بات کیا شروع کی تھی میں نے اور کہاں نکل گیا۔ میرے جیسے جھلے بہت ہیں جو ایسی باتیں سوچتے ہیں' کر کچھ بھی نہیں سکتے۔ دیلے لوگ ہیں نا' اس لیے خواب دیکھتے رہتے ہیں کہ الہ دین کا چراغ مل جائے۔ جن قابو میں آجائے تو راتوں رات سب ٹھیک کردیں۔"

"ایک جن بھی منافق کو سچا آدمی اور بے ایمان کو ایماندار تو نہیں بنا سکتا۔" میں نے کہا "قوم کا کردار تو نہیں بدل سکتا۔"

"ہاں مگر اور بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اسے حکم دیا جائے کہ آج رات میں ساری سڑکیں بنا دو۔ ہر گاؤں' قصبے اور شہر میں۔ بجلی' پانی' گیس پہنچا دو۔ سب کے لیے اسکول کھڑے کردو۔ اسپتال تعمیر کروا دو اور جا کے جہاں سے مرضی لاؤ' ایک ہزار کھرب ڈالر لاؤ تاکہ صبح ہم سب کا قرضہ ان کے منہ پر ماریں۔"

میں نے کہا "تم نے وسیم کو پچاس ہزار دیے تھے تاکہ وہ اپنے سالے تھانے دار سے کہہ کے تمہیں بھی پولیس میں بھرتی کرا دے۔"

"ہاں" اس نے ٹھنڈی سانس لی "بڑی مشکل میں پڑگیا تھا میں۔ میں نے سوچا کہ ایک لمبا ہاتھ مارا جائے۔ اس کے بغیر پچاس ہزار جمع نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے ایک فیکٹری کا مال روک لیا۔ اس میں کچھ گڑبڑ تھی۔ مالکوں نے مجھے پچاس ہزار تو ادا کردیے مگر صبح رپورٹ پہنچ گئی اوپر والوں کو۔ بڑی تفتیش ہوئی اور بہت سے لوگوں کی پیشی ہوئی۔ میں دو ہفتے گھر سے نہیں نکلا۔ میرے حلیے کا ایک انسپکٹر پکڑا گیا۔ وسیم نے مجھے بتایا کہ رقم چوہدری صاحب کو پہنچ گئی ہے اور بہت جلد مجھے انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا۔"

"کیا تم انٹر پاس ہو؟"

"ہاں۔ اس لیے تو مجھے یقین آگیا تھا۔ ویسے بھی فٹ ہوں پولیس کی نوکری کے لیے" وہ بولا "مگر میں چوہدری سے ملا تو وہ الٹا میرے گلے پڑگیا کہ مجھ پر الزام لگاتے ہو؟ میں نے رشوت لی ہے تم سے پچاس ہزار؟ دو ہفتے اس نے مجھے حوالات میں بند رکھا اور میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو جھوٹا الزام لگانے والے کے ساتھ کیا جاتا ہے پھر دو ہفتے میں بستر پر لیٹا رہا کیونکہ میں اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے لیے پیشاب اور پاخانہ بھی ایک اذیت تھی۔ وسیم نے الگ مجھے بے عزت کیا کہ تم کو بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

ایسے کون تھانے دار مانے گا؟ اب تمہارا کام کبھی نہیں ہوگا۔ پیسے بھی گئے لیکن مجھے معلوم ہے اچھی طرح کہ وسیم جھوٹ بول رہا تھا' اس نے وہ رقم عیاشی میں خود ہی اڑا دی تھی۔"

"تمہاری بہن پر خرچ کردی تھی" میں نے کہا "مالِ حرام کے بارے میں کیا کہا جاتا ہے۔ جیسے آتا ہے' ویسے ہی چلا جاتا ہے مگر تمہیں کیا نقصان ہوا۔ گھر کا پیسہ گھر میں ہی رہا۔ جیسے ایک جیب سے نکل کے دوسری جیب میں آجائے۔ بھائی کا پیسہ تھا' بہن کو مل گیا۔"

وہ بھڑک اٹھا "بار بار بہن کا نام لے کر مجھے بے غیرتی کے طعنے دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بھائی ضرور کہتی ہے مگر میری بہن نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے؟"

اس کی نظریں میرے پیچھے والی دیوار کو دیکھتی رہیں "میری ماں ہے وہ۔"

میں بھونچکا رہ گیا "ماں..... پھر بھائی کیوں کہتی ہے؟"

"یہی دستور ہے وہاں کا۔ بیٹی ہو تو آپا کہتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"برا مت ماننا۔ اس تکون کا تیسرا ضلع بھی ہوگا۔ ماں بیٹے کا رشتہ باپ کے بغیر تو نہیں بنتا۔"

"ہاں۔ بولو کیا نام بتاؤں میں؟ تمہیں معلوم ہے اپنے باپ کا نام؟"

میرا چہرہ گرم ہوگیا "ہاں۔ محمد عظیم تھا اس کا نام۔"

"تو سمجھ لو کہ میرے باپ کا بھی یہی نام تھا۔ محمد عظیم۔ کیا تم نے دیکھا ہے اپنے باپ کو؟"

"نہیں.... مگر مجھے معلوم ہے۔"

"کیسے معلوم ہے؟ اس لیے کہ یتیم خانے کے ریکارڈ میں یہ نام درج ہے۔ اس کی جگہ شیخ تسلیم ہوتا یا عظیم بیگ تب بھی تم یقین کرلیتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔"

"ہاں بھائی جی۔ مجھے کم سے کم یہ تو معلوم ہے کہ میری ماں کون ہے۔ تمہیں یہ بھی پتا نہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ ایک یتیم خانے اور طوائف کے کوٹھے میں بڑا فرق ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "آپ تو گری کھا گئے۔ مجھے بتاؤ کیا فرق ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ فرق یہاں ہے" اس نے اپنے سر کو انگلی سے بجایا۔ "میں اپنے آپ کو بڑا بے غیرت سمجھتا ہوں اور تم خود کو بڑا عزت دار۔ حالانکہ ہم دونوں کو حالات نے یا حادثات نے وہاں پہنچا دیا تھا۔ اس کا الٹ بھی ہوسکتا تھا۔ تم میری جگہ ہوتے اور میں تمہاری جگہ۔ اس میں تمہارا میرا کیا اختیار تھا۔ جہاں ہم پیدا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے' کیا اپنی مرضی سے ہوئے تھے۔ اور ذرا غور فرماؤ بھائی جی۔ اس وقت یہاں کون زیادہ معزز ہے۔ آگے پیچھے جتنے لوگ موجود ہیں وہ کیا جانتے ہیں اور کیسے جان سکتے ہیں کہ ہم میں سے کون حرامی ہے اور کون حلالی۔ نام کا لیبل تو ہم جب چاہیں بدل لیں۔"

"میرے پاس تمہاری فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے" میں کھڑا ہو گیا۔

"ایک منٹ بیٹھو یار۔ ایسی کیا ناراضی" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "چلو آئندہ ہم سچ نہیں بولیں گے۔ اچھی لگنے والی جھوٹی باتیں کریں گے۔ اپنا یار ہے دونوں کا رئیس۔ وہ بھی لاوارث ہے۔ ہم سب مل کے بیٹھیں گے اور اپنے ماضی کے بارے میں اچھی متاثر کرنے والی تاریخ بنالیں گے۔ پورا شجرۂ نسب ایسا ہوگا جس پر ہم فخر کریں... دادا پردادا تک۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "میرا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔"

"ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ تین ہوں تو ایک سو گیارہ۔" اس نے بڑی رئیسانہ شان سے سو کا ایک نوٹ میز پر رکھا اور ویٹر کو اشارہ کر کے چل پڑا۔

میں نے کہا "مگر تمہیں رئیس کہیں ملے..."

"ملے گا کیسے نہیں۔ آج ہی ملے گا۔ خود آئے گا میرے پاس" وہ بولا اور پھر میرے ساتھ چلنے لگا "تم ملنا چاہتے ہو ابھی اس..."

"ابھی" اس وقت وہ کہاں ملے گا؟"

"وہیں۔ جہاں وہ لوٹ کے گیا ہے۔ شاہ جی کے پاس۔ ڈر لگتا ہے تو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" وہ بولا "پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا "مگر شاہ جی نے پہچان لیا تمہیں؟"

"اس کا تو باپ بھی نہیں پہچان سکتا۔"

میں نے فوراً فیصلہ کر لیا "اچھا چلو۔"

جیرے نے ایک ٹیکسی روک لی اور ڈرائیور کے احتجاج کو نظرانداز کر دیا "چل پتر' شرافت سے ورنہ دو دن میں تیری گاڑی بھی ٹھیک ہو جائے گی اور دماغ بھی۔ تھانے میں بڑے اچھے مستری ہیں۔"

میں نے کہا "تم فکر مت کرو' کرایہ میں دوں گا تمہیں۔"

ڈرائیور نے یقین کیا یا نہیں مگر وہ روانہ ہو گیا۔ بیس منٹ بعد میں نے پھر وہ جگہ دیکھی جہاں بقول شاعر۔ کبھی یہیں مرے دل کافر نے بندگی۔ میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو کتنا ڈرا ہوا تھا۔ شاہدہ سے پہلی ملاقات کی برباد کا نقش میرے دل میں محفوظ تھا۔ وہ پہلی نظر کا عشق تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کیا نہیں جاتا' ہو جاتا ہے۔ اس پہلی ملاقات میں شاہدہ نے اپنے لطف و عنایات سے مجھے اتنا ہی مسحور کر لیا تھا جتنا اپنے حسن کی جادوگری سے۔ وہ ماحول' اس کا قرب اور اس کا التفات سب نے مل کے ایک طلسماتی فضا پیدا کر دی تھی جس نے مجھے جکڑ کے بے بس کر دیا تھا۔

آج میں بڑے فاتحانہ غرور کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ شاہ جی کی حیثیت میری نظر میں ایک شکست خوردہ سپہ سالار جیسی تھی جو اپنی طاقت کا گھمنڈ ہار چکا تھا۔ اپنی سپاہ کے ناقابل تسخیر ہونے کے یقین سے محروم ہو چکا تھا اور خود اپنی عزت نفس کا احساس بھی کھو چکا تھا۔ وقت کی بساط پر ایک پیادے نے شاہ کو مات دے دی تھی کیونکہ اس بے وقعت اور حقیر مُہرے کے پیچھے بڑے مہرے کھڑے تھے۔

مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ فقیر اپنے روزگار کے لیے نکل گئے تھے۔ مجھے شاہ جی کے ملنے کی امید بھی کم تھی مگر میرا خیال تھا کہ رئیس ضرور ملے گا۔ ابھی دو چار دن وہ پرانے معمول سے دور رہے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھے اس کے سب ٹھکانے معلوم ہیں اور میں اسے تلاش کرتا ہوا ہر جگہ پہنچ سکتا ہوں' سوائے اس جگہ کے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "او باؤ جی۔ آپ نے تو بولا تھا۔"

میں نے کہا "تھوڑی دیر انتظار کرو۔ ہم واپس جائیں گے۔"

جیرے نے گاڑی کی چابی نکال لی "بس آدھے گھنٹے میں واپس آتے ہیں ہم۔"

اب ٹیکسی ڈرائیور بے بس ہو گیا تھا اور انتظار کرنے پر مجبور تھا ورنہ شاید وہ میرے وعدے کو بھول کر اور کرائے پر لعنت بھیج کے رفو چکر ہو جاتا۔

شاہ جی کی گاڑی موجود تھی۔ میں نے نیچے والے ہال میں جھانک کے دیکھا۔ وہاں تاریکی تھی اور ویرانی۔ مجھے اس پوری عمارت کے وجود سے لپٹی ہوئی خاموشی اور ویرانی میں عجیب سی نحوست کا احساس ہوا۔ معلوم نہیں شاہدہ ایسے پُر آسیب اور پُر دہشت ماحول میں کیسے جیتی تھی اور میں نے یہاں اتنے دن کیسے گزار دیے تھے۔ وہ جگہ مجھے کسی اجڑے ہوئے قید خانے یا خرکاروں کے اڈے کی طرح لگی جہاں زندگی کے سب آثار موت کی بھیانک تاریکی میں کھو گئے ہوں۔

جیرے کی دستک پر شاہ جی نے دروازہ کھولا اور کچھ دیر ہمیں خالی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے جیرا ہی نہیں' میں بھی اس کے لیے ایک اجنبی ہوں۔ اس کا چہرہ بیمار لگتا تھا۔ آنکھوں کی بوجھل سرخی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پیے ہوئے ہے۔ اس کے بال پریشان تھے اور اس نے صرف ایک نیکر بنیان پہن رکھی تھی۔ کوئی سوال کیے بغیر اس نے ہمیں راستہ دے دیا۔

"کیا بات ہے؟ اب کیا لینے آیا ہے تو یہاں؟" اس نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

میں نے کہا "میں رئیس سے ملنے آیا تھا' کہاں ہے وہ؟"

اس نے خالی بوتل کو اوپر اٹھا کے دیکھا اور پھر مایوس ہو کے رکھ دیا "رئیس کا یہاں کیا کام۔"

میں نے کہا "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ واپس جا رہا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ابھی تک تو نہیں آیا۔ آیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ گلا گھونٹ دوں گا اس کا اور اس کی لاش تیرے حوالے کر دوں گا۔ وہی ہے ساری خرابی کا ذمے دار۔ تجھے وہی لایا تھا یہاں اور تو نے مجھے برباد کر دیا۔ سب کچھ چھین لیا مجھ سے۔ میری شاہدہ کو لے گیا' حرامی کی اولاد۔"

میں نے کہا "میں چاہتا تھا کہ اب تم وہ ساری باتیں بھول جاؤ۔"

"بھول جاؤں؟ اتنی جلدی بھول جاؤں؟" اس نے کہا "ہمت تھی تو اکیلا آتا مجھ سے یہ بات کہنے کے لیے مگر میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ اپنے کسی دشمن کو نہیں چھوڑا میں نے۔ چاہے بعد میں مجھے پھانسی ہو جائے۔"

میں نے کہا "شاہ جی۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تمہاری شاہدہ سے شادی کروں گا' عزت کی زندگی دوں گا اسے۔"

وہ چیخنے لگا "عزت کی زندگی۔ تیرے پاس ہے عزت جو تو دے گا اسے؟ اور شادی کرے گا تو شاہدہ سے؟" اس نے ایک قہقہہ مارا۔ "وہ تجھ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں اسے تجھ سے زیادہ۔ تیری اوقات کیا ہے۔ حیثیت کیا ہے تیری۔ لاوارث کتے' جس کی نہ ماں کا پتا نہ باپ کا۔"

میں نے جیرے سے کہا "چل یار۔ یہ نشے میں ہے۔ پاگل ہو رہا ہے۔"

شاہ جی مجھے گالیاں دینے لگا "پتا چل جائے گا تجھے بھی حرام کے پلّے۔ ایک دن شاہدہ لات مار کے نکالے گی تجھے اور تو چیاؤں چیاؤں کرتا دوڑے گا۔ کسی بس ٹرک کے نیچے آکے کچلا جائے گا۔ شادی کرے گا شاہدہ سے۔ تیری ماں نے بھی شادی کی تھی؟"

ذہنی صدمے نے شاہ جی کو اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا اور وہ اپنی ذلت آمیز شکست کا غم بھلانے کے لیے ہوش و حواس کو شراب میں ڈبو رہا تھا مگر اپنا دکھ دبانے اور اس کی اذیت کو چھپانے میں ناکام تھا۔ قانونی طور پر وہ بازی ہار گیا تھا مگر ذہنی طور پر ابھی تک اس نے ہار کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے' جیتنا واقعی مشکل ہوتا ہے مگر ہارنا اس سے کہیں زیادہ مشکل۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ معاملات اس حد تک بڑھ جائیں گے کہ اس کے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

ٹیکسی والا سخت غم زدہ بونٹ کا سہارا لیے گھاس کا ایک تنکا چبا رہا تھا۔ اگر جیرا چابی نہ لے جاتا تو وہ یقیناً فرار ہو جاتا۔ پولیس والوں کا کیا اعتبار۔ سارا دن ساتھ لیے پھریں اور شام کو کرائے کی جگہ صرف تڑی دے کر رخصت کریں کہ چل پھٹ نہیں تو بیوی بچے رات بھر انتظار کرتے رہیں گے۔

جیرے نے کہا "یہ پکڑ چابی اور ہمیں گھر چھوڑ کے جا۔"

میں نے اسے تسلی دی "ہم وعدے کے پکے ہیں۔ آدھا گھنٹا

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اُس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت : ۱۷۵ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار، لاہور۔
فون : ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ : علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا تھا۔ اس سے پہلے ہی آگئے۔ کرایہ بھی پورا دیں گے۔"

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد جیرے نے کہا "یار' رئیس آخر کہاں گیا؟"

میں نے کہا "شاہ جی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ رئیس اِدھر نہیں آیا۔ شاید اسے ڈر ہو گا کہ میں یہاں پہنچ کے اسے زبردستی واپس نہ لے جاؤں۔ کیا پتا وہ تمہاری طرف گیا ہو؟"

"فکر مت کرو رئیس کی۔ میں تلاش کروں گا اسے اور سمجھاؤں گا کہ ہم سے شاہ جی نے کیا کہا تھا لگتا مجھے بھی یہی ہے کہ رئیس لوٹ کر گیا تو شاہ جی اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ خیر اب وہ ہماری بھی ذمّے داری ہے بھائی جی اور یار' ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اپنی چنڈال چوکڑی ہے پوری۔ ایک بیٹھک بھی ہے ہماری جہاں وہ سب جمع ہوتے ہیں۔ بڑی رونق لگی رہتی ہے۔ تم بھی دیکھو کسی دن آ کے۔"

میں نے کہا "کتنے لوگ ہیں اس چنڈال چوکڑی میں؟"

"بڑے نامی گرامی بندے ہیں بھائی جی۔ ایسے ایسے فنکار کہ بندے کی آنکھ سے سرمہ غائب کر دیں یا سالم بندہ ہی غائب۔ اس وقت بھی ایک دو تو پڑے ہوں گے وہاں مگر اصل رونق رات کو نظر آئے گی۔ رئیس کو ملا کے آٹھ ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔

"کہاں ہے تمہاری یہ بیٹھک؟" میں نے کہا۔

"اِدھر' پرانی انارکلی میں۔ سامنے تو دکان ہے فائیو اسٹار ڈرائی کلینرز۔ یہ اپنے یار سراج دھوبی کی ہے۔ ہم سب کو وہی کپڑے فراہم کرتا ہے بھائی جی۔ اتنے گاہک ہیں' کبھی کسی کی پتلون غائب کر دیتا ہے کبھی کسی کی قمیص۔ سال چھ مہینے میں ایک کپڑا گم جائے تو بندہ تھوڑا بہت بول کے چپ ہو جاتا ہے۔ وہ بھی سن لیتا ہے ہر بات۔ اس کے علاوہ بھی جس کو جیسے کپڑوں کی ضرورت ہو' مل جاتے ہیں۔ تمہیں بھی ضرورت ہو تو بے فکر بتانا بھائی جی۔ دکان کے پیچھے اس کا گھر ہے۔ دو ہی کمرے ہیں مگر ایک چھوٹا ہے۔ اس میں وہ سوتا ہے' بڑے کمرے میں بیٹھک ہے۔"

"اور وہ فنکار کون ہیں جو وہاں آتے ہیں؟"

"ایسے بتانے سے کیا فائدہ۔ ملو گے تو جی خوش ہو جائے گا مگر اچھا ہے تعارف پہلے ہی ہو جائے۔ ایک بناتا ہے پٹاخے اور شب برات کے بم مگر بڑے بم بھی بنا سکتا ہے۔ لوہے کے پائپ بم سے اس نے ایک فٹ موٹی دیوار گرا دی تھی۔ اس دیوار کے پیچھے تجوری تھی۔ اس کا وزن ہو گا آٹھ من۔ گوجرانوالے کے مشہور جنگلی پہلوان کا پٹھا ہے' شاہ نواز عرف شانو پہلوان۔ وہ اور جانی جن اسے اٹھا کے لے گئے۔ اِدھر بیٹھک میں لا کے تالے کو کھولا گل خان پشاوری نے۔ دنیا کا ہر تالا وہ جادو سے کھول لیتا ہے۔ جادو ہے اس کے ہاتھوں میں۔ ایک اور فنکار ہے محبوب عرف بولی۔ کبھی ضرورت پڑے گاڑی کے ٹیپ کی یا اے سی کی تو اسے بتانا' پہلے پسند کر لینا پھر اسے کہنا۔ وہ اگلے دن لا دے گا۔ بولی تیر کمان استعمال کرتا ہے اور شرط لگا کے اُڑتی چڑیا کا نشانہ لیتا ہے۔ کبھی اس کے بنائے ہوئے تیر کمان دیکھو تو حیران رہ جاؤ گے۔ چھوٹے تیر کمان ہیں جو وہ جیب میں ڈال کے پھرتا ہے۔ فولڈنگ ٹائپ۔ چالیس قدم سے نشانہ لے تو دل میں اتر جائے مگر مرنے والے کو بھی پتا نہ چلے کہ آخر ہوا کیا تھا۔ چلتی گاڑی کا ٹائر پھاڑ دے۔ گولی کی آواز ہوتی ہے۔ تیر خاموشی سے کام کرتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کتنے قتل کر چکا ہے وہ؟"

"قتل؟ توبہ بھائی جی! اس کا گزارہ تو ایسی چیزوں پر ہے جیسی میں نے بتائیں۔ گاڑیوں کے ٹیپ اور ریڈیو۔ اے سی وغیرہ۔ جانی جن کو دیکھو رات کے وقت تو ڈر جاؤ۔ سات فٹ سے کچھ کم ہے۔ کالا سیاہ اور وزن ساڑھے تین سو پاؤنڈ۔ کھڑکی کی سلاخوں کو ہاتھ سے الگ کر دیتا ہے۔ گاڑی کے سامنے کھڑا ہو جائے تو سمجھو دیوار آگئی راستے میں۔ گاڑی کے پہیے گھومتے رہیں گے' گاڑی ایک انچ آگے نہیں بڑھے گی۔ مکا مار کے بیل کی گردن توڑ دی تھی اس نے لیکن بیل نے پہلے ٹکر مار کے اسے مشتعل کیا تھا۔ چاچا پتنگ باز ہے جو دنیا گھوم چکا ہے اور ہر کام کر چکا ہے دنیا میں۔"

"تمہارا مطلب ہے ہر بُرا کام؟"

وہ ہنسنے لگا "کام سب کرنے پڑتے ہیں بندے کو۔ اچھے بُرے وقت کی بات ہے۔ جعلی نوٹ تک چھاپ چکا ہے۔ دستاویزات بنانے کا ماہر ہے۔ چھپکلی کی طرح سیدھی دیوار پر چڑھ جاتا ہے۔ تین بار جیل گیا' دو بار باہر اور ایک بار پاکستان میں۔ وہ ہم سب کا چاچا ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ تم سب جرائم پیشہ لوگ ہو۔ ایک گروہ بنا لیا ہے تم نے۔ ظاہر ہے رئیس تم جیسے لوگوں کی صحبت میں ہی خوش رہ سکتا ہے۔ میرے ساتھ شرافت کی زندگی اسے راس نہیں آسکتی تھی۔"

وہ پھر ہنسنے لگا "کون سی شرافت کی بات کرتے ہو تم بھائی جی۔ سب معلوم ہے ہمیں' تمہارے کارنامے سنا چکا ہے رئیس ہمیں۔"

"دو ملاقاتوں میں اس نے تمہیں سب بتا دیا؟"

"دو ملاقاتیں..... بھائی جی آپ کو وہاں کون لایا تھا..... رئیس پرانا جاننے والا ہے اپنا۔ دو بار تو ابھی ملا ہے وہ جب آپ کے ساتھ تھا۔"

وہ بہت آہستہ بات کر رہا تھا اور باہر ٹریفک کا شور بھی بہت تھا۔ ڈرائیور کی ساری توجہ گاڑی چلانے پر تھی چنانچہ اس کے لیے ہماری باتیں سننا محال تھا۔ جب اس نے گاڑی روکی تو جیرا بھی ساتھ ہی اتر آیا۔

"تو یہ ہے تمہارا ڈیرا" اس نے دلچسپی سے کہا "اب آئے ہیں تو چائے پی کر ہی جائیں گے اور تمہاری ماسی ہیر سے بھی ملیں گے۔"

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو سو کا نوٹ دے دیا۔ اس نے کسی

خوشی کا اظہار نہیں کیا حالانکہ میرے حساب سے یہ بالکل مناسب اُجرت تھی۔ شاید زیادہ ہی تھی۔

"دیکھا تم نے' یہ شرافت کا نمونہ۔ اس نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ اچھا ہوتا اگر میں اس سے کاغذات مانگ لیتا اور وہ الٹے سو روپے دے کر جاتا۔" جیرے نے افسوس سے سر ہلایا "یہی ہے نا وہ مکان جو تمہارے یار ناصر کا تھا۔ وسیم نے قبضہ کر لیا تھا اور پھر بیچ دیا تھا کسی کو۔"

میں نے کہا "جب ہر بات رئیس بتا چکا ہے تمہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔"

ماسی ہیر نے دروازہ کھولا اور وردی والے تھانے دار کو دیکھتے ہی حواس باختہ ہو گئی "ہائے میں مر گئی۔ خیر تو ہے ناصر۔ پولیس نے کیوں پکڑ لیا تجھے؟"

میں نے کہا "ماسی۔ یہ اپنا جاننے والا ہے' محمد نذیر۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سکون کا سانس لیا "میں تو ڈر گئی تھی۔"

جیرا بلیڈ تھوڑی دیر بعد رخصت ہو گیا۔ وہ ذہین آدمی تھا مگر اپنی ذہانت کا غلط استعمال کر رہا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے یاروں نے پوری کر دی تھی۔ وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے اور جس راستے پر وہ چل رہے تھے' وہ منظم گروہ بنا کے بڑے جرائم کرنے کی منزل کا پتا دیتا تھا۔ اس گروہ کے مستقبل کو کسی طرح بھی تابناک نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ان کا انجام جیل خانوں میں قید بامشقت کاٹنے یا پھانسی کے تختے پر ہوتا تھا مگر انہیں اس راہ پر چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ سب ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں نظریاتی دلیل دی جاتی ہے کہ احساسِ محرومی کے باعث وہ انتقامی ردِعمل کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر سب سے انتقام لیتے ہیں۔ اپنے آپ سے' معاشرے سے' ملک اور قوم سے۔ شرافت اور انسانیت سے اور اخلاقی قدروں سے۔ وہ باغی سمجھے جاتے ہیں اور اپنی بے راہ روی کا ایک جواز بھی رکھتے ہیں۔

معاشی اور معاشرتی ظلم' جبر اور ناانصافی نے نوجوانوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ فرسٹریشن کا شکار ہیں اور مایوسی کی انتہا نے ان کی سوچ میں بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ وہ کوئی مثبت اور تعمیری انقلاب لانا چاہتے ہیں مگر وہ منتشر ہیں۔ ان کی قوت منظم نہیں ہے اور انقلاب سے ڈرنے والے ان کو منتشر دیکھنا چاہتے ہیں۔

جیرا بلیڈ اس کی ایک مثال تھا۔ اس کی باتوں میں رئیس نے بڑی کشش محسوس کی ہو گی اور اسے اپنے جیسے بے فکرے' مستقبل کے اندیشوں سے آزاد' ایڈونچر پسند اور سنسنی خیز تجربات کی زندگی گزارنے والے نوجوانوں کی صحبت اچھی لگی ہو گی۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ وہ لوٹ کر شاہ جی کے ڈیرے پر جا رہا ہے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ جیرا بلیڈ اس کی تلاش میں نکلا اور مجھے مل گیا۔ مجھے سچ کا پتا چل گیا مگر اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ واپس اپنی پرانی زندگی کی طرف نہ جائے۔ زندگی اس کی اپنی تھی اور وہ اسے اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے آزاد تھا۔ اس کے اور میرے راستے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی الگ ہونا تھے۔

شام تک میرا ذہن انتشار کا شکار رہا۔ شاہدہ نے مجھے اپنی قسم دے کر پابند کر دیا تھا کہ میں اپنی ساری توجہ امتحان کی تیاری کے لیے وقف کر دوں مگر میں کتاب لے کر بیٹھتا تھا تو میری نظروں کے سامنے اس کا چہرہ آجاتا تھا پھر میں رئیس کے بارے میں سوچنے لگتا تھا یا شاہ جی کے بارے میں۔ اس کی باتوں نے میرے خیالوں میں کڑواہٹ گھول دی تھی۔ بے شک وہ نشے میں تھا مگر کوئی دشمن سرِبازار کسی کے منہ پر تھوک دے تو ذلت کا احساس اس خیال سے کم نہیں ہوتا کہ وہ ہوش میں نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ جذبات کی شوریدہ سری کم ہوتی گئی اور میں شام تک کچھ پُرسکون ہو گیا۔ میں نے اپنے خیالات کے بیل بے عنان کو روکنے کے لیے خود اپنے آپ کو قائل کیا۔ میرے لیے اس وقت اپنے مستقبل کے سوا کسی اور بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جب میں نے ماسی ہیر کو بتایا کہ دو دن بعد میرا امتحان شروع ہونے والا ہے تو اس نے مجھے خوب لتاڑا۔ "لے آج بتا رہا ہے مجھے یہ بات۔ پاگل نہ ہو تو۔ ایسے رہتا ہے کوئی امتحان۔ تجھے تو بہت پہلے سب کچھ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ دیوانہ ہو رہا ہے اس لڑکی کے پیچھے' اسے کوئی خیال نہیں تیرا۔"

میں نے کہا "ماسی آج اسی نے قسم دی ہے....."

"آج دی ہے قسم جب ایک دن بیچ میں رہ گیا ہے۔ وہ ایک مہینہ پہلے نہیں کہہ سکتی تھی یہ بات؟" اس نے میری بات کاٹ دی "اور وہ خبیث تیرا دوست رئیس' اچھی دوستی نبھائی اس نے۔ کسی کو خیال ہوتا تیرا تو تجھے کر دیتے میرے حوالے کہ ماسی ہیر' سنبھال کے رکھ اسے گھر میں۔ امتحان سے پہلے یہ کہیں نہ جائے' خیال رکھنا۔ جائے تو ٹانگیں توڑ دینا اس کی۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم دیکھنا' میں پاس ہو جاؤں گا۔"

"کیسے؟ نقل کر کے یا جادو سے۔ میں کہتی ہوں چل بیٹھ جا کتاب لے کر اور خبردار جو اپنی جگہ سے اٹھا۔ جو چاہیے مجھے بتا۔ میں نے تو سونے نہیں دینا ہے تجھے آدھی رات سے پہلے اور صبح اٹھاؤں گی فجر کی اذان کے ساتھ۔ کوئی آئے تو سہی تجھ سے ملنے۔ جوتی مار کے بھگا دوں گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماسی ہیر نے ایک سخت نگراں کے فرائض پورے کیے اور میرا اسی طرح خیال رکھا جیسے بچوں کے تابناک مستقبل کے خواب دیکھنے والی سب مائیں رکھتی ہیں۔ وہ رات بارہ بجے تک جاگتی رہی۔ اس نے دو بار مجھے چائے بنا کے دی اور ٹھیک بارہ بجے لائٹ آف کر دی۔ "چل اب سو جا" آنکھیں بند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر کے۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر۔ تمہارا رانجھا کیا آنکھیں کھلی رکھتا ہے سوتے وقت؟"

"وہ تو آتا ہے دن بھر کا تھکا ہارا۔ تیرا پتا ہے مجھے' تو لیٹے گا تو کس کے بارے میں سوچے گا۔"

"اسے تو خواب میں بھی نہیں دیکھوں گا میں۔ اس نے قسم دی ہے تو وہ خود بھی نہیں آئے گی خواب میں" میں نے ہنس کے کہا۔

ہیر نے مجھے صبح ٹھیک چھ بجے جگا دیا۔ اس کے شفقت آمیز سخت رویے نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اگلے دن میں نے پہلا پرچہ دیا جو خلافِ توقع اچھا ہو گیا۔ واپسی پر ماسی ہیر نے مجھے دودھ میں بادام گھوٹ کر پلائے اور میرے ہاتھ پر ایک تعویذ باندھا جو وہ میری پکی کامیابی کے لیے منت مان کے لائی تھی۔ اس سے وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا "اب میں ضرور پاس ہو جاؤں گا مگر منت کیا مانی ہے تم نے؟"

"چادر چڑھاؤں گی اور کالا بکرا صدقہ دوں گی۔ اودھر دعا بھی مانگی تھی میں نے کہ تیرے اچھے نمبر آئیں۔"

میں نے کہا "پھر مجھے محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری دعائیں ہی کافی ہیں ماسی ہیر۔ میں جاتا ہوں فلم دیکھنے۔"

"چل بکواس بند کر۔ ٹانگیں توڑ دوں گی اگر باہر قدم نکالا۔ بیٹھ جا پڑھنے کے لیے۔" اس نے حکم دیا۔

تین پرچے اچھے ہو گئے پھر ایک دن کا وقفہ آ گیا۔ اگلے دن جمعے کی چھٹی تھی۔ میں نے اچانک خود کو شادو کی ایک جھلک دیکھنے کی خواہش کے سامنے بے بس پایا۔ میں نے خود کو اس کی قسم یاد دلائی۔ یہ سمجھایا کہ وہ مجھ سے نہیں ملے گی تو اس سے ملنے کی کوشش کرنا ہی لاحاصل ہو گا۔ وہ خفا ہو جائے گی کہ میں نے اس کی قسم توڑ دی۔ وہ میری مجبوری کے کسی عذر کو قبول نہیں کرے گی اور مجھ سے ملنے سے انکار کر دے گی۔ ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے چوکیدار کے سامنے مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے گی اور ناکام واپس آتے ہوئے سخت خفت کا سامنا ہو گا۔

لیکن عقل کی زنجیر میرے قدم نہ روک سکی۔ میں ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار نے باہر ہی مجھے روک دیا "اندر کدھر جاتا ہے ناصر صاب' وکیل صاب تو گھر میں نئیں اے۔"

میں نے کہا "مجھے شادو...... شاہدہ پروین سے ملنا ہے۔ وکیل صاحب سے نہیں۔"

"شاہدہ بیگم صاب بھی نئیں اے۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

"وہ کہاں گئی ہے' کب تک آئے گی؟"

"شام کو آئے گا وکیل صاب کے ساتھ۔ آفس گیا ہے۔"

میں نے کہا "آفس؟ کون سے آفس؟ کیا اس نے کہیں ملازمت شروع کر دی ہے۔"

چوکیدار نے مجھے دیکھ کے افسوس سے سر ہلایا "وہ اپنا وکیل صاب کا ساتھ جاتا ہے کورٹ۔ کورٹ سے اس کا آفس۔ ہم کو بولا ہے کہ آپ آئے تو بتا دے۔ وہ آفس میں تمہیں ملے گا' ادھر مت جانا۔"

میں نے سخت ذلت محسوس کی "اگر میں آفس جا کے اس سے ملنا چاہوں تو تم روک سکتے ہو مجھے۔"

"ہم تو نئیں روک سکتا۔ ادھر دوسرا گارڈ ہے۔ وہ روک سکتا ہے" چوکیدار نے پیلے نسوار زدہ دانتوں کی نمائش کی۔

واپسی پر مجھے جتنا غصہ شادو پر آیا اس سے زیادہ اپنے آپ پر آیا۔ جب معلوم تھا کہ ملاقات کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تو مجھے کیا ضرورت تھی ایک معمولی چوکیدار کے ہاتھوں ذلت اٹھانے کی اور شادو...... الو کی پٹھی' اس نے اچھا نہیں کیا چوکیدار کو یہ سمجھا کے مگر اسے بھی پتا ہو گا کہ میں باز آنے والا نہیں ہوں۔ میرا اس کے سوا علاج کوئی نہیں تھا کہ مجھے دھتکار دیا جائے تاکہ آئندہ میں ایسی حماقت کرنے کا سوچوں بھی نہیں۔ وہ خود بھی اسی لیے صبح ہاشمی صاحب کے ساتھ کورٹ چلی جاتی ہو گی اور وہاں سے ان کے آفس کہ وہ گھر پر رہے گی تو میں زبردستی اندر گھس جاؤں گا' چوکیدار سے جھگڑا کروں گا۔

میں نے بڑی بے عزتی محسوس کی تھی لہٰذا واپسی کا ہر قدم مجھے ہزیمت کی چٹیانی' کوفت اور جھنجلاہٹ کی بے بسی میں جلا کر رہا تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ میں ہاشمی صاحب کے آفس جا کے شادو سے ملوں۔ اس کے بغیر ہراست کا یہ آزار کم نہیں ہو سکتا تھا مگر ایک طمانچہ کھا کے میری عقل ٹھکانے آ گئی تھی اور میں دوسرا طمانچہ کھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔

یہاں دیکھنے والا اور سننے والا کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک چوکیدار تھا جس نے شاید اپنی اتھارٹی کے کامیاب مظاہرے اور میری ناکامی کے تماشے میں خوشی محسوس کی ہو۔ میں بزعم خود معزز تھا اور اپنا شمار مالک کے ہم رتبہ لوگوں میں کرتا تھا۔ چوکیدار کی حیثیت بہرحال ایک معمولی ملازم کی تھی مگر اس نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ مجھے اس گھر میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت اور اختیار حاصل نہیں ہے۔ مالک تو مالک ہی ہوتے ہیں مگر ان کے کچھ عزیز اور دوست اتنے اہم ہوتے ہیں کہ انہیں مالک کے برابر سمجھنا پڑتا ہے۔ اتنی ہی عزت دینی پڑتی ہے اور ان کے لیے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رکھنے پڑتے ہیں ورنہ نوکری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میں ایسے سب لوگوں سے کم تر تھا۔ باہر کا آدمی تھا اور غیر متعلقہ شخص تھا جو زبردستی کرے تو اسے TRESPASS کرنے والوں میں شمار کرتے ہوئے حوالۂ پولیس بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگر میں آفس جا کے بھی شادو سے نہ مل پاتا تو میری پسپائی اور

رسوائی کا تماشا دیکھنے والے بہت ہوتے۔ وہ ایک نامور وکیل کا دفتر تھا۔ پرچون کی دکان نہیں تھی جہاں کوئی بھی منہ اٹھا کے داخل ہو جائے۔ وہاں گارڈ سے جھگڑا مجھے مہنگا پڑتا۔ شاید ہاشمی صاحب کو اور شادو کو پتا بھی نہ چلتا اور مجھے باہر ہی باہر سے پولیس ہنگامہ آرائی کے جرم میں اپنے ساتھ لے جاتی پھر شادو بڑی شان دکھاتی ہوئی ہاشمی صاحب کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کے ان کے ساتھ تھانے آ کے مجھے حوالات سے چھڑاتی اور ظاہر ہے اس کے بعد جھگڑا ہوتا۔ میں نے تم کو منع کیا تھا۔ اپنی قسم دی تھی۔ یہی ہے تمہاری محبت؟ خود بھی ذلیل ہوتے ہو مجھے بھی رسوا کرتے ہو۔

میں پیدل چلتا گیا اور سوچ سوچ کے اندر ہی اندر غصے سے کھولتا رہا۔ کچھ دیر بعد میرا غصہ اتر گیا تو میرے جذبات کا رخ مخالف سمت میں ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ شادو اپنی محبت میں مخلص نہ ہوتی تو اسے میرے مستقبل کی اتنی فکر نہ ہوتی۔ امتحان میرے لیے اہم تھا' اس کے لیے نہیں۔ اس نے اپنی قسم بڑے مان کے ساتھ دی تھی۔ اس کا مان توڑنا محبت کی تذلیل ہے۔ مجھے اپنے رویے سے بھی ثابت کرنا چاہیے کہ میرا عشق محض جذبات کی آتش نشانی نہیں ہے' عقل کی رضا بھی ہے۔

ایک جگہ میں سڑک پار کرنے کے لیے رکا تو دائیں جانب سے آنے والی ٹریفک میں مجھے ایک پرانی جیپ نظر آئی۔ ملٹری ماڈل کی اس جیپ کو اختراع اور آرائش کے اسباب سے سب کے لیے قابلِ توجہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں موٹے موٹے پائپ لگائے گئے تھے۔ ان کے اوپر اضافی لائٹس تھیں۔ دو لائٹس زرد نارنجی تھیں جو FOG لائٹس کہلاتی ہیں جن کی چندھیا دینے والی روشنی کا لاہور کی سڑکوں پر استعمال بے جواز تھا۔ اس میں ایک تانگے کا بگل جیسا ہارن تھا اور ایک سمع خراش پریشر ہارن۔ جیپ کا رنگ سرخ تھا اور اس کے پہیوں کا نارنجی۔ فولادی پائپ گولڈن تھے اور اس کی باڈی پر ہر قسم کے اسٹیکر چسپاں تھے۔ ایک اسٹیکر کسی تقریباً عریاں امریکن ماڈل کا تھا جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ میں تمہاری ہوں۔ دوسری طرف خطرے کے نشان ایک کھوپڑی اور دو ہڈیوں والا اسٹیکر تھا۔

اس قسم کی جیپ سواری سے زیادہ تفریح اور تفریح سے زیادہ اپنے شہدے پن کا اشتہار دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اوباش نوجوان اس جیپ کو طوفانی رفتار سے دوڑاتے ہیں اور نئی خوب صورت اور نازک کاروں کے محتاط مالکوں کو کھلا چیلنج دیتے پھرتے ہیں کہ جس میں ہمت ہو' سامنے آئے اور گاڑی ٹکرا کے دیکھ لے۔

اس جیپ میں بھی چھ سات نوجوان سوار تھے۔ کچھ پائپ کے سہارے کھڑے تھے تو کچھ سیٹوں پر پاؤں رکھے بیٹھے تھے۔ وہ اونچی آواز میں ڈیک بجا رہے تھے اور سگریٹیں پھونکتے ہوئے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ میری نظر نے سب سے پہلے جانی جن کو دیکھا۔ وہ جیرے بلیڈ کے بتائے ہوئے حلیے کی زندہ تصویر تھا۔ سیاہ فام اور دیو ہیکل جانی جن کے ہاتھوں میں جیپ کا اسٹیئرنگ وہیل بہت چھوٹا لگتا تھا۔ جیرا بلیڈ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ باقی لوگوں سے میں زبانی متعارف ہوا تھا۔ صورت سے میں نے صرف رئیس کو پہچانا جو پیچھے پائپ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس نے پیلے رنگ کی بشرٹ پہن رکھی تھی اور الٹی کیپ لگا رکھی تھی۔ وہ مٹھی میں دبا کے سوٹے لینے کے انداز میں سگریٹ پی رہا تھا اور بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

رات کا وقت ہوتا تو مجھے کسی کا چہرہ ہی نظر نہ آتا۔ جیپ کے گزر جانے کے بعد بھی میں ادھر ہی دیکھتا رہا جدھر ساری ٹریفک جا رہی تھی۔ مجھے رئیس کو خوش دیکھ کے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیرے بلیڈ اور ببلی جیسے لوگوں کی چنڈال چوکڑی میں شامل ہو کے بدمعاشی کے راستے پر چل پڑا تھا۔ اس کے اور میرے راستے جدا ہو گئے تھے لیکن ہمارے ایک دوسرے کے لیے دوستی کے جذبات شاید وہی تھے۔ اس دوستی میں واحد قدرِ مشترک ہمارا خلوص تھا۔ آنے والے وقت نے ایسا ہی ثابت کیا ورنہ ہم ایک دوسرے کی ضد تھے۔ متضاد سوچ رکھتے تھے اور مخالف سمت میں جانے والے راستوں پر چلتے تھے لیکن پھر بھی دوست تھے۔

آخری پرچہ دینے تک میں نے شادو کے عشق میں بے اختیاری کے ایک تجربے کی ذلت کو فراموش کر دیا تھا اور صرف اس کی دی ہوئی قسم کو یاد رکھا تھا۔ امتحان دینے کے بعد مجھے دہری طمانیت کی خوشی حاصل ہوئی۔ ایک یہ کہ میرے پرچے خاصے اچھے ہو گئے تھے۔ میں اے گریڈ کی امید نہیں رکھتا تھا تو فیل ہو جانے کے خوف میں بھی مبتلا نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ میں شادو کی دی ہوئی قسم پوری کرنے کے بعد اس سے ملنے کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ میں یقین اور اعتماد کے ساتھ اس کے سامنے جا سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جس دن میرا آخری پرچہ ہو گا' اس دن وہ میرا انتظار کرے گی۔ مجھے اپنے گھر کے دروازے پر منتظر ملے گی۔

میں شوق' اضطراب اور فرطِ جذبات سے چھلکتا دل لیے امتحانی مرکز سے سیدھا ہاشمی صاحب کے گھر گیا۔ بارہ بجے میں نے امتحانی کاپی ممتحن کے حوالے کی تھی اور بارہ بج کر پچیس منٹ پر میں ٹیکسی سے اتر کے کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔

اس بھاری بھرکم اور دس فٹ چوڑے فولادی گیٹ کو میں نے پہلے کبھی مقفل نہیں دیکھا تھا۔ آج اس میں تالا دیکھ کے مجھے یوں لگا جیسے غلطی سے میں کسی اور دروازے پر آ گیا ہوں لیکن دروازہ وہی تھا۔ میں نے کال بیل بجائی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ بڑا گیٹ باہر سے مقفل ہو۔ چھوٹا گیٹ اندر سے کھول کے شادو اچانک میرے سامنے آ جائے۔ مجھے غیر متوقع شاک دینے کے بعد ایک خوش گوار پُر مسرت SURPRISE...... دید کی ساعتِ نایاب۔

دروازہ بند ہی رہا تو اندر سے اٹھنے والے خوف کے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنبولے نے آہستہ سے کروٹ لی۔ نہیں، وہ مجھے تنگ کر رہی ہے۔ میری بے قراری میں دیوانگی کی حد آزمانا چاہتی ہے۔ وہ میرے جذبات کے آتش شوق کو بھڑکا رہی ہے۔ میں نے پھر گھنٹی بجائی۔ اندر کہیں سے میں نے سریلے گھنٹوں کی بازگشت سنی۔ کال بیل خراب نہیں تھی۔ اس کے باوجود اندر سے کسی نے انٹر کام پر بھی بات نہیں کی۔

میں نے ہاتھوں کے زور پر خود کو اوپر کھینچا اور گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بھاری بھرکم ملازمہ قسم کی عورت گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ گیٹ کے اوپر میرا سر دیکھ کر وہ رک گئی۔

"اے۔ کیا بات ہے؟"

"باہر آ" میں نے فرش پر قدم رکھ کے گیٹ بجایا۔ اس عورت کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زیادہ حیرانی مجھے اندر کا منظر دیکھ کے ہوئی تھی۔ ہاشمی صاحب کی گاڑی اس وقت پورچ میں موجود نہیں ہوتی تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے کورٹ چلے جاتے تھے مگر ان کی گاڑی پورچ میں ڈھکی کھڑی تھی۔ اس پر نیلے رنگ کا پیراشوٹ کے کپڑے کا بنا ہوا کور پھیلا دیا گیا تھا۔

عورت نے گیٹ کھولے بغیر پوچھا "کس سے ملنا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

"ہم۔۔۔ چوکیدار کی گھر والی ہیں اور کون۔۔"

میں نے کہا "چوکیدار خود کہاں ہے؟"

"وہ سو رہا ہے۔ تم بتاؤ کیا کام ہے۔ ہم اسے جگا دیں گے۔"

میں نے کہا "مجھے ہاشمی صاحب سے ملنا ہے۔"

"وہ تو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ وہ کورٹ میں ہوں گے مگر میں شادو۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہدہ پروین سے ملنے آیا ہوں۔ میرا نام ناصر عظیم ہے۔"

"دیکھو جی، ہم تمہیں نہیں جانتے۔ وکیل صاحب شہر سے باہر گئے ہیں اور ان کی بیگم صاحب بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔"

"باہر کہاں گئے ہیں۔۔۔ اور کب۔۔۔ واپس کب آئیں گے؟"

میرے صبر و ضبط کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا تھا۔

"ابھی ہم اپنے گھر والے کو بھیج دیتے ہیں۔ اس سے سوال جواب کریں آپ" اس نے ناگواری سے کہا اور واپس چلی گئی۔

چوکیدار پانچ منٹ بعد آنکھیں ملتا باہر آیا تو میرے لیے اجنبی تھا لیکن اپنی گھر والی کے مقابلے میں اس کا رویہ زیادہ جارحانہ تھا۔

"کیا بات ہے جی۔ ایسے ہنگامہ کیوں کر رہے ہو دروازے پر۔ جب بتا دیا ہماری گھر والی نے کہ وکیل صاحب نہیں ہیں تو عورت ذات کو گرمی دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا، کون ہو تم؟"

"دیکھا ہم نے بھی نہیں پہلے تمہیں۔ ہم تو چوکیدار ہیں یہاں اور وکیل صاحب کے ساتھ ہیں دس سال سے" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"میں بھی بہت دن سے آ رہا ہوں یہاں۔ پہلے دوسرا چوکیدار ہوتا تھا۔"

"دیکھو جی۔ ہم دفتر میں رات کی ڈیوٹی دیتے ہیں، ایک مہینہ اور ایک مہینہ ادھر دن میں چوکیداری کرتے ہیں۔ جو چوکیدار ادھر تھا وہ دفتر چلا گیا ہے ہماری جگہ۔"

میں نے کہا "میں شاہدہ پروین سے ملنے آیا تھا۔ وہ گھر پر نہیں ہے تو میں انتظار کروں گا۔" میں نے کہا "تم دروازہ تو کھولو۔"

اس نے مجھے گھورنا جاری رکھا۔ "یہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو نہیں جانتے اور بیگم صاحب کا کیا پتا کب آئیں گی۔"

میں نے کہا "دوپہر تک آئیں گی یا شام تک۔ کچھ بتا کے نہیں گئی ہیں؟ تمہیں نہیں معلوم تو گھر کے دوسرے ملازموں سے پوچھو۔ وہ جانتے ہیں مجھے۔"

وہ کچھ حیران ہوا "ملازم تو سب چھٹی پر چلے گئے ہیں۔ اندر کوئی نہیں ہے لیکن اتنا ہم بھی بتا سکتے ہیں کہ صاحب اور بیگم صاحب اتنی جلدی آنے والے نہیں ہیں۔ آپ ایک مہینے بعد پتا کرنا۔"

"ایک مہینے بعد؟" میں نے چلا کے کہا۔

"ہاں۔ ملازم بھی ایک مہینے بعد آفس سے تنخواہ لیں گے۔ ادھر ان کو بتا دیا جائے گا کہ پھر کب آنا ہے۔ ایک ہفتے بعد یا ایک مہینہ بعد۔"

"کیا مطلب۔۔۔ دو مہینے بھی لگ سکتے ہیں ان کی واپسی میں۔ کہاں گئے ہیں آخر وہ؟" میں نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"ہم نے بتایا تھا باہر گئے ہیں۔"

"باہر کہاں؟ کراچی۔۔۔ پنڈی۔۔۔ کوئی پتا ٹھکانا تو ہو گا ان کا۔ ایسا کیا کام پڑ گیا آخر انہیں؟"

وہ مسکرانے لگا "لگتا ہے آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ ہمارے وکیل صاحب نے پھر شادی کر لی ہے جی۔ پچھلے ہفتے ان کی شادی تھی۔ آج پانچواں دن ہے۔ آپ نہیں جانتے ہو تو ہم بتا دیتے ہیں۔ ان بڑے لوگوں کا دستور ہے کہ شادی کے بعد گھومنے چلے جاتے ہیں کہیں اپنی دلہن کے ساتھ۔ اس کو ہنی مون بولتے ہیں وہ۔"

"سب جانتا ہوں میں۔ تم یہ بتاؤ کہ شاہدہ کیوں گئی ہے ان کے ساتھ؟"

وہ ہنسنے لگا "کیسی باتیں کرتے ہو جی آپ؟ اور کون جائے گا ان کے ساتھ۔ دولہا کے ساتھ دلہن نہیں جائے گی ہنی مون کے لیے تو کیا ساس جائے گی؟" وہ منہ پھاڑ کے زور زور سے ہنسنے لگا۔

میں نے اس کا گلا دبوچ لیا "کیا بک رہے ہو۔ نشے میں تو نہیں ہو تم؟"

اس کی ہنسی رک گئی اور وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "چھوڑو، ہمیں چھوڑو جی۔ ہمیں تو آپ نشے میں لگتے ہو۔"

بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی اور آہستہ آہستہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ زمین میرے قدموں کے نیچے ہلنے لگی تھی اور میرے چاروں طرف دن کا اجالا کم ہو رہا تھا۔ ٹریفک کا شور اور انسانی آوازیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ آدمی کا وہم بھی کیا کیا روپ دھارتا ہے۔ میں نے سوچا۔ برے برے خیال آتے ہیں اور پھر وہی خواب بن کے ڈراتے ہیں۔ یہ سب ذہنی اور اعصابی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ میں نے بائیس دن تک اپنے آپ پر جبر کیا، بائیس دن تک اسے نہیں دیکھا۔

چوکیدار کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی "کیا ہوا جی؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے خود کو سنبھالا اور چوکیدار کو دیکھا "تم نے کیا کہا؟ ہاشمی صاحب نے شادی کر لی ہے شادو سے۔ وہ شادو کے ساتھ ہنی مون پر گئے ہیں۔ ابھی یہی کہا تھا نا تم نے۔ میرا خیال ہے کہ غلط سنا تھا میں نے۔"

"نہیں جی۔ یہی بتایا تھا میں نے آپ کو اور دو مہینے باہر رہیں گے۔ لندن، پیرس۔۔۔ اور پتا نہیں کہاں کہاں جائیں گے۔ بڑے لوگ ہیں جی۔"

میں ایک دم پلٹا اور چلنے لگا۔ میں یہ نہیں مان سکتا تھا۔ میں چوکیدار کی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں تو اس کی بات ہی سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بدمعاشی کر رہا تھا میرے ساتھ۔ جھوٹ بول رہا تھا مجھے پریشان کرنے اور اذیت دینے کے لیے۔ میں نے اس کی گھر والی پر غصہ کیا تھا۔ وہ جاہل آدمی مجھے تنگ کرنا چاہتا تھا لیکن اسے جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا تھا۔ میں ہنس پڑا۔

ایک شخص نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کیا ہے؟ میری شکل جوکروں والی ہے یا سینگ نکل آئے ہیں میرے؟"

میں نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کوئی بس اسٹاپ تھا۔ پتا نہیں میں وہاں کیوں رک گیا تھا۔ "بھائی صاحب، ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"گھڑی تو تیرے ہاتھ پر بھی ہے۔ دیکھنے میں لگتی بھی اچھی ہے۔"

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "اس میں۔۔۔ ڈیڑھ بجا ہے۔"

"پھر پریشانی کیا ہے۔ گھڑی ٹھیک ہے۔ ڈیڑھ ہی بجا ہے" وہ بولا۔

"اچھا؟" میں نے بے یقینی سے کہا "دن کا کہ رات کا؟ ظاہر ہے رات ہی ہوگی، دن میں ڈرانے والے خواب نہیں آ سکتے مگر خواب سے کیا ڈرنا۔"

"چل جا ادھر سے" اس نے ہمدردی سے زیادہ نفرت کے ساتھ کہا۔

"نشئی ہے کوئی" ایک اور شخص بولا جو میری بات پر ہنس رہا تھا۔

"توبہ" ایک بزرگ نے کہا "ذرا اس کی عمر دیکھو، جوانی میں کیا لت لگائی ہے۔ ایسے کتنے دن جیے گا۔"

ایک بچے نے دوسرے کے کان میں سنسنی خیز سرگوشی کی "ہیرونچی ہے۔"

میں چل پڑا۔ اب فٹ پاتھ میرے قدموں کے نیچے سے نکلتی جا رہی تھی۔ میں چلتا جا رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ چوکیدار میرے تعاقب میں تھا اور مسلسل چلا رہا تھا۔ نہیں جی، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور میں کیوں تنگ کروں گا آپ کو۔ میں تو وہی بات بتا رہا تھا جو سارے زمانے کو معلوم ہے۔ یہ سچ ہے، ہاشمی صاحب نے آپ کی شادو سے ہی شادی کی ہے اور وہ چلے گئے ہیں ہنی مون منانے۔ لندن، پیرس، بڑے لوگ ہیں نا جی۔ آپ دو مہینے بعد پوچھ لینا خود ان سے۔ شادو جی کی آواز میرا پیچھا کر رہی تھی، وہ تجھ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں اسے تجھ سے زیادہ۔ تیری اوقات کیا ہے۔ حیثیت کیا ہے تیری۔ لاوارث۔۔۔ وہ زور سے ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔

میں ان آوازوں سے بچ کے بھاگ رہا تھا۔ پناہ کہیں نہ تھی۔ آوازیں ہر جگہ اسی طرح سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ ان سے مفر کہیں نہ تھا اور یہ بے رحم آوازیں مجھ پر خندہ زن تھیں۔ لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ میری طرف انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ مجھ پر طعنہ زن تھے اور میری تحقیر کر رہے تھے۔ وہ دیکھو، سالا عاشق زار، مجنوں کی اولاد۔ شادو سے عشق کرتا تھا۔ محبت کی دنیا کو سکندر اعظم کی طرح تسخیر کرنے نکلا تھا مگر جو انجام سکندر کا ہوا اس سے ایک یتیم خانے کے پروردہ بے نام و نشاں، بے حسب و نسب لاوارث لڑکے کا کیا مقابلہ۔ کیسا چکر دیا اس لڑکی نے۔ عمر میں ہی نہیں، عقل میں بھی وہ اس سے زیادہ تھی۔ ایسا محبت کا ڈراما کیا کہ خود کو جوان سمجھنے والا بوڑھا سینہ تان کے چلنے لگا۔ بے وقوف۔ احمق۔ ایک سو تیس آئی کیو کی ایسی تیسی کر دی ایک معمولی لڑکی نے۔ شادی کر لی باپ کے برابر امیر آدمی سے۔ ہوتا کیسی کہاں کا عشق۔ جو ہے صرف مال و زر ہے۔ نو ٹیش وو آؤٹ کیش۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میرے دماغ میں غبار تھا اور مجھے ویران صحرا میں بگولوں نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرے قدم زمین سے اکھڑ گئے تھے اور میں جذبات کی آندھی میں تنکے کی طرح گھوم رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے اس آندھی میں اڑنے والا کوئی پہاڑ مجھ سے آ ٹکرایا ہے۔ دھماکے سے میری نظروں کے سامنے پھیل جانے والے اندھیرے میں چنگاریاں سی اڑیں۔ میں تھوڑا سا اوپر اٹھا اور پھر سخت تپتی زمین پر گر کے بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ میرے ہاتھوں اور پیروں پر پٹیاں تھیں۔ ایک پٹی میرے سر پر تھی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے قریب رکھے ہوئے لوہے کے اسٹینڈ سے لگی ہوئی گلوکوز کی بوتل سے قطرہ قطرہ توانائی میرے وجود میں منتقل ہو رہی تھی۔

درد میرے سارے بدن میں کروٹیں لے رہا تھا اور مجھے اپنا سر کسی چٹان کے نیچے دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے آس پاس کے بستروں پر لیٹے ہوئے مریضوں میں سے اکثر ٹوٹے پھوٹے تھے۔ ان کی ٹانگوں پر' بازوؤں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ کسی ہڈیوں کے اسپتال کا جنرل وارڈ ہے۔

میں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخر میری یہ حالت کیسے ہوگئی تھی۔ شاید میرا ایکسی ڈنٹ ہوا تھا مگر کیسے؟ کہاں اور کب؟ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھنے کے لیے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو میرے بازو میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ ویسے بھی کلائی کی گھڑی غائب تھی۔

میرے داہنی جانب لیٹا ہوا شخص ایک ٹانگ سے محروم تھا۔ اس کی دوسری پلاسٹر میں پھنسی ہوئی ٹانگ چھت سے معلق اسپرنگ والے جھولے میں رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف والا بستر پر لیٹا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی قطار میں چھ سات مریض تھے۔ دوسری قطار میرے سامنے والے حصے میں تھی۔ اس طرح یہ بارہ چودہ بیڈز کا وارڈ تھا جس کے بیڈ نمبر دو پر میں لیٹا ہوا تھا۔

سب مریض غریب اور نادار لگتے تھے۔ وارڈ کی حالت سے بھی یہی ظاہر تھا کہ یہ سرکاری اسپتال ہوگا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ دیواروں کا رنگ برسوں پرانا لگتا تھا۔ چھت سے اور کونوں میں مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے۔ پورے ہال کے چھ میں سے صرف دو پنکھے چل رہے تھے اور چار میں سے دو ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ اس وقت کسی مریض کے پاس کوئی ملاقاتی نہیں تھا۔

رسالہ پڑھنے والے نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "بھائی صاحب۔ یہ کون سا اسپتال ہے؟"

"گنگا رام۔۔۔" وہ بولا "کیسی ہے اب طبیعت؟"

میں نے کہا "ٹھیک ہوں۔ کیا ہوا تھا مجھے؟"

"گاڑی سے ٹکر ہوگئی تھی تمہاری۔ تمہیں یاد نہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ کب کی بات ہے؟"

"آج چوتھا دن ہے۔ جب تمہیں لایا گیا تم بے ہوش تھے۔"

میں نے اس صورت حال پر غور کیا "مجھے کون لایا تھا یہاں؟"

"وہی جس کی گاڑی کے آگے تم نے چھلانگ ماری تھی۔ خودکشی کرنا چاہتے تھے تم؟"

میں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا "خودکشی۔ حالات ضرور ایسے تھے مگر میں نے یہ سوچا نہیں تھا۔"

"پھر تم نے غیر ارادی طور پر ایسی حرکت کی۔ تمہارے لاشعور میں مرجانے کی خواہش موجود تھی۔ ابھی جو کہانی میں پڑھ رہا تھا۔" اس نے رسالہ اٹھایا۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "چھوڑو کہانی کو۔ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے جان بوجھ کے گاڑی کے نیچے آنے کی کوشش کی تھی۔"

اس نے رسالہ رکھ دیا "لو۔ یہ خود اس نے پولیس کو بتایا جو تم کو یہاں لے کر آئی تھی۔ یہاں پولیس سرجن نے رپورٹ لکھی تھی۔ وہ تمہارا بیان لینے ضرور آئیں گے۔"

میں نے کہا "وہ کوئی عورت تھی؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا "ابھی شام کو چار بجے آئے گی تو دیکھ لینا۔ چار سے چھ ملاقات کا ٹائم ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ روز آتی رہی؟"

"ہاں۔ بس شرافت ہے اس کی۔ نہ آتی تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس کا۔ خود پولیس کا ٹریفک سارجنٹ اس کے قدموں میں بچھا جا رہا تھا کہ جی آپ جائیں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ ایسے حادثات تو ہوتے رہتے ہیں سڑک پر۔ نامعلوم گاڑی والا ٹکر مار کے بھاگ جاتا ہے۔ آپ نے اپنا اخلاقی فرض پورا کردیا اسے اسپتال پہنچا کے۔ ہم اسے سمجھا دیں گے کہ شور شرابا نہ کرے ورنہ اس کے خلاف کیس بنا دیں گے۔"

میں نے کہا "مگر یہ نشے میں تھا۔ ہیروئن پیتا ہے۔ یہ اقدام خودکشی کا کیس بھی بنتا ہے۔ پولیس کچھ بھی کرسکتی ہے۔"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ نہیں' کیس کچھ نہیں بنانا۔ میں خود اس سے پوچھ لوں گی کہ معاملہ کیا ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ کسی عاشق جانباز نے سچ مچ اپنی جان دینے کی کوشش کی تھی بالکل اسی طرح مگر وہ بھی بچ گیا تھا۔ کہیں تم بھی اس کے پرستار تو نہیں ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں کسی کا پرستار نہیں' آخر کون ہے وہ۔۔؟"

اس نے رسالے کے چند صفحات پلٹ کے میرے سامنے کردیے۔ "یہ۔۔۔ اچھی طرح دیکھ لو۔"

میں نے کہا "یہ کون ہے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رسالہ بند کردیا "کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری یادداشت چلی گئی ہے اس حادثے کے بعد۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ حادثے کے وقت میں کہاں تھا۔ کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ میں اسے نہیں پہچانتا۔"

"بھائی یہ مشہور فلمی ہیروئن ہے۔ نیلم' آدھا پاکستان اس کا دیوانہ ہے اور اس پر مرتا ہے۔ باقی تو جیسے وہ ہیں جو تمہاری طرح نہ فلم دیکھتے ہیں نہ ٹی وی۔ نہ فلمی رسالے پڑھتے ہیں' نہ پان کھاتے ہیں اور نہ سگریٹ پیتے ہیں۔"

میں نے حیران ہوکے کہا "پان سگریٹ کا کیا تعلق اس سے؟"

"ہے میری جان۔ اس کے رنگین پوسٹر اور فلمی رسالوں کے

سرورق پان سگریٹ کی دکانوں پر زیادہ نظر آتے ہیں یا وڈیو شاپس پر۔ ابھی جب وہ اسپتال آئے گی تمہیں دیکھنے کے لیے تو سب آجائیں گے یہاں۔ ڈاکٹرز نرسیں' مجمع لگ جائے گا تمہارے بیڈ کے آس پاس۔ اس کی وجہ سے تمہیں اتنی توجہ ملی۔ فوراً داخل کرلیا گیا اور دو دن آئی سی یو میں رکھا گیا۔"

میں نے کہا "آئی سی یو۔ کیا میری حالت اتنی خراب تھی؟"

"تین دن بعد ہوش آیا ہے اور اب بھی یہ پوچھ رہے ہو۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ تمہارے سر میں چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اندرونی چوٹ ہے۔ شاید خون جم گیا ہے دماغ میں کہیں لیکن خوش قسمت ہو تم کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "ہوش میں آنے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے یہاں لا کے ڈال دیا۔ جنرل وارڈ میں۔"

"آئی سی یو میں جگہ کم ہوتی ہے۔ نئے کیس آتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے جب دیکھ لیا کہ تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تو یہاں شفٹ کردیا۔ تمہارے سب ٹیسٹ ہوگئے تھے۔ رشک کرتے ہیں سب تمہاری تقدیر پر۔"

میں نے کہا "اسے اتنا خیال ہوتا تو مجھے اس سرکاری اسپتال کے جنرل وارڈ میں نہ رکھتی۔ کیا کسی پرائیویٹ کلینک کے پرائیویٹ روم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تھی وہ۔ لاکھوں لیتی ہیں یہ ایک ایک فلم کا اور ایک ایک رات کا۔"

وہ پھر رسالہ کھول کے لیٹ گیا "ناشکرے ہو تم۔ اگر وہ تمہیں وہیں پڑا رہنے دیتی یا پولیس کے حوالے کردیتی کہ ایمبولینس میں ڈال کے جہاں جی چاہے لے جاؤ تو تمہیں معلوم ہی نہ ہوتا کہ وہ گاڑی نیلم کی تھی۔"

"مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ نیلم مرد ہے یا عورت۔۔۔"

میں نے کہا مگر میرا پڑوسی پھر اسی کہانی میں کھو گیا تھا جس میں حادثے کے بعد یادداشت کھو گئی تھی۔ ہیرو کی یا ہیروئن کی اور اب ضروری تھا کہ یادداشت کی بحالی کے لیے قدرت ایک اور حادثے کا اہتمام کرے۔

مجھ پر غنودگی اور تھکن کا اثر غالباً خواب آور دواؤں کے باعث تھا جو اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ہاتھوں پیروں کو ہلا کر دیکھا۔ پلاسٹر کہیں نہیں تھا ورنہ اس کے وزن سے ہی مجھے معلوم ہوجاتا کہ میری ہڈیاں کہاں کہاں سے ٹوٹی ہیں۔ درد میرے شانوں میں' کمر کے نچلے حصے میں اور ایک گھٹنے میں تھا۔ ابھی یہ درد بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے درد کش دوائیں بھی دی ہوں گی۔ یہ درد ابھی کچھ دن ساتھ رہے گا اور جسمانی نظام کے معمول پر آنے تک مجھے یہ دوائیں کھانی ہوں گی۔ میں نے سوچا۔ خیر' خدا کا شکر ہے کہ حادثے نے مجھے معذوری نہیں دی۔

حادثے کے متعلق سوچتے ہوئے میرا ذہن پھر شادو کی طرف چلا گیا اور درد کی ایک ٹیس نے میرے دل کے اندر انگارے بھر دیے۔ میں اس وقت یقیناً ہوش میں نہیں تھا اور میں اس جگہ سے' تلخ حقائق سے' اندر کے سناٹے میں گونجنے والی زہر بھری آوازوں کی بازگشت سے اور اپنے آپ سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دکھ' ندامت اور غصے کی بے بسی کے احساس سے فرار چاہتا تھا۔ عین ممکن ہے' میں نے کچھ دیکھے اور سنے بغیر سڑک پر قدم رکھ دیا ہو۔ فٹ پاتھ پر چلنے والا اگر ایک دم دوڑ کے سڑک پر آجائے تو گاڑی والا اسے کیسے بچا سکتا ہے۔ قصور سراسر میرا تھا۔ یہ نیلم کی رحم دلی اور نیکی تھی جس نے اسے رک کر مجھے اٹھانے پر مجبور کردیا ورنہ یہاں سارے قوانین کی گرفت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جس کے پاس اثر رسوخ ہے یا معاملات کو دبانے کے لیے پیسے کی طاقت ہے۔

ایک عمر رسیدہ موٹی اور بھدی نرس کو گزرتا دیکھ کے میں نے اسے آواز دی "سسٹر' پلیز ایک منٹ میری بات سن لیں۔"

وہ بُرا سا منہ بنا کے میری طرف آئی "کیا ہوا ہے۔ ہوش آتے ہی شور مچا دیا۔"

میں نے کہا "میں کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں۔۔۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "اس وارڈ میں کسی ڈاکٹر کی ڈیوٹی ضرور ہوگی۔ کہاں ہے وہ ڈاکٹر۔ وہ کہیں اور مصروف نہیں ہوسکتا۔"

"ہاں۔۔۔ تو ایسے پوچھ رہا ہے جیسے تو بڑا افسر ہے ہمارا۔ کہہ دوں گی جب ڈاکٹر آئے گا۔" اس نے جاتے جاتے کہا۔

ایک نئی لیڈی ڈاکٹر اس کے جاتے ہی آگئی۔ وہ دیکھنے میں بالکل اسکول میں پڑھنے والی لڑکی لگتی تھی لیکن ابھی خدمتِ خلق کے جذبے پر پیشہ ورانہ لالچ غالب نہیں آیا تھا۔ اس نے میرا معائنہ بھی تفصیل سے کیا اور وہ سب سوال پوچھے جو ضروری تھے "بہت جلد بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے تم" اس نے کہا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔"

وہ بینچ پر بیٹھ گئی "اپنی حالت کے بارے میں؟ اچھا سنو' تم نے نیلم کی گاڑی کے سامنے آکے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ تم اس کے کتنے بڑے پرستار ہو۔"

میں نے کہا "سچ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں نے نیلم کا نام بھی آج ہی سنا ہے۔ وہ یقیناً صف اول کی ہیروئن ہوگی اور اس کے ایسے پرستار بہت ہوں گے جو اس پر جان دینے کی تمنا دل میں رکھے ہوں گے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔"

وہ مسکرانے لگی "تم کیا کسی اور کے لیے جان دینا چاہتے تھے۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"اس کا نام شادو ہے" وہ بولی۔

میں اچھل پڑا "شادو۔۔۔ آپ کو کس نے بتایا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خود تم نے" وہ بولی۔
"میں تو بے ہوش تھا۔"
"اسی لیے تو بتا دیا۔ ہوش میں ضرور چھپا جاتے" وہ دبلی پتلی سانولی سی لڑکی بڑے نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔ پرانے اور تجربہ کار ہو جانے کے بعد یا اسپیشلسٹ بن جانے کے بعد ڈاکٹروں کے رویے اور لہجے میں جو۔ بیزاری' رعونت یا بے حسی آجاتی ہے وہ اس سیدھی سادی عام گھریلو قسم کی لڑکی میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لباس اور صورت سے بھی وہ متوسط طبقے کے کسی خاندان کی نظر آتی تھی جہاں والدین پیٹ کاٹ کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں اور ان کے (یا اپنے) خوش حال مستقبل کے لیے انہیں ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کے خواب خریدتے ہیں۔
میں نے کہا "کس کو بتایا تھا میں نے... اور کیا کہا تھا؟ ڈاکٹر صاحبہ..."
اس نے کہا "خود میں نے سنا تھا۔ تم بے ہوشی میں اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔"
میرے پڑوس والے مریض نے کہا "بے ہوشی میں شعور کا پہرے دار سو جاتا ہے تو لاشعور آزاد ہو جاتا ہے۔"
میں نے پلٹ کے کہا "مسٹر لاشعور۔ آپ دوسری کہانی پڑھیں' مجھے ذرا ڈاکٹر صاحبہ سے بات کرنے دیں۔ دوسروں کی باتیں سننا ویسے بھی معیوب حرکت ہے۔"
مسٹر لاشعور پھر برا مان کے رسالے کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔ وہ غالباً اس گفتگو میں غیر جانب دار مبصر کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے تھے۔ جیسے ہمسایہ بیچ کی دیوار کے ادھر سے سنائی دینے والی آوازوں سے بہت کچھ جان لیتا ہے ایسے ہی انہوں نے بھی میرے لاشعور کی سنسر سے آزاد گفتگو سنی ہو گی۔ ڈاکٹر کے سامنے میں نے اتفاق سے ایک آدھ جملہ بولا ہو گا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں کی بے ہوشی میں جو کچھ میں نے کہا ہو گا وہ سب مسٹر لاشعور نے ہی سنا ہو گا۔
"بڑی عجیب سی بات کی تھی تم نے" ڈاکٹر نے کہا "تم نے کہا تھا کہ شادو... تو طوائف ہے۔"
میں نے آنکھیں بند کر کے ایک سانس لی "یہ کہا تھا میں نے؟ اور..."
"ایک بار اسے شاہدہ پروین بھی کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ تو نے اپنے آپ کو بیچ دیا... تم اسے گالیاں دے رہے تھے اور... رو رہے تھے۔"
میں نے دکھی لہجے میں کہا "کوئی اور بھی تھا یہ سب سننے والا؟"
"دوسروں کا تو مجھے علم نہیں' ہو سکتا ہے تم دوسرے ڈاکٹروں یا نرسوں کے سامنے بھی بولتے رہے ہو۔ تم ذہنی طور پر بہت DISTURBED تھے۔"
"کیا میں مسلسل بولتا تھا؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "بے ہوشی کے دوران میں نیم بے ہوشی کے وقفے آتے ہیں۔ جب ان TRANQUILISERS اور PAIN KILLER دواؤں کا اثر کچھ کم ہونے لگتا ہے اس وقت ایسا ہوتا ہے۔ مسلسل کوئی نہیں بولتا۔ بے ربط الفاظ اور ٹوٹے پھوٹے جملے ہوتے ہیں بعض اوقات۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے۔"
میں نے اسے غور سے دیکھا "آپ کا وقت قیمتی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔"
"ابھی اس کی قیمت کوئی نہیں" وہ بولی "میں ابھی ہاؤس جاب کر رہی ہوں۔ پرسوں تک میری ڈیوٹی رات کی تھی اس لیے میں یہاں بیٹھ گئی تھی۔"
"ڈاکٹر صادقہ" وہی بدشکل اور بدمزاج نرس پھر نمودار ہوئی "لو۔ میں آپ کو باہر دیکھ رہی ہوں' آپ ادھر بیٹھے ہو۔ وہ کیا نام تھا ان ڈاکٹر صاحب کا۔ مجھے تو بھول گیا۔"
"تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی اس نام کی؟"
"وہ بڑے ڈاکٹر صاحب پوچھ رہے تھے۔ اے ایم ایس صاحب' آپ خود ہی جا کے بتا دو" نرس نے کہا۔
ڈاکٹر صادقہ اٹھی "میں ابھی آتی ہوں۔"
میں نے اپنے پڑوسی سے کہا "آئی ایم سوری۔ آپ نے میری بداخلاقی کا برا مانا ہو گا۔"
"یہاں سب بیمار ہیں۔ کچھ ذہنی اور کچھ جسمانی۔ جو کسی کی بات کا برا مانتا ہے وہ بے وقوف بھی ہے" مسٹر لاشعور نے رسالہ رکھ دیا "اب یہ ڈاکٹر صادقہ جو فرما رہی تھیں کہ تم ذہنی طور پر DISTURBED تھے تو بھائی پُرسکون کون ہے یہاں؟ اور دنیا میں کون ہے جو DISTURBED نہیں ہے۔ کیا خوب شعر ہے' تم بھی سنو۔ ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہ عدم۔ اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم۔"
ڈاکٹر صادقہ پھر آگئی "ایڈیشنل ایم ایس کے دوست ہیں ایک ڈاکٹر مشہود الکفر۔"
میں پھر اچھلنے پر مجبور ہو گیا "مشہود الکفر۔ وہی جو آئی اسپیشلسٹ ہیں۔ کیا وہ آئے ہوئے ہیں یہاں؟"
"تم کیسے جانتے ہو انہیں؟" وہ بولی۔
"میں... کس نے کہا کہ میں انہیں جانتا ہوں؟"
"کسی نے بھی نہیں' تم میٹرک کا امتحان دے کر آئے تھے۔ تمہارے کاغذات میں رول نمبر درج تھا۔ نیلم نے رول نمبر سے تمہارا پتا تلاش کیا۔ پتا تھا... ڈاکٹر مشہود کے گھر کا۔ اس نے فون کر کے بتا دیا کہ ناصر عظیم نے میری گاڑی کے سامنے آ کے SUICIDE کرنے کی کوشش کی تھی۔"
"او مائی گاڈ!" میں نے اپنا سر پکڑ لیا "وہ تو قتل کر دیں مجھے۔ ایک فضول بے بنیاد بات پر۔ میں کیسے یقین دلاؤں گا انہیں کہ میں نیلم تو کیا کسی بھی لڑکی کے لیے جان دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شادو کے لیے بھی نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ اتنی فالتو نہیں ہے میری جان۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس روز جب یہ حادثہ پیش آیا تو میں اسی شاہدہ پروین کی وجہ سے بہت UPSET تھا۔ اس نے مجھے محبت کا فریب دیا۔ بے وقوف بنایا اور شادی کرلی ایک دولت مند بوڑھے سے جو عمر میں اس سے دگنا ہے۔ اس نے باپ کو شوہر بنالیا۔"

"TAKE IT EASY" اس نے شفقت سے کہا "زندگی میں ایسے بہت تجربات ہوں گے تمہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ تم زندگی کی قدر کرتے ہو۔"

"ڈاکٹر صادقہ، پلیز! میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر مشہود کو کچھ پتا نہ چلے۔"

اس نے افسوس سے نفی میں سرہلایا "اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر غیور ادھر ہی گئے ہیں' ڈاکٹر مشہود کی طرف۔ ظاہر ہے ان سے باتوں باتوں میں تمہارا ذکر نکلا تو سب بتادیں گے۔"

"شادو والی بات بھی معلوم ہے انہیں' ڈاکٹر غیور کو؟"

"ہاں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں' وہ سب بتادیتے ہیں ڈاکٹر کو اور اس کیس میں تمہارے فزیشن وہی ہیں۔ ڈاکٹر غیور۔ ہم جیسے جونیئرز صرف رپورٹ دیتے ہیں۔ علاج انہی کا چلتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ مجھے ابھی فارغ کردیا جائے یہاں سے۔"

وہ ہنسنے لگی "ہم اپنی مرضی سے تمہیں دوا نہیں دے سکتے تو ڈسچارج کیسے کرسکتے ہیں اور پھر تمہاری حالت ایسی کہاں ہے۔ تمہیں تو کم سے کم ایک ہفتہ اور یہاں رہنا پڑے گا۔"

"اور اگر میں بھاگ جاؤں۔"

"کیسے بھاگو گے؟ ذرا کھڑے ہوکے دکھاؤ پہلے۔" وہ بولی "تمہیں تو ابھی پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا جائے گا۔ کل تو نیلم بہت خفا ہوئی تھی۔ ایم ایس کو فون کیا تھا اس نے کہ اسپتال والے مجھے لفٹ نہیں کرواتے۔ پہلے دو دن آئی سی یو میں ٹھیک تھا۔ تیسرے دن مجھے بتایا گیا کہ جیسے ہی کمرا خالی ہوا۔ ہم شفٹ کردیں گے مگر چوتھے دن بھی وہ جنرل وارڈ میں پڑا ہوا ہے۔ آپ لوگ باتیں بہت کرتے ہیں کہ اس کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ یہ خاص خیال رکھا ہے اس کا؟ کچھ نہیں کرسکتے تو رہنے دیں' میں اسے پرائیویٹ کلینک لے جاتی ہوں۔ ایم ایس ہیں ڈاکٹر افضال۔ وہ بھی کم نہیں ہیں' نیلم کے سامنے تو ہوجاتے ہیں ریشہ خطمی۔ ہمارے ساتھ چنگیز خان جیسا سلوک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مشہود کیا لگتے ہیں تمہارے؟"

"وہ..... کچھ نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے میٹرک کا داخلہ بھیجتے وقت انہی کے گھر کا پتا لکھا ہوگا فارم میں۔ کیا بھول گئے؟ اور تعلق کوئی نہیں تو پھر ڈر کیوں رہے ہو ان سے اتنا کہ وہ قتل کردیں گے تمہیں۔"

جواب سے میری جان یوں بچ گئی کہ دو خونخوار قسم کے وارڈ بوائے ایک اسٹریچر کے ساتھ یوں نمودار ہوئے جیسے کال کوٹھری کے مجرم کو پھانسی گھاٹ لے جانے والے آتے ہیں۔ "چلو بھئی' پرائیویٹ کمرے میں عیش کرنے" ایک نے کہا اور میری ٹانگیں پکڑ کے کھینچا۔

دوسرے نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اسٹریچر پر پھینک دیا اور بولا "ویسے تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہو۔ گپ شپ بھی ہورہی ہے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔"

یہ میرے لیے خاصے اطمینان کی بات تھی کہ میری دو سو چھ... ہڈیوں میں سے ایک بھی نہیں ٹوٹی ہے اور جسم کے جو حصے درد کا شکار ہیں یا سوجے ہوئے ہیں وہ حادثے میں آنے والی چوٹ کا اثر ہے۔ میرا سر سلامت تھا' حواس ٹھیک تھے' میں لنگڑا' لولا یا معذور نہیں ہوا تھا۔

پرائیویٹ روم میں پہنچتے ہی میں نے گھنٹی بجائی اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک ایک نرس پاؤں پٹختی اور جھنجلاتی ہوئی نمودار نہیں ہوئی "کیا ہوگیا' ہاتھ گھنٹی پر چپک گیا ہے۔"

"یہاں گھنٹی نہیں گھنٹا ہونا چاہیے" میں نے کہا "ڈیوٹی روم میں نہیں ڈیوٹی دینے والوں کے گلے میں۔ لگتا ہے سب بہرے اسی وارڈ میں بھرتی کرلیے گئے ہیں۔"

وہ کچھ محتاط ہوگئی "آپ ابھی کمرے میں پہنچے ہیں' آتے ہی کیا ضرورت پڑگئی ایسی؟"

"یہ ایمرجنسی بیل ہے۔ کسی کو کسی وقت بھی اس کی ضرورت پڑسکتی ہے' اتنی دیر میں تو بلانے والا دوبار فوت ہوسکتا ہے۔ خیر' میں جاننا چاہتا ہوں کہ جو کپڑے میں نے پہن رکھے تھے وہ کہاں ہیں؟ ان کپڑوں کے ساتھ اچھی خاصی رقم تھی۔ میری گھڑی اور کاغذات۔"

"دیکھیے' مجھے یہ سب نہیں معلوم۔"

"معلوم نہیں تو معلوم کرکے بتاؤ مجھے ورنہ ایک گھنٹے میں ڈاکٹر غیور حیدر کے ساتھ ڈاکٹر مشہود الظفر آنے والے ہیں اور وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ شام کو جب مس نیلم آئیں گی تو ان کے ساتھ ایم ایس بھی آئیں گے پھر مجھے ان سے کہنا پڑے گا کہ تم نے مجھے ٹکا سا جواب دیا تھا۔"

وہ پریشان ہوگئی "میں پوچھتی ہوں.... مگر اس بارے میں شاید وہی بہتر جانتے ہوں گے جو آپ کو لے کر یہاں آئے تھے۔ تمام چیزیں ان کے حوالے کردیتے ہیں شعبۂ حادثات والے۔"

"ہوں..." میں نے سوچتے ہوئے کہا "یعنی یہ سب چیزیں مس نیلم کے پاس ہوسکتی ہیں۔ مس نیلم کا فون نمبر کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ بوکھلا گئی۔

"کیا؟ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں؟ پھر کیا معلوم ہے تمہیں۔ آدھا پاکستان ان کو جانتا ہے۔ لگتا ہے کہ میری طرح تم بھی باقی

آدھے پاکستان میں ہو۔"

وہ مسکرانے لگی "دیکھیں جی۔ آج جب نیلم آئے تو آپ ایک مہربانی کریں مجھ پر۔ ان کے ساتھ ایک فوٹو بنوا دیں میرا۔ کیمرے کا انتظام ہے۔"

میں نے فراخ دلی سے کہا "جاؤ سارے اسپتال میں اعلان کردو کہ جسے بھی نیلم کے آٹوگراف لینے ہوں' تصویر اتارنی ہو یا اتروانی ہو' وہ تمہارے پاس اپنا نام لکھوادے اور وقت پر آجائے۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے' سب لائن بنا کے باری باری آئیں... چار گھنٹے ٹھہریں گی وہ میرے ساتھ۔"

وہ خوشی خوشی جانے لگی "تھینک یو مسٹر ناصر۔"

میں نے کہا "بات سنو۔ میرے آٹوگراف نہیں لوگی؟ ابھی موقع اچھا ہے ورنہ ایک دن تمہیں اسی طرح لائن بنا کے بھی شاید چانس نہ ملے۔"

اس کے جاتے ہی میں نے کھڑکی کھولی اور باہر کود گیا۔ کھڑکی صرف تین فٹ اونچی تھی مگر اس معمولی سی مشقت میں بھی میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد سے چلانے لگا۔ میں برآمدے میں گرا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں ایک اجڑے چمن میں پہنچ گیا جہاں گھاس خشک تھی اور چند پودے ایک بے آب فوارے کے گرد نظر آرہے تھے۔ فوارے کے تالاب کی منڈیر پر' سیمنٹ کی بینچوں پر اور درختوں کے سائے میں مریض اور ان کے لواحقین بیٹھے تھے یا لیٹے ہوئے ملاقات کا وقت شروع ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کے لیے یہی انتظار گاہ ان کی خواب گاہ بھی تھی۔ وہ دور دراز سے آنے والے لوگ تھے جن کے مریض آپریشن کے انتظار میں تھے یا آپریشن کے بعد شفایابی کے لیے داخل تھے۔ ان کے تیمارداروں کے پاس اس شہر میں قیام کی کوئی جگہ نہ تھی۔ نہ کسی عزیز کا گھر۔ نہ کرائے کا گھر اور نہ اللہ کا گھر۔ وہ ہوٹل کے اخراجات بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے اور فٹ پاتھ پر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اس دن کے انتظار میں تھے جب مریض کو یا اس کی میت کو لے کر واپس گھر جائیں' جو رب کی رضا۔

میں آخری جنگلے والی دیوار کے ساتھ ٹہلتا رہا اور یہ غور کرتا رہا کہ اگر میں دیوار اور پھر جنگلے کو عبور کرکے سڑک تک پہنچنا چاہوں تو اپنی اس کوشش میں میری کامیابی کے امکانات کا تناسب زیادہ ہے یا ناکامی کا؟ میری جسمانی حالت یقیناً بہت خراب تھی اور یہ ہوسکتا تھا کہ میں جنگلے پر ہی لٹک جاؤں یا میرے کپڑے پھٹ جائیں تو میں جنگلے کے دوسری جانب فٹ پاتھ پر چت گروں اور حادثے میں تو خیر کچھ نہیں ہوا تھا مگر اب میری ٹانگ یا ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے پھر مجھے بڑی شان سے اسٹریچر پر ڈال کے واپس لایا جائے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اسپتال سے فرار ہونا کوئی جرم نہیں جس پر مجھے قید کی سزا ہو۔ نہ مجھے کوئی اس الزام میں پکڑ سکتا ہے کہ میں بل ادا کیے بغیر بھاگ رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر خفا ہوں گے۔ نرسیں بک بک کریں گی۔ اس کے بعد نیلم میری خاطر وقت ضائع کرنے پر افسوس کا اظہار کرے گی اور ڈاکٹر مشہود یہ فرمائیں گے کہ وہ بڑی خبیث اور احسان فراموش چیز ہے۔ میں جانتا ہوں اسے۔

بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں کوئی پبلسٹی نہیں چاہتا تھا جو مجھے نیلم کی وجہ سے ملنے والی تھی۔ اس سے زیادہ مجھے ڈاکٹر مشہود کا سامنا کرنے کے خیال سے ہول آتا تھا۔ کاغذات' گھڑی اور رقم کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ چیزیں نیلم کے پاس ہوں گی تو بعد میں بھی مل جائیں گی لیکن لوٹ کے ڈاکٹر مشہود کے گھر جانے اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں پکڑے جانے والے مفرور مجرم کی حیثیت سے پیشی کا خیال سوہان روح تھا۔

گیٹ بہت دور تھا اور چوکیدار مجھے دیکھ لیتا تب بھی ڈیوٹی چھوڑ کے میرے پیچھے نہ دوڑتا۔ زیادہ خطرہ غیر متعلق افراد سے تھا جو ہمدردی میں تھانے داری کریں گے یا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہوئے ٹانگ اڑائیں گے۔

جب میں دیوار پر تھا اور جنگلے کو آدھا عبور کرچکا تھا یعنی میری ایک ٹانگ اسپتال میں تھی اور دوسری باہر تو کچھ آوازیں آئیں۔ اوئے' اوئے' اسے کی ہورہا ہے۔ یہ مریض تھے یا ان کے ملاقاتی۔ میں نے ان کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ گڑبڑ باہر والوں نے کی۔ کچھ راہ چلتے لوگ رک گئے۔ جائے واردات پر موجود ایک بھٹے بیچنے والا درخت کے سائے میں اونگھ رہا تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے کھڑا ہوگیا۔ ایک رکشا والے نے بریک لگائی۔

اگر میرے جسم پر اسپتال کے کپڑے اور ہاتھوں پیروں پر پٹیاں نہ ہوتیں تو کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوتا۔ باہر نکلنے کا راستہ دور ہو تو رکاوٹیں پھاندنے کے کسی شارٹ کٹ کا استعمال سب ہی کرتے ہیں۔ مجھ میں اتنی جسمانی طاقت بھی نہیں تھی کہ میں دوڑ لگا کے سب کو پیچھے چھوڑ جاؤں یا کسی چلتی بس سے لٹک جاؤں۔ رکشا ٹیکسی کے لیے میری جیب میں پیسے نہیں تھے اور ویسے بھی ان سے امید کم تھی کہ کوئی میری مدد کرے۔

بھٹے والے کو مجھے پکڑنے میں پہل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس نے مجھے پیچھے سے "بھی" مارلی "اوئے پاگل دے پتر۔ ذرا حالت دیکھ اپنی۔ اسپتال سے بھاگ رہا ہے۔"

رکشا والا میرے سامنے آگیا "اسپتال کے کپڑے تو چھوڑ جاتا۔"

ایک بزرگوار نے فرمایا "میاں جی پولیس کے پہرے سے نکل کے بھاگا ہوگا۔ کی ہوگی کوئی واردات۔"

میری کسی نے ایک نہیں سنی اور چند منٹ کے بعد مجھے گیٹ سے جلوس کی شکل میں واپس اندر لایا گیا۔ لمبی لاٹھی' نکیلی مونچھوں اور طوطے جیسی ناک والے سابق فوجی چوکیدار نے جلوس کا استقبال کیا اور ہکلا کے بولا "ب.... ب.... بس جی۔ باقی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ... آ... آپ مجھ پر چھوڑ دیں" اور تیز سیٹی بجا کے حاضرین و ناظرین کو متوجہ کیا۔ اس کے ہاتھ ہلاتے ہی پیرامیڈیکل اسٹاف نے مجھے پکڑ لیا۔ میری پیشی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے سامنے ہوئی۔ مجھ سے پوچھا گیا اور معلوم کیا گیا تو پتا چلا کہ میں تو خاصا مشہور کیس ہوں۔

"او جی وہی جھلا ہے جو نیلم کی گڈی کے نیچے آ کے جان دینے لگا تھا" ایک نرس نے مجھے پہچان کے کہا۔

ڈاکٹر نے اس انکشاف پر یا نرس کو دیکھ کے سیٹی بجائی۔ "اوہ۔ آئی سی۔ اس کو دیکھنے آئی ہے وہ؟ یار ہم کیا اس سے بھی گئے گزرے ہیں کہ ہماری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتی کہ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔"

"وہ تو آئی بیٹھی ہے جی!" نرس نے کہا۔

نیلم شاید میرے جاتے ہی آ گئی ہوگی۔ مجھے فرار ہونے اور لوٹ کر آنے میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ادھر میں نے کھڑکی سے باہر قدم رنجہ فرمایا ہو اور ادھر دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی ہو۔

وہ مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں تو کبھی باتھ روم میں ہو" اس نے ایک ادائے ناز سے چہرے کے چاند کو زلفوں کی گھٹا میں نمایاں کیا۔

میرے ساتھ آنے والے ڈاکٹر اور ہٹے کٹے اسٹاف نے مجھے ہر طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ میری حالت ہی ایسی نہ تھی کہ میں نیلم کی بات کا جواب دیتا۔ بستر پر لیٹ جانے کے بعد اس لاحاصل مشقت سے مجھ پر تقریباً بے ہوشی طاری ہو گئی۔ میں آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانس لیتا رہا اور جسم کے ہر عضو میں بیدار ہو جانے والے درد کی اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

نیلم کی وجہ سے میرے ساتھ ایک جم غفیر اندر آ گیا تھا۔ ان میں ڈاکٹر نرسیں اور اسٹاف کے دوسرے لوگ سب ہی شامل تھے۔

"یہ کیا ہے جی ڈاکٹر صاحب۔" نیلم نے ناگواری سے کہا "یہ مجمع کیوں لگا ہوا ہے یہاں۔ نکالیں سب کو باہر۔"

ڈاکٹر نے چلا کے کہا "آؤٹ۔ ایوری باڈی۔"

کمرا خالی ہو گیا تو اس نے ایک نرس کو کچھ ہدایات دیں اور ایک وارڈ بوائے کی ڈیوٹی گیٹ پر لگا دی۔ نیلم نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر کرسی پر بیٹھ گئی "یہ کیا چکر ہے جی، مجھے بھی تو بتائیں۔"

"چکر کیا مس نیلم۔ آپ کا بیمار بھاگ گیا تھا" ڈاکٹر نے مسکرا کے کہا اور گلے میں لٹکے ہوئے آلے کو اتار کے میرا معائنہ کرنے لگا "میڈیکل سے زیادہ مینٹل کیس لگتا ہے جی۔ یہ بھی ایک مرض ہے۔ توجہ حاصل کرنے کے لیے پبلسٹی کا اچھا طریقہ ہے۔ اب دیکھیے نا پہلے تو خبر آ گئی کہ نیلم کے پرستار نے راہِ عشق میں جان نثار کرنے کے لئے..."

نیلم نے اس کی بات کاٹ دی "اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ ہوش کب آیا اسے؟"

نرس نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے جی۔"

"اور ہوش آتے ہی یہ نکل گیا کسی اور پر مرنے کے لئے۔ کیوں یار، اگلی بار کس کی گاڑی کے نیچے آنے کا سوچا تھا، بابرا شریف کی؟"

میں نے کہا "ول یو پلیز شٹ اپ!"

اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس کی ساری شوخ مزاجی ختم ہو گئی۔ نیلم کے سامنے اس کی بے عزتی ہو گئی تھی اور یہ سین اسٹاف نرس نے بھی دیکھا تھا۔ تاہم اس نے ایک مثالی ڈاکٹر بنتے ہوئے مسکرا کے کہا "سب سہنی پڑتی ہے ہمیں، مریضوں کی الگ، ان کے ساتھ آنے والوں کی الگ۔"

"ڈاکٹر صاحب!" نیلم نے کہا "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو... میں اس سے اکیلے میں کچھ پوچھ لوں؟"

"وائی ناٹ، شیور!" ڈاکٹر نے کہا اور نرس کے ساتھ واک آؤٹ کر گیا۔

اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بلاشبہ حسین اور پُرکشش عورت تھی اور اگر فلمی دنیا میں صفِ اول کی اسٹار سمجھی جاتی تھی تو یہ اس کا حق تھا۔ نیلم ادھیڑ عمر کی وہ موٹی بھدی ہیروئن نہیں تھی جو پنجابی فلموں میں سولہ سال کی الھڑ مٹیار کا رول کرتی ہے اور رنگین ریشمی لاچے کرتے میں جسم کا فاضل گوشت ہلا ہلا کے فلمی شائقین کو اپنے سنسنی خیز رقص سے بہ آوازِ بلند چلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہاں میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ نیلم اس کا اصل نام نہیں، کچھ مصلحت کا تقاضا اور کچھ قانونی مجبوریاں ایسی ہیں کہ میں نے اصل واقعات میں کرداروں کو فرضی نام دے دیے ہیں۔ مداری کا تماشا دیکھنے والوں کے لیے نام سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔

نیلم فلمی صنعت میں نووارد تھی اور اس نے بہت جلد پرانی گھسی پٹی اور کھٹارا ہیروئنوں سے اکتائے ہوئے تماش بینوں کے دلوں کو گرما دیا تھا۔ اس کی عمر کا میں کوئی اندازہ نہ کر سکا۔ عمر کا مسئلہ ہر عورت کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ اگر وہ تیس پینتیس کی تھی تو میک اپ اور افزائشِ حسن کے لوازمات سے دس سال کم کی لگتی تھی۔ ابھی وہ سلم تھی اور اس کی تر و تازہ اور دمکتی جلد کے نیچے چربی کی تہیں جمنا شروع نہیں ہوئی تھیں جو فلمی دنیا میں دو چار کو چھوڑ کر ہر ہیروئن پر نظر آتی ہیں۔ اس کا لباس اور اندازِ حسن صرف میک اپ اور کیمرے کی نظر کا کرشمہ نہیں تھا۔ وہ واقعی خوب صورت تھی اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، تعلیم یافتہ بھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" نیلم نے شرمائے بغیر کہا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے معافی کیسے مانگوں؟" میں نے کہا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ پہلے تم نے خودکشی کی کوشش

کی تھی اور وہ تو خدا کا شکر ہے کہ گاڑی میں خود چلا رہی تھی۔ میں زیادہ تیز ڈرائیونگ نہیں کرتی۔ اگر میرا شوفر ہوتا تو تمہارا بچنا مشکل تھا۔"

میں نے کہا "مس نیلم! پہلے میں ایک غلط فہمی دور کر دوں۔ اس سے شاید آپ کو مایوسی ہوگی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے آج آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی سینما کے باہر پوسٹر سائن بورڈ یا کسی فلمی رسالے کے ٹائٹل پر آپ کی تصویر دیکھی ہوگی تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ میں آپ کو پہچانتا نہیں تھا۔"

"کیوں! کیا تم فلمیں نہیں دیکھتے؟"

"بالکل نہیں مگر آج کے بعد ضرور دیکھوں گا۔ خصوصاً وہ فلمیں جن میں آپ ہوں گی" میں نے کہا۔

وہ مسکرانے لگی "وہ کیوں؟"

"ایک تو اس لیے کہ میں بھی آپ کے لاکھوں پرستاروں میں شامل ہو گیا ہوں۔ یہ ملاقات تو ایک حادثہ ہے جو میری خوش قسمتی سے ہوا۔ دوبارہ آپ کہاں ملیں گی اور کون ملنے دے گا مجھے۔ بس فلمیں دیکھ دیکھ کے گزارا کریں گے۔ لوگوں کو یہ قصہ سناتے رہیں گے کہ کیسے میں نیلم کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ کیسے اس نے مجھے اسپتال پہنچایا اور پھر مجھے دیکھنے آتی رہی۔ لوگ کچھ دن سنیں گے پھر نہیں گے کہ پتا نہیں کیا بکتا رہتا ہے سوچے سمجھے بغیر۔ خواب کی بات کو سچ سمجھ کے سناتا ہے۔ پاگل ہو گیا ہے۔ ایسی بے پر کی اڑاتا ہے لیکن مس نیلم! زندگی کے بہت سے حقائق بعض اوقات افسانے سے زیادہ رنگین اور ناقابلِ یقین لگتے ہیں۔"

"تم اچھی خاصی سمجھ داری کی باتیں کرتے ہو پھر یہ کیا بے وقوفی کی تھی تم نے؟ اسپتال سے بھاگ کے کہاں جا رہے تھے؟ تمہاری حالت ایسی ہے کہ تمہیں کم سے کم دو ہفتے آرام سے لیٹ کر گزارنے پڑیں گے۔"

میں نے کہا "مس نیلم۔ میں گھر جا کے لیٹ جاؤں گا۔"

"مجھے پتا بتاؤ۔ میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع کر دیتی ہوں" وہ بولی۔

"گھر سے میری مراد تھی... وہ جگہ جہاں میں رہتا ہوں" میں نے کہا۔

"گھر میں اور کون رہتا ہے تمہارے ساتھ؟"

"ہیر رانجھا!" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی "اور شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں۔"

میں نے کہا "یہ مذاق نہیں ہے۔ مائی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا سے میری حال ہی میں شناسائی ہوئی ہے۔ ہم کرائے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر رانجھا، کیا یہ خطاب تم نے ان کو دے رکھا ہے؟ ڈاکٹر مشہود کو۔ جن کا پتا تمہارے کاغذات میں لکھا ہوا تھا۔"

"جی نہیں۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میں ان کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ ان کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔"

"اور تمہارے اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن... وہ کہاں ہیں؟"

"وہ کہاں ہیں، کون ہیں، مجھے صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں۔ جس یتیم خانے میں میری پرورش ہوئی تھی وہاں میرے والد کا نام محمد عظیم لکھا ہوا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ نام کس نے لکھوایا تھا۔ کون تھا جو مجھے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔"

"اوہ، آئی ایم سوری۔ دیکھو نا صرا! اگر تم کو یہ جگہ پسند نہیں تو میں تم کو کسی پرائیویٹ اسپتال لے جاتی ہوں۔ گھر میں نہ آرام کرتا ہے کوئی باقاعدگی سے اور نہ علاج۔ اخراجات کی فکر مت کرو۔"

"اپنا خرچ میں خود اٹھا سکتا ہوں۔ جتنا آپ نے ابھی تک کیا وہی بہت ہے اور میں آپ کے احسان کا بدلہ شاید کبھی نہیں اتار سکوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"یہ ٹھیک ہے مس نیلم۔ آپ کو ضرورت پڑے گی تو جان تک دینے والے بہت ہوں گے۔ میں کس منہ سے کہوں کہ کبھی میں بھی آپ کے کام آؤں گا پھر بھی یہ ہے کہ آپ کا مجھ پر اس نیکی کا قرض باقی رہے گا۔ آپ بلاشبہ بہت حسین ہیں، آپ کے لاکھوں پرستار ہیں مگر میری بدقسمتی کہ میں ان میں شامل نہیں تھا۔ یہاں آپ کے ظاہری حسن سے بڑھ کر میں نے آپ کے باطن کو دیکھا جو آپ سے بھی زیادہ حسین ہے۔ میں اس کا پرستار بن گیا ہوں۔"

"تھینک یو۔ تم بہت غیر معمولی لڑکے ہو۔ تمہاری باتوں میں بڑی پختگی اور گہرائی ہے" وہ مجھے نظر جما کے دیکھتی رہی۔

"میری وجہ سے آپ کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔ آپ تو جہاں جاتی ہیں، پرستاروں کا ہجوم آپ کا تعاقب کرتا ہے۔"

"شہرت میں یہ مصیبت تو ہے مگر میں عادی ہو چکی ہوں۔ اس وقت بھی باہر ایک مجمع لگا ہوا ہوگا۔ فلمی فوٹوگرافر اور رپورٹر کھڑے ہوں گے اور مجھے معلوم ہے کہ کس کس قسم کی باتیں کر رہے ہوں گے۔" اس نے بدمزگی سے کہا۔

ڈاکٹر نے دوبارہ اندر جھانک کے دیکھا تھا مگر نیلم کی نظر کا اشارہ سمجھ کے وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ نیلم کے مشتاقانِ دید کا اجتماع بڑی بے صبری سے وارڈ کے قریب انتظار کر رہا تھا۔ وہ میری خوش قسمتی پر رشک اور حسد میں مبتلا تھے۔ دروازہ بند تھا مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے پردہ تھا۔ پردہ ہوا سے ہلتا تھا تو مجھے اندر جھانکنے والوں کی پُرتجسس آنکھیں اور حیران چہرے نظر آ جاتے تھے۔ ان کی باتوں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔

"اوئے یار، پورا ایک گھنٹا ہو گیا کیا کر رہی ہے نیلم۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"راز و نیاز چل رہے ہیں یار۔ ایسے جم کے بیٹھی ہے سامنے۔"

"ہاں یار۔ نصیب اپنا اپنا۔ آخر یہ ڈراما کیا ہے؟"

"کون سا ڈراما؟"

"یہ حادثہ ڈراما ہی تو تھا۔ اصل بات کچھ اور ہوگی۔"

"دال میں کالا ہے جی۔ معاملے کی تہ تک پہنچنا پڑے گا۔"

"تو شرط لگا لے۔ اسے وہ ساتھ لے جائے گی اپنے گھر۔"

"اور اس کے بعد وہی ہوگا جو فلموں میں ہوتا ہے۔ جب چکڑ اور کنگال ہیرو کسی کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی کی گاڑی سے ٹکراتا ہے۔"

"ہے بھی پورا ہیرو۔ میں نے سنا ہے کوئی فلم بنا رہی ہے نیلم۔"

"بس تو پھر اس کا چانس پکّا۔"

یہ باتیں نیلم بھی سن رہی ہوگی مگر جیسا کہ اس نے بتایا' وہ سب کچھ سننے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ بھی جو زبانِ خلق کہتی تھی' وہ بھی جو نام نہاد فلمی صحافی کہتے تھے اور وہ بھی جو دوست دشمن کہتے تھے۔

میں نے کہا "آپ بھی ادھر سے ہی نکل جائیں۔ جدھر سے میں گیا تھا۔"

وہ ہنس پڑی "کھڑکی کے راستے؟"

"میں آپ کے ساتھ گیا تو تماشا بن جائے گا۔ آپ کا ایک بار پھر بہت شکریہ۔ میں بعد میں چلا جاؤں گا۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے جانے دیں۔"

"یہاں آرام سے لیٹنے اور علاج کرانے میں کیا پریشانی کی بات ہے آخر؟ کیوں جانا چاہتے ہو تم اتنی جلدی۔ نہ بیوی بچوں کی فکر ہے ابھی تمہیں۔ نہ کوئی تمہاری فکر کرنے والا ہے۔"

"ایسا مت کہیں۔ ہیر رانجھا بہت پریشان ہوں گے میرے لئے۔ اس کے علاوہ.... میں ڈاکٹر مشہود کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے ہی نکل جاؤں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" نیلم نے حیرانی سے کہا۔

"ہے کچھ ایسی ہی بات۔ وہ مجھے زبردستی پکڑ کے اپنے گھر لے جائیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی "اچھا پھر تم میرے ساتھ چلو۔"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ "سوری۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کچھ کرنا ہی چاہتی ہیں تو یہ مہربانی کریں کہ مجھے میرے گھر کے پاس چھوڑ دیں لیکن ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔"

"اوکے۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

نیلم نے ڈاکٹر کو اندر طلب کیا اور اس سے کہا کہ شوفر کو اندر بھیج دے۔ اس کا شوفر اور باڈی گارڈ صورت اور حلیے سے ڈاکو نظر آتا تھا۔ اس کی گھنی سیاہ داڑھی تھی اور ڈراؤنی مونچھیں۔ اپنے چھ فٹ قد' مضبوط جسم' چہرے کے سخت اور کھردرے نقوش' میں گز کپڑے سے بنائی گئی شلوار قمیص اور اس پر اسلحے کی بیلٹ۔ بالکل صاف سر اور ہاتھ میں کھلونے کی طرح پکڑی ہوئی کلاشنکوف سے وہ اپنے خطرناک ہونے کا پورا تاثر دیتا تھا۔

اس نے نیلم کی بات پلک جھپکائے بغیر سنی اور صرف "یس میڈم" کہتا رہا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد نیلم نے مجھے اشارہ کیا "چلو' کھڑے ہو جاؤ۔ آج ہو جائے تھوڑا سا ایڈونچر۔ پہلے اکیلے بھاگے تھے تم۔ اب ایک ساتھ فرار ہو جاتے ہیں' ہمت ہے نا۔"

میں نے مسکرا کے اقرار میں سر ہلایا "کیا واقعی۔۔۔"

"ہاں بھئی۔ چلو تم نکلو پہلے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے کہا "نہیں' پہلے آپ..."

اس نے پلٹ کے کھڑکی کو دیکھا جس کا پردہ ابھی ساکت تھا پھر وہ سامنے والی کھڑکی سے باہر اتر گئی۔ اس کے پیچھے میں نکلا تو مجھے شوفر نظر آیا۔

"ادھر سے آئیں میڈم!" وہ بولا اور آگے آگے چلنے لگا۔

ہم نے اس کے پیچھے ایک مختصر برآمدے کا فاصلہ طے کیا اور پھر نرسنگ ہوسٹل کی طرف سے سڑک پر آ گئے۔ وہاں اس کی گاڑی موجود تھی۔ نیلم بچوں کی طرح خوش نظر آ رہی تھی۔

"کتنے حیران ہوں گے جب انہیں پتا چلے گا کہ مریض ہے نہ تیماردار۔ دونوں بھاگ گئے۔ یک نہ شد دو شد" وہ گاڑی میں بیٹھ کے ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "اخبار والے تو بات کا بتنگڑ بنا دیں گے۔"

اس نے میرا کندھا دبایا "سمجھا کرو بات کو۔ ہمارے لیے ایسی پبلسٹی فائدہ مند ہوتی ہے۔ بے چارے فلمی صحافیوں کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔ کوئی سنسنی خیز اسٹوری مل جاتی ہے۔ بعد میں تردید آتی رہے۔ تردید بھی تو خبر ہی ہوتی ہے۔"

"آپ کے نام کے ساتھ میرا نام بھی تو آئے گا۔"

"بھئی یہ تو اتنی خوش قسمتی کی بات ہے....اور کوئی ہوتا تمہاری جگہ تو خوشی سے اور فخر سے پھول کے کپّا ہو جاتا۔ تم۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں ڈر ہے کسی کا۔ کسی کے بدگمان ہو کے روٹھ جانے کا؟" وہ ہنس پڑی۔

"نہیں' ایسا کوئی نہیں اور بدنامی سے بھی نہیں ڈرتا میں۔"

"تم کرتے کیا ہو؟"

"میں نے ابھی میٹرک کا امتحان دیا ہے۔"

"میرا مطلب تھا" کام کیا کرتے ہو' زندہ رہنے کے لئے۔"

"کوئی خاص کام نہیں" میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

"اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں تمہارے۔ تم نے بتایا کہ مکان کرائے کا ہے' اپنے علاج کا خرچہ بھی تم مجھ سے نہیں لینا چاہتے۔"

میں نے کہا "میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور اپنے بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگی پھر اس نے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا "یہ لو' اسے رکھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا "ایک لاکھ کا چیک؟"

"ہاں۔ یہ میری طرف سے اس تکلیف کا جرمانہ یا نذرانہ..... جو اس حادثے کی وجہ سے تمہیں اٹھانی پڑی۔"

میں نے کہا "مگر وہ میری غلطی تھی۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کے لیے پریشانی پیدا کی تھی' میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "سوری مس نیلم۔ میں یہ چیک نہیں لے سکتا۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "دیکھو۔ انکار مت کرو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھاتا۔ مجھے بلیک میل بھی کر سکتا تھا۔ پولیس کیس بنانے کی دھمکی دے سکتا تھا۔ اخبار والوں کے سامنے کچھ بھی بک سکتا تھا۔ وہ خود اس سے ایسی باتیں منسوب کر دیتے کہ میرے بدخواہوں کو موقع مل جاتا..."

میں نے چیک اس کی گود میں ڈال دیا "میں کہہ چکا ہوں کہ غلطی میری تھی اور اخبار والوں کے سامنے بھی میرا یہی بیان ہوگا۔ آپ کا احسان ہے مجھ پر۔"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے ایک ٹھنڈی سانس لی "ناصر عظیم' لوگ کہتے ہیں پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔"

"لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔"

"ہاں۔ پیسہ بعض اوقات ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ خوشی اور دل کی تسکین حاصل کرنے کا۔ روح کے آزار سے اور ضمیر کی خلش سے نجات دلانے کا۔ کوئی نیکی کرنے اور ثواب کمانے کا۔ میں بھی کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جو بات کسی کو معلوم نہیں اور معلوم ہو جاتی تب بھی مجھے فرق نہ پڑتا۔ وہ بات بھی دبا دی جاتی مگر میں جانتی ہوں کہ اس روز میں پوری طرح ہوش میں نہیں تھی۔ اگر مجھے اپنے اعصاب پر پورا قابو ہوتا تو مجھے اتنا وقت ضرور ملا تھا کہ گاڑی روک لوں۔۔۔ یا دوسری طرف موڑ کے تمہیں بچا لوں لیکن میں نشے میں تھی۔ میں نے شراب پی رکھی تھی۔ میرا ذہن مستعد نہیں تھا اس لیے یہ حادثہ ہوا' پلیز! یہ رکھ لو۔"

میں نے چیک لے لیا اور پھر درمیان سے دو ٹکڑے کر دیا۔ "اب میں بھی آپ کو بتا دوں کہ میں بھی جانتے بوجھتے آپ کی گاڑی کے سامنے آیا تھا۔ میں واقعی خودکشی کرنا چاہتا تھا۔"

وہ مجھے گھورنے لگی "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس اسپتال میں ایک نئی ڈاکٹر ہے' صادقہ۔ وہ جانتی ہے کہ میں خودکشی کیوں کرنا چاہتا تھا۔ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا اور ایک دولت مند بوڑھے سے شادی کر لی۔ یہ وجہ تھی میرے زندگی سے دل برداشتہ ہونے کی۔ بس یہاں گاڑی روک لیں۔"

"یہاں؟ کوئی کام ہے یہاں؟"

میں نے کہا "یہاں سے میں اپنے گھر جا سکتا ہوں۔"

"پیدل! تمہارا دماغ خراب ہے۔"

میں نے کہا "آپ کی گاڑی اس گلی میں نہیں جا سکتی۔"

"میں تم کو پرائیویٹ اسپتال لے جاؤں گی۔ شادمان۔۔۔"

میں نے دروازہ کھول لیا "اگر علاج کی ضرورت ہوگی تو میں ڈاکٹر سے دوا لے آؤں گا اور گھر میں رہ کے ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"پاگل مت بنو" اس نے بے بسی سے کہا اور پھر خود بھی گاڑی سے نکل آئی "اچھا چلو' میں گھر تک چھوڑ آؤں تمہیں۔"

"تھینک یو۔ اس دیوار کے پیچھے ہی گھر ہے میرا۔ چند قدم کا فاصلہ ہے' میں جا سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی بداخلاقی ہے۔ ایک کپ چائے کے لیے بھی نہیں کہو گے مجھ سے" اس نے بڑی عیاری سے کہا "گھر نہیں دکھاؤ گے اپنا؟"

"مس نیلم! وہ میرا گھر نہیں ہے۔ میں بتا چکا ہوں' اس کے علاوہ آپ کا اس گلی میں میرے ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ آپ کی پوزیشن خراب ہوگی۔"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "شوفر۔ ناصر صاحب کو سہارا دے کے لے چلو گھر تک۔"

وہ میرے ساتھ اس شکستہ دیوار کے شگاف سے گزری اور تنگ گلی میں پیدل چلتی ہوئی گھر کے دروازے تک گئی۔ شام کے وقت سرکے محکمے کے دفاتر بند تھے۔ گلی میں کھڑے ہوئے لڑکوں اور آتے جاتے لوگوں نے اسے اور اس کے شوفر کو خاصی دلچسپی اور حیرت سے دیکھا۔ اسے دیکھ کر کوہ قاف کی پری کا خیال آتا تھا تو شوفر کو دیکھ کے الہ دین کے چراغ والے جن کا۔ خود میں ابھی اس محلے میں اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔ میرے زخموں پر بندھی پٹیاں دیکھ کے ہر نظر میں شک بھرے سوالیہ نشان نمایاں ہو گئے تھے۔

ایک لڑکے نے سوچ کے کہا "او یار' یہ کون ہے؟ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔"

دوسرے نے کہا "یہ چکر کیا ہے' یہ شکلیں نئی ہیں۔"

پہلے نے چٹکی بجائی "او بے وقوف۔ یہ نیلم ہے فلم اسٹار۔"

دوسرا ہنس پڑا "پاگل دے پتر' تجھے سب نیلم لگتی ہیں۔"

ماسی ہیر نے دستک پر دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی چیخ ماری "ناصر۔ تو۔۔۔ کیا ہوا ہے تجھے..... کہاں چلا گیا تھا تو..... ہائے میں صدقے۔"

میں نے اسے پیچھے دھکیلا "سب ٹھیک ہے ماسی ہیر۔ ہمیں اندر تو آنے دو۔ مہمان بھی ہیں میرے ساتھ۔"

اس نے دروازہ بند کر دیا مگر تشویش میں جتلا رہی۔ "بتا کیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں۔ ایکسی ڈنٹ ہوا تھا تیرا؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی" اس نے مجھے اوپر نیچے سے ہاتھ لگا کے دیکھا "تا مراد ہمیں نہیں بتایا' ہم تو پاگل ہو گئے تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ رانجھا تھانے اسپتال سب جگہ دیکھ آیا۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر۔ بعد میں سب بتا دوں گا اور تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ میں اپنی غلطی سے ان کی گاڑی کے سامنے آگیا تھا اور زخمی ہو گیا تھا مگر دیکھ لو میں زندہ سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ کوئی تشویش یا پریشانی کی بات نہیں۔ انہوں نے مجھے اسپتال پہنچایا اور میرا بہت خیال رکھا۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے..... مگر ہمیں بتا دیتا۔"

میں نے کہا "کیسے بتا دیتا' میں بے ہوش تھا۔ آج ہی ہوش آیا اور میں سیدھا یہاں آگیا۔ حالانکہ یہ چاہتی تھیں کہ میں ابھی ایک ہفتہ اسپتال میں لیٹا رہوں مگر میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ گھر میں میری ماسی ہیر ہے۔ وہ زیادہ خیال رکھے گی میرا اور پھر انکل رانجھا ڈاکٹر ہیں۔"

"خاک ڈاکٹر ہیں۔ اسے تو میں ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ چل تو لیٹ جا فوراً۔ آپ تشریف رکھیں بیگم صاحبہ۔ ہمارا تو غریبانہ سا گھر ہے۔"

میں نے کہا "تم چائے لاؤ ان کے لئے۔ یہ خاص طور پر اسی لیے آئی ہیں یہاں۔ آج اس غریب خانے کی قسمت جاگ اٹھی۔"

شوفر محسن میں دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ نیلم ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں دوسری پر لیٹ گیا۔ اس گھر کی بے سروسامانی میں اس کے دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا مگر نہ اس نے کسی حیرانی کا اظہار کیا اور نہ کوئی سوال۔ اکثر لوگ جو ایسے ہی غربت اور افلاس کی زندگی والا ماضی رکھتے ہیں' جب تقدیر کی مہربانی سے یا بڑا من فضلِ ربی سے دولت میں کھیلنے لگتے ہیں تو اپنے رویے اور رہنے سہنے بدل دیتے ہیں۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا تعلق جدی پشتی رئیسوں کے خاندان سے ہے اور ان کے تو آباؤ اجداد بھی دولت کو گھر کی لونڈی سمجھتے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ بھوک کیا ہوتی ہے اور تاریک کوٹھڑیوں میں انسان کیسے جیتے ہیں اور کیسے مرتے ہیں۔

نیلم کو ایسا کوئی کمپلیکس نہیں تھا "ہم بھی ایسے ہی گھر میں رہتے تھے۔" وہ بولی "پندرہ سال پہلے۔ راولپنڈی کے محلہ وارث خان میں میرا باپ سائیکل پر کپڑے کے تھان رکھ کے پھرتا تھا پھر اس نے درزی کا کام سیکھ لیا اور گھر کے باہر والے کمرے کو دکان میں بدل دیا۔ اندر صرف ایک کمرا رہ گیا۔ اس میں ہم سب سمٹ کر رہتے تھے۔ تین بھائی اور ان کی اکلوتی بہن میں۔ معلوم ہے اس وقت میرا کیا نام تھا' شریف النساء۔ بعد میں دکان چل گئی تو ہم نے بڑا مکان لے لیا۔ اس میں تین کمرے تھے۔ دکان الگ تھی۔ میرے بھائی بھی باپ کی مدد کرنے لگے' پانچ سال میں ان سب نے الگ الگ دکان کھول لی۔ وہ سب کاریگر ہو گئے تھے پھر ان کی شادیاں ہو گئیں اور وہ بیوی بچوں کے ہو گئے۔ میں سب سے چھوٹی تھی' میں ابا کے ساتھ رہی۔ وہ بہت مشہور ٹیلر ماسٹر ہو گیا تھا۔ اس سے بڑے گھروں کی بیگمات کپڑے سلواتی تھیں۔ انہی میں ایک کسی پروڈیوسر کی بیوی تھی۔ وہ ڈائریکٹر بھی تھا اور اس کے دونوں بڑے بھائی اور بھابیاں نامور فلم اسٹار تھے۔ اس نے مجھے فلموں میں کام کرنے پر راغب کیا۔ شوق مجھے پہلے ہی تھا۔ میں نے کالج سے انٹر پاس کیا تھا۔ ڈاکٹری کے پہلے سال میں ہی تعلیم ختم ہو گئی۔ ابا کو بہت رنج تھا اس کا۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟"

"بس ایسے ہی۔ آج یہ گھر دیکھا تو پرانا وقت یاد آگیا۔ آج کوئی پہچانتا بھی ہے تو نیلم کو' میں محلہ وارث خان گئی تھی ایک بار۔ پرانے گھر کو دیکھنے مگر مجھے وہ گھر ہی نہیں ملا۔ اس کی جگہ تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔"

میں نے کہا "آپ نے یہ سب کسی انٹرویو میں بتایا؟"

وہ ہنسنے لگی "انٹرویو..... وہ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی سوال جواب لکھ کے لے آتا ہے۔ ایک ہی جیسے۔ میں دیکھ کے دستخط کر دیتی ہوں اور وہ شائع ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسا ویسا سوال ہو تو میں نکال دیتی ہوں۔"

چائے اس نے موت میں پی۔ ماسی ہیر نے اپنی ساری محبت چائے کے کپ میں چینی کے ساتھ ملائی ملا کے ڈال دی تھی پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری ایک بات مانو گے؟"

"وہ بات نہیں مانوں گا' ایک لاکھ کا چیک نہیں لوں گا۔"

"تمہیں اس کی ضرورت ہو گی۔ تم بہت کچھ کر سکتے ہو اس سے۔"

میں نے کہا "اگر آپ کو ضرورت ہے تو مجھ سے ایک لاکھ لے لیں۔ آپ بھی تو بہت کچھ کر سکتی ہیں اس سے۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی رہی۔ تاہم اس نے جھوٹ سمجھنے کے باوجود یہ بات میرا دل رکھنے کے لیے مان لی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ سے یا لہجے سے بھی میرا مذاق نہیں اڑایا اور خاموشی سے خدا حافظ کہہ کے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی ماسی ہیر کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا "ناصر' کون تھی یہ۔ بڑے اونچے گھر کی بیگم لگتی تھی۔"

میں نے کہا "یہ نیلم تھی' فلموں کی ہیروئن۔"

ماسی نے سینے پر ہاتھ رکھا "ہائے میں مر گئی۔ تو نے اب بتایا ہے مجھے اور ساتھ کون تھا اس کے۔ گھر والا تو نہیں لگتا تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ڈرائیور تھا اور باڈی گارڈ۔"

"ایک لاکھ کس بات کے دے رہی تھی تجھے؟"

میں نے کہا "نقصان کا ہرجانہ' کہتی تھی اس کی وجہ سے اتنی تکلیف اٹھائی میں نے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے یہ۔ تو نے انکار کیوں کیا؟ پاگل' ایک لاکھ کم ہوتے ہیں؟"

"ایک لاکھ کیا' میں چاہتا تو اس سے دو بھی وصول کر لیتا اور وہ ہنسی خوشی دے دیتی۔ مگر ماسی' شرافت اور نیکی کا مول نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے میری زندگی بچ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے وہیں سڑک پر پڑا چھوڑ کے نکل جاتا۔ پولیس آ کے مجھے اٹھاتی' اور اپنی ایمبولینس میں ڈال کے سرکاری اسپتال پہنچا دیتی۔ الٹا مجھ پر کیس بن جاتا کہ میں خود کشی کرنا چاہتا تھا۔"

"تو کیا جان کے آیا تھا گاڑی کے سامنے؟"

"دیکھنے والوں کو ایسا ہی لگا تھا' غلطی میری تھی کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا اس وقت۔ فکر تو ہوئی تھی۔ نیلم مجھے اپنی گاڑی میں اسپتال لے گئی۔ اس کا بہت اثر رسوخ ہے۔ ڈاکٹروں نے پوری توجہ دی۔ میں تین دن بے ہوش پڑا رہا۔ آج ہوش آیا تو سب پتا چلا۔ نیلم روز آتی رہی اور دیکھ لو' گھر چھوڑ کے گئی ہے۔ یہ شرافت ہے اس کی۔ لوگ تو ایک ہی رائے رکھتے ہیں فلم میں کام کرنے والی ہیروئنوں کے بارے میں لیکن سب ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میں اس سے ایک لاکھ لے لیتا تو بڑے شرم کی بات ہوتی۔ کہنے والے تو یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ میں نے یہ حرکت جان بوجھ کے کی تھی۔"

"حادثے کی شادو کو بھی خبر نہیں ہو گی۔ رانجھا گیا تھا اس سے پوچھنے کے لیے مگر وہ نہیں ملی۔ آج چوتھا دن تھا۔ وہ بھی نہیں آئی تیرا معلوم کرنے کے لئے۔" ہیر نے خفگی سے کہا۔

"وہ اب نہیں آئے گی ماسی۔" میں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا "کبھی نہیں آئے گی' وہ چلی گئی ہمیشہ کے لئے..... سمجھو مر گئی۔"

"ہائے کیسی باتیں کرتا ہے تو۔"

"اس نے شادی کر لی ہے اسی وکیل سے ماسی جس کی کوٹھی میں وہ رہتی تھی۔ یہ ہے مانے والی بات؟ مگر اس بڈھے کی دولت پر ریجھ گئی وہ۔"

ماسی ہیر کا حیرت' صدمے اور خوف سے بُرا حال ہو گیا "نہیں ناصر۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا مذاق مت کر' شادو ایسی نہیں ہے۔"

"شادو ایسی ہی تھی" میں نے چلا کے کہا "دھوکا میری نظر کو ہوا تھا کہ میں اس کی فطرت کو پہچان نہیں سکا۔ بے وقوف بنایا اس نے مجھے محبت کے نام پر۔ محبت صرف فلموں اور کہانیوں میں ہوتی ہے اور وہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔ زندگی میں صرف دولت کی اہمیت ہے۔ تو بھی چھوڑ دے گی رانجھے کو اگر آج تجھے موقع ملے۔ تو بھی بک جائے گی۔ کوئی عورت اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔ مجبوری کو وفا کا نام دیتی ہے' خریدار نہ ملے تو وفادار رہتی ہے۔"

ماسی ہیر رونے لگی' پھر میں بھی رونے لگا۔ رانجھا آیا تو وہ بھی ایسے بیٹھ گیا جیسے کوئی میت والے گھر میں جا کے بیٹھتا ہے۔ وہ مجھے تسلی دیتا رہا' سمجھاتا رہا۔ صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کرتا رہا۔ اس رات کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ گھر میں ایک سوگوار ماتمی فضا مسلط رہی۔ رانجھا نے مجھے دو خواب آور گولیاں دیں پھر لائٹ بجھا کے اور دروازہ بند کر کے اس نے کہا کہ میں سو جاؤں۔ وہ میری طرف سے بہت پریشان تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت میں اور صدمے کے باعث میں کہیں اپنی جان لینے کی کوشش نہ کروں۔ وہ بار بار دروازہ کھول کے خاموشی سے اندر جھانکتے تھے اور مطمئن ہو جاتے تھے کہ گولیوں نے اپنا کام دکھایا ہے اور میں سو گیا ہوں۔

میں اندھیرے میں اس وقت کی یادوں کو فلم کی طرح دیکھتا رہا جو بہت پیچھے رہ گئی تھیں شادو سے پہلی ملاقات کا پہلا لمحہ۔ دید کی ساعتِ نایاب کی اولیں یاد۔ دل کی پہلی شوخ دھڑکن۔ عشق کی پہلی کسک اور اس کے بعد گزرنے والے اَن گنت دنوں کی اَن گنت ملاقاتوں کا ہر عکس میرے خیالوں میں زندہ و تابندہ تھا۔ میں پھر اپنے گزرے ہوئے وقت سے گزرا لیکن یہ ایک اذیت اور کرب کو لہو رلانے والا سفر تھا۔ صحنِ گلشن کے جن راستوں پر بہار نے گلوں کے سب رنگ بچھا رکھے تھے وہاں اب پُرآزار کانٹوں اور سنگریزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ خوابوں کا نگر اس بستی کی طرح سنسان تھا جہاں کوچہ و بازار میں اور گھروں میں صرف موت رہتی ہو۔ زندگی کے سارے آثار' انسان' درخت اور پودے' پرندے اور حشرات الارض۔ جانور اور انسان سب کو اجل نے سمیٹ لیا ہو۔

مجھے وہ سب یاد آیا جو شادو نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ گزرے ہوئے روز و شب یاد آئے۔ اس کے وعدے اور عہد و پیماں یاد آئے۔ اس کی وارفتگی اور بے قراری یاد آئی۔ کیا وہ سب اداکاری تھی؟ ذرا نا تھا۔ نہیں' وہ شادو ہی دوسری تھی۔ اس کی محبت میں فریب نہیں تھا اور جھوٹ نہیں تھا۔ اس نے جان کی بازی لگا کے اپنے عشق کو صداقت کی سند دی تھی۔

پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟ وہ شادو اچانک کیسے بدل گئی؟ میں سوچتا رہا اور اندر ہی اندر اپنے لہو کی آگ میں جلتا رہا۔ مجھے رئیس کی سخت کمی محسوس ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ہوتا تو ہم مل کے شادو کی باتیں کرتے۔ سوچتے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اسے گالیاں دیتے' روتے اور طے کرتے کہ جب وہ واپس آئے گی تو اسے ایسی بے بھاؤ کی سنائیں گے' ایسی سزا دیں گے۔

مگر میں اکیلا تھا اور جو کچھ میں سوچ رہا تھا' لاحاصل تھا۔ حالات کی کسوٹی پر ہی انسان کے کردار کی آزمائش ہوتی ہے۔ شادو نے پہلے میرا سہارا لیا۔ وہ اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی مگر کوئی اور اس کے اعتماد پر پورا اترنے والا ہی نہیں تھا۔ میں نے خود کو اس قابل ثابت کیا۔ اس کے آس پاس منڈلانے والے فقیروں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقابلے میں یقیناً میں شہزادہ تھا۔ وہ ہیرو تھا جو اسے خواب دے سکتا تھا اور خوابوں کی تعبیر دے سکتا تھا۔ وہ مجھے پسند کرنے لگی اور یہی پسند تھی جس نے محبت کو عشق اور عشق کو جنون میں بدل دیا مگر یہ سمندری طوفان تھا جو آیا اور گزر گیا۔ اس قید خانے سے نکل کے شادو نے ایک نئی دنیا دیکھی جو دولت کے ساتھ عزت اور شہرت کی چمک دمک رکھتی تھی۔ دولت صرف زندگی کو عیش اور آسائش فراہم کرتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے ساتھ اس نے ہائی سوسائٹی کا لائف اسٹائل بھی دیکھا جس میں صرف گلیمر نہیں تھا' تعلیم اور تہذیب' اختیار اور اقتدار' حسب نسب اور اپر کلاس کا احساسِ تفاخر بھی تھا۔ انتہائی پستی سے وہ اچانک انتہائی بلندی پر پہنچ گئی۔ ایک جست میں کہیں رکے بغیر۔ اگر وہ میرا ساتھ دیتی تو اس مقام تک پہنچنے کے لیے اسے برسوں انتظار کرنا پڑتا اور یہ بھی یقینی نہیں تھا کہ میری جدوجہد کامیابی کی اس منزل تک پہنچے۔ ابھی میں صرف ایک میٹرک پاس لڑکا تھا جس کے ارادے بہت بلند تھے اور جس کے پاس حوصلے کے ساتھ ذہانت بھی تھی مگر تقدیر بھی یاور ہوگی' یہ ضمانت بہرحال نہیں تھی۔ اس نے غیر یقینی مستقبل پر یقینی حال کو اپنی دسترس میں دیکھا تو وفا کی راہ اسے دشوار لگی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

یہ بھی نہیں سمجھا جاسکتا تھا کہ غلطی میں نے کی اور اسے ہاشمی صاحب کے گھر میں چھوڑا۔ میں کیسے اندازہ کرسکتا تھا کہ ہاشمی صاحب اس کے لیے جو ترغیب کا جال پھیلائیں گے' وہ اتنی جلدی اس میں گرفتار ہوجائے گی۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مزاحمت کی بے پناہ صلاحیت ہے اور وہ حالات سے لڑسکتی ہے۔ دراصل یہ حالات مختلف تھے۔ جہاں اس کے لیے لڑنا ضروری تھا وہاں وہ جم کے لڑی اور اس حصار کو توڑ کے نکلنے میں کامیاب رہی جس میں اس کی زندگی محض شرمندگی تھی۔ یہاں حالات نے اسے اسیر کرلیا اور اسے لڑنا پڑا ہوگا صرف اپنے ہی احساس سے۔ ورنہ مزاحمت کی ضرورت ہی نہیں۔ مفاہمت کرکے وہ سب آج ہی حاصل کرسکتی ہے جو میرے ساتھ مستقبل کی موہوم امیدوں میں چھپا ہوا ہے۔ میرے ساتھ کامیاب' باعزت اور پُرعیش زندگی ایک جوئے کی طرح تھی۔ وہ دس بیس سال میرا ساتھ دیتی اور پھر اسے معلوم ہوتا کہ اس نے سب کچھ داؤ پر لگا کے بھی بازی ہار دی پھر اس کے بعد داؤ پر لگانے کے لیے بھی کیا ہوتا؟ شاید خود اسے اندازہ نہیں ہوگا کہ اس کے جذبات کا حصار اتنا کمزور ثابت ہوگا۔ آدمی ایسے ہی خود اپنی کمزوری کا شکار ہوتا ہے۔ شادو نے یقیناً میرے بارے میں سوچا ہوگا۔ میرے ردِعمل کے بارے میں بھی سوچا ہوگا کہ مجھے دکھ ہوگا۔ یہ احساس ہوگا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ اس کی بے وفائی کا صدمہ مجھے پاگل کردے گا۔ میں ناصر کے چچا کے انتقام کی خواہش سے ابھی تک کنارہ کش نہیں ہوا تھا۔ میں شاہ جی جیسے سفاک دشمن کے سامنے بھی مرنے مارنے کے لیے کھڑا ہوگیا تھا۔

کیا میں اسے معاف کردوں گا؟ نہیں' میں محبت کے نام پر بے وقوف بنانے والی اس لڑکی سے بھی انتقام ضرور لوں گا جس کی خاطر میں نے کاسۂ گدائی اٹھانا بھی قبول کرلیا تھا۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر کی زندگی چھوڑ کے میں نے فقیروں کے ساتھ رہنے کی شرط مان لی تھی۔ میں شادو کو اس جرمِ بے وفائی کی سزا دینے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ میں ہاشمی صاحب کو گولی مار سکتا ہوں۔ شادو کو قتل کرسکتا ہوں۔ جذبات کی بلاخیز طوفانی اور اندھی کردینے والی آندھی میں میرے ہوش اڑجائیں تو میں خود اپنے آپ کو بھی مار سکتا ہوں۔

مگر بالآخر شادو نے یہ مشکل فیصلہ کرلیا ہوگا کہ اسے ہاشمی صاحب کی پیش کش قبول کرلینی چاہیے۔ ہاشمی صاحب نے یقیناً اسے بڑی ہوشیاری سے قائل کیا ہوگا کہ ناصر سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ صرف باتیں کرسکتا ہے شیخی خورا۔ کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ویسے بھی اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ شناختی کارڈ بنوا کے کوئی بڑا نہیں بن جاتا۔ ابھی اس نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ پاس ہوگیا تب بھی کون سا تیر مار لے گا۔ اس کی حرکتوں سے تو یہی لگتا ہے مجھے کہ اس کا انجام جیل کی دیواروں کے پیچھے ہوگا۔ سارے زمانے کو اپنا دشمن بنالیا ہے ابھی سے اور چکر چلاتا پھرتا ہے۔ رئیس جیسے لوفر اور بدمعاش اس کے دوست ہیں۔ رہتا ہے وہ اس مکان میں جہاں میری ملازمہ نے رہنا پسند نہیں کیا۔ آج نکال دوں تو سڑک پر کھڑا نظر آئے۔

ہاشمی صاحب نے شادو کو میرے خلاف کرنے کے لیے الگ حکمتِ عملی اپنائی ہوگی اور شادو کو اپنانے کے لیے دوسری۔ انہوں نے اسے سبز باغ دکھائے ہوں گے جو واقعی سبز ہیں۔ ان کے ساتھ وہ اونچی سوسائٹی کے لوگوں سے ملی۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں گئی۔ ڈنر اور پارٹیوں میں گھومتی رہی۔ ہاشمی صاحب نے ایک شاندار گاڑی مع شوفر اس کے لیے وقف کردی ہوگی۔ ڈھیروں کیش اس کی تحویل میں دے دیا ہوگا۔ اس کی خواہش کے بغیر ہی وہ سب تحفے تحائف پیش کردیے ہوں گے جو عورت کی کمزوری ہیں۔ اچھے کپڑے' زیورات' ہیروں کے سیٹ اور بالآخر ہاشمی صاحب نے کہا ہوگا کہ یہ کوٹھی میں تمہارے نام کردوں گا۔ میرا سب کچھ تمہارا ہوجائے گا۔ تم اسی قابل ہو۔ ایک میٹرک پاس لاوارث' بے نسب اور بے روزگار لڑکے کی محبت میں کیا رکھا ہے۔ وہ تمہارے لائق نہیں۔ تم سے چار سال چھوٹا بھی ہے۔

اور آہستہ آہستہ شادو کی مزاحمت کمزور پڑتی گئی ہوگی۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ انہی کے ذہن سے سوچنے لگی ہوگی اور ہاشمی صاحب جیسا گھاگ آدمی آہستہ آہستہ پیش قدمی کرتا رہا ہوگا یہاں تک کہ شادو نے بھی سوچا ہوگا کہ ناصر کی زندگی اپنی ہے۔ میری اپنی' صرف محبت کی خاطر میں اپنی زندگی اس کے خوابوں پر قربان کروں؟ پھر میرے خوابوں کا کیا ہوگا؟ جو آج میری دسترس میں ہے

اسے گنوانے کے بعد پچھتانا بھی لاحاصل ہوگا۔ جذبات میں زبردستی کا کیا دخل۔ جو کل پسند تھا آج پسند نہیں۔ اینڈ دیٹ از دیٹ۔

ہاشمی صاحب نے اپنا سب کچھ شادو کے حوالے کردیا اور شادو کو اس کے سارے خوابوں کی تعبیر دے دی۔ بدلے میں شادو نے خود کو ان کے حوالے کردیا اور وہ سب بھول گئی جو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ہاشمی صاحب اسے باہر لے گئے۔ تم فکر مت کرو' تمہاری تو گرد کو نہیں پہنچ سکتا وہ۔ اس کا تمہارا سامنا نہیں ہوگا کبھی۔ یہاں آیا تو گارڈ ہے۔ وہ اسے باہر سے ہی بھگا دے گا۔ اس کی بدمعاشی یہاں نہیں چلے گی۔ یہ اسے سمجھایا جائے گا۔ پہلے شرافت سے اور اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو دوسرے طریقے بھی ہیں۔ آخر عدالت میں ہم انہی لوگوں کی وکالت کرتے ہیں۔ چور' ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کی۔ جس زبان میں شاہ جی جیسے شخص نے بات سمجھ لی تھی وہ ناصر بھی سمجھ لے گا۔

مجھے شاہ جی کی بات بھی یاد آئی۔ اس نے شراب کے نشے میں وہ سچ بول دیا تھا جو اس وقت مجھے ہوش سے بے گانگی کی علامت لگا تھا۔ تیرے پاس ہے عزت جو تو اسے دے گا؟ اور شادی کرے گا تو شادو سے؟ وہ تجھ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں اسے تجھ سے زیادہ۔ تیری اوقات کیا ہے۔

شاہ جی واقعی اسے مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کی فطرت کو مجھ سے بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ اس کے جذبات کی آندھی ایسے ہی چڑھتی ہوگی اور اترجاتی ہوگی۔ اس کے مزاج میں اور فطرت میں قرار اور قیام نہیں ہوگا یا شاید وہ AMBITIOUS ہوگی۔ حصولِ مقصد کی خواہش میں وہ کسی بھی انتہا تک جاسکتی ہے اور ایک مقصد حاصل ہوجائے تو دوسرے مقصد کے لیے بھی اس کی کوشش میں اتنا ہی دیوانگی کا خلوص ہوگا۔ زندگی کے مقاصد وقت کے ساتھ بدلتے ہیں۔ اس نے فقیروں کی دنیا سے نکلنے کے لیے میرا سہارا لیا تو یہ ایک مقصد تھا۔ معاشرے کے سب سے ذلیل اور نچلے طبقے سے انتہائی معزز اپر کلاس میں شامل ہونا دوسرا مقصد تھا جس کے لیے اس نے ہاشمی صاحب کا سہارا لیا اور کامیاب رہی۔ اس نے میرا بھی جذباتی استحصال کیا اور ہاشمی صاحب کا بھی۔ اس کے نزدیک مقاصد ہی اہم تھے' جذبات نہیں۔ وہ فقیروں کی دنیا میں پلی بڑھی تھی۔ چہرے بدلنے والوں کو دیکھتی تھی اور خود بھی چہرے بدل لیتی تھی۔ جذبات کے کھیل میں ماہر فقیر بڑے منجھے ہوئے اداکار تھے جو اندھے نہیں تھے وہ آنکھوں والوں کو اندھے ہی نظر آتے تھے۔ جو صحت مند تھے' اتنے معذور اور لاچار لگتے تھے کہ دیکھنے والوں کے دل پگھل جائیں۔ ان کی کامیابی کا انحصار اچھی اداکاری اور اچھی صداکاری پر تھا۔ یہ سب شادو نے بچپن سے دیکھا تھا اور وہ استاد کی بیٹی تھی جو کسی طرح بھی استاد سے کم نہیں تھی۔ اس نے محبت کی اداکاری کی تو مجھے پاگل کردیا۔ اپنی سے دگنی عمر کے ہاشمی صاحب کا دماغ عقل کے دلائل سے بھرا پڑا تھا لیکن ان کا علم اور تجربہ بھی دھرا رہ گیا۔ آج شادو کے پاس سب کچھ ہے اور وہ لندن پیرس' نیویارک میں گھوم رہی ہے۔ کل کیا ہوگا؟ یہ شاید ہاشمی صاحب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔

میں صبح تک جاگتا اور سوچتا رہا۔ کبھی عقل پر جذبات حاوی آجاتے تھے تو دل یقین کرنے سے انکار کردیتا تھا کہ شادو ایسی بھی ہوسکتی ہے پھر عقل بھرپور جواب دیتی تھی اور جذبات کی سوچ کو بلڈوز کردیتی تھی۔ مجنوں کی اولاد' عقل کے اندھے' اُلو کے پٹھے' اب بھی شک ہے کوئی۔ اس کی نظر تو پہلے ہی بدلی ہوئی تھی۔ بیس بائیس دن تو اس کی قسم کو مقدس حلف سمجھے بیٹھا رہا اور اس نے مہلت سے فائدہ اٹھا کے فیصلہ کرلیا۔ اب تو کیا کرے گا؟ خودکشی یا قتل؟ اس سے کیا حاصل ہوگا۔ بیسویں صدی کے ناکام عشق پر ایک اور کلاسیکی داستان وجود میں آئے گی؟ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے ساتھ ناصر شادو کا نام بھی الف لیلوی تاریخ میں رقم ہوگا اور اس پر دردناک فلمیں بنائی جائیں گی۔ نہیں' ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس جذبات کے پاگل پن سے دنیا نہیں بدلے گی۔ ایک زندگی کو ایک لڑکی پر قربان کرنے کے پاگل پن پر دنیا ہنسے گی۔

صبح تک میں ذہنی اور جسمانی طور پر اتنا بے حال ہوگیا تھا کہ مجھ میں رونے' سوچنے اور فیصلہ کرنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے آرام کے لیے نیند کی مہربان آغوش کی ضرورت تھی۔ میں خود سے بھی فرار چاہتا تھا۔ پناہ اور سکون چاہتا تھا۔ ایک جذباتی حادثے نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا پھر نیلم کی گاڑی سے ٹکرا کے میں جسمانی طور پر بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ تین دن کی بے ہوشی نے مجھے ہر چوٹ کے درد کے احساس سے بیگانہ کردیا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ بے ہوشی اور بے حسی کا وقفہ کچھ اور طویل ہوجاتا۔ میں سکون سے سوتا رہتا۔ ذہنی انتشار سے محفوظ اور اس درد سے بے نیاز جو جسم میں اندر تک اتر گیا ہے۔ ہفتے' مہینے اور سال گزر جاتے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس بے ہوشی میں ابدی نیند کو گلے لگالیتا یا جاگتا تو اس وقت جب وقت اتنا آگے نکل گیا ہوتا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے عمرِ رفتہ کی مسافت میں کسی یاد کا دھندلا سایہ بھی نہ ہوتا۔ شادو؟ کون شادو؟ اچھا وہ..... مسز ہاشمی' ہاں وہ امریکا میں ہے آج کل۔ ہیومن رائٹس کمیشن کے اجلاس میں خواتین کے مسائل پر پاکستان کی نمائندگی کرے گی۔ دو بچے ہیں اس کے۔ بڑا لڑکا اسکول میں ہے۔ لندن میں داخل کرادیا ہے اسے۔ شاہ جی تو مرگیا۔ چھ مہینے ہوگئے۔ مسٹر ہاشمی نے اپنے فادر ان لا کا لندن کے کرامویل اسپتال سے علاج کرایا تھا مگر اس کو ہارٹ پرابلم تھی اور وہ شراب نہیں چھوڑتا تھا۔ رئیس؟ ہاں وہی رئیس خبیث..... وہ جیل میں ہے۔ ماسی ہیرا اور ڈاکٹر رانجھا کا کچھ پتا نہیں۔ ہاشمی صاحب نے انہیں نکال دیا تھا اپنے مکان سے۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میرے بھائی۔ پہاڑ پر چڑھنے والے پلٹ کر نہیں دیکھتے ورنہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشیب انہیں کھینچنے لگتا ہے۔ تمہیں اوپر جانا ہے تو آگے دیکھو۔ پیچھے اب کیا رکھا ہے۔ ماضی کے پُر آسیب قبرستان میں گھومتے رہو گے اور پرانی یادوں کے مدفن پر کتبے پڑھ پڑھ کے روتے رہو گے تو وقت بہت آگے نکل جائے گا۔ کس کو فرصت یا ضرورت ہے کہ تمہارے لیے رکے۔ وہ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ شادو کو تم میٹرک کا امتحان سمجھ لو۔ پاس کرلیا تو اگلا مرحلہ ہے انٹر کا۔ عشق کے ایف اے کا کورس کوئی اور کراوے گی۔ نائلہ "فاطمہ" نوری یا نورین۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ ایف اے کے بعد بی اے' پھر ایم اے۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ بس پاس کرتے جاؤ۔ جب ایف اے کرلیا تو میٹرک کا سرٹیفکیٹ بے کار۔ ایم اے کرلیا تو بی اے کی ڈگری کا کیا ذکر۔

سوتے میں میرا دماغ جاگتا رہا۔ میں خود اپنے خیالوں سے باتیں کرتا رہا۔ ہنستا اور روتا رہا۔ نہ جانے کس وقت مجھے احساس ہوا کہ ماسی ہیر میرے بستر کی پٹی پر بیٹھی ہے اور ڈاکٹر رانجھا میرا معائنہ کررہے ہیں "کچھ نہیں' کچھ نہیں۔ سب خیر ہے۔"

ہیر نے روتے ہوئے کہا "رات بھر ایسی ہی حالت رہی ہے۔"

"ہوتا ہے بھئی۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ لڑکا بڑا سیانا اور جی دار ہے۔ خیر ہے' ٹھیک ہوجائے گا۔ بس اسے کہیں جانے مت دینا۔ آرام کرے اور کھائے پیئے' میں دوائی دے دیتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں" وہ بولی "میں بڑے ڈاکٹر کو لاؤں گی' پیچھے ہی رہتا ہے۔"

"اوئے پاگل۔ یہ بڑے ڈاکٹر دیتے ہیں ولایتی دوائیں جو ہمارے دیسی مزاج کے موافق نہیں ہوتیں۔ ہم دیسی بندوں کے مرض بھی ڈھیٹ ہوتے ہیں اور یہاں کے تو جراثیم بھی بڑے ڈھیٹ ہیں۔"

"میں نے کہہ دیا نا۔ خبردار جو اس پر اپنی ڈاکٹری آزمائی۔ ادھر بیٹھ کے بندوں کو پتا نہیں کیا گند بلا کھلاتا رہتا ہے۔ حشر والے دن پکڑا جائے گا جب ایک سو ایک بندہ آجائے گا دعوے لے کر" وہ چلانے لگی۔

"کبھی دیکھ آکے ادھر' اللہ نے کیسی شفا دی ہے میرے ہاتھ میں۔ کتنے مریض آتے ہیں" رانجھا مشتعل ہوگیا۔

"کسی دن قبرستان میں بیٹھ کے دیکھ' کتنے جنازے آتے ہیں۔"

میں نے آنکھیں کھول کے کہا "مجھے نہ دیسی علاج کی ضرورت ہے نہ ولایتی کی۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوجاؤں گا۔"

"اللہ تیرا شکر ہے" ہیر نے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے۔

ڈاکٹر رانجھا کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے "تو بھی خیر سے اب اٹھ جاؤ۔ کچھ کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔"

"میں تیرے لیے گرم دودھ لاتی ہوں۔ ملائی اور بادام والا۔" ہیر کھڑی ہوگئی۔

موقع ملتے ہی ڈاکٹر رانجھا نے مجھے ایک لیکچر دیا جس کا موضوع تھا بیماریِ عشق۔ فرمایا انہوں نے کہ ٹی بی کی طرح یہ بھی جوانی کا مرض ہے مگر ستر سال میں بھی اس کا وائرس لگ جاتا ہے تو بڑی خرابی کرتا ہے لیکن اللہ نے ہر مرض کی دوا بھی پیدا کی ہے۔ ٹائیفائڈ کی طرح عشق کا روگ بھی سخت ہوتا ہے اور مکمل شفایابی میں کچھ وقت لگتا ہے پھر بھی بعض اوقات کچھ نشانیاں باقی رہ جاتی ہیں مثلاً بے خوابی اور بے قراری۔ دل کا درد اور زخمی جگر۔ کچھ لوگ شادی کرلیتے ہیں یا خودکشی۔ ایک ہی بات ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ عشق میں نے کیا مگر شادی کسی اور نے کرلی۔ حکما کا قول ہے کہ لڑکی اور ویگن کے نکل جانے پر کیا رونا' دوسری آتی ہی ہوگی اور اللہ کے ہر کام میں بڑی مصلحت پوشیدہ رہتی ہے جس کو بندے کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔

"اپنی بھی مت ماری گئی تھی' جو پہلی ویگن آئی اسی میں دوڑ کے سوار ہوگئے۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کدھر جارہی ہے۔ شالیمار باغ کہ لنڈے بازار اور دیکھ لو اب تمہارے سامنے ہے ہمارا حال۔ ذرا صبر سے کام لیا ہوتا تو اپنی مسرت نذیر' نیلو اور صبیحہ...... یہ سب اس زمانے میں کنواری بیٹھی تھیں۔ رشتہ ہی نہیں ملتا تھا۔ ماشاء اللہ سے تم دیکھتے اس زمانے میں کیا صحت تھی اور صورت شکل تو خیر لاکھوں میں ایک تھی۔"

"بس کر بڈھے بس کر!" ماسی ہیر نے دودھ سے اوپر تک بھرا ہوا گلاس میرے سرہانے رکھ دیا "ابھی دکھادوں گی فوٹو نکال کے۔ شادی کے وقت دولہا بن کے کیسا لگ رہا تھا۔"

"کیسا لگ رہا تھا؟" ڈاکٹر رانجھا نے اپنی خودی کو بلند رکھا۔

"جیسے کھیتوں میں کھڑا نہیں کرتے..... دو ڈنڈوں کی ٹانگیں' لکڑی کے بازو۔ اوپر الٹی ہانڈی کا سر۔ کوے اور چڑیوں کو ڈرانے والا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ڈاکٹر رانجھا احتجاجاً واک آؤٹ کرگئے۔ ماسی ہیر نے میرے پاس بیٹھ کے مجھے دوسرا لیکچر دیا جس میں صرف محبت تھی اور ماتا کی تشویش تھی "دفع کر اس گشتی کو۔ وہ نہیں تھی تیرے لائق۔ تجھے کوئی کمی ہے۔ میں لاؤں گی تیرے لیے ایسی ڈھونڈ کے۔ دیکھے گی تو جل کے کوئلہ ہوجائے گی۔ وہ اس بڈھے خصم کے ساتھ بھی نہیں رہے گی زیادہ دن۔ تو بے شک لکھ لے میری بات۔ ادھر ولایت میں کسی گورے سے یاری کرلے گی۔ شادی بھی کرلے گی' رہے گی پھر لندن میں..... ایسی عورتیں کوئی گھر بساتی ہیں۔"

میں کسی بحث یا جھگڑے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں خلا تھا اور اپنی بے بسی و بے کسی کا احساس۔ ڈاکٹر رانجھا یا ماسی ہیر کی باتیں جاہلانہ سہی مگر ان کی نیتوں میں خلوص تھا اور اپنائیت تھی۔ وہ میرے لیے دکھی تھے اور میرا دکھ کم کرنا چاہتے تھے۔ انہیں کسی سائیکاٹرسٹ کے انداز میں گفتگو کا فن نہیں آتا تھا لیکن وہ

میرا اعتماد بحال کرنے' مجھے زندگی کی اہمیت اور دلکشی کا احساس دلانے اور میرا ذہنی انتشار مٹانے کے لیے جو کچھ کررہے تھے' فیس مشورہ کے بغیر کررہے تھے۔

ماسی ہیر نے جس بڑے ڈاکٹر کا ذکر کیا تھا وہ بلاشبہ اچھا ڈاکٹر' اچھا آدمی اور اچھا پڑوسی ثابت ہوا۔ اس نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور مجھ سے بہت سے سوالات کیے۔ "مسٹر ناصر۔ آخر کیا پریشانی تھی آپ کو اسپتال میں۔ یو آر سو لکی' نیلم کی ایک نگاہ کے لیے ترستے ہیں لوگ۔ اتنی توجہ مل رہی تھی آپ کو۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب' میں کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا۔ کیا میرا علاج گھر پر ممکن نہیں؟"

"ممکن کیوں نہیں۔ اگر آپ ہفتہ دس دن لیٹے رہیں۔ دوا کھاتے رہیں باقاعدگی سے۔ اور کھائیں پئیں تو ٹھیک ہوجائیں گے مگر ایسا ہوگا نہیں۔"

"ایسا کیوں نہیں ہوگا آخر؟"

"اس لیے کہ اسپتال میں مریض پابند ہوتا ہے اور گھر میں مرضی کا مالک۔ آپ نے تو ثابت کردیا ہے کہ آپ خودسر ہیں۔ خیر' میں دوائیں بھیج دیتا ہوں۔"

"آپ نسخہ لکھ دیں' میں منگوالوں گا۔"

"میرے پاس سب مفت کی دوائیں ہیں۔ فزیشن کے SAMPLE آتے ہیں جو میں سارے محلے کو دیتا ہوں اور سب جاننے والوں کو بھی۔ میں کوئی احسان نہیں کررہا ہوں تم پر۔ پڑوسی کی حیثیت سے میرا تم پر حق ہے اور تمہارا مجھ پر۔ خدا حافظ۔"

ماسی ہیر نے اس کے جانے کے بعد کہا "سن لی ہے نا اس کی بات۔"

"مجھ سے پہلے تم پوری اسٹوری سناچکی تھیں۔ کیا ضرورت تھی اسے نیلم کے بارے میں بتانے کی" میں نے خفگی سے کہا۔

"لے۔ اسے پہلے ہی معلوم تھا۔ اس کے بھائی نے دیکھا تھا تجھے نیلم کے ساتھ آتے ہوئے۔ سارے محلے کو پتا ہے" وہ بولی۔ "اور اب تو سن لے کان کھول کے' باہر نہیں جانا ہے تونے۔ میں باندھ دوں گی رسی سے اور دروازے میں تالا ڈال دوں گی۔"

"اور بھی کچھ کرنے کو رہ جائے تو ٹانگیں توڑ دینا" میں نے چڑ کے کہا "بندوق لے کر کھڑی ہوجانا دروازے پر۔"

"چل یہ دودھ پی لے۔ ناراض مت ہو' میں تیرے بھلے کے لیے کہتی ہوں۔"

میں نے ہاتھ مار کے گلاس گرادیا "یہ سب بکواس ہے۔ کوئی میرا بھلا نہیں چاہتا۔ اپنے بھلے کے لیے' اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے محبت کا ڈراما کرتے ہیں سب۔ یہ ڈراما میری ماں نے بھی کیا ہوگا میرے باپ کے ساتھ۔ اپنے بچے کے ساتھ بھی کیا ہوگا۔ اور جب پال نہیں سکے تو پھینک آئے یتیم خانے میں۔ آخر کیوں؟ کیا ان کے پاس مجھے کھلانے کے لیے کچھ نہیں تھا؟ یا میرا وجود ان کے گناہوں کی جیتی جاگتی علامت بن گیا تھا اور وہ بدنامی کے اس داغ کو اسی طرح چھپاسکتے تھے....."

"ناصر.....!" وہ چیخ کے بولی "بے غیرت۔ بے شرم' جانے بغیر الزام لگاتا ہے ان پر۔ اپنے ماں باپ پر' تجھے کیا معلوم وہ کون تھے اور ان کے ساتھ کیا ہوا۔ ایک ناصر عظیم کو جانتا تھا تو بھی۔ وہ کیسے یتیم خانے پہنچا تھا۔ کیا ایسا ہی ان کے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا۔ کیا پتا وہ زندہ ہی نہ ہوں۔ کسی نے انہیں بھی ماردیا ہو یا وہ حادثے میں مرگئے ہوں۔ کیوں کسی ثبوت کے بغیر ان پر اور اپنے آپ پر ایسا گندا الزام لگاتا ہے؟"

"چلانے سے کچھ نہیں ہوگا ماسی۔ حقیقت نہیں بدلے گی۔ اپنے ماں باپ کو معاف بھی کردوں میں تو شادو کو کیسے معاف کروں' وہ بھی میرا بھلا چاہتی تھی۔ رئیس بھی میرا بھلا چاہتا تھا۔ سب دھوکے باز' مطلبی....."

وہ پھر رونے لگی "یہ ٹھیک ہے کہ میں تیری کچھ نہیں لگتی۔ کوئی رشتہ نہیں ہے میرا تیرے ساتھ۔ تو خود ہمیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا یہاں۔ ہم پہلے ہی اکیلے تھے۔ تو کہے گا تو چلے جائیں گے یہاں سے۔ ہماری کوئی غرض نہیں ہے تجھ سے۔ جیسے اب تک زندگی گزری' باقی بھی گزر جائے گی لیکن ہمیں لالچی اور مطلبی مت کہہ۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "ماسی ہیر۔ مجھے معاف کردو۔ میں ہوش میں نہیں ہوں۔ میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ تم جانتی ہو۔"

وہ روتے روتے مسکرانے لگی اور جھک کر شیشے کے گلاس کے ٹکڑے سمیٹنے لگی "بادام تو ہیں لیکن مجھے دودھ کے لیے بازار جانا پڑے گا۔"

"ماسی۔ دودھ میں بعد میں پی لوں گا' ابھی تم مجھے چائے دے دو۔ میرا سر بھاری ہورہا ہے' نیند سے آنکھیں بوجھل ہیں۔"

"بس تو پھر چائے پی اور سوجا۔ میں دیسی گھی بھی ڈالوں گی اس میں۔ یا اس میں ایک انڈا اور مکھن کی ٹکیا ڈال دوں؟ خالی چائے پی کے نیند خراب کرنا ضروری ہے؟"

میں نے اپنا سر پکڑلیا۔ "چائے میں دیسی گھی' انڈا' مکھن.....؟"

میرے اگلے تین دن ایسے ہی گزرے۔ دواؤں کے اثر سے مجھ پر غنودگی طاری رہتی تھی۔ ماسی نے خود کو کُلی طور پر میرے لیے وقف کردیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر ایک گھنٹے بعد مجھے دیسی گھی پلاتی۔ پسے ہوئے بادام والا گاڑھے دودھ کا آمیزہ پلاتی۔ چکن سوپ میں انڈا پھینٹ کر پلاتی۔ اللہ نے مجھے یوں بچایا کہ دوسرے دن ہی میرا ہاضمہ جواب دے گیا اور ڈاکٹر نے میری خواہش کے عین مطابق سادہ غذا کا مینیو منظور کردیا۔ اس سے ماسی ہیر کو خاصی مایوسی ہوئی اور وہ کسی حد تک رانجھے کی ہم خیال ہوگئی کہ ولایتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دواؤں سے علاج کرنے والے ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے۔ ماسی نے جتنی میری خدمت کی اس سے زیادہ حفاظت کی۔ اس کے دل میں یہ ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ کسی دن میں غائب ہو جاؤں گا۔ صدمے سے پاگل ہو کے سڑکوں پر خاک بسر' ننگ دھڑنگ شادو شادو چلاتا پھروں گا یا کوئی خطرناک الٹی سیدھی حرکت کروں گا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری نگرانی کے خیال سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ باہر جانا ہی پڑے تو تالا ڈال کے جاتی تھی۔ کمرے میں بھی اور صحن کے دروازے میں بھی۔ اس کی سادگی پر مجھے ہنسی آتی تھی۔

جب میں جاگتا تھا تو سوچتا تھا۔ میری قوتِ فیصلہ اِدھر سے اُدھر ہوتی رہتی تھی۔ کبھی میں طے کرتا تھا کہ شادو کو تماشائے عبرت بنادوں کیونکہ ایسا ہی اس نے میرے ساتھ بھی کیا تھا پھر یہ ارادہ بدل دیتا تھا۔ اس کی سب سے اچھی سزا یہ ہوگی کہ میں اسے بھلادوں۔ یہ ظاہر کروں کہ مجھے کوئی صدمہ نہیں ہوا۔ میں تو خود اس سے عہدِ وفا کرکے پھنس گیا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے زیادہ تھی اور میرا ابھی شادی کے چکر میں نہ پڑنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ اس نے میری مشکل آسان کردی۔ شادی مبارک ہو ہاشمی صاحب۔

چوتھے دن میں سوچ رہا تھا کہ باہر جانے کے لیے ماسی سے کیا بہانہ کروں۔ میں رئیس سے ملنا چاہتا تھا۔ اب مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ جیرے بلیڈ کے گروہ میں شامل ہے اور ان کی بیٹھک کہاں ہے۔ میں اس گروہ کے دوسرے لوگوں سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ اچانک میری زندگی میں بھی خلا آگیا تھا۔ میرے پاس بھی کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ مجھے صرف میٹرک' ایف اے' بی اے نہیں کرنا تھا' مجھے آگے بڑھنا تھا۔ دنیا کی بھیڑ میں اپنا راستہ بناکے آگے نکلنا تھا۔

دوپہر کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ ماسی نے کچن سے نکل کے کہا "اس وقت کون آگیا؟"

اس نے دروازے کی کنڈی کھولی اور بولی "کس سے ملنا ہے جی آپ کو؟"

میں نے عورت کی آواز سنی "ناصر عظیم سے۔"

میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ اب وہ یہاں کیا لینے آئی تھی۔۔۔ لیکن وہ اندر آگئی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

O☆O

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "کیا۔۔۔ کیسی بری خبر لے کر آئی ہو تم؟"

"کیا ضروری ہے کہ میں سب کچھ یہاں کھڑے کھڑے بتادوں؟" رخشی نے اپنی چادر ہٹا کے بالوں کو جھٹکا۔

میں نے کہا "نہیں۔۔۔ اندر آؤ" میں نے کہا "تم یہاں آئیں کیسے؟"

وہ خاموشی سے آگے آئی "میں چھپ کر آئی ہوں۔ بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اس کے لیے۔ پورے ایک لاکھ نقد۔"

میں نے کہا "ایک لاکھ۔ کس کو دیے تم نے؟"

"کوئی سب انسپکٹر ہے' عباسی" وہ بولی۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "عباسی نے رشوت لی تم سے۔۔۔؟"

"اس نے کہا کہ ویسے تو تم سے ملاقات ناممکن تھی لیکن وہ ذاتی طور پر تم سے ہمدردی رکھتا ہے اور اس نے تمہاری مدد کے لیے رئیس کو بھی یہاں بلوایا ہے۔"

"رئیس آگیا ہے' اندر موجود ہے مگر رئیس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"عباسی پہلے میرے پاس آیا تھا' کہنے لگا کہ مجھے بڑی شرم آتی ہے ایسی بات کرتے ہوئے مگر یہ صرف میرا معاملہ نہیں اور بھی ہیں کچھ لوگ جن کے منہ بند کرنے ضروری ہوں گے۔ جو یہاں تمہاری حفاظت پر مامور ہیں ان کو دس دس ہزار دینے پڑیں گے ورنہ اس کیس میں براہ راست ڈی آئی جی صاحب کی ذمے داری ہے۔" وہ بولی۔

رئیس اسے دیکھ کے کھڑا ہوگیا "سلاواں لیکم۔۔۔ بیگم صاحب۔"

میں نے کہا "یہ رخشی ہے۔ تم اسے بھابی کہہ سکتے ہو۔ کہنے میں کوئی حرج نہیں۔۔۔ اور یہ ضروری بھی ہے کسی حد تک۔"

رخشی نے اسے غور سے دیکھا۔ شاید اسے رئیس کا چہرہ اور حلیہ پسند نہیں آیا۔ اس نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور بیٹھ گئی۔

"تم کو عباسی لایا ہے یہاں؟"

"ہاں۔ اپنی گاڑی کی ڈکی میں چھپاکے۔ اس نے کہا ہے کہ آدھے گھنٹے میں جو بات کرنی ہے کرلیں' پھر صبح ہو جائے گی تو۔۔۔"

"تو کیا۔۔۔ جب سارے کتوں کے منہ بند کردیے گئے ہیں تو پھر کسی کے بھونکنے کا ڈر کیوں؟" میں نے کہا۔

"شاہ جی۔ یہ تو عباسی کہہ رہا ہے نا۔ اسے سچ کیوں سمجھ رہے ہو؟" رخشی نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ اکیلے عباسی نے ایک لاکھ ہتھیا لیے۔ رخشی' وہ تو اچھا آدمی ہے۔۔۔"

"اچھائی بھی ایسے ہی کون کرتا ہے کسی کے ساتھ اور کرتا ہے تو اس کی قیمت بھی لیتا ہے۔ تم چھوڑو اسے' میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ تیمور مرگیا۔"

میں اچھل پڑا "تیمور مرگیا۔۔۔ کیسے۔۔۔ کب۔۔۔؟"

"ابھی دو گھنٹے پہلے اسپتال میں۔"

میں نے چلا کے کہا "لیکن وہ ٹھیک تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی۔"

رخشی نے اِدھر اُدھر دیکھا "چلاؤ مت۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شبنم آئی تھی میرے پاس۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی مرضی نہیں تھی اسے اسپتال میں رکھنے کی۔ وہ اتنا زخمی نہیں تھا۔

معمولی چوٹیں آئی تھیں اسے مگر پولیس نے اسے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیا تھا۔ ایس پی غلام محمد نے اسے بتایا تھا کہ باہر اس کی جان کو خطرہ لاحق ہے اس لیے وہ اسپتال میں رہے پھر انہوں نے تیمور پر سازش کا الزام لگادیا۔ شاہ عالم ہاؤس پر فائرنگ میں اس کی گاڑی ملوث پائی گئی۔ پولیس نے وہ گاڑی برآمد کرلی۔"

"مگر وہ تیمور کی گاڑی نہیں تھی۔"

"گاڑی اس کی بیوی کے نام پر رجسٹرڈ تھی" رخشی نے کہا۔ "پولیس نے اسپتال میں ہی اس سے پوچھ گچھ کی۔ ابھی کسی کو معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ تیمور نے کیا کہا اور کیا نہیں کہا مگر شبنم کا خیال تھا کہ پولیس نے اسے بلیک میل کرکے اپنی مرضی کا بیان حاصل کیا جس میں اس نے سارے الزامات اپنے سر لے لیے۔ تمہارے خلاف سیاسی سازش' قاتلانہ حملے' جھوٹے مقدمات' اس نے سب کی ذمے داری قبول کرلی۔"

"تیمور ایسا نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا۔

"مجبور آدمی سب کچھ کرسکتا ہے" وہ بولی۔

"اور مجبور تو سب ہو جاتے ہیں پیارے۔ پولیس سارے طریقے جانتی ہے مجبور کرنے کے۔" رئیس نے کہا۔

"تھوڑی بہت سمجھ بوجھ مجھے بھی ہے شاہ جی مگر شبنم کا بھی یہی خیال ہے کہ تیمور کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کو بلڈ پریشر اور دل کا مرض تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ زیادہ مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی دوسری کمزوری تھی اس کا خاندان۔ ایک بیٹی کی وہ شادی کرچکا ہے۔ دوسری کی ہونے والی تھی۔ بیٹا سب سے چھوٹا مگر جوان ہے۔ ان کے خلاف مقدمات بنادیے جاتے تو تیمور کی سیاست کا خمیازہ اس کی اولاد کو بھگتنا پڑتا۔ بیوی بچے ہر شخص کی سب سے بڑی جذباتی کمزوری بن جاتے ہیں۔ پولیس نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ تیمور کے سامنے دو OPTIONS رکھ دیے۔ یا سارے الزامات قبول کرلو اور بیان پر دستخط کردو یا تیار ہو جاؤ تفتیش کے لیے۔ تفتیش ہوگی تو تمہارے لواحقین کو بھی نہیں بخشا جائے گا۔ ان سے پولیس نے ایک رات کسی خفیہ مقام پر پوچھ گچھ کی تو صبح تک وہ سب ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگیں گے۔"

"سچ ہے بھائی' آدمی طوطے کی طرح رٹایا ہوا سبق پڑھنے لگتا ہے۔ ہم نے تو سب دیکھا ہے اور بھگتا بھی ہے" رئیس نے آہ بھری۔

میں نے کہا "تیمور کی جگہ کوئی بھی ہوتا' انکار کیسے کرسکتا تھا۔"

"شبنم نے کہا کہ پولیس نے تیمور کو قربانی کا بکرا بناکے بہت سے فائدے حاصل کیے۔ ایک تیر سے دو نہیں کئی شکار کیے۔ اس کے ایک بیان سے وہ سارے کیس ختم ہوگئے جو تمہاری طرف سے درج کرائے گئے تھے۔ ایک شخص نے مان لیا کہ سب اسی کا کیا دھرا تھا' تفتیش ختم' تیمور تمہارا دستِ راست تھا۔ اسے مجرم بناکے تمہیں مزید تنہا کردیا گیا۔ وہ سینئر نائب صدر تھا۔ تمہاری جگہ لینے کا قانونی حق رکھتا تھا۔ اس کے ہوتے شمس اور قریشی کا پارٹی پر قبضہ مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تم قید میں ہو' تیمور مرگیا ہے۔ عدالت نے STATUS QUE دے کر ایک طرح سے انہیں اپنا قبضہ مکمل کرنے کی مہلت دے دی ہے۔ قریشی اور شمس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں رہا۔"

"کیا یہ بھی شبنم نے کہا تھا؟"

رخشی نے کہا "یہ تو میں اپنا خیال ظاہر کررہی ہوں۔"

"تمہاری سیاسی فراست اور معاملہ فہمی سے شاہ عالم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کتنا بدنصیب تھا وہ؟" میں نے افسوس سے کہا "اس کی سب سے اچھی مشیر تم ثابت ہوسکتی تھیں۔"

وہ اداس ہوگئی "بدنصیب وہ تھا؟ تم بھی ایسا سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "میں نے تمہاری تعریف کی تھی۔ اس سے خوشی نہیں ہوئی تمہیں؟"

"اس خوشی کی جو قیمت میں نے ادا کی ہے۔۔۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ شبنم نے اور کیا بتایا؟"

"وہ جلدی میں تھی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا پھر تیمور کی موت کی خبر دی اور کہنے لگی کہ اس معاملے میں ابھی زیادہ معلومات نہیں ہیں اس کے پاس مگر وہ پتا چلالے گی کہ تیمور کی موت کیسے ہوئی؟ اسپتال والے تو کہتے ہیں کہ اس پر دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔"

"اسے نہیں کون چیلنج کرسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں مگر دل کا دورہ کیوں پڑا' یہ تو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ دل کے کسی مریض کو موت کا بہانہ فراہم کیا جاسکتا ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے وہ شدید اعصابی اور جذباتی دباؤ میں مبتلا ہو جائے۔ کوئی شدید صدمہ یا کوئی خوف اس کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔"

میں نے کہا "سائنس بہت ترقی کرگئی ہے رخشی۔ دل کی دھڑکن رک جائے تو اسے الیکٹرک شاک سے بحال کیا جاتا ہے مگر الیکٹرک شاک سے ہی چلتا ہوا دل بند بھی ہوسکتا ہے۔ ایسی دوائیں بہت ہوں گی جن کو ایک بیمار دل برداشت نہیں کرسکتا اور سو جان بچانے والے ڈاکٹرز میں سے ایک جان لینے والا ہو تو یہ کام بہت آسان ہوسکتا ہے۔ کوئی پتا بھی نہیں چلاسکتا کہ ہارٹ اٹیک کے اسباب طبعی تھے یا پیدا کیے گئے تھے۔"

رئیس نے افسوس سے سرہلایا "اس میں شک کی کون سی بات ہے یار کہ اسے قتل کیا گیا ہوگا۔"

"سوال یہ بھی ہے رئیس کہ قتل کس نے کیا؟"

"بے خود پولیس نے اور کس نے؟"

میں نے کہا "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے تمام ناکردہ جرائم کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اعتراف کرنے کے بعد تیمور نے خود ہی مرجانا بہتر سمجھا ہو۔ اس کے لیے جینا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا تھا۔ وہ جینے کے لیے جدوجہد کرتا تو اس کے خاندان کا جینا مشکل ہوجاتا۔ اس نے سب کا عذاب اپنے سر لے لیا۔ جو تھوڑی بہت زندگی باقی رہ گئی تھی وہ اس نے خود کو اور اپنے خاندان کو مشکلات سے بچانے کے لیے قربان کردی۔"

رخشی نے کہا "تمہارا مطلب ہے اس نے خودکشی کی ہوگی؟"

"اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ خودکشی آسان تھی۔ الزامات کا سامنا کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس میں ذلت تھی اور بڑی رسوائی تھی۔ اس نے شارٹ کٹ لیا اور سارے تفکرات سے آزاد ہوگیا۔ اس پر ہر جرم ثابت ہوجاتا تب بھی سزائے موت ہی ملتی۔ اس نے سب کا مسئلہ حل کردیا" میں نے کہا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رخشی نے کہا "اب تم کیا کروگے؟"

میں نے کہا "میں اپنی مرضی سے کیا کرسکتا ہوں۔ میرے خلاف دہرے قتل کا الزام ہے۔ اس میں میری ضمانت ہوسکتی ہے کیونکہ ابھی تک پولیس کے پاس میری گرفتاری کا کوئی جواز نہیں۔ مجھے شک کی بنیاد پر صرف تفتیش کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔"

"تمہاری بیرسٹر سلطان محمود سے بات ہوئی؟" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "اب ہوجائے گی۔ اگر مجھے دو افراد کا قاتل قرار دینا فی الحال ضروری نہ سمجھا گیا تو مجھے ضمانت پر رہا بھی کردیا جائے گا۔ مقتول سمجھے جانے والے خالد خٹک اور مرزا خادم سامنے آجائیں گے۔ ان کا فون آجائے گا کہیں سے۔ سنگاپور یا لندن سے کہ بھئی یہ کیا مشہور ہوگیا ہے ہمارے بارے میں۔ نصیب دشمناں، ہم بالکل فوت نہیں ہوئے ہیں یا وہ کسی فلائٹ سے مسکراتے ہوئے اتریں گے اور سخت حیران پریشان نظر آئیں گے کہ آخر یہ کیا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ جیتے جاگتے آدمی کو مرحوم قرار دینے کا۔ پہلے شاہ عالم کے ساتھ ایسا ہوا اور عدالت کے حکم پر اسے زندہ تسلیم کیا گیا۔ اب ہم باہر تھے تو ہمیں بھی دوسری دنیا کا مکین بنادیا گیا۔ کیا ہمیں بھی عدالت سے زندہ سمجھے جانے کی سند حاصل کرنی ہوگی؟"

"اور خدانخواستہ..... ایسا نہ ہوا؟ کیا یہ کوئی مشکل کام ہے کہ انہیں سچ مچ مار دیا جائے۔ ان کی لاشیں مل جائیں شاہ عالم ہاؤس کے احاطے اور باغ میں کسی جگہ ایک تبصرہ سے..." رخشی نے فکرمندی سے کہا۔

"ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک لڑکی کی لاش شاہ عالم ہاؤس کے احاطے کے باہر ملی تھی۔ کوئی جوان اور حسین لڑکی تھی۔"

رخشی کے چہرے کا تاثر بدل گیا "ہاں..... ایسا ہوا تھا۔ ایک لاش اس کے دشمنوں نے وہاں چھوڑ دی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ میرے بدخواہوں نے سازش کی تھی اور لاش کہیں سے لاکے وہاں ڈال دی تھی۔ اس کی نیک نامی کو نقصان پہنچانے کے لیے لیکن میں جانتی ہوں کہ دشمنوں سے زیادہ لاشیں اس کے دوست اٹھا کرلے جاتے تھے۔ وہ جیتی جاگتی لاشیں ہوتی تھیں۔ شرافت اور انسانیت کی لاشیں۔ رات کے اندھیرے میں ہی وہ شاہ عالم ہاؤس کے ان حصوں میں آتی تھیں جو میرے لیے ممنوعہ علاقے تھے۔ جہاں اہم سیاسی اور دفتری مسائل حل کیے جاتے تھے اور صبح ہونے سے پہلے ان لاشوں کو غائب کردیا جاتا تھا۔ غیرت اور عزت کے ایسے بہت سے جنازے میں نے چھپ چھپ کر آتے جاتے دیکھے تھے۔" اس نے نفرت، احساسِ ذلت اور ندامت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا "میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں لیکن میں بات کرنا چاہتا تھا اس لڑکی کے بھائی کی۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اسی نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اسے انتقام کے لیے اکسا کے مجھے قتل کرنے کے لیے وہاں لایا گیا تھا۔ اگر میں مارا جاتا تو اسے بحفاظت پولیس کی تحویل میں دے دیا جاتا اور بعد میں عدالت اسے ہلکی کردیتی یا بہت معمولی سزا دیتی کیونکہ اس نے قتل شدید اشتعال انگیزی کے باعث ایسی کیفیت میں کیا تھا جب اسے اپنے قول و فعل پر اختیار حاصل نہ تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ جب وہ ناکام رہا تو افشائے راز کے خوف سے اسے وہیں ماردیا گیا۔ وہ زندہ رہتا تو شاید ان سب کے نام بتادیتا جنہوں نے اسے استعمال کیا تھا۔"

"اب تو وہ الزام بھی تیمور کی فردِ جرم میں شامل ہے۔ اسی نے سب کچھ کیا تھا اور وہ حرکتِ قلب بند ہوجانے سے مرگیا۔ اب تفتیش کیسی، ملزم نے موت سے پہلے ہر جرم کا اعتراف کرلیا تھا" رخشی نے کہا۔

"ہاں۔ سارے کیس داخل دفتر۔ کوئی پولیس پر زبردستی کا الزام بھی نہیں عائد کرسکتا۔ تیمور نے یہ بیان اسپتال میں ریکارڈ کرایا تھا۔ وہاں ڈاکٹر موجود ہیں جو اس کی دیکھ بھال کررہے تھے۔ کسی مرتے ہوئے شخص کے اقبالِ جرم کو دنیا کے بھی قانون سچ تسلیم کرلیتا ہے۔" میں نے کہا "خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ آخر شبنم تمہارے پاس کیوں آئی تھی۔ تیمور کی موت کی اطلاع دینا اس کا مقصد نہیں ہوسکتا۔ یہ خبر شاہ عالم کے لیے اہم ہوسکتی ہے، اس کی بیوی کے لیے نہیں جس کا آج تک سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔"

"لیکن اب ہے" رخشی نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اسے سوال بھی سمجھا جاسکتا تھا، قدرت کی ستم ظریفی پر اظہارِ حیرت بھی۔

"ہاں اب ہے۔" میں نے کہا "مگر شبنم نہیں جانتی یہ بات کہ تم کس طرح میری مدد کررہی ہو۔ اس کے تم سے ملنے کا مقصد کچھ اور ہوگا۔"

"وہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔ میں ہی نہیں، سارا زمانہ اس کے شاہ عالم کے ساتھ خصوصی مراسم سے آگاہ تھا۔ وہ کبھی ان باتوں کی تردید نہیں کرتی تھی جو اس کے بارے میں سرِعام کہی جاتی تھیں۔"

"شاہ عالم تردید کرتا تھا؟"

"ہاں۔ سیاسی مصلحت اور ضرورت کا تقاضا تھا کہ وہ ہر افواہ کی تردید کرے خواہ وہ ناقابلِ تردید حقیقت ہو۔"

میں نے کہا "سیاست میں ایسا ہی معمول ہے۔ کچھ کھلے سچ ہوتے ہیں جن کو جھوٹ کہا اور مانا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ ایسے حقائق ہوتے ہیں جو کسی ثبوت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کو جھوٹ کہا اور مانا جاتا ہے۔"

"شاہ عالم کی زندگی میں شبنم میرے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی مگر کہیں اتفاق سے میں اور وہ ایک ہی جگہ موجود ہوتے تھے تو وہ مجھ سے دور دور رہتی تھی۔ وہ باتوں سے اور بدنامی سے نہ ڈرنے والی لڑکی مجھ سے ڈرتی تھی مگر گزشتہ رات اس نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے اس نے فون کیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ مجھے آج یہ عزت بخشنے کا سبب؟ وہ کہنے لگی کہ میں جانتی ہوں آپ مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔ میری صورت بھی آپ کو زہر لگتی ہوگی۔ میں اپنی صفائی پیش کرنے یا اظہارِ افسوس کرنے کے لیے نہیں ملنا چاہتی۔ میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں جن کا تعلق آپ کی اور میری ذات سے ہے۔ کچھ ذاتی باتیں۔ پہلے تو میں نے انکار کردیا تھا مگر اس نے کہا کہ مسز شاہ عالم، کچھ باتیں میرے لیے ناقابلِ فہم حد تک پراسرار ہیں۔ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر کو ان کے دشمنوں اور بدخواہوں نے آں جہانی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر آپ کی گواہی نے انہیں بچالیا۔ آپ کی گواہی ایک طرف، سارے زمانے کی گواہی دوسری طرف۔ عدالت کے نزدیک ایک بیوی سے بڑھ کر شوہر کو شناخت کرنے والا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ عورت جتنا شوہر کے ظاہر کو جانتی ہے اس سے زیادہ باطن کو پہچانتی ہے۔ یہ صرف آپ کی گواہی تھی جس نے شاہ عالم کو اصل ہونے کی سند فراہم کی اور عدالت نے اسی گواہی کو معتبر جانتے ہوئے اپنے حکم پر مہرِ صداقت ثبت کی تھی۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے مگر اب تو کوئی معاملہ پراسرار نہیں رہا۔ شبنم نے کہا کہ مسز شاہ عالم۔ آپ کے شوہر کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت بھی وہ پولیس کی تحویل میں ہیں اور ان پر دو افراد کے قتل کا الزام ہے۔ مقتول سمجھے جانے والے کوئی عام لوگ نہیں، اس شہر کے معزز کاروباری لوگ تھے۔ میں ذاتی اثر رسوخ سے فائدہ اٹھا کے یہ معلوم کرچکی ہوں کہ آپ کے شوہر کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھ سے خصوصی ملاقات کرچکی ہے؟"

"نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ سے ملنے کے بعد ہی میں فیصلہ کروں گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ابھی تک میں نے شاہ عالم کو شاہ عالم تسلیم نہیں کیا ہے۔ عدالت کے حکم سے دنیا نے اسے شاہ عالم مان لیا تو مان لے۔ اگر آپ سے ملنے کے بعد مجھے یقین آگیا کہ آپ نے کسی دباؤ کے بغیر گواہی دی تھی تو میں بھی اسے شاہ عالم مان لوں گی اور پھر پوری کوشش کروں گی اسے بچانے کی۔ میرے اپنے وسائل ہیں اور تعلقات ہیں۔ انہیں کام میں لاکے میں سازش کو اور سازش کرنے والوں کو بے نقاب کرسکتی ہوں۔ ایسا میں ذاتی وجوہ کی بنا پر کروں گی یا پیشہ ورانہ دلچسپی کے باعث، یہ بات رہنے دیں۔ اگر شاہ عالم کو بچانے میں آپ کا کوئی فائدہ ہے تو مجھے بتائیں، آپ چاہتی ہیں کہ وہ پھانسی تک جائے تو ٹھیک ہے۔ نہ ملیں مجھ سے۔ ٹھکرادیں مدد کی اس پیش کش کو کیونکہ آپ کو مدد کرنے والے سے نفرت ہے۔ کیا ان حالات میں ایک طوائف بھی ہو تو اسے انکار جائز ہے؟"

رئیس نے اونگھتے اونگھتے سر اٹھایا "یار بڑی تیکھی چیز ہے یہ شبنم بھی۔"

رخشی مسکرائی "ظاہر ہے اس کے بعد میں مجبور ہوگئی۔ میں نے کہا کہ اچھا آجاؤ۔ باتیں تو ساری ہی پرائیویٹ ہیں ہمارے درمیان۔ عام حالات میں تم سے کبھی بات نہ کرتی مگر اس وقت میں بھی مجبور ہوں۔ وہ پانچ منٹ میں پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ کہیں قریب ہی موجود تھی۔ اپنی گاڑی میں بیٹھی موبائل فون سے بات کررہی تھی۔"

"اسے یقین ہوگا کہ تم انکار نہیں کروگی۔ دروازے تک پہنچنے سے پہلے اس نے تمہیں قائل کرلیا۔"

رئیس نے جماہی لے کر گھڑی دیکھی "یار، صبح ہوئے ایک گھنٹا ہوگیا۔ سورج سر پر آگیا، قسم اللہ کی پیٹ کے اندر بگولا سا اٹھ رہا ہے۔ کیا کوئی سالا چائے ناشتے کو بھی نہیں پوچھے گا؟ آخر ہم شرفا ہیں۔"

"شرفا۔ اندر جاکے کچن تلاش کرو۔ وہاں ایک بوڑھا خانساماں ملے گا۔ اس سے بات کرو۔ وہ تمہاری بات سمجھ لے گا مگر جواب نہیں دے گا کسی بھی بات کا۔ وہ گونگا ہے۔ معلوم نہیں کس ظالم نے کس قصور پر اس کو زبان کاٹنے کی سزا دی تھی۔ اس سے زیادہ باتیں مت کرنا۔ وہ مجھے پولیس کا آدمی لگتا ہے۔"

"اسے یہ ظالمانہ سزا بھی پولیس نے دی تھی؟" رخشی نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔ سزا دینے کا اختیار ہر طاقتور رکھتا ہے۔ کسی مافیا کا سربراہ، ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار۔ وڈیرا یا جاگیردار۔ وہ اپنی صورت کی مظلومیت سے ہی غلام ابن غلام لگتا ہے" میں نے کہا۔

"وہ لڑکی دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی" رخشی نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ایسی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"جیسی اس کی بدنامی اور نیک نامی ہے۔ مطلب یہ کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطرناک صحافی ہے اور بے باک عورت ہے۔ ذہین ہے اور عیار ہے۔ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی لیکن سب سے اپنا کام نکالنا جانتی ہے۔ مردوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہے مگر خود کبھی کمزور نہیں پڑتی اور نقصان نہیں اٹھاتی۔"

"یہ سب بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے بارے میں متضاد باتیں مشہور ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے مگر کتابیں ہے کہ وہ سب جانتا ہے۔ وہ ایک MYSTRY اور LEGEND بنتی جارہی ہے۔ تم سے مل کے اس نے کیا کہا؟"

رخشی نے کہا "پہلے تو یہی کہ ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دشمن سے بھی تعاون کرنا دانش مندی ہے۔ وہ کسی کی ذاتی رائے کی پروا نہیں کرتی لیکن میری پوزیشن مختلف ہے۔ میں شاہ عالم کی قانونی بیوی ہوں اور وہ میرے جذبات کا اندازہ کرسکتی ہے۔ مجھے اس سے نفرت کرنے کا حق حاصل ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن میں نے کہا کہ میں نہ کسی سے ڈرتی ہوں اور نہ کسی کو اہمیت دیتی ہوں۔ شاہ عالم کی پبلک لائف سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے گھر کی مالک میں ہوں اور میری جگہ دوسری عورت نہیں لے سکتی۔ میرے لیے یہ احساس کافی ہے۔ تم کو کیا پوچھنا ہے۔ شبنم نے کہا کہ مسز شاہ عالم کوئی بیوی اپنے شوہر کی شناخت میں دھوکا نہیں کھاسکتی۔ وہ اپنے شوہر کو اس کے سانسوں سے اور خوشبو سے پہچان سکتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں شاہ عالم کے معاملے میں آپ نے بھی جو گواہی دی تھی وہ صرف آنکھوں سے دیکھ کر نہیں دی تھی۔ آپ نے محسوس کرکے اور اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر دی تھی۔ ایک بیوی کا تجربہ یقیناً باقی سب سے الگ ہوتا ہے اور سو فیصد درست نتائج کا حامل۔ کیا یہ صحیح ہے۔ میں نے کہا کہ اگر تمہاری شادی ہوجاتی تو تم یہ سوال نہ کرتیں مگر پھر بھی تم دوسروں کے مقابلے میں شاہ عالم کو زیادہ سمجھتی ہو۔ زیادہ قریب سے دیکھ چکی ہو۔ میرے برابر نہ سہی۔ میرے بعد تمہارا تجربہ بہت قابلِ اعتبار ہے۔ اس پر وہ تھوڑا سا ہنسی اور بولی کہ اسی لیے میں ذرا کنفیوژن کا شکار ہوں۔ شاہ عالم مجھے پہلے جیسا نہیں لگتا۔ اس میں اتنی تبدیلی محسوس ہوتی ہے کہ لگتا ہے وہ کوئی اور ہے۔ کیا یہ تبدیلی کا احساس تمہیں بھی ہوا تھا؟ میں نے سوچ کے کہا کہ ہاں وہ بہت بدل گیا ہے۔ اس کے پرانے طور طریقے نہیں رہے۔ وہ شریف اور مہذب آدمی بن گیا ہے۔ شبنم نے کہا کہ یہ سب اچانک کیسے ہوگیا؟ میں نے کہا کہ اسے میں منجانب اللہ سمجھتی ہوں۔ اس نے مجھ پر خاص عنایت کی اور میرے شوہر کو ویسا ہی کردیا جیسا کہ وہ تھا۔ بہت پہلے۔ اب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ میرا خیال رکھتا ہے۔ میری عزت کرتا ہے۔ مجھے اہمیت دیتا ہے اور اس کے سیاسی نظریات بھی بدل گئے ہیں۔ شبنم نے کہا کہ آخر اس تبدیلی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ شاہ عالم کا تو لب ولہجہ اور اندازِ گفتگو تک بدل گیا ہے۔ اکثر اس قسم کے انقلاب کا سبب حالات ہوتے ہیں۔ کوئی حادثہ، کوئی مافوق الفطرت واقعہ۔ کوئی روحانی بشارت، کوئی خواب یا کسی پیر کامل کی کرامت۔ میں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ شاہ عالم نے بھی موت کو بہت قریب سے دیکھا اور شاید یہی اس انقلاب کی وجہ بن گئی۔ آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ زندگی کتنی بے ثبات اور اس کی کامیابی کا نشہ اور غرور کتنا لاحاصل اور ناپائیدار ہے۔ ایک معمولی سی دو انچ لمبی گولی اس میں سوراخ کردے تو دنیا ختم، ہوس ختم، جاہ و اقتدار ختم۔"

میں نے کہا "تم نے تو کمال کردیا رخشی!"

وہ مسکرائی "میں نے تو بتایا تھا کہ شادی سے پہلے میں کہانیاں لکھتی تھی۔"

"شبنم قائل ہوئی کہ نہیں؟"

"فوراً نہیں ہوئی۔ اس نے بہت سے سوالات کیے۔"

"وہ اپنا شک رفع کرنا چاہتی ہوگی کہ میرے ساتھ سازش میں تم کس حد تک شریک ہو؟"

"ہاں۔ یہ بات وہ کھل کے نہیں کہہ سکتی تھی مگر اشاروں کنایوں میں اس نے کہا کہ ایک آدمی کی شناخت اس کے رشتوں اور حوالوں سے ہوتی ہے اور کوئی دولت سے یا دباؤ سے چند معتبر گواہیاں حاصل کرلے تو جھوٹ کو قانون بھی سچ کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔ میں اس کی بات سمجھ گئی تھی۔ میں نے کہا کہ مس شبنم، کیا آپ خود کو مسز شاہ عالم یعنی رخشندہ ثابت کرسکتی ہیں؟ اس نے کہا کہ صورت میں کچھ مشابہت ہوتی تو شاید میں آپ کو قتل کرکے آپ کی جگہ لے سکتی تھی۔ میں نے کہا کہ شاہ عالم شاید پہلے آپ کو خاموشی سے قبول کرلیتا۔ اسی طرح جیسے وہ نئے ماڈل کی اس ڈیجیرو کے بدلے ایسی ہی دوسری بالکل نئی گاڑی رکھ لے۔ خواہ وہ چوری کی ہو اور اس پر یہی نمبر پلیٹ لگادے مگر مس شبنم، کوئی عورت اپنے شوہر کا ماڈل نہیں بدلتی۔ بدلتی ہے تو وہ بیوی نہیں طوائف کہلاتی ہے۔"

"تمہیں غصہ آگیا تھا اس کی بات پر؟"

"ہاں لیکن میں نے فوراً ہی اپنے غصے پر قابو پالیا اور کہا کہ آج شاہ عالم پر مجھے پورا بھروسا ہے۔" رخشی بولی "شبنم ایک گھنٹے تک بات کو اِدھر سے اُدھر گھماتی رہی۔ یہ پوچھتی رہی کہ مجھے کون سی تبدیلی نے حیران کیا۔ کیا عجیب لگا اور میں نے اسے بڑے آرام سے جواب دیے۔ اس نے یہاں تک پوچھا کہ جب شاہ عالم دو ہوگئے تھے تو آپ کو ڈر نہیں لگا کہ کہیں آپ کی لاعلمی میں اصل کی جگہ نقل نہ آجائے۔ میں نے ہنس کے کہا کہ بی بی، آدمی اپنے کتے کو پہچانتا ہے، اپنی کار کو پہچانتا ہے حالانکہ ایک ہی ماڈل کی گاڑیاں ہزاروں ہوتی ہیں۔ شوہر ایک ہی ہوتا ہے۔ شادی کرکے دیکھ لو، تمہیں یقین آجائے گا میری بات کا۔ بالآخر وہ قائل اور مطمئن ہوگئی۔"

"یہ اندازہ تم کیسے کرسکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ کچھ مایوس، افسردہ اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک امید کے آخری تنکے کا سہارا لے کر وہ میرے پاس آئی تھی۔ اپنے یقین کو شکست سے بچانے کی یہ آخری کوشش تھی جو ناکام ہوگئی۔ اس کا صدمہ ایک قدرتی بات تھی۔"

میں نے کہا "اس کے لیے یہ تسلیم کرنا آسان نہیں ہوگا کہ سچ وہی تھا جسے وہ جھوٹ سمجھتی رہی۔ پہلے بھی لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب زیادہ لوگ اسے پاگل قرار دیں گے کہ ضرورت سے زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش کررہی تھی۔ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ سب اندھے اور بے وقوف ہیں۔ بس اسی کے پاس حقیقت شناس نگاہ ہے۔ صحافی سے زیادہ سراغ رساں بن رہی تھی۔ سنسنی پھیلانا چاہتی تھی۔ پبلسٹی کا اچھا طریقہ تھا مگر پلان فیل ہوگیا۔ جتنے دی کھوئی اوتھے آن کھلوتی۔ جھک مار کے ماننا پڑا کہ شاہ عالم نہیں مرنے والا کوئی اور تھا۔"

رئیس بڑی پریشانی کے عالم میں نمودار ہوگیا "اے یار! یہ کیا چکر ہے؟ اندر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"وہ بڈھا خانساماں جس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔"

"مجھے تو لگتا ہے پیارے کہ یہ بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ وہ بھی ہوگا کوئی بدروح۔ مجھے تو کہیں نظر آیا نہیں۔ سارے میں دیکھ لیا۔"

میں نے کہا "کہیں گیا ہوگا۔ آجائے گا۔ باہر پولیس تو ہوگی، انہیں معلوم ہوگا۔"

"قسم اللہ کی، باہر بھی کوئی نہیں ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا جھانک کر۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "یہ کیا کہہ رہا ہے تُو خبیث؟"

رئیس غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کوٹھی میں ہم تینوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں کب وہ سارے لوگ غائب ہوگئے تھے جو یہاں میری حفاظت پر مامور تھے۔ کچن کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ گزشتہ رات اسے استعمال کیا گیا تھا۔ چائے کے برتن اور کھانے پینے کی بچی ہوئی چیزیں اسی طرح پڑی تھیں۔

"آخر یہ کس کی کوٹھی ہے؟" رخشی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو سب انسپکٹر عباسی نے یہ بتایا تھا کہ وہی اس کا مالک ہے۔ اس نے مجھے ایک اسٹوری بھی سنائی تھی جو اب مجھے جھوٹ لگتی ہے اور اسٹوری کیا، مجھے تو یہ سارا مداری کا کھیل لگتا ہے۔ مجھے یہاں لایا گیا تھا تفتیش کے لیے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔"

"یہ گلبرگ تھری کا علاقہ ہے" رخشی نے کہا۔

ہم نے کوٹھی میں گھوم پھر کے دیکھا۔ اس ایک کمرے کے سوا جس میں مجھے رکھا گیا تھا، باقی سب کمرے بند تھے۔ خانہ ویرانی کے آثار خود اپنی کہانی کہتے نظر آتے تھے۔ مہینوں یا شاید برسوں سے اس گھر کو مکینوں سے آباد نہیں کیا گیا تھا۔ باہر گیراج کا شٹر گرا ہوا تھا لیکن پورچ میں جیپ کے ٹائرز کے نشانات بالکل تازہ تھے۔ پہیوں کے ساتھ آنے والی کیچڑ نے سیمنٹ پر لائنوں کے پرنٹ چھوڑ دیے تھے۔ کوٹھی کا بیرونی گیٹ مقفل نہیں تھا۔ اسے ایسے بند کردیا گیا تھا کہ کھلا نظر آئے۔ ہم لوٹ کے کمرے میں آگئے۔

"کیسی عجیب بات ہے یار!" میں نے رئیس سے کہا "مجھے پولیس اسٹیشن سے پولیس کی سخت نگرانی میں یہاں لایا گیا تھا۔ کسی خطرناک مجرم کی طرح۔ وہاں میری ایس پی غلام محمد سے بات ہوئی تھی اور اس نے اپنے رویے سے مجھے خاصا پریشان اور مشتعل کیا تھا۔ ایس ایچ او نے مجھ سے رہائی کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر تفتیش کے لیے عباسی کے سپرد کردیا تھا۔"

"کیا وہ سب فراڈ تھا؟" رخشی نے کہا۔

"ایسا ہی لگتا ہے مگر مجھے یہاں رات بھر الگ قید میں رکھنے کا کوئی مقصد تو ہوگا، اس ڈرامے کا ایک کردار خود محترم ڈی آئی جی صاحب تھے۔"

"وہ سب فراڈ ہوں گے یار!"

میں نے کہا "نہیں رئیس۔ پولیس کی نفری تھانے سے میرے ساتھ آئی تھی۔ وہ اصلی پولیس تھی۔ سب انسپکٹر فرید عباسی نے جو کچھ مجھے بتایا وہ جھوٹ ہوسکتا ہے مگر وہ جعلی سب انسپکٹر نہیں تھا۔ میں اسے دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔"

"وہ جعلی کیوں نہیں ہوسکتا۔ قسم اللہ کی۔ جیرا بلیڈ کتنے سالوں سے جعلیے تھانے دار بنا پھر رہا ہے۔ آج تک پکڑا نہیں گیا اور اپنے پاس پوری پولیس فورس ہے یار۔ پولیس کی اصلی وردی میں گئے تھے مگر خدا کا شکر ہے یہ سب میں نے عباسی کے سامنے نہیں بتایا۔ وہ دھوکے باز آدمی تھا۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھے تلاش کرکے کیوں لاتا، وہ اچھا آدمی تھا۔"

"خاک اچھا آدمی تھا۔ ایک لاکھ وصول کرلیے مجھ سے۔" رخشی نے کہا۔

"تم نے نقد دیے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، چیک دیا تھا، ابھی رکوادوں گی اسے۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "رخشی۔ وردی میں چہرے شناخت کھودیتے ہیں۔ سب ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ اگر آدمی غور سے نہ دیکھے۔ ریسٹورنٹ میں کنفیوژن ہوجاتا ہے کہ کس ویٹر نے سرو کیا تھا۔ تم دوبارہ عباسی کو دیکھو گی تو پہچان لو گی؟"

"بالکل پہچان لوں گی مگر ابھی نکلا یہاں سے۔ معلوم نہیں ہم کس کی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ مالک آگیا تو کیا یقین کرے گا ہماری بات پر؟"

میں نے کہا "رخشی! تم صبح آئی تھیں تو پولیس کا پہرا تھا؟"

"میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ فرید عباسی نے گاڑی پورچ میں روکی تھی۔ میں اتر کے سیدھی اندر آگئی تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "ذرا مجھے حلیہ بتاؤ۔ اس کا ناک نقشہ کیسا تھا؟ کپڑے کیسے پہن رکھے تھے اس نے؟"

رخشی نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ سب انسپکٹر فرید عباسی نہیں ہو سکتا۔ شاید وہ اسی تھانے کا کوئی آدمی تھا جہاں کے انچارج نے مجھ سے باعزت رہائی کے لیے ایک کروڑ میں سودا کرنے کی احمقانہ کوشش کی تھی۔ وہاں کسی کو علم ہوگا کہ مجھے کہاں رکھا گیا ہے اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک لاکھ کما لیے۔ ابھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ وہ چیک کاغذ کا ایک پرزہ تھا، بینک کھلنے سے پہلے اس کی ادائیگی روکی جا سکتی تھی۔

میرا دماغ چکرا گیا تھا۔ اس کوٹھی میں کہیں ایک ایسا کمرا بھی تھا جہاں مجھے تھوڑی دیر کے لیے باندھ کے بٹھایا گیا تھا۔ عباسی نے اس خصوصی تفتیش کے کمرے میں تھوڑا سا تفتیش کا ڈراما بھی کیا تھا جو ڈی آئی جی صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے تھا مگر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ کیا مقصد تھا آخر اس ڈرامے کا؟ مجھے خود ڈی آئی جی نے یقین دلایا تھا کہ میرے خلاف ٹھوس ثبوت کوئی نہیں ملا تو میری ضمانت فوراً منظور ہو جائے گی۔ فرید عباسی کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے ڈی آئی جی کے احکام کی تعمیل میں لاشوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی تھی مگر خالد عثمان اور مرزا خادم کی لاشیں کسی اسپتال کے مُردہ خانے میں نہیں ملی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ایک چوکیدار کو گرفتار کر کے تھانے میں پوچھ گچھ کی جا رہی ہے اور اس سے معلوم ہو جائے گا کہ خالد عثمان اور مرزا خادم کی روپوشی کس حد تک حقیقی ہے۔

فی الحال ہمارا یہاں رکنا لاحاصل تھا۔ ہم باہر آئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میری نظر ہر طرف تھی مگر مجھے کسی جگہ بھی خفیہ آنکھوں کی نگرانی کا شبہ نہیں ہوا۔

رئیس اچانک ہنسنے لگا "قسم اللہ کی' کیا لطیفہ ہے؟"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"ابے یار' اندر بیٹھے تھے قیدی بنے۔ سمجھ رہے تھے باہر نکلے تو پولیس والے سامنے آجائیں گے توپ لے کر۔ باہر کوئی تھا ہی نہیں۔"

رخشی نے کہا "یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی آخر۔"

میں نے کہا "ضرورت تھی' مجھے تم سے الگ اور شاہ عالم ہاؤس سے دور کر دیا گیا تھا۔ میں وہاں ہوتا تو حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا' انہیں پہچان بھی لیتا۔"

تھکن مجھ پر بھی غالب تھی۔ میں رات بھر سویا نہیں تھا لیکن رخشی کے اعصاب پر خوف کا دباؤ بھی تھا۔ اس کے لیے زندگی کے یہ تجربات نئے تھے۔ اپنے شوہر شاہ عالم کی زندگی میں اس کی مصروفیات کا دائرہ گھر تک محدود تھا' اس کی عقل اور ذہانت کو شاہ عالم نے عملی زندگی میں در خور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی بہترین معاون اور مشیر ثابت ہو سکتی تھی مگر شاہ عالم جیسے دقیانوسی معیاروں والے شخص کے لیے گھر کی عورت پاؤں کی جوتی تھی تو باہر کی عورت اس قابل کہ اسے محبوبہ کا درجہ دے کر سر پر بٹھایا جائے۔

رئیس کا حال بھوک سے پتلا تھا۔ اس نے انارکلی جا کے سری پائے کا ناشتا کرنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے معذرت کر لی "میں ابھی محتاط رہنا چاہتا ہوں۔ ایسے ہر جگہ جانے میں خطرہ ہے میرے لیے۔"

"خطرہ تو گھر جانے میں بھی ہے پیارے" وہ بولا "اچھا تو ہم چلتے ہیں' پھر ملیں گے۔"

وہ ایک رکشا میں بیٹھ گیا۔ میں اور رخشی کچھ دیر کسی سواری کی تلاش میں پیدل چلتے رہے۔ گلبرگ کے علاقے میں صبح ہو جانے کے بعد بھی سڑکوں پر رونق اور گہما گہمی مفقود تھی۔

"میرا خیال ہے کہ رئیس کی بات قابلِ غور ہے۔ ہمیں ایسے گھر جانے کا رسک نہیں لینا چاہیے" رخشی نے کہا۔

"ایسے کا کیا مطلب؟ ہم اپنے ساتھ فوج اور توپ خانہ لے کے تو نہیں پھر سکتے... اور دشمن کو ہمارے گھر میں بیٹھ کے ہمارا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس وقت ہم نشانہ نہیں بن سکتے؟" میں نے کہا "مجھے دیکھنا ہے کہ رات کو حملہ آوروں نے کیا کارروائی کی۔ کتنا نقصان ہوا پھر مجھے تیمور کے جنازے میں شرکت کے لیے بھی جانا ہوگا۔"

شاہ عالم ہاؤس کھلا پڑا تھا۔ باہر کوئی چوکیدار تک نہیں تھا۔ مجھے اپنا ہی گھر وہ اجنبی لگا جسے دیکھ کے خوف آئے۔ دونوں گاڑیاں بھی لاوارث کھڑی محسوس ہوتی تھیں۔ اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ میں رخشی کے ساتھ پیچھے سے گھر میں داخل ہوا۔ گلاب اور چنبیلی کچن میں نہیں تھے۔ یہ خاموشی شاہ عالم ہاؤس کی خانہ ویرانی کے تاثر کو گہرا اور ڈراؤنا بنا رہی تھی۔ رات کے حملہ آوروں کی کارروائی کے آثار پورے گھر میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے ہر کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔

رخشی نے کہا "میں پہلے نہالوں پھر ناشتا بناتی ہوں۔ گلاب اور چنبیلی کا تو پتا نہیں۔ شاید ڈر کے بھاگ گئے۔"

میں نے کہا "جب گھر میں مالک محفوظ نہ ہوں تو نوکر بے چارے کیا کریں۔"

"ویسے وہ بھاگنے والے نہیں ہیں۔ چھپے ہوئے ہوں گے کہیں۔ خود ہی آجائیں گے۔" رخشی نے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

میں ڈرائنگ روم میں تھا جب میں نے رخشی کی چیخ سنی۔

میں رخشی کے بیڈ روم کی طرف دوڑا۔ اسی وقت رخشی دروازہ کھول کے بدحواسی میں باہر آئی اور مجھ سے ٹکرائی۔ میں نے اسے گرنے نہیں دیا "کیا ہوا؟"

اس نے کراہتے ہوئے ایک ہاتھ سر پر رکھا جہاں میری پیشانی لگی تھی۔ "رات کو پھر کوئی آیا تھا۔"

میں نے اندر جا کے دیکھا "کون آیا تھا؟"

"مجھے... مجھے کیا معلوم" اس نے کونے میں صوفے کے ساتھ لگی ہوئی شیشے کی سینٹر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیبل پر ایش ٹرے میں بجھائی ہوئی سگریٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس میں دو طرح کے ٹکڑے نظر آئے۔ ان کے فلٹر کا رنگ الگ الگ تھا۔ ان کے برانڈ الگ تھے۔ وہاں کم سے کم دو افراد بیٹھے رہے تھے۔ جو اعلیٰ قسم کا غیر ملکی سگریٹ پیتا تھا' وہ سگریٹ کو ختم ہونے سے بہت پہلے بجھا دیتا تھا۔ دوسرا گھٹیا کوالٹی کے سگریٹ پینے والا آخری کش کی قیمت بھی وصول کرتا تھا۔

میں نے رخشی کے ساتھ گھوم پھر کے پورے گھر میں ہونے والی تباہی اور بربادی کا جائزہ لیا۔ حملہ آور یقیناً کچھ تلاش کرتے رہے تھے۔ شاید پارٹی کے ریکارڈ میں ایسی دستاویزات ہوں گی جن کا میرے قبضے میں ہونا خطرناک تھا۔ رخشی نے خود ہی ناشتا تیار کیا اور میں نے میز پر لگانے میں اس کی مدد کی۔

"آخر کون لوگ ہو سکتے ہیں... جو یہاں اطمینان سے بیٹھ کے سگریٹ پیتے رہے اور انتظار کرتے رہے" میں نے ناشتے کے بعد کہا۔

"اس سوال کا جواب میں دوں؟" رخشی نے تیز لہجے میں کہا "کیا یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔"

تھکن' خوف اور اعصابی دباؤ نے رخشی کو ہسٹیریا کے قریب کر دیا تھا۔ میں نے مسکرا کے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا "ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ میرا ہاتھ جھٹک کے آگے بڑھ گئی "کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا۔ روز بروز معاملات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں' صرف تمہاری وجہ سے۔"

میں نے نرمی سے کہا "میں کب کہہ رہا ہوں کہ اس کی ذمے دار تم ہو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

"کیسے ٹھیک کرلو گے اور کب؟" اچانک وہ غصے میں آ گئی تھی "چھ سال میں یہ کبھی نہیں ہوا تھا جو اب ہو رہا ہے۔ شاہ عالم میں لاکھ خرابیاں سہی' وہ نہ اچھا شوہر تھا نہ اچھا انسان۔ اس کا ذاتی کردار بہت برا تھا مگر وہ احمق نہیں تھا تمہاری طرح۔ اس نے اپنی سیاسی اور کاروباری دشمنی کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا تھا اس گھر پر۔ ہم اس گھر کے اندر بالکل محفوظ تھے۔ ہماری زندگی کو کبھی کسی سے خطرہ لاحق نہیں ہوا تھا۔ یہ گھر آباد تھا اور اب دیکھ لو اس کی ویرانی کو۔ یہاں سے میاں جی اور ماں جی گئے۔ نوکر چاکر گئے' محافظ گئے۔ ہر وقت رونق رہتی تھی یہاں' ملاقاتی' پارٹی کے لوگ' سرکاری افسر اور

انوار صدیقی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول
ہزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
● سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی زربا کی داستان حیرت۔
● سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
● عمر کا پندرھواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
● سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
● سیّد بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔
قیمت 250 روپے
محصول ڈاک 30 روپے
بہترین کتابت، خوبصورت گردوپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں یا براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صحافی' غرض مند اور بے غرض سب آتے تھے۔ اب کون آتا ہے؟ چور اور قاتل۔ جان کے دشمن لٹیرے اور آگ لگانے والے۔ گولیاں چلانے والے۔۔۔ اور دیکھو' یہ گھر کیا ہو گیا ہے۔"

وہ چیخنے لگی تھی لیکن میں نے اسے نہیں روکا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ اس کے وجود میں بھر جانے والا خوف اور غصے کا لاوا خارج ہو جائے۔ اس کے علاوہ رخشی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میرے پاس اس کی کسی بات کی تردید کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ دلائل نہ الفاظ۔

میں نے موقع پا کے کہا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو رخشی۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ کے رونے لگی "دیکھو' مسٹر شاہ عالم۔ یہ گھر کھنڈر ہو گیا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ تم شاہ عالم بن گئے مگر وہ سب تمہارے پاس نہیں رہا جو شاہ عالم کے پاس تھا۔ تمہارے پاس نہ پارٹی ہے' نہ پارٹی کے چیئرمین کا عہدہ۔ تمہارے نائب اور مددگار' تمہارا ساتھ دینے والے' تمہارے حمایتی' سب تمہارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ تم اکیلے رہ گئے ہو۔ اتنا تمہارا ساتھ دینے والوں کے لیے ان کی وفاداری جرم بن گئی ہے۔ تیمور پر سب سے زیادہ بھروسا تھا نا تمہیں۔ اسے اسپتال میں ڈاکٹرز کی موجودگی میں مار دیا گیا۔ اشرف روپوش ہے۔ روپوش نہ ہوتا تو وہ بھی قتل کر دیا جاتا۔ خود تم کب تک بچو گے؟ یہ عزت اور اوقات رہ گئی ہے تمہاری کہ ایک معمولی ایس پی تمہیں اٹھا کے تھانے لے جاتا ہے اور کسی ثبوت کے بغیر تم پر دہرے قتل کی فردِ جرم عائد کر دیتا ہے۔ معمولی پولیس اہلکار تمہیں بے وقوف بناتے ہیں۔ رات بھر انہوں نے تمہیں قید میں رکھا مگر کیا تم کسی کے خلاف کوئی رپورٹ لکھوا سکتے ہو؟ کوئی گواہ ہے جو بتائے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ تو صاف انکار کر دیں گے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی۔ تمہارا بیان لے کر انہوں نے تمہیں باعزت طور پر گھر واپس بھیج دیا تھا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "میں جانتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو تم؟" وہ پھر بھڑک اٹھی "تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ بس تم نے شاہ عالم کا لیبل لگا لیا ہے۔ اپنا نام بدل کے تم نے خود کو شاہ عالم منوا لیا ہے مگر تم وہ سب نہیں جانتے جو شاہ عالم جانتا تھا۔ تم وہ سب کرنے کے اہل ہی نہیں ہو جو شاہ عالم کر سکتا تھا۔ وہ مکار تھا اور چالباز تھا۔ عیار تھا اور بے ضمیر تھا مگر سیاست میں اور کاروبار میں اس کا ہر قدم کامیابی کی طرف اٹھتا تھا۔ اس کا رعب تھا اور دبدبہ تھا۔ کارکن اور عہدے دار اس سے ڈرتے تھے۔ وہ مخالفوں اور غداروں سے نمٹنا جانتا تھا۔ اس کے پاس ایف اے ایف کی طاقت تھی جو اس کے اشارے پر ہر دوست دشمن کسی کو بھی ٹھکانے لگا سکتی تھی۔ وہ کسی کو بھی اٹھوا سکتا تھا۔ ختم کرا سکتا تھا۔ سرکاری افسر' پولیس والے' صحافی۔ سب ڈرتے تھے اس سے۔"

میں نے میز کو لات ماری اور الٹ دیا "بکواس بند کرو اپنی۔ میں وہ سب نہیں کر سکتا جو شاہ عالم کرتا تھا۔"

"تو پھر شاہ عالم کیوں بنے ہو؟" اس نے تڑخ کے سوال کیا "صرف اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے۔ عزت اور شہرت' اثر و رسوخ اور طاقت حاصل کرنے کے لیے؟"

"تم جانتی ہو ایسا نہیں ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ سب تھا میرے پاس لیکن مجھے مجبور کر دیا گیا تھا" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"آخر کب تک خود کو اس جھوٹ سے بہلاؤ گے تم۔ تمہاری مجبوری وقتی تھی۔ تم تیمور کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا تم نے جال سے نکلنے کی کوشش کی؟ نہیں۔ تم نے دوسرا کھیل شروع کر دیا۔ تم نے بازی پلٹ دی۔ تم نے مجبوری کو ایک چیلنج بنا لیا کہ اچھا اب میں شاہ عالم بن کے دکھاؤں گا۔ شاہ عالم کو ایک میرے کی طرح استعمال کرنے والے شاطروں کو مات ہو گی۔ تم کہتے ہو سب کچھ تھا تمہارے پاس۔"

"ہاں۔ میرے پاس شاہ عالم سے زیادہ دولت اور جائداد تھی۔ عقل اور ذہانت تھی" میں نے کہا۔

"ہو گی مگر بہت کچھ تمہیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ ساری دولت دے کے بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہارے پاس خاندانی حسب نسب نہیں تھا۔ وہ عزت اور شہرت نہیں تھی جس کا خواب تم اپنے بچپن سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ تم ناصر عظیم تھے اور یہی تمہارا کمپلیکس تھا۔ ناصر عظیم وزیرِ اعظم بننا چاہتا تھا مگر کیا یہ اس کے لیے ممکن تھا؟ نہیں' وزیرِ اعظم صرف شاہ عالم بن سکتا تھا چنانچہ تم کو تقدیر نے ایک موقع فراہم کیا تو تم نے شاہ عالم بننے میں دیر نہیں لگائی۔ تم نے اس کے ماضی' حال اور مستقبل سب پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ یتیم خانے کے ماحول میں پرورش پانے والے لاوارث بچے کی حسرت اچانک ایک مغلوب کرنے والی خواہش بن گئی۔ تم نے اپنے ماضی سے سارے رشتے توڑ لیے۔ تم ان سب کو بھول گئے جن کے متعلق تمہارا خیال تھا کہ تم ان سے محبت کرتے ہو۔ تمہارے سامنے اچانک نئی منزل کے نئے راستے آ گئے پھر تم نے جائز اور ناجائز کو بھول کر شاہ عالم بننے کے لیے سب کچھ کیا۔ تم نے تیمور کو یرغمال

بنا لیا۔ مجھے بلیک میل کیا۔ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ کیا نہیں کیا تم نے۔۔۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ مجبوری تھی۔"

میں نے اپنا سر تھام لیا "رخشی۔۔۔ پلیز! مجھے اتنا ذلیل مت کرو خود اپنی نظر میں۔"

"یہ ذلت نہیں' حقیقت ہے شاہ عالم۔ مان لو کہ تم شاہ عالم کی جگہ لینے کا یہ موقع ضائع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ اقتدار کی لاٹری کا ٹکٹ تھا جو ایک حادثے میں تمہارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ تم اسے پھاڑ کے نہیں پھینک سکتے تھے کہ میں تو ناصر عظیم ہوں اور اس پر شاہ عالم کا نام لکھا ہوا ہے۔ اس وقت تم نے نہیں سوچا تھا کہ اسے کیش کرانے میں کتنے خطرات کا سامنا ہو گا۔ تم کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت پڑتی ہے' وہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔ یہ سب اسی کا نقصان ہے' بہت بڑی غلطی کی میں نے بھی تمہارا ساتھ دے کر۔"

میں نے تلخی سے کہا "شاہ عالم کی موت کے بعد تم آزاد تھیں۔"

"نہیں۔ میں کبھی آزاد نہیں تھی۔" اس کے آنسو اب رک گئے تھے "پہلے میں اپنے شوہر کے حکم کی غلام تھی۔ اس کی خواہشات اور عزائم کی غلام تھی۔ اس کی سیاسی نیک نامی میرے پاؤں کی زنجیر تھی پھر میں نفرت اور انتقام کے جذبات کی غلام ہو گئی۔ میں نے اس سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے صاف الفاظ میں مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے طلاق دے کر اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا الزام قبول نہیں کر سکتا۔ اپنی نجی زندگی کو تماشا نہیں بنا سکتا۔ بدخواہوں کو کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع فراہم نہیں کر سکتا۔ میری نجات صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے' موت۔ اس کی یا میری۔ میں مرنے سے بھی ڈرتی تھی اور مجھ میں اسے مارنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مجھے موقع ملا تو میں نے اپنی تمام زندگی کی محرومی کا انتقام لیا۔ اس کی موت ذلت اور رسوائی کا عبرت ناک تماشا بن گئی تھی۔ وہ ایک بار مرا اور تین بار دفن ہوا۔ اسے ایک اذیت ناک موت نصیب ہوئی تھی مگر اس سے زیادہ اذیت شاہ عالم کی روح کے لیے ہے کہ وہ اپنی جان ہے گیا مگر دنیا نے اسے شاہ عالم نہیں مانا۔ دو بار قبر کھود کے اسے نکالا' جانچا' پرکھا اور پھر بھی اسے شاہ عالم تسلیم نہیں کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ خود اس کی بیوی نے جانتے بوجھتے کسی اور کو شاہ عالم مان لیا۔ وہ آج بھی ایک گمنام اور لاوارث شخص کی طرح اپنے مدفن میں پڑا ہے اور ایک اجنبی اس کی نجی' سیاسی اور کاروباری زندگی پر قابض ہے۔

میرے لیے اس خیال میں بڑی تسکین تھی کہ وہ اپنی قبر میں بے بسی سے کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کی روح کی مغفرت کے لیے ایک دعا نہیں کی۔ اس نے مجھے دنیاوی زندگی میں صرف آزار دیا تھا' میں نے جانتے بوجھتے دوسری دنیا میں اس کی روح کو تکلیف پہنچانے کے لیے تمہارا ساتھ دیا تھا مگر اس کے بعد میں تمہارے ارادوں کی غلام ہو گئی۔"

"یہ غلط ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تم جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ یہ سب تمہارا ہے۔ مجھے شاہ عالم کی دولت اور جائداد میں سے کچھ نہیں چاہیے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید مجھے چلا جانا چاہیے تھا۔ کیا ضرورت تھی مجھے اس کھیل میں شامل ہونے کی۔"

"دنیاداری کے تقاضے پورے کرنے کے لیے میں تمہیں طلاق دے سکتا تھا اور تمہاری علیحدگی کی خبر کو عام کر سکتا تھا۔"

"اب احساس ہو رہا ہے مجھے اپنی غلطی کا۔ معلوم نہیں میں نے اتنا کیوں کیا تمہارے لیے۔" وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کے بولی۔

"شاید تمہیں بھی اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا۔"

"شاید۔۔۔ شاید ایسا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ اب یہ کیا تو بات غلط ہو جائے گی۔ وہ کیا تو معاملہ مشکوک نظر آئے گا پھر تم نے مجھ سے مدد مانگی اور میں نے انکار نہیں کیا۔ میں شاہ عالم بننے میں تمہاری مدد کرنے لگی۔ تم نے کسی مداری کی طرح الفاظ کا کھیل دکھا کے میری قوتِ فیصلہ کو غیر مؤثر کر دیا اور مجھ پر اپنی مرضی مسلط کر دی۔ تم نے میرے جذبات کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھا اور مجھے میری ہی کمزوری کے جال میں الجھا کے شکار کر لیا۔ پہلے میں بھی مجبور تھی۔ تم مجھے بلیک میل کر رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم دونوں مجبور نہیں تھے۔ تم لوٹ کر اپنی دنیا میں نہیں گئے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی۔ اپنی اپنی مرضی سے ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ آخر کیوں؟"

میں نے کہا "حالات نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بنا دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے۔ آج تمہیں احساس ہو رہا ہے غلطی کا تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ تم مجھے چھوڑ کے جا سکتی ہو۔"

"کیا تم بھی چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟"

میں نے کہا "میرے ایسا چاہنے کا کیا سوال۔ آج مجھے کل سے زیادہ تمہاری مدد کی ضرورت ہے لیکن میں تمہارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ زبردستی نہیں کرسکتا۔ جو کچھ بھی تم نے میرے لیے کیا' وہ ایک احسان تھا اور رہے گا۔ یہ بھی تم نے ٹھیک ہی کہا کہ میں صرف نام بدل کے شاہ عالم نہیں بن سکتا۔ ابھی تک جتنا میں نے شاہ عالم کو سمجھا تھا' وہ شاہ عالم بننے کے لیے بہت کم ہے۔ کسی اور کی شخصیت بننے کے لیے اس کی زندگی کے ہر گزرے ہوئے دن کے ہر لمحے سے شناسائی ضروری ہے مگر یہ ناممکن کام ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ جتنا عرصہ تم اس کے ساتھ رہیں۔"

"چھ سال۔"

"چھ سال تک تم نے جو دیکھا' سنا اور محسوس کیا' اس کی پرائیویٹ لائف سے مجھے کوئی سروکار نہیں مگر پبلک لائف میں وہ جیسا تھا' تم اس کے بارے میں مجھے پوری معلومات فراہم کرسکتی ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تم کو سیاست داں اور بزنس مین شاہ عالم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

"مجھے سب معلوم تھا۔"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے جاسوس اس کی مصروفیات کے پل پل کی خبر تمہیں دیتے تھے۔ تم میری شریکِ راز ہو اور میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں۔ لیکن تم سمجھتی ہو کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی کے لیے بھی خطرات پیدا ہوگئے ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں دلدل میں قدم رکھ چکا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' میں ڈوب جاؤں گا کیونکہ مجھ میں شاہ عالم بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن شاہ عالم بھی تو ڈوب گیا۔ یہ صلاحیت اس کے کام کیوں نہ آئی؟"

"تم نے غلط مطلب لیا میری بات کا۔ میں تمہیں احساس دلانا چاہتی تھی کہ تم جتنی کمزوری دکھا رہے ہو' اتنے کمزور نہیں ہو۔ تمہارے پاس طاقت ہے اور اختیار ہے۔ عقل اور ذہانت ہے۔ حوصلہ ہے' پھر کیا وجہ ہے کہ تم اکیلے ہوتے جا رہے ہو۔ تمہارے دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔"

"کیا وجہ ہے؟"

"وجہ صرف یہ ہے کہ تم ابھی تک اپنی پرانی شخصیت کے خول سے پوری طرح باہر نہیں آئے۔ تم شرافت اور اصول پرستی کے چکر میں حقائق کی نفی کر رہے ہو۔ آج کی سیاست میں اور کاروباری دنیا میں شرافت اور اصول پرستی کا کیا کام۔ تم ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو۔ راتوں رات دنیا کو بدل دینے کا سوچتے ہو۔ تم کو ایسی کیا جلدی تھی پارٹی کو پاک صاف کرنے کی۔ اگر تمہیں شمس اور قریشی کو ہٹانا ہی تھا تو پہلے ان کے لیے دوستی اور اعتماد کا جال بچھاتے۔ ان کو قریب آنے کا موقع فراہم کرتے اور جب وہ پوری طرح تم پر بھروسا کرنے لگتے تو خاموشی سے ایک کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیتے اور مجرم دوسرے کو بنا دیتے۔ ان کی جگہ اپنے آدمی لاکے تم پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کرسکتے تھے مگر جو تم نے کیا اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔"

"یہ پہلے بھی سمجھایا تھا تم نے؟" میں نے اعتراف کیا۔

"دوسری غلطی پارٹی کے نوجوانوں کی مسلح "تنظیم" ایف اے ایف کو ختم کرنا تھا۔ سیاست کو اسلحے سے پاک کرنا اب کسی جماعت کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اپنے دفاع کے لیے سب مسلح ہوں تو طاقت کا توازن پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی طاقت اور صلاحیت نہیں رکھتے تو پھر آپ اپنا وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ کیا فائدہ ہوا تمہیں ایف اے ایف کو دشمن بنا کے؟ وہ پاگل اور سرپھرے نوجوان ہی تمہارے محافظ تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے شمس یا قریشی کی مجال تھی کہ تمہارے سامنے سر اٹھاتے؟ خالد عثمان اور خادم مرزا جیسے تمہیں اٹھوانے کی جرأت کرسکتے تھے؟ ایک ایس پی شاہ عالم ہاؤس میں گھس کے تمہیں پکڑ سکتا تھا؟ لیکن تم نے اپنے ہتھیار اپنے دشمنوں کے حوالے کردیے۔ تم نہتے رہ گئے تو کمزور ہوگئے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا جیسے لوگوں سے چھٹکارا پانے کے لیے بھی تمہیں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ تم آسانی سے ان کا بیڑا غرق کرسکتے تھے۔ انہیں تم آپس کی کاروباری رقابت سے فائدہ اٹھا کے ختم کرسکتے تھے۔ تم نے انہیں بھی دشمن بنالیا۔ پریس تم سے اس لیے ناخوش ہے کہ تم نے بڑے اور نامور صحافیوں کے سامنے پریس کانفرنس کی۔ شبنم کو تم اس طرح استعمال کرسکتے تھے۔۔۔ جیسے شاہ عالم کرتا تھا۔"

رخشی کی سیاسی سمجھ بوجھ اور مشوروں پر میری عقل پہلے بھی حیران تھی مگر آخری بات سن کے میں بھونچکا رہ گیا "یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ میرا شوہر اسے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کرتا تھا اس لیے کہ وہ خود استعمال ہونا چاہتی تھی۔ پھر تم نے اس کے ساتھ اپنا رویہ کیوں بدلا؟ تم وہی شاہ عالم بن کے رہتے تو اسے شک بھی نہ ہوتا۔"

"مگر یہ میرے لیے ناممکن تھا" میں نے کہا۔

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا سیاست میں۔ تمہاری شرافت کا سکہ یہاں نہیں چلے گا شاہ عالم۔ تم ناکام ہو جاؤ گے اگر اسی طرح سوچتے رہے۔"

"میرا خیال تھا کہ تمہیں شبنم سے رقابت کا حسد

ہوگا۔"

"شاہ عالم ایک عیاش آدمی تھا۔ مجھے کیا کسی عورت کو بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس کا شوہر گھر کی نوکرانی سے پیرس کی ماڈلز تک سب کے ساتھ راتیں گزارے اور بیوی گھر میں اس کے انتظار میں سوکھتی رہے۔ بے وقوف بنتی رہے۔ جھوٹ اور جبر برداشت کرتی رہے لیکن شبنم کی حد تک میں اسے معاف کرسکتی تھی کیونکہ وہ ایک صحافی تھی اور شاہ عالم کے لیے بہترین پی آر او۔ شاہ عالم پورا فائدہ اٹھاتا تھا اس کے ساتھ اپنے مراسم سے۔ تم بھی اٹھا سکتے ہو۔ سیاست داں بننا ہے تو پھر سیاست سے کام لو۔ شرافت علی خاں۔"

میں بہت دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ رخشی کا تجزیہ بالکل حقیقت پسندانہ اور سو فیصد درست تھا۔ میری ساری غلطیاں میرے سامنے آگئی تھیں اور وقت آگیا تھا کہ مزید نقصانات سے بچنے کے لیے میں زیادہ عملیت پسندی سے کام لوں۔ میں اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا لیکن ابھی تک میرا مستقبل کوئی نہیں تھا۔ میں لوٹ کے اپنی پرانی زندگی کی طرف نہیں جاسکتا تھا کیونکہ اس زندگی نے مجھے اپنانے سے انکار کردیا تھا۔ یہ جلاوطنی کی زندگی تھی جس میں ابھی تک میں بے یقینی کے ساتھ بھٹک رہا تھا۔

میرے حالات کا تقاضا تھا کہ میں اب گزر جانے والے دن کا غم بھول کے اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ آنے والے دن کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔

ناصر عظیم نے شاہ عالم بننے کا فیصلہ مجبور ہو کے کیا تھا یا اس نے محض مجبوری کو عذر بنالیا تھا۔ اس کے لاشعور میں کہیں ابھی تک اس خواہش کی کوئی چنگاری دبی ہوئی تھی جسے وہ مشعل بنا کے اقتدار اور اختیار کی آخری منزل تک دوڑتے ہوئے پانا چاہتا تھا۔ یا گردشِ حالات اسے ایک ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں ماضی کے سب رشتوں اور جذبوں کا ساتھ دینا اس کے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔ اس پر سوچ بچار لاحاصل تھی۔ مجھے فوری طور پر کوئی عملی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ یتیم خانے کے بعد میری زندگی میں ان گنت موڑ آئے تھے مگر ان میں میری خواہش یا کوشش کا دخل نہیں تھا۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر سے خان اعظم کے گھر تک ایک مسلسل سفر تھا جو ابھی جاری تھا۔ یک چشم صوفی کے بید کی مار کا درد بھی میں آج تک اسی طرح محسوس کرسکتا تھا جیسے شادو سے پہلے عشق کی کسک اور اس کی بے وفائی کے زخم کی ٹیس کو۔ آج چندا سے جدائی کا صدمہ نیا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس سے جانبر ہونا مشکل ہوگا۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی کیسے کیا جاسکتا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گا اور سب یوں ہی چھوڑ چھاڑ کے اس کی بارگاہِ نیاز میں حاضر ہو جاؤں گا کہ میری خطا معاف ہو۔ میں شاہ عالم نہیں' تمہارا وہی ناصر عظیم ہوں۔ میں خان اعظم سے دست بستہ معافی مانگوں گا اور آنسو بہانے والی قمر کو گلے لگا کے کہوں گا کہ پاگل لڑکی' تیرا بھائی تجھے چھوڑ کر کہیں جاسکتا ہے۔۔۔ تو صرف چاکلیٹ لینے کے لیے۔ اور ڈاکٹر کمال فاروقی کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

لیکن وہ وقت گزر گیا تھا جب میرے لیے اپنے نقشِ قدم دیکھتے ہوئے الٹے پاؤں لوٹ جانا ممکن تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ نقشِ پا وقت کی گرد میں گم ہوگئے تھے۔ وقت بڑا سفاک مسیحا ہے اور بڑا رحم دل چارہ گر ہے۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اپنی دنیا بسائی تھی اور پھر اسے چھوڑ کے ایک اجنبی اور نئی دنیا میں جا اترا تھا جہاں کے زمین و آسمان تک مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ جب میں نے ڈاکٹر مشہود کے گھر سے اپنے رشتے توڑے تھے اور فقیروں کے ڈیرے پہنچا تھا تب بھی میرے جذبات کی یہی کیفیت تھی۔ پھر جب شادو نے مجھے اپنے خوابوں کی دنیا سے بے دخل کیا تھا تب بھی میں اتنا ہی اکیلا تھا کہ اپنے دکھ اور احساسِ تنہائی کے ساتھ مرجانا چاہتا تھا لیکن ہجر کے صحرا میں آبلہ پا بھٹکنے کے باوجود میں نے امید کا نیا نخلستان تلاش کرلیا تھا۔ ہم سب ایسے ہی جیتے ہیں۔ جب مرنے کے بہانے رکھتے ہیں تو جینے کے بہانے بھی تلاش کرلیتے ہیں۔

رخشی کی آواز نے پھر مجھے سنگین حقائق کی دنیا میں کھینچ لیا "اب کیا سوچ رہے ہو؟"

"رخشی۔ جو سوال ابھی تم نے مجھ سے کیا تھا' وہی میں تم سے کرتا ہوں۔ کیا میں یہاں سے چلا جاؤں؟ یہ گھر بہرحال تمہارا ہے۔" میں نے کہا۔

"قانونی طور پر تم اس کے مالک ہوگئے ہو۔"

"سچ وہی ہے جو تم نے کہا تھا۔ میں نے شاہ عالم پر' اس کی بیوی پر اور گھر پر غاصبانہ قبضہ جمالیا ہے۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "جاؤ پھر عدالتِ عالیہ کے سامنے حاضر ہو کے سچ بولو۔ انہیں بتاؤ کہ تم ناصر عظیم ہو۔ جو پہلے ثابت کیا تھا اب اس کا الٹ ثابت کرو۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب تھا۔ تمہاری ہر بات کا مطلب کچھ اور کیوں ہوتا ہے آخر؟" وہ پھر چلانے لگی "تم شاہ عالم بن گئے ہو تو شاہ عالم بن کے کیوں نہیں دکھاتے۔ تم اتنا ڈر گئے ہو' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کم ہمت اور بزدل ہو۔"

"رخشی۔ نہ میں بزدل ہوں اور نہ شاہ عالم بننے سے ڈرتا ہوں۔ اب میں شاہ عالم ہوں تو شاہ عالم بن کے ہی دکھاؤں گا۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے لیکن میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کس منہ سے کہوں کہ تمہیں میرے ساتھ اسی طرح رہنا چاہیے جیسے تم شاہ عالم کے ساتھ رہتی تھیں۔ مجھے ہر قدم پر تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہوگی مگر میرے اور تمہارے ساتھ رہنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں بنتا۔"

"یہ اخلاقی جواز کون مانگ رہا ہے تم سے؟ یہ بقا کا مسئلہ ہے تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔"

"نہیں۔ میں اس مسئلے کے اخلاقی پہلو کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اگر میں شاہ عالم ہوں تو ہمارا دنیا کے سامنے میاں بیوی بن کے ایک ہی چھت کے نیچے نظر آنا ضروری ہے۔"

"اس چھت کے نیچے ایک ہی بیڈ روم نہیں ہے شاہ جی۔ ہم ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی الگ رہ سکتے ہیں۔"

"آخر کب تک؟"

"ابھی سے یہ فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ اپنے آپ سے۔"

"خطاکار انسان کو ایسا کوئی دعویٰ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تمہاری بہت سی خوبیوں کا معترف ہوں۔ تمہاری اس صلاحیت پر بھروسا کرتا ہوں جس سے اپنی بدقسمتی کے باعث شاہ عالم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ میں تمہارے اعتماد پر پورا اترنا چاہتا ہوں۔ ہم ایک اچھے دوست کی طرح رہ سکتے ہیں مگر ہمارے مذہب میں عورت 'مرد کی دوستی کا کوئی تصور نہیں کیونکہ یہ دینِ فطرت ہے۔ آگ اور پانی کی کیسی دوستی۔ اگر میں تمہیں دنیا کو دکھانے کے لیے چھوڑ دوں تو پھر مجھے اپنا ٹھکانا کہیں اور بنانا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ شاہ عالم کی یہاں کتنی جائداد تھی۔ اگر اس شہر میں اس کی اور کوئی کوٹھی ہے تو وہ میں تم سے خرید لوں گا۔ بے شک وہ میرے ہی نام پر ہوگی مگر اس کی قیمت تم کو ادا کی جاسکتی ہے۔"

"خدا کے لیے شاہ جی۔ یہ سب مسائل بعد میں حل کیے جاسکتے ہیں۔ ابھی سوچو کہ تمہیں آج کیا کرنا ہے۔ اس وقت جو کرنا ہے 'وہ کرو۔"

"نظر مجھے اپنی نہیں' تمہاری ہے۔ مجھے سب سے پہلے تیمور کے گھر جانا ہے اور اس کے جنازے میں شریک ہونا ہے۔ میں تم کو اکیلا چھوڑ کے جاؤں گا تو تم یہاں غیر محفوظ رہوگی۔"

"ان حالات میں تم کو بھی اکیلے نہیں گھومنا چاہیے" رخشی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تدفین شام سے پہلے ہوجائے گی۔ اس کے بعد میں ایک پریس کانفرنس بلاتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ موقع ملا تو میں پہلے شبنم سے بات کروں گا اور ابوبکر آزاد صاحب مل گئے تو ان سے بھی۔ تم دیکھنا' اب سارے معاملات ٹھیک ہوجائیں گے۔ کیا ایک دو روز کے لیے تم کسی محفوظ مقام پر منتقل ہوسکتی ہو۔ تمہارے کسی عزیز یا کسی سہیلی کا گھر ہو۔ یا شاہ عالم کی دوسری رہائش گاہ ہو کہیں۔"

"شاہ عالم حفاظت کے خیال سے ٹھکانے بدلنے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے شاہ عالم ہاؤس کے حفاظتی انتظامات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اندر باہر ایف اے ایف کے مسلح جوان ہر وقت پہرا دیتے تھے۔ گیٹ پر سخت سیکیورٹی تھی' کلوز سرکٹ کیمرے تھے اور انٹرکام کا نظام پورے گھر سے منسلک تھا۔ اب کچھ بھی نہیں' سب برباد کردیا حملہ آوروں نے۔"

میں نے کہا "یہ سب پھر ویسا ہی ہوجائے گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں جاسکتی ہو؟"

"ویسے تو میرے ایک چچا ہیں یہاں۔ وہ فوج میں کرنل تھے۔ لیکن میں نے شاہ عالم سے شادی کی تو وہ مجھ سے ناراض ہوگئے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے مجھے اپنے بیٹے کے لیے منتخب کیا تھا۔ اب تو اس بیٹے کی شادی بھی ہوچکی ہے۔ چچا شاید رویے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیں مگر چچی کی زبان سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ پھر ان کا بیٹا ہے اور اس کی بیوی۔ شاید وہ بھی مجھے برداشت نہ کریں۔ دور کے کچھ اور بھی رشتے دار ہیں۔ چھ سال سے میں نے کسی کی صورت نہیں دیکھی۔ کسی سے رابطہ نہیں رکھا۔ اب ضرورت پڑنے پر ان کے پاس پناہ کے لیے جانا مناسب نہیں لگتا۔"

"اسی لیے میں نے پوچھا تھا کہ شاہ عالم کی اور کوئی کوٹھی ہو؟"

"اس کی چار کوٹھیاں ہیں' شہر کے بہترین علاقوں میں۔ ایک میں کوئی وزیر صاحب رہتے ہیں بلکہ ان کی دوسری یا تیسری بیوی رہتی ہے۔ خود ان کے پاس تو سرکاری رہائش گاہ ہے اور پہلی بیوی انہی کے ساتھ ہے۔ باقی تین میں سے ایک حکومت نے کرائے پر لی ہے۔ جس میں کوئی سرکاری دفتر ہے۔ غالباً واپڈا کا کوئی آفس ہے۔ دو میں کرائے دار ہیں۔ وہ بھی اعلیٰ سرکاری افسر ہیں اور ان کا کرایہ بھی حکومت ادا کرتی ہے۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر شاہ عالم نے ایسا چکر چلایا تھا کہ اسے کرایہ بھی وگنا مل رہا تھا اور ہر سال کرائے کی مجموعی رقم اس کے اکاؤنٹ میں ایڈوانس جمع ہوجاتی تھی۔ اگر شاہ عالم کا کوئی خفیہ ٹھکانا تھا تو مجھے نہیں معلوم۔"

"ایسے لوگ ہر شہر میں ایک خفیہ ٹھکانا ضرور رکھتے ہیں۔"

"شاہ عالم کو کسی کا ڈر نہیں تھا۔ نہ اس کی آنکھ میں شرم تھی۔ شہر کے سارے ہوٹل آخر کس لیے ہیں۔"

میں نے کہا "ہوٹل بھی بعض اوقات غیر محفوظ ہوجاتا ہے۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کوئی جاننے والا دیکھ لے گا۔ شاہ عالم کو پہچاننے والے بہت تھے۔"

"اس کا آفس بھی گھر تھا۔ وہ ہفتے میں ایک دوبار ہی یہاں آتا تھا۔ باقی وقت وہ کہاں ہوتا تھا' مجھے نہیں معلوم۔ جیسے یہاں روپوشی کے لیے ایک تہ خانہ ہے ایسے ہی پارٹی کے سیکریٹریٹ میں انڈر گراؤنڈ آفس اور بیڈ روم ہیں۔ باہر نکلنے کا زیرِ زمین راستہ بھی ہے۔ میں نے سنا تھا۔"

"ٹھیک سنا تھا تم نے۔ ابھی ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ کیوں نہ میں سیکیورٹی کے سارے انتظامات کی ذمے داری کسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کو دے دوں۔ دو چار ایجنسیاں بڑی اچھی شہرت رکھتی ہیں" میں نے کہا۔

یہ آئیڈیا رخشی کو پسند آیا۔ اس کے ساتھ میں گیراج سے گزر کے تہ خانے میں پہنچا کیونکہ اوپر کے سارے ٹیلی فون بند پڑے تھے۔ گزشتہ رات جب نامعلوم حملہ آور شاہ عالم ہاؤس میں تخریبی کارروائی کے لیے پہنچے تھے تو رخشی نے... تہ خانے میں پناہ لی تھی۔ وہ میرا اور اپنا موبائل فون بھی ساتھ لے گئی تھی۔ شاہ عالم کا تمام ذاتی ریکارڈ بھی نیچے ہی تھا اور اس کی تفصیلات اس کے پرسنل کمپیوٹر میں محفوظ تھیں۔ ابھی تک یہ تہ خانہ رخشی کے سوا کسی کے علم میں نہیں تھا۔ ممکن ہے گھر کے اندر رہنے والے پرانے ملازم گلاب اور چنبیلی اس کے بارے میں جانتے ہوں۔ اشرف نے بھی ریکارڈ نیچے لے جانے میں رخشی کی مدد کی تھی مگر وہ خود غائب تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اوّلین فرصت میں اس تہ خانے سے تمام اہم دستاویزات' فائلیں اور کمپیوٹر وغیرہ کو میں خود کسی ایسی جگہ منتقل کرلوں گا جس کا علم میرے سوا کسی کو نہ ہو۔ یا صرف رخشی کی اس جگہ تک رسائی ہو۔ دشمنوں کا کیا بھروسا۔ جو آج ناکام لوٹ گئے تھے' کل پھر زیادہ تیاری کے ساتھ آئیں اور اس تہ خانے کا سراغ لگالیں۔

پہلی سیکیورٹی ایجنسی نے مجھے خوش آمدید کہا "ہم کیا کرسکتے ہیں آپ کے لیے سر۔ میں کمپنی کا جنرل منیجر ہوں۔"

میں نے کہا "آپ مجھے مکمل سیکیورٹی فراہم کرنے کی ذمے داری لے سکتے ہیں۔"

"آف کورس۔ ہم آپ کو بتاسکتے ہیں کہ اس وقت کتنے وی آئی پی ہمارے کلائنٹ ہیں" جی ایم نے کہا۔

"وہ مجھے معلوم ہے" میں نے کہا "مجھے ہائی رسک حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہے۔ گھر کے اندر' گھر کے آس پاس۔ آفس میں اور باہر جہاں بھی میں جاؤں یا میری فیملی جائے۔"

"بس آپ حکم کریں سر۔ ہم بہترین وسائل رکھتے ہیں۔ ویسے تو یہ بات ہے محاورے کی مگر عملاً پرندہ پر نہیں مار سکتا وہاں جہاں آپ نہ چاہیں۔ کوئی انگلی نہیں اٹھاسکتا آپ پر۔"

"پلیز شاعری مت کریں۔ مجھے مختصراً بتائیں کہ آپ کیا STEP لیں گے اگر میں آپ کو اسی وقت طلب کرکے مطمئن ہونا چاہوں۔ اخراجات کی بالکل فکر مت کریں۔ انتظامات فول پروف ہونے چاہئیں۔"

"فول پروف۔ بلٹ پروف' راکٹ اور میزائل پروف۔ اور پروف دینے کے لیے میں خود آتا ہوں توپ خانہ اور بکتر بند گاڑی لے کر۔" جی ایم یقیناً خوش مزاج اور کلائنٹس کی نفسیات کو سمجھنے والا شخص تھا۔

میں نے کہا "آپ آنے سے پہلے کم سے کم چھ سیکیورٹی گارڈ اسی وقت روانہ کریں جو شاہ عالم ہاؤس کو ہر طرف سے محصور کرلیں۔ آپ کی یا میری اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندر نہ آنے دیں۔ خصوصاً موت کے فرشتے کو۔"

وہ ہنسا "اسے تو ہم ہمیشہ رانگ نمبر کہہ کے کہیں اور بھیج دیتے ہیں۔ ہمارے کلائنٹس اسی لیے بے فکر ہوجاتے ہیں۔"

سیکیورٹی ایجنسی والوں کی انتظامی برق رفتاری نے مجھے حیران کردیا۔ رخشی مجھے ایک دیوار میں تصویر کے پیچھے نصب تجوری تک رسائی کا نظام سمجھا چکی تھی اور شاہ عالم کی ہر اپرنی کی فائلیں' بینک اکاؤنٹس کی ڈپازٹ بکس اور چیک بکس دکھا رہی تھی کہ موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"سیکیورٹی گارڈ پہنچ چکے ہیں سر۔ اور پوزیشن لے چکے ہیں۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟" جی ایم نے کہا۔

"آپ آجائیں۔ میں گھر پر ہی ملوں گا۔" میں نے کہا۔

میں نے تجوری بند کی۔ تصویر کو برابر کیا جو ایک کھانچے میں فٹ ہوجاتی تھی اور اسے باہر نکالنے کے لیے فریم کو ایک خاص جگہ سے دبانا پڑتا تھا۔ آرائش کے لیے تمام تصویریں اسی طرح لگائی گئی تھیں۔ یہ مصوری کے اصل شاہکار نہیں' ان کے پرنٹس تھے اور ان کے انتخاب میں کسی خاص جمالیاتی ذوق کا دخل نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ عالم نے تصویر کے موضوع سے زیادہ فریم کی خوب صورتی سے متاثر ہوکے انہیں خرید لیا تھا۔

"یہ سارا ریکارڈ جو سیف میں ہے' کمپیوٹر کی ایک ڈسک میں بھی محفوظ ہے اور وائرس کے خطرے کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاہ عالم نے ڈسک کی ڈپلی کیٹ الگ رکھی ہے" رخشی نے بتایا۔

میں نے کہا "وہ کہاں ہے؟"

"اسی تجوری میں۔ تم کمپیوٹر میں لگا کے ساری تفصیلات دیکھ سکتے ہو۔ سارے بینک اکاؤنٹس' ہر ماہ یا ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال کا لین دین' منافع' دیگر ذرائع سے آمدنی' اخراجات' ٹیکس' سب کچھ ہے اس میں۔"

"مجھے اندازہ ہے کہ ایک کمپیوٹر ڈسک میں کیا کچھ سما سکتا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ اس کے مقابلے میں ہیچ لگتا ہے مگر بنیادی اور سب سے اہم چیز ہے شاہ عالم کی شناخت سمجھے جانے والے اس کے دستخط۔ وہ میں نے دیکھ تو لیے ہیں۔"

"اگر بھی لوگے۔ زیادہ مشکل نہیں ہیں اور شک وہاں ہوتا ہے جہاں چیک کوئی اور پیش کرے" وہ بولی۔

"اب مجھے پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ یہ سب تمہارے اکاؤنٹ میں ڈال دوں۔ کیا تمہارا اور شاہ عالم کا کوئی مشترکہ اکاؤنٹ تھا؟"

"ایک اکاؤنٹ ہے مگر وہ بہت کم آپریٹ ہوتا ہے۔ اس میں دو چار لاکھ کی رقم پڑی ہوگی۔"

میں نے کہا "چلو یہ اچھا ہے۔ اگر سارا سرمایہ ایک ہی اکاؤنٹ میں چلا جاتا ہے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا اور نہ شک۔"

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "ضرورت ہے۔ میں شاہ عالم کا اور تمہارا پیسہ خرچ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ سب تمہارا ہے تو تمہارے پاس ہی رہنا چاہیے۔ میں ساری چیک بکس بھی تمہارے حوالے کر دیتا مگر اب میرے اکاؤنٹ میں سے جتنا پیسہ جائے گا اس سے زیادہ ہی دوسرے اکاؤنٹ سے آجائے گا۔ وہ میرا اپنا پیسہ ہے جو مختلف بینکوں میں پڑا ہوا ہے۔ ناصر عظیم کے اکاؤنٹ میں۔"

"جلد بازی میں کوئی فیصلہ مت کرو۔ یہ سب اطمینان سے بیٹھ کے بھی طے کیا جا سکتا ہے" وہ بولی۔

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ سیکیورٹی کمپنی کے جی ایم نے کہا "بندہ حاضر ہے سر۔ آپ بھی تشریف لے آئیں تو بات بنے۔"

"کیا بنے بات' جہاں بات بنائے نہ بنے۔" میں نے کہا۔

"جی۔ یعنی بات کیوں نہ بنے آخر۔ جہاں چاہ ہے' وہاں راہ ہے۔"

میں فون بند کر کے رخشی کے ساتھ اوپر گیا تو اسے گھر سے باہر پورچ کے سامنے لان میں کھڑا پایا۔ وہ دائیں بائیں اور اوپر نیچے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے بسنت پر اقبال پارک میں کوئی بچہ پتنگوں کو دیکھتا ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ مجھے ہائی رسک سیکیورٹی چاہیے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں اپنی زندگی اور جان و مال کی سلامتی کو سخت خطرے میں محسوس کرتا ہوں مگر اس نے سب کچھ سمجھ لینے کے باوجود اپنے رویے سے میری پریشانی اور تشویش کم کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ شاید یہی اس کے اچھے سیلز مین ہونے کا ثبوت اور اس کمپنی کی گڈ ول کا راز تھا۔ ایک اچھا ڈاکٹر مریض کا اعتماد اپنی باتوں سے بحال کر کے آدھا مرض علاج شروع کرنے سے پہلے ہی دور کر دیتا ہے کہ یہ تو کوئی ایسی پریشانی کی بات ہی نہیں۔ معمولی مسئلہ ہے۔ آپ دوا کھائیں گے اور یوں چٹکی بجاتے میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایسے ہی سیکیورٹی ایجنسی کے جی ایم نے بڑے شگفتہ انداز میں بات کر کے مجھے یقین دلایا تھا کہ مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ہر قسم کے خطرات سے نمٹنے کا تجربہ رکھتے ہیں اور میں ان کی کارکردگی پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ اس نے صرف باتیں ہی نہیں کی تھیں عملی طور پر اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر کے مجھے قائل کر لیا تھا کہ میں نے حفاظت کے فرائض انہیں سونپ کر صحیح سمت میں قدم اٹھایا تھا۔

وہ بسنت کی پتنگوں کو نہیں' سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے اہم اور STRATAGIC مقامات کی LOCATION پر غور کر رہا تھا۔ یہ طے کرنے کے لیے کہ خطرہ کس سمت سے کیا ہو سکتا ہے اور اس سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے۔ اسے کہاں کہاں کیمرے لگانے ہوں گے۔ کہاں الارم نصب کرنے ہوں گے اور کہاں گارڈ کھڑے کرنے ہوں گے۔

اس نے میرے ساتھ شاہ عالم ہاؤس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ پرانے سیکیورٹی سسٹم کا جائزہ لیا اور حملہ آوروں کے ہاتھوں ہونے والی تخریب کاری کو دیکھا۔ وہ میری بات بھی دھیان سے سنتا محسوس ہوتا تھا لیکن اس کا ذہن اپنے طور پر بہت کچھ طے کرنے میں مصروف تھا۔ وہ میرے جیسے کلائنٹ سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پلیز شٹ اپ۔ یہ ہمارا کام ہے اور ہم پروفیشنل لوگ ہیں۔ ہمیں کچھ سمجھانے اور مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے کہا "میں نے سب دیکھ لیا ہے سر اور مسئلہ کسی حد تک سمجھ بھی لیا ہے۔ آپ مجھے دو دن دیجیے۔"

"دو دن۔۔۔ وہ کس لیے؟"

"اپنا پورا پلان دینے کے لیے اور اخراجات کا ESTIMATE بنانے کے لیے۔"

میں نے کہا "یعنی خطرہ مجھے آج ہے۔ تم ذمے داری قبول کرو گے اپنی ضابطے کی کارروائی کے بعد۔ جب میں تمہیں ادائیگی کروں گا؟"

وہ مسکرایا "وہ تو سر۔ کام تو شروع کر چکے ہیں ہم۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ چھ گارڈ یہاں موجود ہیں۔ اب انہیں میں

سمجھاؤں گا کہ ان کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا ہے۔ آپ کا گھر محفوظ ہے لیکن یہ پہلا مرحلہ ہے' دوسرے مرحلے میں ہم سیکیورٹی کے آلات وغیرہ نصب کریں گے۔ یہاں پہلے جو سسٹم تھا' وہ بھی خراب نہیں تھا لیکن ہمارا سسٹم مختلف ہے اور زیادہ RELIABLE ہے۔ اسے ہمارے انجینئرز دو دن میں لگا دیں گے۔ الارم سسٹم کیمرے وغیرہ CCTV کیمرے اور اندھیرے میں دیکھنے والے اور تصویر اتارنے والے۔ ٹیپ ریکارڈر' فون کال کو مانیٹر کرنے والے اور کچھ مخصوص آلات جو آگ اور آتشیں اسلحے وغیرہ کو محسوس کرتے ہیں۔ پھر ہمیں FENCING کرنی ہے۔"

"کیا مطلب۔ کانٹوں والے تار کی باڑھ لگائیں گے دیوار پر اور اس میں بجلی چھوڑیں گے؟"

"یہ بھی ہوتا ہے سر" وہ ہنسنے لگا "لیکن آپ سمجھتے ہیں نا کہ ایک معمولی ربر کے دستے والی پلائر سے کوئی بھی یہ تار کاٹ سکتا ہے۔ ہم دوسری چیز لگائیں گے۔ یہ انفراریڈ شعاعوں کی باڑھ ہوگی۔ ایک آلہ ہے جو اندھیرے اجالے میں نظر نہ آنے والی روشنی کی شعاعیں خارج کرتا ہے۔ اس کی کرنیں ایک BEAM کی صورت میں چاروں طرف سے حصار قائم کرتی ہیں۔ جب اس سسٹم کو آن کر دیا جائے تو غلط سمت سے داخل ہونے والے کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اس نے روشنی کا راستہ روک کے سرکٹ توڑ دیا ہے اور الارم خاموشی سے آن ہو جاتا ہے۔ کنٹرول میں لائٹ کا سگنل مل جاتا ہے اور ہلکی سی سیٹی کا بھی جو باہر سنائی نہیں دیتی۔ کیمرے آن ہو جاتے ہیں اور ناجائز طریقے سے اندر آنے والے کی تصویر مانیٹر پر آجاتی ہے۔ پرنٹ بھی ہو جاتی ہے۔ سیکیورٹی گارڈ اس پر سرچ لائٹس فوکس کر کے اچانک اسے اندھا کر دیتے ہیں اور پکڑ لیتے ہیں۔ بس ایسی ہی حفاظتی تدابیر ہیں۔ آپ تفصیل سے سمجھنا چاہیں تو میں انجینئرز سے کہہ دوں گا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ جتنا سمجھنا میرے لیے ضروری تھا' اتنا میں نے سمجھ لیا۔"

"مجھے آپ سے ایک میٹنگ کرنی ہوگی۔ آپ کی مصروفیات اور آپ کے شیڈول کو سمجھنے کے لیے۔ آپ کس وقت کیا کرتے ہیں' بیگم صاحبہ کی مصروفیت کیا ہے۔ آپ کے سب ملاقاتیوں کی تفصیل۔ ممکن ہو تو فوٹو۔ نام پتے اور ٹیلی فون نمبر۔ یہ سب ہمیں کمپیوٹر میں ڈالنے ہوں گے۔ بعد میں یہ کام جاری رہے گا۔ جو لوگ آئیں گے ان کے بارے میں معلومات جمع ہوتی رہیں گی اور کمپیوٹر چیک بھی کرتا رہے گا۔ آپ ہمیں درجہ بندی بتائیں گے۔"

"درجہ بندی۔۔۔ کس کی۔۔۔؟"

"سب جاننے والوں کو CLASSIFY کرنا ضروری ہوگا۔ کون لوگ ہیں جن کو سیکیورٹی کلیئرنس حاصل ہوگی ہر وقت۔ انہیں روکا جائے تو تعلقات خواہ مخواہ خراب ہوتے ہیں۔ سو فیصد اپنے لوگ مثلاً ماں باپ' بھائی بہن وغیرہ اس CATAGORY میں آتے ہیں۔ پھر دوست احباب اور کاروباری لوگ۔ سیاسی شخصیات۔ ہر ایک سے DEAL کرنے کے لیے یہ ساری انفارمیشن ضروری ہے۔ آخر میں ہم آپ کو بریف کریں گے کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ کیسے کرنا ہے' کیا نہیں کرنا ہے۔ دیکھئے نا' آپ کے تعاون کے بغیر تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ سکتا ہوں آپ کی پرابلم۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں' کریں۔ اخراجات کے لیے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

"ویٹ از نو پرابلم" وہ بولا "ابھی آپ کو ESCORT بھی چاہیے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ڈرائیور بھی ہم فراہم کریں گے اور ایک گن مین جو اس کے ساتھ آگے بیٹھے گا۔ آپ کو جہاں بھی جانا ہوگا آپ اسے پہلے بتائیں گے اور راستے کا انتخاب اس پر چھوڑ دیں گے۔ کتنی گاڑیاں ہیں آپ کے پاس؟"

"کل تک دو تھیں' انہیں آگ لگا دی گئی۔ دوسری خرید لیں گے۔"

"آپ سیکیورٹی والوں کے مشورے سے گاڑی بدلیں تو بہتر ہے سر۔ ان سے کوئی بحث نہ کریں۔ آج ممکن ہے آپ کو کرائے کی گاڑی یا ٹیکسی میں جانا پڑے اور آپ کے ساتھ ایک گاڑی خالی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو ایک پائلٹ گاڑی فراہم کر دی جائے۔"

"آپ اس معاملے میں خود مختار ہیں۔ ابھی آپ نے ڈرائیور کی بات کی تھی کہ وہ آپ فراہم کریں گے۔ مجھے اور بھی ملازم ایسے ہی چاہئیں۔ مالی' خانساماں' ویٹر' بٹلر۔ جو بھروسے کے قابل ہوں۔"

"نو پرابلم سر۔ اس سے تو ہمارے لیے آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اصرار کرتے ہیں کہ ان کے پرانے ملازمین کو سیکیورٹی کلیئرنس کی ضرورت نہیں مگر ہم کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ زمانہ ایسا ہے کہ کسی شخص کا بھی ایمان خریدا جا سکتا ہے۔ انڈین پرائم منسٹر اندرا گاندھی کو انہی کے ایک گارڈ نے ہلاک کر دیا تھا۔ گھر کا بھیدی والا محاورہ ایسے ہی تو مشہور نہیں ہوا۔ ایک دو دن میں آپ کو ملازم فراہم کر دیے جائیں گے۔"

"اندر آنے جانے والے افراد کے علاوہ ہر قسم کے سامان کی چیکنگ بھی ہونی چاہیے" میں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بالکل ہوگی سر۔ ورنہ تو گنٹ میں ٹائم بم بھی آجائے گا اندر۔ ہم دیکھیں گے کہ تربوز واقعی تربوز ہے یا ایٹم بم۔ ہم PERFECTIONIST ہیں' اپنے کام کے معاملے میں۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے آدھے تفکرات کا بار سر سے اتر گیا ہے۔ اب میں اپنی حفاظت کی طرف سے بے فکر ہو کے اپنی ساری توجہ دوسرے زیادہ اہم مسائل پر دے سکتا تھا اور اپنا کام بے خوف ہو کے یکسوئی سے کر سکتا تھا۔ شاید یہ سب مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا مگر خیر۔ دیر آید درست آید۔

"آج میری کچھ ایسی مصروفیات ہیں جہاں مجھے زیادہ حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا "ایک تو مجھے اپنے سینئر نائب صدر کے جنازے میں شرکت کرنی ہے۔ گھر سے قبرستان تک۔"

اس نے کچھ سوچ کے کہا "تدفین شام تک ہوگی۔ میں معلوم کرلوں گا کہ جنازے کا راستہ کیا ہے۔ آپ سارا راستہ بدل نہیں چلیں گے۔ آپ کی گاڑی میں چار افراد ہوں گے۔ دو آگے۔۔۔ دو پیچھے آپ کے دائیں بائیں۔ وہ سب سادہ کپڑوں میں مگر پوری طرح مسلح ہوں گے۔ ڈرائیور اور گن مین دونوں سابق فوجی کمانڈو ہیں اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا۔ یہ بہت زیادہ نہیں ہے؟"

"آپ نے ہائی رسک سیکیورٹی مانگی تھی۔ ہم چند دن میں صورتِ حال کا مزید اندازہ کرلیں گے۔ پھر شاید کچھ RELAX کردیں۔ زیادہ سخت بھی کرسکتے ہیں۔ آپ کی ایک کیس فائل بنے گی۔ ہر روی آئی پی کی طرح۔"

رخشی نے کہا "شاہ جی۔ آپ نے کہا تھا کہ تعاون کریں گے پھر ابھی سے اعتراض کیوں؟"

میں نے کہا "سوری بابا' میں بھول گیا تھا۔ مجھے تدفین کے بعد ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کرنا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہ تو ابھی میں نے طے نہیں کیا۔ کسی ہوٹل میں" میں نے کہا۔

"اوکے۔ جب آپ یہ بتادیں گے۔ اس کے بعد ہم دیکھ لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ آپ کا کوئی پی آر او ہے یا سیکریٹری؟"

"ابھی تو نہیں ہے" میں نے کہا۔

رخشی نے کہا "جو پہلے تھے انہیں بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہٹانا پڑا تھا۔"

میں نے کہا یا "ہاں۔ نئی اپائنٹمنٹ کریں گے چند دن میں۔"

اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا "آپ دن رات کے چوبیس گھنٹے مجھے کہیں بھی کال کرسکتے ہیں۔ آفس میں یا گھر پر۔"

"وہ سب آلات وغیرہ جو آپ نصب کریں گے' ان کی قیمت تو مجھے الگ دینی ہوگی لیکن ماہانہ خدمات کا معاوضہ کیا ہوگا؟"

"دس لاکھ سر۔ آپ سے ایک ایگریمنٹ سائن کرائیں گے ہم۔ اس میں ساری تفصیلات ہوں گی" اس نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے رخشی سے کہا "کیسی عجیب بات ہے۔ دس لاکھ ماہانہ صرف حفاظت کی ذمے داری کے؟"

وہ بولی "زندگی کی قیمت لاکھوں یا کروڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "کس کی زندگی؟ ایک وی آئی پی کی زندگی۔ عام آدمی کی جان کی قیمت کیا ہے؟"

"یہاں کروڑوں خرچ کیے جاتے ہیں سرکاری خزانے سے۔ ان لوگوں کی حفاظت کے لیے جو عوام کی خدمت کے لیے عوام کے نمائندے بن کے منتخب ہوتے ہیں۔" رخشی نے کہا "وزیراعظم ہاؤس اور ایوانِ صدر پہنچنے والا اتنا قیمتی ہوجاتا ہے کہ بعد میں اسی کو ووٹ دینے والے عوام سے سیکیورٹی فراہم کی جاتی ہے۔ قوم کے خزانے سے الیکشن پر خرچ ہونے والے ایک روپے کے بدلے سو وصول کرنے کے لیے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔"

"ایسا ساری دنیا میں ہوتا ہے۔"

"ہم جیسا غریب ملک کیسے مقابلہ کرسکتا ہے ساری دنیا کا۔ امریکی اپنے صدر کی حفاظت پر کروڑوں ڈالر صرف کرسکتے ہیں مگر اس کے باوجود زندگی کی ضمانت کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ وقت آیا تو صدر کینیڈی کا ایک بلٹ پروف کی چھت پر بیٹھے ہوئے ایک پیشہ ور قاتل کی صرف ایک گولی نے کام تمام کردیا۔ وہ بلٹ پروف کار میں تھے اور کار جلوس میں چل رہی تھی۔ گولی صرف کینیڈی کو لگی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی جیکولین کو نہیں لگی۔"

"تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہ حفاظتی انتظامات کا کوئی فائدہ نہیں؟" رخشی نے چڑ کے کہا۔

"دس لاکھ ماہانہ کسی اسکول کو مل جائیں تو ان تمام بچوں کو بیٹھنے کے لیے فرنیچر مل جائے جو ابھی فرش پر بیٹھ کے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ سرکاری اسپتالوں کو مل جائیں تو سیکڑوں مریض جو بازار سے دوا نہیں خرید سکتے' مایوس نہ لوٹیں۔ میرے دس لاکھ میرا ذاتی پیسہ ہیں۔ اسے بھی خرچ کرتے ہوئے مجھے احساسِ جرم ہوتا ہے۔ جو سرکاری خزانے سے

لاکھوں کروڑوں خرچ کر ڈالتے ہیں' بلاوجہ' کسی خطرے کے عملی وجود کے بغیر۔ صرف شان اور اپنے مرتبے کا اظہار کرنے کے لیے کہ دیکھو ہم کتنے بڑے اور اہم ہیں اور ہماری زندگی کس قدر بیش قیمت ہے۔"

"پہلے بادشاہ کی آمد کا اعلان ہوتا تھا۔ نوبت اور نقارے کے ساتھ سواری نکلتی تھی۔ باادب باملاحظہ ہوشیار کی صدا دی جاتی تھی۔ اب وہی کام سیکیورٹی والے کرتے ہیں۔ بائلٹ' اسکورٹ' موٹر سائیکل سوار۔ سائرن اور آگے پیچھے مسلح محافظوں کی فوج۔"

"سب بے کار اور لاحاصل غرور کی نمائش ہے رخشی۔ مقررہ وقت کو خدا کے سوا کون ٹال سکتا ہے۔ مجھے یہ سب ہرگز اچھا نہیں لگتا مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ میرے مقابلے پر پیشہ ور لوگ ہیں تو ان کا مقابلہ میں اکیلا نہیں کرسکتا۔ یہ بے وقوفی اور خودکشی کی کوشش ہوگی' اگر میں سینہ تان کے سڑک پر چلنے لگوں اور کہوں کہ مجھے خدا پر بھروسا ہے' آنکھیں بند کرکے سڑک عبور کروں کہ موت کا ایک دن معین ہے' مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج کے ان انتظامات سے مجھے ذہنی سکون کا احساس ضرور ملا ہے۔"

رخشی نے کہا "اب میں بھی سکون سے رہوں گی۔ فارغ تو بیٹھ نہیں سکتی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے تو صفائی ہونی چاہیے۔ جتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے کل رات' اس نے گھر کو کباڑ خانہ بنادیا ہے۔ میں سب چیزیں باہر نکال کے انہیں بالکل REPLACE کرنا چاہتی ہوں۔ سب کچھ بدل دینا چاہتی ہوں۔ ہر چیز نئی۔"

"تاکہ تمہیں اس احساس کی مکمل طمانیت حاصل ہو کہ وقت بدل گیا ہے اور یہ ایک نئی زندگی ہے۔"

اس کے چہرے پر اداسی کا سایہ سا آکے گزر گیا۔

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔ اب کم سے کم یہ اطمینان تو ہے کہ میری ساری زندگی رائگاں نہیں گئی۔ میں بھی اب اہم ہوں۔ میری سوچ اور خواہش لاحاصل نہیں رہی۔ میں کچھ کرنا چاہوں تو کرسکتی ہوں۔"

"کبھی پہلے ایسا ہوا کہ تم نے شاہ عالم ہاؤس کی نئے سرے سے اپنے ذوق وشوق کے مطابق آرائش کرنے کا سوچا ہو اور تمہیں روک دیا گیا ہو؟"

"نہیں مگر روکا جاتا اگر میں ایسا کرتی۔ مجھے اندازہ تھا اپنی وقعت کا۔ اس گھر میں وہ (نعوذباللہ) خدا تھا۔ اس کی خدائی میں دخل دینے کا مطلب تھا اپنی تذلیل۔ مجھے اتنا اختیار حاصل نہیں تھا کہ ذاتی کپڑے اپنی پسند سے خرید سکوں۔ اپنی مرضی سے کہیں جاسکوں۔ میری دوست اور سہیلی کوئی نہیں رہی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ فون پر بات کرلو۔ فون ٹیپ ہوتے تھے یا سہیلی کو یہاں بلالو۔ ہماری گفتگو خفیہ مائک سنتے تھے۔ یہ عملاً نظربندی تھی۔"

"آئی ایم سوری کہ میں نے یہ ذکر چھیڑا۔ اب تم شاہ عالم ہاؤس کو بالکل بدل ڈالو۔ کسی انٹیریر ڈیکوریٹر کو بلاؤ۔"

"مجھے اپنے آپ پر بھروسا ہے۔"

"اوکے۔ تم اسے REDECORATE کرو۔ اندر سے باہر سے۔ کلر اسکیم بدل ڈالو۔ لائٹس اور فٹنگ تبدیل کردو۔ فرنیچر' ڈیکوریشن کی ہر چیز۔ پردے' قالین۔ سب کو ایک نئی LOOK دے دو۔ اچھی سے اچھی چیز خود پسند کرو اور لے آؤ۔ اخراجات کی فکر مت کرو۔ میں بلینک چیک دے سکتا ہوں۔"

"اخراجات میرے ہوں گے۔ میں اپنا شوق پورا کررہی ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ شاہ عالم ہاؤس میرا ہے" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

مجھے کچھ شرمندگی اور مایوسی ہوئی "اس میں کیا شک ہے۔ لیکن میں بھی رہوں گا یہاں۔۔۔ تمہارے ساتھ۔"

اس نے نظر جھکائی "ہاں۔ ابھی تو رہیں گے ہم ساتھ۔ جب تک تم چاہو گے۔ اور میری ضرورت محسوس کرو گے۔"

میں نے موضوع بدلنے کے لیے گھڑی دیکھی "ایک بجنے والا ہے' لنچ کا کیا ہوگا؟ گلاب اور چنبیلی کہاں غائب ہوگئے؟ سرونٹ کوارٹر میں دیکھا؟"

"سرونٹ کوارٹر میں ان کا سامان پڑا رہتا تھا۔ وہ خود اندر ہی رہتے تھے" رخشی نے کہا "میں دیکھ لیتی ہوں۔"

اب رخشی کا خوف دور ہوگیا تھا اور اعتماد لوٹ آیا تھا۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ چھ مسلح گارڈ ہر طرف سے شاہ عالم ہاؤس کی نگرانی کررہے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کے سرونٹ کوارٹر کا دروازہ کھولا اور پھر ایک چیخ ماری۔ گلاب اور چنبیلی وہاں ایک ساتھ بندھے پڑے تھے۔ ان کے منہ پر ٹیپ لگادیا گیا تھا۔ اگر مجھے سرونٹ کوارٹر دیکھنے کا خیال نہ آتا تو شاید وہ اسی طرح پڑے رہتے اور بھوکے پیاسے مرجاتے۔

میں نے ان کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ چنبیلی بے ہوش تھی۔ گلاب ہوش میں تھا مگر اس کی حالت غیر ہورہی تھی۔ فوری طور پر ان سے سوال جواب کرنا بے کار تھا۔ انہیں پہلے طبی امداد کی' خوراک اور آرام کی ضرورت تھی۔ گلاب کو رخشی نے سہارا دیا اور وہ چند منٹ بعد اٹھ کر کھڑے ہونے اور چلنے کے قابل ہوگیا۔ چنبیلی کو مجھے اٹھا کر اندر لے جانا پڑا۔ رخشی نے اسے ایک بیڈ روم میں لٹادیا اور ڈاکٹر کو فون کرنے لگی لیکن میں نے اسے روک دیا۔

"یہ ابھی کچھ دیر میں بالکل ٹھیک ہوجائیں گے" میں نے کہا "دیکھو چنبیلی کو بھی ہوش آنے لگا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں ان کے لیے پانی میں گلوکوز ملا کے لاتی ہوں" رخشی نے کہا "اس کے بعد گرم دودھ۔"

گلاب دس منٹ بعد بالکل ٹھیک اور اس قابل ہو گیا کہ بات کر سکے۔ اس کی گھر والی ہوش آجانے کے بعد بھی خوف سے لرزتی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رخشی نے مجھے بتائے بغیر اسے سکون آور گولی بھی دے دی۔

میں نے گلاب سے کہا "دیکھو اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ باہر سیکیورٹی والے آگئے ہیں۔ مجھے بتاؤ کل رات کیا ہوا تھا؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں سرکار' وہ کون تھے۔" وہ پُر خوف لہجے میں بولا "میں نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چاروں ایک جیپ میں بیٹھ کے آئے تھے۔"

"تم نے انہیں آتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"نہیں جی۔ ہمیں تو بیگم صاحبہ نے کام سے بھیجا تھا۔" اس نے رخشی کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم کس کام سے باہر گئے تھے۔"

"رخشی بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ اخبار کے دفتر جاؤ۔ اور آپ کے ایک دوست ہیں' ان کو بلانے کے لیے کہا تھا۔ لیکن۔"

"لیکن کیا۔؟" میں نے کہا "آگے کیوں نہیں بولتے؟"

اس نے رخشی کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ دیے "ہمیں معاف کردو بیگم صاحبہ۔ ہم سے غلطی ہوگئی' ہم بہت ڈر گئے تھے۔"

رخشی نے اسے ڈانٹا "صاف صاف بات کیوں نہیں بتاتے۔"

"وہ جی۔ بیگم صاحبہ' آپ نے کہا تھا کہ کسی نے فون پر دھمکی دی ہے۔ ہم نے آپ کے ساتھ مل کے کچھ سامان نیچے پہنچایا تھا۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ آپ۔۔۔ بہت پریشان تھیں۔ اور ڈری ہوئی تھیں۔ چنبیلی تو بہت بزدل ہے اور بے وقوف بھی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم کہاں تلاش کریں گے اخبار کا دفتر۔ ٹیلی فون کردیتے ہیں۔ ہم نے فون کیا مگر اخبار کے دفتر والوں نے بتایا کہ مس شبنم رات کے وقت نہیں ہوتیں۔ اپنے فلیٹ پر ہوں گی۔ ہم نے وہاں کا نمبر مانگا تو انہوں نے نہیں بتایا۔ کہا کہ ہمیں بتادو کیا کام ہے؟ ہم پیغام دے دیں گے۔ ہم نے کہہ دیا کہ شاہ عالم صاحب کی بیگم ان سے ابھی ملنا چاہتی ہیں۔ پتا نہیں کون تھا جی' ہنسنے لگا کہ اس وقت تو شبنم سے گورنر بھی ملنا چاہے تو وہ نہیں ملے گی۔۔۔ اور۔۔۔" وہ رُک گیا۔

"اور بھی کچھ کہا تھا اس نے تو بتادو" رخشی بولی "ڈرو نہیں۔"

"اس نے کہا تھا کہ شاہ عالم کی بیگم صاحبہ کیا اسے قتل کرنا چاہتی ہیں' اپنے گھر بلا کے۔ بس جی پھر اس نے فون بند کردیا۔ مجھ سے بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ رئیس خان کا پتا چلاؤ۔ چنبیلی رات کے وقت اکیلی اخبار کے دفتر جا ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ میرے ساتھ رہی۔ ہم نے رئیس خان کا پتا تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے۔ ہم رکشا میں پھرتے رہے۔ ان کے دو تین ٹھکانے ہیں۔ سب جگہ دیکھا اور پھر واپس آگئے۔ جب ہم رکشا چھوڑ کے اندر آئے تو جیپ کھڑی تھی۔ ہم نے سمجھا کہ پولیس والے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ نے تھانے فون کیا ہوگا تو آئے ہوں گے مگر اندر گئے تو بڑی گڑبڑ تھی۔ وہ سارے کمروں میں پھر رہے تھے۔ ہر الماری کھول کے چیزیں باہر پھینک رہے تھے اور توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا۔ ہم سے پوچھا کہ گھر والے کہاں ہیں۔ ہم نے کہا کہ کون گھر والے۔ ایک بیگم صاحبہ ہوتی ہیں یہاں۔ وہ صاحب کے وکیل سے ملنے گئی ہیں' ایک صحافی ہیں مس شبنم ان کے ساتھ۔"

میں نے کہا "قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ بڑی عقلمندی سے کام لیا تم نے۔"

"انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو اور اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟ ہم نے کہا کہ نوکر ہیں اس گھر کے۔ گھر والی امریکہ سے ہے۔ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ چنبیلی کا حال خراب ہوگیا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم سے جھوٹ بولا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ پتا نہیں کیا کیا پوچھتا رہا ہم سے۔ ہمیں کچھ پتا ہوتا تو بتاتے۔ اس نے مارنا شروع کردیا ہمیں تو یہ چیخنے لگی اور بے ہوش ہو کے گر گئی۔ اس کے بعد دوسرے نے کہا کہ یہ نوکر ہیں انہیں کیا معلوم پھر انہوں نے ہمیں وہاں بند کردیا۔"

میں نے کہا "تم نے جیپ کا نمبر دیکھا تھا؟"

اس نے منہ لٹکا لیا "شک ہو جاتا تو ضرور دیکھتے۔ مگر۔"

میں نے کہا "ان چاروں کی صورت تو غور سے دیکھی ہوگی۔ مجھے یاد کر کے بتاؤ' ناک نقشہ کیسا تھا' بال کیسے تھے' آنکھیں کس رنگ کی تھیں۔ کپڑے کیا پہن رکھے تھے؟"

اس نے ایک ایک کے بارے میں خاصی تفصیل سے بتایا۔ وہ بے وقوف اور بزدل ضرور نظر آتا تھا مگر تھا نہیں۔ اس نے سب کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ

بعد میں اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جب پولیس کے پاس رپورٹ لکھوائی جائے گی تو انہیں چشم دید گواہ کی حیثیت حاصل ہوگی اور تفتیش کا سارا دباؤ انہی پر ہوگا۔

اس کے بیان سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ چاروں حملہ آور کون تھے۔ ان میں سے ایک خالد عثمان تھا اور دوسرا خادم مرزا۔ ان کے ساتھ بابر اور ٹائیگر آئے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حملہ میرے سیاسی مخالفین نے پارٹی کا ریکارڈ حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا' یہ پرنس کی مافیا کا کارنامہ تھا۔ انہیں وہ سب واپس لینا تھا جو رئیس خان نے اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ اس خیال نے ان کی نیندیں حرام کردی ہوں گی کہ اگر میں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو ان کی نجی اور کاروباری زندگی کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ رئیس نے ان کے بریف کیس بھی چھین لیے تھے جو درحقیقت چھوٹے لیپ ٹاپ کمپیوٹر تھے۔ ایسے کمپیوٹر بریف کیس میں ہی ہوتے ہیں اور جب بریف کیس کھولا جائے تو اوپر والا حصہ ایک اسکرین بن کر سامنے آجاتا ہے۔ چھوٹے ہونے کے باوجود ایسے کمپیوٹر کارکردگی میں بڑے کمپیوٹر سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتے۔

خالد عثمان اور خادم مرزا مجھ سے کاروباری ملاقات میں سارے لین دین کے اور نفع نقصان کے معاملات طے کرنے آئے تھے۔ اگر صرف کمپیوٹر چھن جاتا تو انہیں پریشانی نہ ہوتی مگر اس میٹنگ کے لیے وہ کمپیوٹر میں ڈسک بھی لگا لائے تھے۔ اس ڈسک میں ان کے سارے کاروبار کی تفصیلات ہوں گی۔ یہ ٹاپ سیکرٹ ڈسک انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگی اور عام حالات میں وہ اسے کسی انتہائی محفوظ اور خفیہ جگہ پر رکھتے ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے شاہ عالم نے اپنے تمام کاروباری اور مالی معاملات کی انفارمیشن ایک ڈسک میں محفوظ کر کے ڈسک کو تجوری میں بند کردیا تھا۔ تجوری اس تہ خانے میں تھی جس کا سراغ لگانا ہی مشکل تھا اور بالفرض محال کوئی تہ خانے میں پہنچ جاتا تو اسے کوئی تجوری نظر نہ آتی۔

خالد عثمان اور خادم مرزا بھی اپنے غیر قانونی کاروبار کی تمام تفصیلات کی پوری حفاظت کرتے ہوں گے اور اسے ناممکن سمجھتے ہوں گے کہ ساری معلومات کی فائل یعنی وہ ڈسک غیر متعلقہ افراد کے ہاتھوں میں پڑ سکے مگر بدقسمتی خود شامت اعمال کو آواز دیتی ہے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ مجھ سے ایک اہم کاروباری ملاقات کے لیے آئے اور ان کا واسطہ ایک بالکل مختلف شاہ عالم سے پڑ گیا۔ جو کل تک ان کا ساتھی تھا' وہ اچانک کسی وجہ کے بغیر ایک خطرناک دشمن بن کے سامنے آیا۔ ان کی بدمعاشی کی طاقت کا مظاہرہ بھی اسے خوف زدہ نہ کر سکا اور اس کی جوابی کارروائی نے انہیں انتہائی شرمناک حالات اور سنگین خطرات سے دوچار کردیا۔

موجودہ حالات میں میرا پلہ بھاری تھا۔ پرنس کے انڈر گراؤنڈ کاروبار کے تمام راز میری تحویل میں تھے۔ اس کے لیے یہ نفع نقصان کا نہیں' زندگی یا موت کا سوال بن گیا تھا۔ اس کاروبار میں وہ اکیلا نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ لوگ اس کے ماتحت ہوں گے تو وہ خود بھی کسی کے ماتحت ہوں گے۔ اس کی ایک مجرمانہ غفلت اور کوتاہی نے نیچے سے اوپر تک سب کو افشائے راز کے خوف میں مبتلا کردیا ہوگا۔ ان کا کاروبار ملک دشمنی کے زمرے میں آتا تھا اور پکڑے جانے والوں کو سزائے موت بھی ہو سکتی تھی ورنہ ان کی ساری زندگی جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے گزر جاتی۔ ان کے ماتحت ساتھی اور باس' سب کا ایک ہی انجام ہوتا۔ ان کا جما جمایا کاروبار ختم ہو جاتا۔ ان کے اثاثے ضبط کرلیے جاتے اور ان کے لیے روپوشی بھی ناممکن ہو جاتی۔ چہرے اور نام بدل کے ایک ملک سے دوسرے ملک فرار ہونے کی کوشش بھی بالآخر ناکام ہو جاتی۔ بین الاقوامی پولیس (انٹرپول) کسی مجرم کے پیچھے لگ جائے تو عدم آباد تک اس کا پیچھا کرتی ہے۔

خالد عثمان اور خادم مرزا کے ساتھ اس سے بڑی پریشانی ان فلموں کی تھی جو رئیس خان کے لاکر میں محفوظ پڑی تھیں۔ رئیس نے جو کچھ کیا قانونی اور۔۔۔ اخلاقی طور پر غلط تھا مگر جنگ میں سب جائز ہو جاتا ہے۔ خالد عثمان اور خادم مرزا کون سے قانون اور اخلاقی اصولوں پر کاربند تھے۔ ان کے اعمال کی سزا اگر ان کی فیملی کو ملی تو یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں۔ ان کی کمائی ہوئی ناجائز دولت سے عیاشی بھی وہی کر رہے تھے۔ وہ دونوں اپنی بدمعاشی اور اپنی طاقت کے غرور میں یہ بھول گئے تھے کہ کامیابی کے اتفاقات کو خوش قسمتی کی ضمانت نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب بدقسمتی آتی ہے تو ایسے ہی حادثات ناکامی اور شکست کی ذلت کا سبب بن جاتے ہیں۔ وہ سب ہونے لگتا ہے جو آپ نہیں چاہتے۔ کسی چیز پر آپ کا کنٹرول ہی نہیں رہتا۔ سیدھا کرنے کی کوشش میں ہر کام الٹا ہونے لگتا ہے۔ آدمی کہہ اٹھتا ہے کہ۔ زمین دشمن مخالف ہے آسماں مرا۔

شاہ عالم خود اس کاروبار میں ایک پارٹنر تھا اور اس کی حیثیت یقیناً اہم تھی چنانچہ خالد عثمان اور خادم مرزا کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ بات ہی ناقابلِ فہم تھی کہ اس نے اچانک، کسی وجہ کے بغیر ایک بے حد منافع بخش کاروبار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیوں کرلیا۔ پہلے وہ سمجھے ہوں گے کہ شاہ عالم اپنا حصہ بڑھوانا چاہتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ کاروبار اس کی ساکھ اور سیاسی اثر رسوخ کے باعث کسی رکاوٹ کے بغیر چل رہا ہے۔ یہ ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوگا کہ اب ان کا واسطہ جس شاہ عالم سے ہے' وہ جیسا باہر سے نظر آتا ہے اندر سے اس کے برعکس ہے۔ وہ ایک حد تک اس کے منافع کا حصہ بھی بڑھا سکتے تھے مگر اس کے الگ ہونے کے خطرات کے بارے میں انہوں نے سوچا تک نہیں ہوگا۔

جب انہیں یقین آیا کہ اب شاہ عالم کسی قیمت پر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تو انہیں سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ اوپر والوں سے مشورہ کرتے اور اس خطرے سے نمٹنے کے انتظامات کرتے وہ خود بری طرح پھنس گئے۔ سارے کارڈز اب شاہ عالم کے ہاتھ میں تھے۔ وہ سب کو بلیک میل بھی کرسکتا تھا لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھی۔

خادم مرزا اور خالد عثمان نے کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کے اپنی عقل کے گھوڑے ہر سمت میں دوڑائے ہوں گے اور تمام امکانات کا اور ناممکنات کا جائزہ لینے کے بعد ان کو پریشانی اور مایوسی کی انتہا نے ڈپریشن میں مبتلا کردیا ہوگا اور ان کی عقل کو اس حد تک ماؤف کردیا ہوگا کہ انہوں نے ایک آخری کوشش کے طور پر میرے خلاف انتہائی جارحانہ ایکشن پلان بنالیا۔ اس حرام زادے کو قتل کے الزام میں بند کرادو۔ ٹائیگر اور بابر سے کہو کہ پولیس کے پاس رپورٹ لکھوادیں۔ ہم دو چار دن سامنے نہیں آتے۔ پولیس میں ایس پی غلام محمد اپنا آدمی ہے۔ وہ شاہ عالم کا دماغ درست کردے گا۔ ایک رات میں سیدھے راستے پر لے آئے گا۔ اس کی عدم موجودگی میں گھر پر چھاپا مارو۔ ایسی کی تیسی کردو جو سامنے آئے اس کی۔ شاہ عالم ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔ دیکھو اس نے گھر میں کمپیوٹر کہاں چھپایا ہے۔ فلمیں کہاں ہیں؟ اس کی بیوی سب بتادے گی۔ نہیں بتائے تو اٹھالاؤ اسے اور کل ہم بھی شاہ عالم کو تھانے میں ایک فلم دکھائیں گے۔ اس وقت جب شاہ صاحب کا دماغ ٹھکانے پر آچکا ہوگا۔

بات وہی ہے کہ جب تقدیر ہی ساتھ چھوڑ دے تو ہر تدبیر الٹی کیوں نہ ہو۔ ان کا یہ پلان شاید کامیاب ہوجاتا اگر تھانے میں مجھے عباسی جیسے پولیس انسپکٹر سے واسطہ نہ پڑتا اور ڈی آئی جی صاحب میری گرفتاری سے خود متفکر ہو کے وہاں تشریف نہ لاتے تو ایک رات میں ایس پی غلام محمد مجھ سے بہت کچھ منوالیتا۔ میرا خیال ہے کہ ڈی آئی جی صاحب کو سب سے پہلے تو پیرسٹر سلطان محمود نے فون کیا ہوگا کہ جب کسی مقتول کی لاش ہی نہیں ملی اور نہ قتل کا کوئی ثبوت ہے تو محض دو ملازمین کے بیان پر شاہ عالم جیسے معتبر اور معزز آدمی کو یوں تھانے لے جانا چہ معنی دارد؟ رات تک انہیں بہت سے سیاست دانوں کے فون ملے ہوں گے جو میرے ہمدرد چاہے نہ ہوں' حکومت کے ہر اقدام کی مخالفت پر اپنی سیاسی دکان چلاتے ہیں۔ رہی سہی کسر شبنم کے آنے سے پوری ہوگئی۔ پولیس کی ساری کارروائی بے جواز تھی۔ اپنی لاقانونیت کو چھپانے کے لیے انہوں نے بہتر سمجھا کہ یہ کھیل ہی ختم کردیا جائے ورنہ لینے کے دینے پڑجائیں گے۔

رخشی نہ خانے میں بروقت روپوش ہوجانے کے باعث بچ گئی اور حملہ آوروں کے لیے ایک پریشانی گلاب نے پیدا کردی۔ یہ کہہ کر کہ بیگم صاحبہ تو اپنے وکیل کے پاس گئی ہیں اور وہ بھی ایک خطرناک صحافی شبنم کے ساتھ۔ انہیں فکر پڑی ہوگی کہ کہیں رخشی پولیس کے ساتھ ہی نہ آجائے۔ میرے گھر کی تلاشی لینے کے لیے انہوں نے ہر چیز کو الٹ پلٹ کے توڑ پھوڑ دیا مگر ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ انہیں ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

گلاب کے بیان نے مجھے اس صورتِ حال کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور کردیا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ گزشتہ رات کی ساری کارروائی میں کوئی سیاسی انتقام کا پہلو نہیں تھا۔ یہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھی اور ناکام رہی تھی۔ ایک سوال یہ تھا کہ آخر کس نے رخشی کو قبل از وقت خبردار کردیا تھا؟ خالد عثمان اور خادم مرزا کے کیمپ میں ان کے کاروباری دشمن کا ہمدرد کون تھا؟ پھر یہ کہ رخشی کے بیڈ روم میں بیٹھ کر سگریٹیں پینے والے کون تھے اور وہ کس کا انتظار کررہے تھے؟ میرا یقین غلط نہیں تھا کہ خالد عثمان اور خادم مرزا دونوں زندہ سلامت کہیں بیٹھے ہیں اور بہت جلد سامنے آجائیں گے مگر ایک ناکامی کا صدمہ اٹھانے کے بعد ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اگر وہ رئیس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئے تو رئیس کی خیر نہیں۔ وہ مقامی سطح کا بدمعاش تھا جس کے ساتھ اسی جیسے نوسرباز اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے پرانے پاپی مل گئے تھے۔ ان سب کا برسوں سے ساتھ تھا چنانچہ وہ اپنے آپ کو چنڈال چوکڑی

کہتے تھے اور خاصے مشہور بھی تھے۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا والی بات تھی۔ کچھ ڈاکوؤں اور کچھ خطرناک قسم کے مجرموں سے ان کی راہ ورسم جیل کے زمانے میں ہوگئی تھی۔ وہ ان کے چمچے تھے اور ان کے لیے چھوٹے موٹے کام بھی کرتے تھے۔ مثلاً ان کے لیے مخبری کرنا۔ ان کا باہر کی دنیا سے رابطہ رکھنا اور انہیں جیل میں ہر سہولت فراہم کرنا۔ یہ ڈاکو کچھ وڈیروں کے خاص آدمی تھے اور ان کے علاقے میں اپنی دہشت سے کسی کو سر نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ وڈیرے اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے اور ان کی سلطنت میں حق' انصاف یا جمہوریت کا نام لینا بھی سنگین جرم تھا۔ ڈاکو ان کا رعب اور دبدبہ قائم رکھتے تھے۔ اس کے بدلے انہیں لوٹ مار اور اغوا برائے تاوان جیسے جرائم کرنے کا لائسنس مل جاتا تھا اور پولیس کبھی ان کے خلاف کارروائی کرتی تھی تو محض پریس اور پبلک کا شور ہنگامہ ختم کرنے کے لیے۔ جیل میں وہ سرکاری مہمان بن کر ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ انہی ڈاکوؤں کی وجہ سے رئیس خان کی چنڈال چوکڑی کو بھی کسی حد تک کچھ سیاست دانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ بھی کبھی چنڈال چوکڑی کی پیشہ ورانہ خدمات حاصل کرتے تھے اور یہ بات پولیس بھی جانتی تھی کہ وہ سرکاری بدمعاش ہیں۔ تاہم بین الاقوامی سطح کے منظم اسمگلروں اور دہشت گردوں کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں رئیس کو بھی خبردار کردوں اور اس سے کہوں کہ اپنی چنڈال چوکڑی کی زبانیں بند رکھے۔ ان میں کچھ شیخی خورے اور گپ باز ایسے بھی تھے کہ کبھی مارتے تھے تو کہتے تھے کہ آج بڑے پرندے شکار کیے۔ ابھی تک شاید پرنس اینڈ کمپنی کو اندازہ نہ ہو کہ شاہ عالم کے معاون اور مددگار کون تھے مگر بات پھیل گئی تو پھر چنڈال چوکڑی کا براہِ راست مقابلہ..... بین الاقوامی یا کم سے کم قومی سطح کے بدمعاشوں سے ہوگا۔ ذہنی طور پر انہیں اس کے لیے بھی تیار رہ جانا چاہیے۔

میں نے جو حفاظتی انتظامات کیے تھے' وہ مجھے تسلی بخش لگتے تھے۔ یہ وقت ہی بتا سکتا تھا کہ وہ کتنے مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ ابھی میں نے پہل کرکے ایک بازی میں شاطر حریفوں کو غیر متوقع طور پر مات دے دی تھی یا کم سے کم ایسی شہ دی تھی کہ وہ اگلی چال چلنے سے پہلے مات ہوجانے کے خوف میں مبتلا ہوگئے تھے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ خاموشی سے اس ہار کو تسلیم کرلیں' پرانی بساط پر نئے مہرے لے آئیں اور اپنا کھیل جاری رکھیں یا وہ دل میں کینہ رکھتے ہوئے ہاتھ ملاکے کہیں کہ اچھا ابھی کھیل ختم تو ختم۔ ہار جیت کا کیا ہے' یار زندہ صحبت باقی۔ دیکھتے ہیں کہ آخری بازی میں کون کسے ہارتا ہے اور کیا ہارتا ہے؟

عقلمندوں نے سچ کہا ہے کہ جارحیت ہی سب سے بہتر دفاع ہے اور امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ آج تک ان کا واسطہ ایک عیار اور مکار مگر لالچی اور بزدل شاہ عالم سے پڑا تھا۔ میرے نئے روپ نے ان کا بیڑا دریائے حیرت میں غرق کردیا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کی تھی۔ ہر پیشکش کو ٹھکرادیا تھا۔ دھمکی کو نظرانداز کردیا تھا۔ جسمانی طاقت میں خود کو رستم اور ٹارزن سمجھنے والے بابر اینڈ ٹائیگر کا سارا غرور پلک جھپکتے میں خاک میں ملادیا تھا اور جو مجھے اغوا کرکے لے گئے تھے ان کو اغوا کرکے کھلا چیلنج دے دیا تھا کہ مشتری ہوشیار باش۔ تم سیر تو ہم سوا سیر۔ تم ہمارے باپ تو ہم دادا تمہارے باپ کے۔

چنبیلی تو ہوش میں آنے کے بعد گلوکوز ملا ہوا گرم دودھ پی کے ہی سوگئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اٹھے گی تو بالکل پُرسکون ہوگی۔ بعد میں رخشی نے گلاب کو بھی آرام کرنے کے لیے کہا مگر وہ فرض شناس اور وفادار ملازم اٹھ کھڑا ہوا۔ رخشی نے اسے کہا تھا کہ وہ بازار سے کچھ لے آئے لیکن وہ ابھی باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ہر طرف سیکیورٹی گارڈز کو دیکھ کے اس میں بڑی خوش گوار تبدیلی آگئی تھی۔ وہ ایک دم بہت مستعد ہوگیا تھا۔

"ہو جی بیگم صاحب۔ اب باہر کا مسئلہ میرا نہیں رہا۔ آپ ان میں سے کسی کو بھیج دو۔ مجھے سامان لادے تو آدھے گھنٹے میں لنچ حاضر۔"

رخشی ہنسنے لگی "بھئی یہ اس کام کے لیے نہیں آئے ہیں یہاں' سودا سلف لانے کے لیے۔ گھر میں کچھ نہیں ہے کیا۔ پہلے تو فریزر بھرے رہتے تھے۔"

"انشاء اللہ پھر بھر جائیں گے جی کل" وہ بولا۔

گھر کے سارے فون ابھی تک ڈیڈ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کارکن' سیاسی شخصیت یا اخبار والے نے مجھ سے ابھی تک رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ پارٹی سیکریٹریٹ پر عدالتی حکم کے باعث قمس اور قریشی کے حامی قبضہ کیے بیٹھے تھے اور انہیں وہاں سے صرف عدالتی حکم کے ذریعے ہی نکالا جاسکتا تھا۔ سب کا رابطہ ان سے ہوگا اور وہ سب کو ہنس ہنس کے بتا رہے ہوں گے کہ شاہ عالم تو اب سچ مچ مرگیا۔ جسمانی موت نے تو اسے شہید کا درجہ دلادیا تھا مگر وہ بات غلط ہوگئی۔ اب سیاسی موت واقع ہوجانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد نہ پارٹی اس کی اور نہ وہ چیئرمین۔ ہم ہی پارٹی ہیں اور ہماری قیادت کو کارکنوں نے دل سے قبول کرلیا ہے۔ شاہ عالم کا دست راست تھا تیمور۔ مرگیا بے چارہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکے۔ بھئی کیا خوب فٹ ہوتا ہے یہ شعر۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

غاصبانہ قبضہ کرنے والے وقتی طور پر پارٹی کے مالک بن گئے تھے اور یقیناً اس صورتِ حال کو وہ پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرسکتے تھے۔ ہر پارٹی میں اکثریت انہی کی ہوتی ہے جو پارٹی منشور وغیرہ کو سمجھتے ہی نہیں چنانچہ سورج مکھی کی طرح اپنا چہرہ اقتدار کے سورج کی طرف کرلیتے ہیں۔ میرے مخلص اور اصول پرست حامی اقلیت میں ہونے کے باعث خاموش ہوکے اپنے اپنے گوشۂ عافیت میں دبک گئے ہوں گے۔ انہیں میری حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی کہ وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں مگر مجھے ان سے الگ اور تنہا کردیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال ان کے لیے مایوس کن تھی کہ چیئرمین صاحب پھر غائب ہیں۔ سینئر نائب صدر اسپتال میں لیٹے لیٹے مرگیا اور سیکریٹری صاحب کا بھی کچھ پتا نہیں۔ جائیں تو کدھر جائیں۔

میں نے اب مؤثر جوابی حکمتِ عملی تیار کرلی تھی۔ دوپہر تک سیکیورٹی کمپنی نے مجھے دو گاڑیاں فراہم کردیں۔ ان میں سے ایک ڈبل کیبن والی ٹویوٹا کی ہائی لکس پک اپ تھی اور دوسری نئے ماڈل کی سفید سوزوکی خیبر۔ دونوں گاڑیاں ائرکنڈیشنڈ تھیں اور ان میں ڈرائیور ایسے تھے جو اپنی صورت اور حلیے سے ہی سابق فوجی نظر آتے تھے۔ پُرسکون انداز رکھنے والے مستعد اور مضبوط۔ جن کی عقابی نگاہیں بڑی خاموشی' بے نیازی سے گردوپیش کا جائزہ لیتی رہتی تھیں۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے اور بظاہر ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ ان کے ساتھ آنے والے گن مین یونیفارم میں تھے اور ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف پکڑنے کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ خبردار کرنے والا اور ڈرا دینے والا کہ موت کا یہ سامان محض نمائشی نہیں۔ جسے شک ہو وہ سامنے آکے آزمالے۔

خیبر کار کے ڈرائیور نے اندر آکے مجھ سے بات کی۔

"سر' میں یہاں کے حفاظتی انتظامات کا نگراں ہوں۔ ریٹائرڈ کیپٹن عادل' عمر عادل۔ آپ عمر بھی کہہ سکتے ہیں اور عادل بھی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کے۔"

"مجھے عالمگیر صاحب نے سمجھایا ہے کہ میری کیا ذمے داری ہے مگر میں آپ سے بھی پوچھتا رہوں گا۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ کسی بات کا برا نہیں مانیں گے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ پروفیشنل ہونا پڑتا ہے ہمیں' کسی مصلحت کو دیکھے بغیر۔"

"آف کورس۔ ایک پروفیشنل جذباتی نہیں ہوسکتا۔"

"ویسے تو میرے سب ساتھی تجربہ کار اور ٹرینڈ ہیں۔ مجھے ہر مشکل جگہ ابتدائی اسٹیج پر صورتِ حال کو سمجھنے اور اس کے مطابق ایک پالیسی یا STRATEGY بنانے کے لیے' جب انتظامات مکمل ہوجاتے ہیں اور ROUTINE سیٹ ہوجاتا ہے تو مجھے دوسرے پروجیکٹ پر بھیج دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایمرجنسی میں ایک ساتھ مجھے دو سیکیورٹی سسٹم آپریشن میں لانے پڑتے ہیں۔ یہ مت سمجھئے گا کہ میں موجود نہیں تو ذمے داری سے بھاگ کے گھومنے پھرنے چلا گیا یا گھر جا بیٹھا۔"

"مجھے پورا اعتماد ہے تم پر۔"

"ہم ہر کلائنٹ کے بارے میں پوری انفارمیشن رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق چلتے ہیں۔ صرف چوکیداری کے لیے آپ کو اس سے آدھے بلکہ چوتھائی معاوضے پر ہی سیکیورٹی فراہم کرنے والے مل جائیں گے لیکن ہم دس لاکھ اس لیے لیتے ہیں کہ ہم خصوصی مہارت کے ساتھ SPECIALISED سروس فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کلائنٹ عام لوگ نہیں ہوسکتے۔ اگر کوئی دس لاکھ خرچ کرسکتا ہو مگر ہماری سروس کی اسے کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو ہم معذرت کرلیتے ہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے مگر بزنس کے نقطۂ نظر سے۔"

اس نے کہا "ہم بزنس ضرور سمجھتے ہیں اسے مگر مؤثر کنٹرول کے لیے اسے محدود رکھنے کے قائل ہیں۔ عالمگیر صاحب براہِ راست نگرانی کے قائل ہیں اور پرسنل سروس کے۔"

"عالمگیر صاحب۔ یعنی آپ کے جی ایم؟"

"یس سر۔ وہ ایم ڈی بھی ہیں یعنی مالک مگر خود کو جی ایم ہی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ سب خود MANAGE کرتے ہیں۔ وہ پورے ملک میں اپنی سیکیورٹی ایجنسی کو پھیلا دیں تو جتنا اب کما رہے ہیں اس سے دس گنا کیا سو گنا بھی کماسکتے ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ اس سے کوالٹی متاثر ہوگی۔ اس کے بعد گڈول۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لاہور سے آگے ان کے لیے خود

سارے معاملات دیکھنا اور ذاتی طور پر نگرانی کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اگر وہ اتنے کوالٹی CONSCIOUS ہیں۔" میں نے کہا "کیا ہم چلیں؟"

"یس سر۔ آپ یہاں سے کار میں روانہ ہوں گے میرے ساتھ۔ ہائی لکس پیچھے رہے گی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہم کیس CHANGE OVER کریں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں نے کہا۔

"آپ کے لیے ایک اطلاع ہے۔ شاید آپ کو پہلے سے معلوم ہو۔ مسٹر تیمور کی فیملی نے سرکاری قسم کے جلوس کی اجازت نہیں دی" وہ بولا۔

"کیا مطلب۔ سرکاری عہدے دار شریک نہیں ہوسکتے؟"

"کوئی بھی شریک نہیں ہوسکتا سوائے فیملی ممبرز کے اور دوستوں کے۔ وہ خاموشی سے تدفین کرنا چاہتے ہیں۔"

"آئی سی۔"

"انہوں نے انتظامیہ سے PROTECTION مانگی تھی۔ کمشنر نے ڈی آئی جی سے کہا کہ فیملی کو مکمل پرائیویسی فراہم کی جائے۔ ان کے گھر جانے والے سارے راستے بند کردیے گئے ہیں۔ لوگوں کو دو سو گز دور ہی روک دیا گیا ہے۔ سیاسی شخصیات' اخبار والے' پارٹی ورکر' کوئی بھی نہیں جاسکتا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ تدفین کب اور کہاں ہوگی۔"

میں نے کہا "یہ اچھا ہی کیا انہوں نے۔ امن وامان کی صورتِ حال خراب ہوسکتی تھی۔"

"یس سر۔ ایک CLASH ہوچکا ہے۔ اس کے بعد پولیس نے لوگوں کو اور پیچھے دھکیل دیا لیکن کئی جگہ اب بھی کارکن جمع ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ کیا ان حالات میں آپ کا وہاں جانا مناسب ہوگا؟"

میں نے کہا "مجھے جانا ہوگا کیپٹن عادل۔ وہ میرا دوست تھا۔ بہت قابلِ اعتماد دوست تھا۔ اس کے علاوہ میں پارٹی چیئرمین ہوں۔"

"پارٹی چیئرمین کو شاید وہ دوست شمار نہ کریں۔ مسٹر قریشی اور شمس کو اجازت نہیں دی انہوں نے۔"

میں نے کہا "میں ذاتی دوست کی حیثیت سے یقیناً جاسکتا ہوں۔"

"شیور سر۔" وہ بولا "آیئے۔"

میں کار میں پیچھے بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ خود کیپٹن عادل نے سنبھالی۔ گاڑی کے پیچھے والے شیشے ڈارک تھے۔ ان پر اندر کی طرف سے دھوئیں کے رنگ کے اسٹیکر پیپر ایسے لگادیا گیا تھا کہ پتا نہیں چلتا تھا۔ ڈبل کیبن والی ہائی لکس پک اپ تقریباً بیس پچیس گز کا فاصلہ برقرار رکھے ہوئے خیبر کا تعاقب کررہی تھی۔

"آپ کے پاس اسلحہ ہے سر؟ کوئی ریوالور وغیرہ۔؟"

میں نے کہا "یس۔ لائسنس بھی ہے اس کا۔"

"آپ کا نشانہ کیسا ہے سر؟" کیپٹن نے پیچھے دیکھے بغیر کہا۔

"قابلِ اطمینان" میں نے کہا "تقریباً نوّے فیصد ACCURACY ہے۔"

"ویری گڈ۔ اسے ریڈی رکھیں سر۔"

میں نے کہا "میں ہر وقت تیار رہتا ہوں اور سوتے سے اٹھ کر بھی مجھے ایکٹو ہونے میں دو سیکنڈ لگتے ہیں۔"

وہ بولا "دو سیکنڈ تو بہت زیادہ ہیں سر۔"

"میں خالی ہاتھوں سے بھی اپنا دفاع کرنا جانتا ہوں" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے سر۔ آپ مارشل آرٹ جانتے ہیں۔"

میں نے کہا' مجھے تم خالی ہاتھ نظر آرہے ہو۔"

"اے کے ۴۷ میرے پیروں میں ریڈی ہے سر۔ میرے بائیں ہاتھ کی دسترس میں ہے" وہ بولا "میرا پیچھے والی گاڑی سے بھی رابطہ ہے اور اپنے سینٹر سے بھی۔ پیچھے والی گاڑی پوری رپورٹ دے رہی ہے کہ ہم کہاں ہیں اور وہ سب ریکارڈ ہو رہی ہے۔"

میں محتاط ہوگیا "ہماری گفتگو بھی ریکارڈ ہو رہی ہے؟"

"یس سر۔ یہ ضروری ہے۔ اگر ہم کوئی مشورہ دیں اور کوئی نہ مانے بعد میں خدانخواستہ سیکیورٹی فیل ہوجائے تو ذمے داری ہم پر نہیں آتی۔"

ایک موڑ پر گاڑی اچانک رک گئی۔ ہائی لکس سامنے سے گھوم کے بالکل میرے سامنے ایسے ٹھہر گئی کہ میں خیبر کا دروازہ کھول کے نکلا تو پک اپ کے پچھلے کیبن میں داخل ہوگیا۔ دوسرے لمحے دروازے بند ہوگئے اور گاڑیاں مخالف سمت میں روانہ ہوگئیں۔ کیبن میں میرے ساتھ کوئی اور نہیں تھا لیکن باہر سے دیکھنے والے کو کچھ پتا نہیں چل سکتا تھا کیونکہ اس کے شیشے بھی TINTED تھے۔ میرے سامنے ڈرائیور کے ساتھ ایک وردی والا گن مین بیٹھا ہوا تھا اور پچھلے کھلے حصے میں اب ایک شخص بظاہر بڑی بے نیازی سے خالی ہاتھ کھڑا ہر طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے پیروں کے پاس کلاشنکوف موجود تھی۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا اور کھلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا میں ڈرائیو کا لطف لیتا محسوس ہوتا تھا۔

اگلے موڑ پر نہ جانے کہاں سے خیبر ہمارے ساتھ ہو گئی اور آگے آگے چلنے لگی۔ مجھے یہ انتظامات بہت قابلِ اعتماد لگے۔ وہ واقعی تجربہ کار، تربیت یافتہ اور پروفیشنل لوگ تھے۔ میرے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک ایسا تجربہ جس نے مجھے رفتہ رفتہ متاثر کیا۔ پھر قائل کیا کہ اس حفاظتی نظام میں میرے لیے ذہنی سکون ہے۔ میں خود اپنی حفاظت کا ذمے دار نہیں رہا۔ دولت مندی کے یہی فائدے ہیں۔ جو کام آپ خود نہیں کرسکتے، وہ آپ معاوضہ دے کر دوسروں سے کروا سکتے ہیں۔ کام معمولی ہو مثلاً ڈرائیونگ کا یا سیکیورٹی جیسا خطرناک اور دشوار۔ آپ نوعیت کے اعتبار سے معاوضہ ادا کریں اور بے فکر ہوجائیں۔ ڈرائیور گاڑی چلائے گا اور ٹریفک کے سارے مسائل سے نمٹے گا۔ آپ اطمینان سے پچھلی سیٹ پر اخبار پڑھتے جائیں یا گپ شپ کریں۔

مجھے اتنی احتیاط اور حفاظت کے سخت انتظام میں نقل و حرکت کا یہ پہلا تجربہ پُرلطف اور دل خوش کن بھی لگا۔ میں نے خود اپنی نظر میں اپنے آپ کو بے حد اہم محسوس کیا۔ میں سڑک پر پیدل چلنے والوں، سائیکل، موٹر سائیکل، بس یا رکشا میں پھرنے والوں اور عام گاڑی والوں سے بہت برتر اور افضل ہوگیا تھا۔ اس احساس میں بڑا نشہ تھا کہ اب میں ایک وی آئی پی ہوں۔ وی آئی پی آدمی نہیں ہوتا، ایک رویّہ ہوتا ہے۔ سوچ اور طرزِ زندگی کا نام ہے۔ میں اس سے ابھی تک ناآشنا تھا۔ آشنا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ یتیم خانے کے ماحول نے مجھے بالکل مختلف کمپلیکس دیا تھا۔ وہاں میرے یا میرے ساتھ رہنے والوں کی زندگی سڑک پر پھرنے والے آوارہ کتّے کی زندگی سے بھی زیادہ بے وقعت تھی۔ اور عملی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھنے کے باوجود میں نے بے قیمت اور بیش قیمت انسانوں کے فرق کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ میں نے سڑکوں پر رکی ہوئی ٹریفک کے ساتھ صدر اور وزیرِاعظم کے گزرنے کا منظر دیکھا تھا اور بے حد متاثر ہوا تھا۔ کیا بات ہے۔ جب وزیرِاعظم سڑک پر ہو تو اس سڑک کو اور کوئی استعمال نہیں کرسکتا۔ اس کے راستے میں کوئی نہیں آسکتا۔ سب دور کھڑے رہ کر دیکھ سکتے ہیں یا نعرے لگا سکتے ہیں اور ہاتھ ہلا سکتے ہیں۔ نعرے صرف زندہ باد کے ہونے ضروری ہیں اور ہاتھوں میں صرف جھنڈے، پتھر یا ڈنڈے نہیں اور وزیرِاعظم کی سواری کے آنے سے پہلے سفید ہاتھی جیسی سواری پر ایک ٹریفک سارجنٹ سائرن بجاتا بڑے غرور کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل کے سامنے والے حصے میں ایک ڈنڈے پر نیلی روشنی گھومتی تھی۔ اس کا راستہ بھی کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ بھی وی آئی پی تھا پھر ایک جیپ گزرتی تھی۔ سناٹا گہرا ہوجاتا تھا۔ لوگوں کی نظر ایک ہی سمت میں ٹھہر جاتی تھی۔ ہر قسم کی حرکت موقوف ہوجاتی تھی۔ لوگوں کے درمیان، عمارتوں کی چھت پر اور سڑک پر ہر کھمبے کے ساتھ، ہر موڑ پر۔ ہر چوراہے پر کھڑے ہوئے پولیس والے ہر طرف ہر شخص کو دیکھتے رہتے تھے پھر موٹر سائیکلوں کی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ چھ یا آٹھ موٹر سائیکل سوار۔ وردی اور ہیلمٹ پہنے۔ وہ دو کی فارمیشن میں ایک ہی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتے نمودار ہوتے تھے پھر جیپ۔ مشین گن لیے ایک باوردی شخص سیدھا کھڑا ہوا پلک جھپکتے میں انسانوں کو بھون ڈالنے کے حکم کا منتظر۔ پھر لمبی جھنڈے والی ایک کار۔ پھر دوسری، تیسری، زن۔۔۔ زن۔۔۔ شاندار گاڑیاں گزرتی جاتی تھیں۔ لوگ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکاتے رہ جاتے تھے۔ وہ۔۔۔ اس گاڑی میں۔۔۔ نہیں پیچھے والی دوسری گاڑی تھی۔ ہمارا محبوب منتخب وزیرِاعظم صرف ٹی وی پر صاف نظر آتا ہے۔ روز نظر آتا ہے۔

اپنے بچپن کے اس تاثر نے مجھے ایک ایسی خواہش کے اظہار پر اکسایا تھا جسے سب نے لطیفہ سمجھا تھا اور بعد میں سننے والے ہنس ہنس کے دہرے ہوگئے تھے۔ سالا باتیں کیسی کرتا ہے۔ پاؤں میں جوتے نہیں، بنے گا وزیرِاعظم پھر جیسے عقل آتی گئی، مجھے یہ احساس ہوتا گیا کہ لوگ بلاوجہ میرا مذاق نہیں اڑاتے۔ اگر وہ اسے ایک بچے کی بات سمجھتے تو نظرانداز کرسکتے تھے مگر وہ لاشعوری طور پر سیریس ہوجاتے تھے اور شاید اسی لیے میری حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ جب ہمارے دماغ میں یہ بات نہیں آتی تو یہ اتنا اونچا کیوں اڑتا ہے۔

جب تک میں ناصر عظیم رہا، اپنی ساری کامیابی کے باوجود، میں عام اور بے وقعت آدمی رہا جس کی زندگی اتنی غیر اہم ہوتی ہے کہ ایک محدود حلقے سے باہر کوئی اس کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ حد یہ ہے کہ شاہ عالم کی جگہ لینے کے بعد بھی میں عام آدمی کی طرح BEHAVE کرتا رہا۔ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے۔

آج اچانک میں اہم ہوگیا تھا۔ قابلِ توجہ اور عوام کی سطح سے بہت اوپر۔ میں محفوظ ہوگیا تھا اور میری زندگی لاکھوں، کروڑوں انسانوں سے زیادہ قیمتی بن گئی تھی چنانچہ اس کی حفاظت پر آج دس لاکھ تو کل ایک کروڑ خرچ کیے جاسکتے تھے۔ میری دوستی اور میری دشمنی عام بات نہیں رہی تھی۔ راستہ اس وقت بھی میرا کون روک سکتا ہے مگر اب یہ

کتنا ممکن لگتا ہے کہ کل سب کا راستہ روک دیا جائے یو نلیہ میں اکیلا اس راستے پر سے گزرنے کا استحقاق استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یوں روکے جانے سے ہزاروں، لاکھوں لوگ وقت پر آفس نہ پہنچ پائیں، اسکول اور کالج جانے والے پیریڈ مس کردیں۔ کوئی ڈاکٹر کو ساتھ لے جانے والا یا مریض کو ایمبولینس میں اسپتال لے جانے والا بے بسی سے فرشتۂ اجل کو خندہ زن دیکھتا رہے اور لوگ کہیں کہ بھئی اللہ کی رضا۔

جب گاڑی رکی تو مجھے عجیب سا لگا۔ شاید میں سو گیا تھا یا پاگل ہوگیا تھا۔ میں کیا دیکھ رہا تھا اور کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میری گاڑی نہ جانے کس راستے سے گزرتی ہوئی تیمور کے گھر سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی تھی۔

ایک پولیس آفیسر نے کہا "اس سے آگے نہیں جاسکتے آپ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر آیا "مجھے معلوم ہے کہ تیمور مرحوم کی فیملی نے جنازے میں شرکت کرنے والوں کو محدود کردیا ہے مگر میں ان کا بہت قریبی دوست ہوں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "شاہ عالم صاحب! آئی ایم سوری۔"

میں نے کہا "آپ اندر جاکے ان کی بیوی سے پوچھ لیں۔ اگر وہ اجازت نہیں دیں گی تو میں لوٹ جاؤں گا" میں نے کہا۔

"اور تب تک آپ زبردستی نہیں کریں گے سر۔ ابھی کچھ دیر پہلے صورتِ حال خاصی خراب ہوگئی تھی۔ مسٹر شمس اور قریشی کو انکار کردیا گیا تھا۔" وہ بولا "وہ بہت ناراض ہوئے ہم پر مگر میں مجبور ہوں۔"

وہ سوگز تک جیپ میں گیا اور اس نے دروازے کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے چند سوگوار افراد سے کوئی بات کی۔ ایک سنجیدہ عمر بوڑھے نے میری طرف آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کے دیکھا اور پھر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو پولیس آفیسر نے پلٹ کر مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت میری عزت بال بال بچ گئی ہے۔ کچھ فاصلے پر پارٹی کے دونوں دھڑوں کے کارکن موجود تھے اور ان کے ساتھ اخباری نمائندے بھی میری بے عزتی کے ساتھ واپسی کا تماشا دیکھنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ میں نے مسکراہٹ کو روک لیا اور فاتحانہ انداز میں آگے بڑھا۔

جب شمس اور قریشی کو یہ خبر ملے گی تو یقیناً ان کے سینے پر سانپ لوٹ جائے گا۔ میں نے سوچا۔ تیمور کی فیملی نے مجھے اپنا دوست مان لیا تھا۔

ابھی میں دروازے سے دور ہی تھا کہ تیمور کی بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے کپڑے اتنے میلے تھے کہ لگتا تھا اس نے ایک مہینے سے نہیں بدلے۔ الجھے ہوئے اور بکھرے ہوئے بالوں میں دھول نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی لالی میں وحشت کے آثار تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ صدمے نے اسے ہوش سے بیگانہ کردیا ہے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی نفرت اور حقارت کے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں چلّانے لگی "آؤ۔۔۔ آؤ چیئرمین صاحب، آج دوست بن کے آئے ہو۔"

میں نے کہا "دیکھیے۔۔۔ میں ان کا دوست تھا۔"

"جھوٹ۔ تم ہی تو اس کے سب سے بڑے دشمن تھے" وہ چیخ کے بولی۔ "تم ہی قاتل ہو اس کے۔ تم نے اسے مار ڈالا اپنی سیاست کے کھیل میں۔ اب آئے ہو دوست بن کے۔ بے غیرت۔"

میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے۔"

"کس بات کا افسوس ہے تمہیں۔ ہمارا تو سب کچھ چلا گیا۔ تمہارا کیا گیا؟ اس کے پاس ایک جان ہی تو رہ گئی تھی۔ کیا کیا تم نے اس کی جان بچانے کے لیے۔ تم اسپتال میں اسے دیکھنے تک نہیں آئے اور وہاں دشمنوں نے اس کو دن دہاڑے قتل کردیا۔ وہ لاوارث پڑا تھا وہاں، چیئرمین صاحب۔"

میں نے سر جھکا کے کہا "اگر ایسی بات ہے۔"

"اگر کا کیا مطلب ہے دوغلے آدمی" وہ چلّائی "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہاں کیا ہوا تھا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اس کے قاتل کون ہیں؟"

"میں چھوڑوں گا نہیں، جو بھی ذمے دار پایا گیا" میں نے دکھ سے کہا۔

"کیا کروگے تم۔ رپورٹ لکھواؤگے؟ پھر کیا ہوگا۔ تفتیش ہوگی۔ انکوائری افسر مقرر ہوگا۔ تم روز بیان دوگے۔ خوب پبلسٹی حاصل کروگے اس سے بھی۔ مگر کیا ان بچوں کو ان کا باپ ملے گا جو یتیم ہوگئے۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ کیا بگاڑا تھا ان بچوں نے تمہارا۔ کمینے شخص۔"

میں نے سخت خفت اور پریشانی محسوس کی "میں یہاں تعزیت کے لیے آیا تھا۔"

"نہیں۔ تم اپنی شان بگھارنے آئے ہو۔ تمہیں مرنے والے کی لاش پر اپنی سیاست کی دکان چلانی ہے۔ تم کو ایک شہید چاہیے جس کے جلوس کو تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے استعمال کر سکو۔ اپنے مزار پر یہ ڈراما نہیں چلا تھا۔ تمہاری زندگی بھی جھوٹ تھی' موت بھی جھوٹی تھی۔ جاؤ' چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ سب۔ اب وہ کسی کا نہیں' صرف میرا ہے۔ میرے بچوں کا ہے۔" وہ چیخ چیخ کے اپنے کپڑے پھاڑنے لگی "اس کا شاندار مزار بنانا ہے تو مجھے اس کے ساتھ گاڑ دو۔ تم اس کے قاتل ہو۔ تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو۔ تیمور نے کہا تھا' شاہ جی کو میری صورت مت دیکھنے دینا مرنے کے بعد۔"

پیچھے سے ایک لڑکی اسے کھینچ رہی تھی اور کچھ لوگ سامنے آنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اندر چلی جائے مگر وہ دیوانگی کے باعث کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اس کے صدمے کی شدت کو سمجھتا تھا مگر وہاں میری پوزیشن بہت خراب ہو گئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ابھی تک سب کو ہی قریب جانے سے روکا جا رہا تھا اور پولیس نے سیاسی کارکنوں اور پریس رپورٹرز کے بارے میں بڑا سخت رویہ اختیار کر رکھا تھا اچانک جیسے ساری پابندیاں خود بخود ختم کر دی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس ایک نہیں کئی اخباری نمائندے اور فوٹو گرافرز پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ شمس اور قریشی بھی تھے۔ میری پارٹی کے چند سینئر ممبر جو ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن تھے ان کے پیچھے موجود تھے۔

میں نے سخت ذلت محسوس کی "یہ کیا تماشا ہے آخر؟" میں نے اس پولیس آفیسر سے کہا جس نے پہلے مجھے روکا تھا۔

"تماشا تو آپ نے کیا ہے شاہ جی۔ جھوٹ بولا تھا آپ نے ہم سے کہ آپ فیملی کے قریبی دوست ہیں" وہ مجھ پر بگڑنے لگا۔

ایک بوڑھے نے جو خاندان کا کوئی عزیز تھا' مجھے آہستہ سے دھکا دیا "چلو اب جاؤ۔ ہمیں کسی کی ہمدردی اور تعزیت کی ضرورت نہیں۔"

"اس کی جان لے لی۔ اب تو پیچھا چھوڑ دو ہمارا" دوسرے نے کہا۔

میں نے اخبار والوں کے سوالات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ "آپ یہ بتائیں کہ اتنے لوگ کیسے آگے پہنچ گئے؟"

پولیس آفیسر نے کہا "کیوں' آپ آ سکتے ہیں تو انہوں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"تم نے پہلے کیوں روکا تھا انہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہم نے تو آپ کو بھی روکا تھا۔ آپ نے مانی ہماری بات؟"

میں نے کہا "تم نے جانتے بوجھتے ایسا کیا۔ میری ذلت کا تماشا بنانے کے لیے انہیں یہ موقع فراہم کیا۔"

"آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے رشوت لے کر ایسا کیا۔ کیا آپ سے رشوت لی تھی میں نے۔ اوپر والوں کو جواب دینا پڑا کہ میں نے آپ کو جانے دیا اور پارٹی کے دوسرے عہدے داروں کو روک دیا۔" وہ بولا۔

"اتنی جلدی تمہاری جواب طلبی بھی ہو گئی؟"

"جی ہاں۔ موبائل فون پر میری شکایت کی گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ اب جانے دو سب کو۔ فوراً تشریف لے جائیں آپ یہاں سے۔ نقص امن کا سخت اندیشہ ہے۔" وہ بولا۔ "ایسا نہ ہو کوئی آپ کو نقصان پہنچائے۔"

کیپٹن عادل نے مجھے کھینچ لیا "اب آپ نکل جائیں سر۔ ٹینشن بڑھ رہی ہے۔"

شمس اور قریشی اپنے حامیوں کے ساتھ میرے خلاف نعرے لگوانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ تیمور کا قاتل' ہائے ہائے۔ شاہ عالم قاتل ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بینر کھول لیے۔ ان پر لکھا ہوا تھا "تیمور کے قتل کے الزام میں شاہ عالم کو سرِعام پھانسی دی جائے۔ ہم تیمور کے خون کا انتقام لیں گے۔" فوٹو گرافرز ان کی تصویریں اتارنے لگے اور فلمیں بنانے لگے۔ اچانک وہ مجمع میرے خلاف مظاہرہ کرنے لگا جو جنازے میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ وہ سوا ڈیڑھ سو آدمی تھے جن کو وہاں پوری تیاری کے ساتھ لایا گیا تھا اور جو اسی موقع کے انتظار میں تھے۔

اخبار والوں کے سوالات زیادہ تند تھے۔ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کسی کو بھی سخت جواب نہیں دیا۔ میرے منہ کے سامنے مائیک لانے والوں کو بھی میں نے ٹال دیا۔ "ابھی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ شام کو پریس کانفرنس میں بیان دوں گا۔"

"لیکن آپ کے ساتھ مرحوم کی بیوہ نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا؟"

"وہ آپ کے دست راست تھے۔"

"آپ پر قتل کا الزام کس حد تک درست ہے؟"

"آپ نے اسپتال میں قتل کیسے کرایا؟"

"کیا آپ تیمور سے بھی خطرہ محسوس کرتے تھے؟"

یہ سارے سوالات اشتعال انگیز تھے مگر ان کا جواب مشتعل ہو کے دینے سے پریس میرے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔ میں نے وہاں شبنم کو تلاش کیا۔ وہ شاید میری مدد کرتی مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سب

صحافی جن کو میں نے پہلے کئی بار پریس کانفرنس میں دیکھا تھا وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ سب نا آشنا چہرے تھے اور ان کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں تھی۔ فوٹو گرافر بھی میرے لیے اجنبی تھے۔

میں نے رک کے کہا "جنٹلمین' کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کا تعلق کس اخبار سے ہے اور آپ۔۔۔ میں نے پہلے آپ کو نہیں دیکھا۔"

"آپ نے ابھی بہت کچھ نہیں دیکھا۔" وہ بولا "مثلاً جیل خانہ۔"

اس کے ساتھ ہی دوسرے نے کہا "پاگل خانہ۔"

میں نے کہا "آپ دونوں اپنے گھر بلائیں گے تو میں ضرور آؤں گا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہاں کسی بھی بڑے اخبار کا کوئی نامور صحافی نظر نہیں آیا۔"

"ایک بار خود آپ نے ان نام نہاد بڑے صحافیوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ آج انہوں نے آپ کو نظر انداز کر دیا۔"

"لیکن یہ میری پریس کانفرنس نہیں ہے" میں نے کہا۔

کیپٹن عادل نے میرے کان میں بتایا "تیمور صاحب کی فیملی نے سب کو مطلع کر دیا تھا کہ جنازے میں نہ کوئی باہر کا آدمی شریک ہو گا اور نہ اخبار والوں کو اجازت ہو گی۔ تدفین گاؤں میں ہو گئی ان کے۔"

"آئی سی۔ یہ وہ ڈھیٹ لوگ ہیں جو منع کرنے کے باوجود یہاں آ گئے" میں نے کہا "جو کسی کے جذبات کی پروا نہیں کرتے۔ انہیں تماشا چاہیے۔"

"آپ بھی تو ان کے زخموں پر نمک پاشی کرنے ہی آئے تھے۔" یہ بات کہنے والا قریشی کا ایک ساتھی تھا "کتنی عزت افزائی ہوئی؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور عادل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ان کرائے کے صحافیوں کو بطور خاص شمس اور قریشی گروپ یہاں کھینچ کے لایا ہو گا۔ میرے خلاف مظاہرے کا پروگرام پہلے سے طے تھا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ تیمور کی بیوہ کے ذہن میں بھی پہلے سے میرے خلاف نفرت کا زہر بھر دیا گیا تھا ورنہ وہ اس طرح سب کے سامنے آ کے مجھے ذلیل نہ کرتی۔ اسے یقین دلا دیا گیا ہو گا کہ تیمور کو شاہ عالم سے وفاداری نبھانے کے جرم میں اس کے مخالفین نے زخمی کر دیا تھا مگر شاہ عالم نے الٹا یہ سمجھا کہ وہ باغیوں کو اکسانے گیا تھا۔ شاہ عالم ایک بار اسے دیکھنے اسپتال نہیں گیا اور اپنے پیشہ ور قاتلوں کی مدد سے اس کو اسپتال میں ہی مروا دیا۔ آج کل خود بھی اپنے دو کاروباری ساتھیوں کے قتل کے الزام میں بند ہے۔

دونوں باتیں جھوٹ تھیں لیکن پروپیگنڈے کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی جاتی ہے اور یہ جھوٹ اتنے منظم اور سائنٹیفک طریقے پر بولا جاتا ہے کہ عام ذہن رکھنے والا آدمی اس پر فوراً یقین بھی کر لیتا ہے۔ تیمور کی بیوی کے پاس مجھ سے پہلے میرے دشمن پہنچ گئے تھے اور وہ سیدھی سادی عورت ان کی باتوں میں آ کے مجھ سے بدظن ہو گئی تھی۔

میں نے واپسی میں ان لوگوں کو دیکھا جو تیمور کے گھر سے کافی فاصلے پر روک دیے گئے تھے۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا گروپ میرے حامیوں کا تھا اور میرے مخالف کون تھے۔ تیمور کے گھر میں جو سلوک میرے ساتھ ہوا تھا' وہ اگلے دن اخباروں کی سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ شائع ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ تصاویر ہوں گی مظاہروں کی جو میرے خلاف ہو رہے تھے اور تبصرے ہوں گے۔ "بڑے بے آبرو ہو کے چیئرمین پی جے ایف گئے؟ آئے بھی وہ گئے بھی وہ" مخالفین کے زر خرید کالم نویسوں کی حاشیہ آرائی ہو گی۔ جو صحافی آج نہیں آئے تھے وہ بھی انہی خبروں اور تصویروں پر گزارہ کریں گے۔ کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ سب جھوٹ ہے اور بہت ہوا تو وہ دیگر ذرائع سے تصدیق کرا لیں گے۔

میں نے یہ ذمے داری رخشی کو سونپی تھی کہ وہ شام کے وقت میری پریس کانفرنس کے لیے صحافیوں کو مدعو کرے۔ سب سے اچھا یہ ہو گا کہ وہ شبنم کا تعاون حاصل کرے اور اسے کہہ دے کہ سب کو اطلاع کر دی جائے۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں خود بھی شبنم سے براہِ راست مل کے اس صورتِ حال کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ اس وقت شبنم کا آفس میں مل جانا یقینی تھا۔

میرے کہنے پر عادل نے گاڑی کا رخ اخبار کے دفتر کی طرف موڑ لیا "ایسے اچانک پروگرام میں کوئی رسک نہیں ہوتا۔ لیکن پریس کانفرنس کا شیڈول ہمیں ابھی تک معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "وہی طے کرنے جا رہا ہوں میں۔"

میں کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ شبنم سے پہلے میری ملاقات چلبلی سے ہو جائے گی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھے بغیر گاڑی سے اتر کے اخبار کے دفتر کا رخ کیا تھا کہ آواز آئی۔ "ارے میاں' کیا عمر طویل پائی ہے تم نے گویا۔ تمہیں ہی یاد کیا تھا چلبلی نے۔ خوب آئے۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو احاطے میں کھڑی ہوئی بہت سی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڑیوں کے قریب چلبلی موجود تھی اور جناب ابوبکر آزاد اس کے بونٹ میں سے سر نکال کے مجھے پکار رہے تھے۔ ان کی حالت بتاتی تھی کہ وہ کافی دیر سے چلبلی کو منانے میں مصروف ہیں۔ ان کے حلیے سے پریشانی ہمیشہ عیاں رہتی تھی مگر اس وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اخبار کے ایڈیٹر نہیں موٹر مکینک ہیں۔ ان کے پاس ہی دو مددگار تھکے ہارے ہانپ رہے تھے۔ ایک قمیص کے دامن سے ماتھے کا پسینہ صاف کررہا تھا اور دوسرا بونٹ کا سہارا لیے آسمان کو فریادی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ان کے آفس میں کام کرنے والے لوگ تھے جو شاید چلبلی کو احاطے کے اندر ادھر سے اُدھر دھکا لگاتے رہے تھے مگر اسے اسٹارٹ کرنے میں ناکام رہے تھے۔

میں نے کہا "اب کیا ہوگیا؟"

"بخدا ہم تو کوئی نقص دریافت نہیں کرسکے" انہوں نے اپنی ناک کی آخری حد تک پھیل جانے والی عینک کو بروقت سنبھال لیا۔ "ناقابلِ فہم سی ہے یہ بات گویا۔ اب ماشاءاللہ تم ہو بالکل صحت مند اور بجے کتنے' حرکتِ قلب اور فشارِ خون بھی درست ہو مگر سانس نہ آرہی ہو تو اسے کیا کہیں گے۔"

"غالباً چلبلی کا موڈ نہیں ہے اس وقت چلنے کا۔"

"یہ کیا نامعقولیت کی بات ہے۔۔۔ بھئی چلبلی ہمارے موڈ کو سمجھتی ہے۔ ہم اس کے موڈ کو جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلیے چھوڑیے۔ کوئی مکینک آکے اسٹارٹ کردے گا" میں نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ میاں یہ جو شخص بلکہ اشخاص بحالتِ قرار نظر آرہے ہیں یہاں یہ ہمہ صفت لوگ ہیں گویا۔" انہوں نے اپنی چھڑی سے ایک کو چھوا "یہ بیک وقت ہمارا کاتبِ زریں قلم ہے۔ موتی پروتا ہے۔ دوپہر میں یہ داروغۂ مطبخ ہے گویا۔ دال ماش اور بگھارے بینگن کیا غضب کے بناتا ہے اور میاں دروغ برگردن راوی۔ دریائے راوی نہیں' خود اس نے بتایا کہ اِدھر اُدھر سے پرزے جمع کرکے' غالباً چرا کے' سالم گاڑی ایجاد کرلی تھی گویا۔ جو چلتی تھی بقلم خود۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسے۔

میں نے کہا "میں ایک کام سے آیا تھا۔"

"تو بھئی کام شروع کرو۔ بسم اللہ۔ ایک نگاہِ مردِ مومن ڈالو جس سے بدل جاتی ہیں تقدیریں وغیرہ گویا۔ ملاحظہ فرماؤ چلبلی کو۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب' اس ضعیفہ کو بھی آزاد کردیں بارِ غلامی سے۔ بہت خدمت کرلی اس نے آپ کی اور آپ نے اس کی۔ اتنے بڑے اخبار کے مدیر ہیں۔ کوئی نئی چمکتی دمکتی نئے ماڈل کی گاڑی لیں۔"

انہوں نے ہمیں بڑی پھرتی سے ایک چھڑی رسید کی۔ "گستاخ' نامعقول۔ اتنی کثیر مقدار میں توہین ہماری۔ چمکتی دمکتی نئے ماڈل کی گاڑی میں بیٹھ سکتا ہے کوئی ہم جیسا شریف آدمی؟ رزقِ حلال کمانے والا۔ ہمیں تم ان کی صف میں لانا چاہتے ہو گویا۔ وزیروں اور راشی افسران اور اسمگلرز کی صف میں۔"

میں نے کہا "اچھا ابھی اوپر چلیے۔ میں تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ لوں گا۔"

"ناممکن۔ اس وقت چلبلی کی طرف سے تشویش ہے ہمیں۔ اس کی علالت کے سبب گویا۔ چلبلی کی شفایابی تک ہم کوئی اور کام کرہی نہیں سکتے۔"

مجبوراً میں نے آستین چڑھا کے انجن کو چیک کیا۔ پرزے چرا کے کار ایجاد کرنے والے کو میں نے اندر بٹھایا۔ وہ میری ہدایات کے مطابق سیلف کا سوئچ گھماتا تھا۔ چند منٹ میں مجھے وجہ معلوم ہوگئی۔ ڈسٹری بیوٹر کیپ کے اندر گھومنے والے "روٹر" کے اوپر معمولی سی کاربن کی تہ آگئی تھی۔ ریگ مال دستیاب نہیں تھا۔ میں نے اسے ڈیش بورڈ پر رگڑا۔ پھر جینز کی پتلون پر جو کاتب خانساماں اور آٹو انجینئر صاحب نے پہن رکھی تھی۔ اسے فٹ کرتے ہی چلبلی اشارے پر اسٹارٹ ہوگئی۔

آزاد صاحب نے لپک کے ہمیں گلے لگایا اور کھلکھلا کے ہنسے "بھئی ہم تو جانتے ہیں گویا کہ چلبلی کے مزاج آشنا اور مسیحا تم ہی ہو۔ ہم تو کہتے ہیں کہ چھوڑو سب فضول کام جو تم کررہے ہو اور باگ ڈور سنبھال لو چلبلی کی۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ ویسے تم کرتے کیا ہو گویا؟"

"حضرت۔ میں شاہ عالم ہوں' آپ بھول گئے؟"

وہ ہاتھ اپنی شیروانی سے صاف کرتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑے "ہاں۔ یاد آیا۔ تم وہ ہو گویا۔۔۔ کوئی مداری قسم کے سیاست باز۔ کبھی غائب ہوجاتے ہو اور پھر نظر آنے لگتے ہو۔ ایک بار فوت بھی ہوچکے ہو غالباً اور پھر ایک سے دو بھی ہوگئے تھے تم۔"

میں نے ہنس کے کہا "بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔"

اپنے دفتر میں بیٹھ کے انہوں نے کہا "تو بھئی یہاں رکھو وہ' تشریف گویا۔ تم ہمارے حق میں تو فرشتۂ غیب کا کردار ادا کررہے ہو مسلسل۔ اس کارِ خیر پر جو تم نے ابھی سرانجام دیا' ہم حقِ خدمت کے طور پر تم کو اسپیشل چائے پلائیں گے۔ ہمارے ایک مداح نے ایجاد کی ہے گویا۔ چائے کے پودے میں جو پھول آتے ہیں' ان کو کشمیر سے حاصل ہونے والے زعفران کے پھولوں میں جلایا اس نے پھر خشک کیا چاندنی میں۔ دھوپ لگ جاتی تو ستیاناس ہوجاتا گویا۔ چودھویں شب کی چاندنی میں خشک آمیزے پر اپنے لاہور کے ایک باغ سے حاصل کردہ عرقِ گلاب کا تڑکا لگایا۔ اور بس ہمیں ارسال کردیا تحفۂ درویش بنام درویش گویا۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "یہ۔۔۔ مجھے پینی پڑے گی۔ اس سے تو بہتر ہوگا' آپ اپنے حقے کا پانی ایک کپ میں ڈال کے میرے سامنے رکھ دیں۔"

وہ ہنسے "وہ بھی پی لینا۔" انہوں نے حقے کی طرف متوجہ ہوکے کہا اور پھر بڑی تفصیل سے بتایا کہ اس کا تمباکو اور قوام وہی ہے جو شہنشاہ اکبر نے میاں تان سین کو انعام میں عطا کیا تھا اور اس کی تاثیر تھی کہ میاں تان سین نے میاں کی ٹوڈی ایجاد کی۔ انہوں نے مجھے مزید دہشت زدہ کیا کہ چائے کے بعد وہ مجھے پان کھلائیں گے اور یہ پان بھی وہ نہیں جو گلی محلوں میں ہر ایرا غیرا نوش فرماتا پھرتا ہے۔ اس کے خواص اور اجزائے ترکیبی بتانے کے بعد انہوں نے کہا۔

"ہاں تو تم آئے تھے کسی کام سے گویا۔ ابھی تک بتایا نہیں۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے" انہوں نے پاؤں سمیٹ کر کرسی پر رکھے اور ہمہ تن گوش ہوگئے۔

میں نے انہیں مختصراً اپنے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھے کچھ اونگھتے رہے اور کبھی کبھی سہلاتے رہے پھر ایک دم سیدھے ہوکے بیٹھ گئے "خوب بہت خوب گویا۔"

میں نے کہا "اس میں کیا بہت خوب ہے آزاد صاحب۔ میرے خلاف یہ سب پریس میں آگیا تو بڑی خرابی ہوگی۔ آپ میری مدد فرمائیں۔"

"برخوردار۔ ہم نے تو سمجھ لیا تمہارا مسئلہ۔ ہمارا نیک خیال اور مشورہ تو یہ ہے کہ بے پر کی اڑانے والوں کو اڑانے دو گویا۔ آج کا نہیں' کل کا سوچو۔ جب حقائق سامنے آئیں گے تو تمہیں دہرا فائدہ ہوگا۔ ویسے خوب یاد آیا ہمیں کہ یہ کام ہمارا نہیں' شبنم کا ہے۔ وہ قلم عندلیب والی شبنم نہیں۔ ہماری نورِ چشم ہے گویا۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ دراصل میں اسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔"

انہوں نے اچانک میز پر مُکا مارا اور دہاڑ کے بولے۔ "آخر یہ کس قسم کا جان لیوا مذاق کررہے ہو تم اس کے ساتھ گویا۔"

کاتبِ زریں قلم دوڑا ہوا آیا "چائے ابھی حاضر کرتا ہوں جناب۔"

"چائے۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں۔" انہوں نے اسے بھی ڈانٹا "اس نامعقول کو میں زہرِ ہلاہل دینا چاہتا ہوں۔ دھتورے میں نیلا تھوتھا ابال کے سائنائیڈ ملاؤ اور ایک کپ فوراً لاؤ۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں' آپ کی خفگی کا سبب؟"

"دیکھو میاں۔ تم جیسے پیدا کئے ہوتے تو اب تک خودبخود ۔۔۔ ملک کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ کرچکے ہوتے گویا" انہوں نے میز پر اپنی چھڑی بجائی "ہم چلاتے ہیں چلبلی کو اور تم ہمیں چلانے کی کوشش کرتے ہو۔ بخدا اس عزیزہ کا خیال نہ ہوتا تو وہ جو کھوٹہ والے ہیں نا اپنے ڈاکٹر قدیر۔ ان سے پہلے ہم ایٹم بم بنا کے تمہارے نیچے رکھ دیتے۔ ہم اسے دکھی دیکھتے ہیں تو دل جگر گردے وغیرہ پھٹنے لگتے ہیں۔"

بات کو کسی حد تک سمجھ لینے کے باوجود میں نے کہا۔ "آخر ایسی کیا خطا کی ہے میں نے اور شبنم کا مسئلہ یہ ہے۔"

"اس کا مسئلہ ہو تم۔۔۔ تم بقلم خود" انہوں نے سر سے ٹوپی اتار کے میز پر ماری "تم نے اسے حیران پریشان عقل و ہوش سے بیگانہ دیوانہ وغیرہ بنادیا ہے' اپنے مداری کے کھیل سے۔ آخر تم ایک کیوں نہیں ہوجاتے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "ہم ایک ہوجائیں۔ حضرت میں شادی شدہ ہوں پہلے سے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ میاں وہ کیا شعر ہے علامہ صاحب کا۔۔۔ دوئی کو چھوڑ دے یک رنگ ہوجا۔ سراسر موم ہو یا سنگ ہوجا۔"

میں نے کہا "میں ایک ہی ہوں آزاد صاحب مگر وہ نہ مانے تو کیا کروں؟"

"کچھ کرو۔۔۔ کچھ بھی کرو۔۔۔ دیکھو تا یہ کبھی فوت ہوتا اور کبھی پھر قبر سے نکل آتا۔ اور بیک وقت یہاں بھی نظر آتا اور وہاں بھی۔ ایک ہی وقت میں ہانگ کانگ اور سنگاپور میں بھی موجود ہوتا اور لاہور کراچی میں بھی۔ مغلوں کے آخری دور میں ضرورت پڑی تو انہوں نے فوراً کنفیوژن دور کرنے کے لیے اسے شاہ عالم ثانی قرار دے دیا۔ وہ ایسا ہی سمجھتی ہے تمہیں بھی گویا۔"

میں نے کہا "شبنم کے وہم کا کوئی علاج نہیں ہے میرے پاس۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمہارے پاس نہیں ہے تو حکیم لقمان کے پاس ہوگا۔ علاج تو ہونا چاہیے گویا۔ اور یہ وہم سارے زمانے کو کیسے ہوا برخوردار! تم پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر لیکن بدقسمتی سے تم بچ گئے۔"

"بدقسمتی سے؟"

"اور خوش قسمتی سے عین اس وقت تم ہلاک بھی ہوگئے۔ لاہور کے قریب ایک ریلوے کراسنگ پر مشتعل ہجوم کے ہاتھوں۔ تو نورِ چشم تجمنم نے گویا یہ بھی دیکھا اور وہ بھی۔ حیران ہوں کہ ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔ اب کل ہم نے کیا دیکھا' پوچھو کیا دیکھا؟" انہوں نے ڈانٹ کے کہا۔

میں نے کہا "کیا دیکھا آپ نے؟"

"ہم نے دیکھا کہ وہ کچھ آلاتِ کان کنی و باغبانی وغیرہ خرید فرما رہی تھی گویا۔" انہوں نے چلّا کے کاتب خانساماں کو پکارا "ابے خانِ بے ساماں۔ بحرالکاہل ولد بحیرۂ مردار۔ یہ چائے کب گلے گی آخر۔"

وہ پھر نمودار ہوا "آپ نے احکامات منسوخ فرمادیے تھے۔"

"ہم منسوخی کے حکم کو منسوخ فرماتے ہیں گویا۔ ستائیس سیکنڈ کی مہلت دے رہے ہیں ہم گویا پھر ہمارے سامنے آؤ تو کلمہ پڑھ کے آنا یا چائے لے کر۔"

میں نے کہا "آپ کچھ تجمنم کے بارے میں فرما رہے تھے۔"

"ابھی ہم سخت سنجیدہ اور رنجیدہ و آبدیدہ وغیرہ ہو رہے ہیں" انہوں نے ایک رومال میں ناک خالی کی۔

خانساماں مسکراتا ہوا چائے کے ساتھ نمودار ہوا۔ جیسی روح ویسے فرشتے والی بات تھی۔ وہ آزاد صاحب کو اُن کی عادت اور مزاج کو برسوں سے سمجھتا تھا۔

"ستائیس سیکنڈ اب ہوئے ہیں" اس نے چائے کا کپ میز پر رکھنے کے بعد باہر جاتے جاتے کہا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ میرا خیال تھا کہ زعفران اور عرقِ گلاب کا یہ مکسچر پیتے ہی مجھے الٹی ہوجائے گی مگر وہ بہت عمدہ چائے تھی۔

"ہم نے اس سے پوچھا کہ عزیزہ۔ تم اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں لان لگا رہی ہو یا آم کا باغ۔" وہ شڑپ سے چائے پی کے بولے "اب مانا کہ وہ بچی ماشاء اللہ بڑی ذہین اور ہوشیار' سمجھ دار' تیز و طرار وغیرہ ہے گویا مگر ہے تو ہمارے سامنے وہی طفلِ شیرخوار کہ جسے ہم نے انگلی پکڑ کے چلنا سکھایا۔ اور بدلے میں اس نامعقول نے دس بار ہمارے ملبوس پر بغیر [illegible] کے آبپاشی کی۔ تو وہ اب ہمیں بچہ سمجھ کے ٹالنے کی کو[illegible] کرے۔"

"اس نے ایسی کیا بات کہہ دی؟"

"اس نے کہا کہ میں یہاں چھانگا مانگا یا کانا کاچھا[illegible] سرنگ نکالوں گی نیچے کی طرف گویا۔ اور وہ سیدھی نکلے[illegible] ہونولولو یا ٹمبکٹو میں۔ لیکن بیچ میں ایک مسئلہ ہے گویا' پو[illegible] کیا؟"

میں نے کہا "کیا مسئلہ ہے؟"

"اُفوہ۔ اس نے ہم سے کہا تھا کہ پوچھو۔ ہم نے پو[illegible] اس نے کہا کہ زمین کی کششِ ثقل مرکز کی طرف کھنچتی [illegible] درمیان میں پہنچ کے صفر ہوجائے گی۔ اور اوپر سے کسی [illegible] سرنگ میں ڈالا جائے تو وہ بیچ میں ایسے پھنس جائے گا [illegible] پائپ میں چوزے کا پَر۔ وزن تو رہے گا نہیں اس کا۔ وہ [illegible] کیسے جائے گا پھر۔ ہم نے بھی کہا کہ پوچھیں گے نیوٹن کی [illegible] سے۔ لیکن برخوردار۔ کل سے وہ مفقود الخبر ہے کیا سمجھے۔"

"اس کا کوئی پتا نہیں؟ لیکن میں تو کل شام اس [illegible] پولیس اسٹیشن پر ملا ہوں۔ بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میری بیوی رخشندہ نے اسے بلایا اور وہ اس سے ملنے گئی تھی۔"

"لیکن ہم سے تو اس کا رابطہ منقطع ہے گویا۔ بینتیس [illegible] گھنٹے چالیس منٹ اور سترہ سیکنڈ ہوگئے" انہوں نے تشو[illegible] سے کہا "اب تم آگئے ہو اس سے ملنے۔ کوئی بتلاؤ کہ [illegible] بتلائیں کیا۔ پریس کلب سے بھی استفسار لاحاصل رہا۔"

"آپ تو جانتے ہیں وہ کسی کام کے پیچھے لگ جائے [illegible] سب کچھ بھول جاتی ہے۔" میں نے کہا "ہوگی کسی اسٹو[illegible] کے چکر میں۔"

انہوں نے ایک آہ بھری "چکر میں تو وہ خود آگئی ہے [illegible] اور ابھی تو خیر دردناک اسٹوری ہے مگر آثار ہیں کہ عبرتناک [illegible] بن جائے گی۔ ہمیں تو سخت ڈر ہے کہ اس کا انجام دیوانگی ہی ہوگا۔ انشاء اللہ۔۔۔ ہمارا مطلب ہے خدانخواستہ۔ کیا [illegible] وہ شعر۔۔۔ کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار۔ ا[illegible] کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہے ا[illegible] اس کی عقل کبھی اسے دھوکا نہیں دیتی۔"

"سچ کہا تم نے برخوردار مگر یہ معاملہ عقل کا نہیں [illegible] گویا۔ یہ ہے جذبات کا مسئلہ۔ کیا سمجھے' بڑی خانہ جنگی کا شا[illegible] ہے وہ۔۔۔ دل اور دماغ میں بڑی ہی گھمسان کی لڑائی چل رہ[illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ اعصاب اس کے فولادی تھے مگر زنگ لگ گیا ہے فولاد کو گویا۔" وہ واقعی سخت متفکر تھے۔ "تم کچھ کرو۔"

میں نے کہا "آج شام ایک پریس کانفرنس میں سب وضاحت کردوں گا میں۔"

وہ اچھل پڑے "یعنی یہ کانا کاچھا سے ٹمبکٹو تک سوراخ کرنے والا معاملہ۔۔۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو میں نے تم کو اپنا آدمی سمجھ کے بتادیا تھا۔ ٹمبکٹو والے تو اقوام متحدہ میں لے جائیں یہ مسئلہ کہ پاکستان ہمارے ملک میں سرنگ بنا کے داخل ہونا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "میں اپنے معاملات کی وضاحت کروں گا۔ جو سازش میرے خلاف ہورہی ہے' اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ شبنم سے رابطہ ہو تو اسے بھی بتادیں۔"

انہوں نے فقط سر ہلایا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔

میں نے کہا "جو کچھ آج ان کرائے کے صحافیوں نے میرے ساتھ کیا ہے میرے مخالف کے کہنے پر' کیا اس کی رپورٹ روکی نہیں جاسکتی۔"

"کیا؟ یعنی ہم اشاعت رکوادیں اس رپورٹ کی؟ نامعقول' کیا سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں۔ ہم سنسر بورڈ ہیں' محکمۂ اطلاعات یا فیلڈ مارشل وغیرہ؟ ساری عمر اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے لڑتے گزری' اب سچ کی راہ میں دیوار بن جائیں یعنی ہم۔ بقلم خود۔"

"مگر وہ جھوٹ ہے۔ بنایا ہوا سچ۔"

"تو تردید کردو اس کی۔ اور جھوٹ سے ڈرنا کیسا۔ ڈرے وہ جو جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا منہ کالا ہونا طے ہے گویا ایک دن۔ اس کے علاوہ یہ سب تو شائع ہوگیا۔ ضمیمے آگئے ہوں گے یا آنے والے ہوں گے۔ شام کو پریس کانفرنس میں ان کے پرزے اڑادینا اگر اڑا سکتے ہو۔" وہ خفا ہوگئے۔

اس کے بعد رخصت ہونے کے سوا میرے لیے چارہ نہ رہا۔ آزاد صاحب سے ملاقات بے سود رہی تھی۔ ان سے یہ درخواست کرکے مجھے شرمندگی ہوئی تھی کہ میں تیمور کے گھر پر ہونے والی بے عزتی کی رپورٹ اخبارات میں نہ آنے دوں۔ آزادیِ تحریر کے حق پر یقین رکھنے والے کسی صحافی سے ایسی امید نہیں کی جاسکتی۔ خبر دینے والا جھوٹ پر مبنی بے بنیاد خبر دے تو اس کی اپنی ساکھ خراب ہوتی ہے۔ سچ اگر سرکاری نہ ہو تو سامنے آجاتا ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' اس کی اتنی اہمیت نہیں تھی کہ بطور خاص ایک ضمیمہ چھاپ کے خبر لوگوں کو دی جائے مگر میرے مخالفین ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میری سیاسی کردار کشی میں مصروف تھے اور ان کے لیے رائی کا پہاڑ بنانا ضروری تھا۔

میں بازار سے گزرا تو مجھے ہاکر چلا چلا کے اور دوڑ دوڑ کے ضمیمے فروخت کرتے نظر آئے۔ ہاکر کو خبر کے سچے جھوٹے ہونے سے کیا۔ اسے چار پیسے ملتے ہیں تو وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اخبار بیچنا چاہتا ہے۔ ایک سرخی یہ بنائی گئی تھی "امیر تیمور کی تدفین۔۔۔ شاہ عالم کو شرکت سے روک دیا گیا" اس سے تاثر یہ ملتا تھا کہ میرے سوا سب اس میں شریک ہوئے۔ یہ وضاحت خبر سے بالکل آخری جملے میں کی گئی تھی۔ دوسرے کی سرخی زیادہ گمراہ کن تھی۔ "امیر تیمور کی بیوہ نے شاہ عالم پر قتل کا الزام عائد کردیا" اس کے ساتھ ہی کسی نے زوم لینس سے بنائی گئی تصویر لگادی تھی۔ اس میں تیمور کی بیوہ مجھے غضبناک نظروں سے دیکھتے ہوئے یوں اشارہ کررہی تھی جیسے دفع ہوجانے کو کہہ رہی ہو۔ اس اخبار میں ایک کارٹون بھی چھپا تھا۔ روم کا شہنشاہ (جس کی صورت کے نقوش تیمور سے ملتے تھے) پلٹ کر اپنے عزیز دوست بروٹس سے کہہ رہا ہے "تم بھی۔۔۔ بروٹس!" بروٹس مجھے بنایا گیا تھا۔ یہ شہرۂ آفاق ڈائیلاگ سیزر نے اس وقت بولا تھا (شیکسپیئر کے ڈرامے میں) جب سازشیوں کے ساتھ مل کر بروٹس نے اپنے دوست کو خنجر گھونپ دیا تھا۔

اخبار والے بادشاہ لوگ کہلاتے ہیں مگر کچھ مداری ہوتے ہیں کہ صرف الفاظ سے مفہوم بدل کے بے پَر کی اڑانے والے محاورے کو سچ کردکھائیں۔ زرد صحافت کی ساری سنسنی خیزی مداری کا تماشا ہے۔ حقیقت خواہ کچھ نہ ہو مگر دیکھنے والے کو مداری کا کھیل ہاتھ کی صفائی نہ لگے۔

اخبار کے ضمیموں کی سرخی دیکھ کے نہ میں حیران ہوا اور نہ مشتعل۔ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں اخبار شائع ہوکے بازار میں کیسے آگیا۔ شاید ساری تیاری مکمل تھی۔ جاننے والوں نے کسی نہ کسی ذریعے سے جان لیا تھا کہ امیر تیمور کے جنازے میں صرف خاندان کے لوگ ہوں گے لیکن میں اپنے خاص تعلق کی بنا پر دوستوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں گا۔ جب ان کی امید بر آئی تو ایک موقع کی تصویر فوراً اخبار کے دفتر پہنچادی گئی جہاں پوری کاپی تیار تھی۔ اگر میں نہ جاتا تو وہ کاپی ضائع کردیتے لیکن تیاری کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک گھنٹے میں اخبار شائع ہوگیا اور دو گھنٹے میں پبلک تک پہنچ گیا۔

میں نے سرخیوں پر ایک نظر ڈال کے اخبار رکھ دیا

اور شبنم کے بارے میں سوچنے لگا۔ گزشتہ رات وہ بہت ایکٹو تھی۔ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچی تھی۔ مجھ پر عائد کیے ہوئے بے بنیاد الزام سے زیادہ اس کی دلچسپی کا محور میری ذات اور شناخت تھی۔ جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مجھے صفائی پیش کرنے کا آخری موقع دینا چاہتی تھی کہ جو پہلے کہا تم نے وہ میں نے بھی سنا اور کچھ ہے تو کہو۔ جیسے سپریم کورٹ میں اپیل میں پرانے دلائل سے کام نہیں چلتا جو ہائی کورٹ میں دیے گئے تھے۔ نئی بات کیا ہے' وہ نکتہ کیا ہے جس پر ابھی تک غور نہیں کیا گیا۔

شبنم نے میرا سراغ کیسے لگایا تھا؟ اس کا کہنا تھا کہ میرے ذرائع ہیں اور وسائل ہیں۔ ایس پی غلام محمد بھی اس کا چاچا ماما تھا جس کو اس کی مرضی کے خلاف EXPLOIT کرتی رہتی تھی۔ لیکن رات کے وقت جب کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور بقول آزاد صاحب کے وہ مفقود الخبر تھی۔ وہ رخشی کے پاس کیسے پہنچ گئی تھی۔ رخشی نے گلاب اور چنبیلی کو شبنم کو بلانے بھیجا تھا مگر وہ اعتراف کرچکے تھے کہ ان کا شبنم سے رابطہ ہی نہیں ہوا تھا۔ رخشی سے ملاقات میں بھی شبنم کی ساری گفتگو میری شناخت کے بارے میں میری "بیوی" سے براہِ راست معلومات حاصل کرنے تک محدود رہی تھی۔

پاگل لڑکی۔ شک کے کانٹوں بھرے راستے پر ایک قدم چلتی تھی اور کانٹے نکالنے کے لیے رک جاتی تھی۔ لیکن اگلا قدم پھر انہی کانٹوں پر پڑتا تھا اور ابھی تک نہ اس نے راستہ بدلا تھا اور نہ کمزوری ظاہر ہونے دی تھی۔ آزاد صاحب بھی متفکر تھے اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے مجھ پر بھی اپنی تشویش کے اسباب واضح کردیے تھے۔

کیا واقعی شبنم پاگل پن کی اس انتہا تک جاسکتی ہے کہ وہ خود اپنے طور پر شاہ عالم کی قبر میں سے اس کی لاش نکلوائے اور ذاتی نگرانی میں اپنے بھروسے کے ڈاکٹروں سے ایک پوسٹ مارٹم رپورٹ اور حاصل کرلے یہ جاننے کے لیے کہ پہلے دی جانے والی دو رپورٹوں میں سے کون سی غلط تھی۔ بظاہر یہ ناممکن کام تھا اور یہ بہت سنگین جرم بھی سمجھا جاسکتا تھا لیکن دیوانگی ناممکن کو ممکن بنادیتی ہے۔ خدمات بھی معاوضے پر حاصل کی جاسکتی ہیں اور شبنم جیسی لڑکی اپنے کام نکالنے کے سو گر جانتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ اس پاگل پن کی انتہا کب اور کہاں ہوگی؟ آزاد صاحب نے اگر اسے بیٹی کی طرح پالا تھا تو وہ اس سلسلے میں کیا کررہے تھے؟ مجھے معلوم تھا کہ آزاد صاحب ازلی و ابدی کنوارے ہیں۔ شبنم سے ان کے پیشہ ورانہ تعلق کا علم مجھے تھا مگر اس کے ساتھ جذباتی وابستگی کا سبب مجھے معلوم نہیں تھا۔ آخر شبنم سے ان کا کیا رشتہ تھا؟

میں شبنم کے لیے خدا سے دعا ہی کرسکتا تھا کہ اس کی روح کو سکون دے اور اس کی عقل کو حقائق سے سمجھوتا کرنے کی توفیق عطا کر۔ مجھے کیا ضرورت ہے فکرمند ہونے کی اور اسے روکنے کی۔ وہ جائے شاہ عالم کی قبر کھودے' لاش کے ڈھانچے سے پوچھے کہ وہ شاہ عالم ہے یا نہیں اور چاہے تو خود اس کے ساتھ دفن ہوجائے یا اسے اپنے بیڈ روم میں اپنے ساتھ سلالے۔

میرا خیال ہے کہ جھنجلاہٹ کے ساتھ میرا غصہ بڑھنے لگا تھا جب اچانک میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

رخشی نے کہا "شاہ جی۔ تم کہاں ہو؟"

میں نے کہا "میں ہمیشہ وہاں ہوتا ہوں جہاں مجھے نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم جنازے میں شامل ہو؟"

"نہیں۔ امیر تیمور کی میت کو چند رشتے دار گاؤں لے جارہے ہیں لیکن تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ کہیں تم نے ضمیمہ تو نہیں پڑھ لیا۔"

"کون سا ضمیمہ؟"

"وہی جو میں پڑھ رہا ہوں" میں نے کہا۔

"شاہ جی مذاق کا وقت نہیں ہے۔ کچھ دیر پہلے بیرسٹر سلطان محمود کا فون آیا تھا۔" وہ بولی "انہیں کل سے دھمکیاں موصول ہورہی تھیں کہ وہ تمہاری وکالت سے دستبردار ہوجائیں۔"

"سلطان محمود کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔"

"وہ آج تمہاری ضمانت کے کاغذات داخل کرانے گئے تھے اور حبس بے جا کی پیٹیشن۔۔۔ انہیں پتا چلا کہ پولیس نے تمہارا کوئی چالان ہی پیش نہیں کیا بلکہ صاف انکار کردیا کہ تمہیں گرفتار بھی نہیں کیا گیا۔"

"اس کا اندازہ تھا مجھے" میں نے کہا۔

"لیکن جب بیرسٹر سلطان محمود کورٹ میں تھے تو ان کے گھر پر فائرنگ کی گئی اور بعد میں نامعلوم افراد نے ان کی بیوی کو فون پر دھمکی دی کہ تم نے اپنے شوہر کو نہ سمجھایا تو اکیلی رہ جاؤگی۔ پہلے تمہارے بیٹے کی باری آئے گی۔ پھر بیٹی کی۔ اس کے بعد بھی عقل نہ آئی تو وکیل صاحب کی بیوہ کہلاؤگی تم۔ پاگل خانے میں۔ ظاہر ہے وہ عورت بہت ڈر گئی کیونکہ اس کے بچے دو ہی ہیں اور وہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ اس نے مجھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بات کی بہت رو رہی تھی وہ۔"

"اس نے اپنے شوہر سے کیوں بات نہیں کی تھی؟"

"وہ کہہ رہی تھی کہ وکیل صاحب بھی ضدی آدمی ہیں۔ وہ نہیں مانیں گے۔ یہی کہیں گے کہ ایسی دھمکیوں سے ڈر کے کون وکالت کرسکتا ہے۔ جس کا جی چاہے کسی وکیل کو مجبور کردے کہ مخالف کی وکالت چھوڑ دو۔ وہ قانون کا سہارا لیں گے یا ہمیں کہیں شفٹ کردیں گے مگر شاہ جی کی وکالت نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے کہا "بالکل صحیح بات ہے۔ دنیا میں ہر شخص اپنا کام کررہا ہے' میں جا کے کسی دوسری جماعت کے سربراہ سے ایسا ہی مطالبہ کروں۔ ایک دکاندار دوسرے سے کہے کہ یہاں سے کاروبار سمیٹ لو اپنا کیونکہ یہاں صرف میں دکان چلاؤں گا۔ ایسی لاقانونیت اور دھاندلی نہیں ہے۔"

"لاقانونیت کتنی ہے' آپ جانتے ہیں شاہ جی۔ آپ سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے؟"

میں نے کہا "او کے' پھر میں کیا کروں؟"

"وہ چاہتی تھی کہ آپ خود بیرسٹر سلطان محمود کا وکالت نامہ منسوخ کردیں" رخشی نے کہا۔

"اور اس کے بعد کسے وکیل کروں؟ یہ نہیں بتایا تھا فائرنگ کرنے والے ان بزدلوں نے۔ بعد میں فون کیا بیوی بچوں کو ڈرانے کے لیے؟ ان کے اپنے بیوی بچے نہیں ہیں کیا؟" میں نے برہمی سے کہا "بے وقوف ہوتا ہے وہ آدمی جو دوسرے کے گھر کو آگ لگانے سے پہلے اپنے گھر کو نہیں دیکھتا۔"

بات کرتے کرتے میں شاہ عالم ہاؤس پہنچ گیا اور پھر سیدھا اس کمرے میں جہاں سے رخشی فون کررہی تھی۔ وہ بری طرح ڈر گئی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے اعصاب کتنے کشیدہ ہیں "حد کرتے ہیں آپ بھی۔ کہہ دیتے کہ میں آکے بات کروں گا۔"

"یہ کہنے کے لیے میں تمہارے سامنے پہنچ گیا۔ اب آرام سے بیٹھو اور بتاؤ کہ اتنا ڈرنے کی کون سی بات ہے۔"

اس نے سر پیچھے کرکے صوفے کی پشت پر لگا دیا "مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا جو اب ہو رہا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہیں ایک پُرسکون زندگی سے محروم کردیا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ سکون نہیں جمود تھا۔ جب میں یہ بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ آخر میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ صرف صبح سے شام کرنا اور شام سے صبح کرنا۔ اب مجھے اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔"

"لیکن ڈر زیادہ لگتا ہے۔ میری مانو تو اپنے آپ کو دوسرے کاموں میں مصروف کرلو۔ سوشل سروس' ثقافتی سرگرمیاں۔ بہت سے کلب ہیں' خواتین کی تنظیمیں ہیں۔ کوئی اسکول کھول لو اور اس کے انتظامی امور میں سب کچھ بھلا دو۔ دن رات ایک کرلو۔ تھیٹر کرو' فلم بناؤ۔ جس کے پاس پیسہ ہو اور وقت بھی ہو وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں تو دنیا گھومنے جاؤ اور واپس آکے سفرنامہ لکھو' اسے شائع کرادو' لکھنا آتا ہے تمہیں؟"

"میں نہیں کرسکتی یہ سب۔ اعتماد نہیں ہے مجھ میں۔"

"آجائے گا اعتماد بھی۔ یہ فون کا ریسیور کیوں نیچے رکھا ہے؟"

اس نے کہا "سارے فون ٹھیک ہوگئے تھے۔"

"خود ہی ٹھیک ہوگئے؟"

وہ مسکرانے لگی "خراب بھی خود ہی ہوئے تھے۔ پھر گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پتا نہیں کون کون بات کررہا تھا۔ میں نے تنگ آکے آف دی ہک کردیے۔"

دستک پر میں نے باہر جا کے دیکھا۔ گلاب نے کہا "کوئی تھانے دار ہے جی' عباسی۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"فرید عباسی۔ یہاں لے آؤ اسے" میں نے کہا۔

رخشی سیدھی ہوکے بیٹھ گئی "یہاں کیوں بلایا ہے اسے؟"

"تاکہ تمہارے سامنے بات کرسکوں میں۔ ایک لاکھ اتنی ڈھٹائی سے لے گیا اور مجھ سے باتیں کررہا تھا فرض شناسی اور اصول پرستی کی۔ تم نے وہ چیک کینسل تو نہیں کرایا ہوگا؟"

"میں بالکل بھول گئی۔" رخشی نے کہا۔

"اب تک اس نے کیش لے لیا ہوگا" میں نے کہا "ابھی پوچھتا ہوں اس سے۔"

فرید عباسی اندر آیا تو بہت تھکا ہوا اور بیزار سا تھا۔ اس نے رخشی کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کے بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "کیا تم چیک کیش نہ ہونے سے پریشان ہو؟ آخر کیا ہوا؟ دستخط نہیں ملے یا بینک والوں نے کہا کہ ایک ہفتے کا نوٹس لاؤ۔"

وہ کچھ حیران ہوا "کون سا چیک؟"

رخشی نے کہا "آہم۔۔۔ وہ شاہ جی۔ کچھ گڑبڑ ہے اس معاملے میں۔ یہ کون سے عباسی صاحب ہیں۔"

میں نے کہا "میرے جاننے والوں میں ابھی دوسرا عباسی کوئی نہیں ہے۔ یہ فرید عباسی ہے' سب انسپکٹر ہے۔"

"سب انسپکٹر تھا" وہ بولا۔

"چیک کوئی اور لے گیا تھا اور مجھے وہاں لانے والا بھی کوئی اور تھا۔" رخشی نے کہا "ان کے نام سے فائدہ اٹھایا کسی نے۔"

میں نے عباسی کو ساری بات بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ایسا کون تھا جس نے میرا نام استعمال کیا۔ آپ دیکھیں گی تو پہچان لیں گی؟"

"ہاں۔ مگر وہ پھر کہاں نظر آئے گا؟" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "سوری یار۔ غلط فہمی کی وجہ سے میں نے تمہیں ذرا غلط لہجے میں مخاطب کیا مگر تم ایک لاکھ کے چیک کو چھوڑو۔ اتنے اداس اور پریشان حال کیوں لگ رہے ہو؟"

"مجھے معطل کردیا گیا ہے۔ اس بار چھٹی بھی ہوجائے گی۔ خیر۔ ایک نہ ایک دن یہ ہونا تھا۔ نوکری بس ایسے ہی چل رہی تھی اپنی" وہ بولا۔

"آخر ہوا کیا؟" میں نے کہا۔

"میں نے خالد عثمان اور خادم مرزا کے گھر سے چوکیداروں کو اٹھوالیا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ صاحب لوگ کہاں ہیں۔"

"انہوں نے کیا بتایا؟"

"انہوں نے مان لیا کہ اس رات وہ اپنے ہی گھر میں تھے جس رات آپ پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ انہیں قتل کردیا" وہ بولا "ظاہر ہے شرافت سے وہ ایسا بیان نہیں دے سکتے تھے لیکن بعد میں وہ کہاں گئے' اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ خالد عثمان کی تین گاڑیاں ہیں۔ خادم مرزا کی دو۔ گھر کے سب لوگ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کوئی گاڑی کسی کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اگر وہ کسی گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے ہوں تو انہیں معلوم نہیں۔ وہ اندر سے باہر جانے والوں پر نظر نہیں رکھتے۔ میں نے ان کا بیان ریکارڈ بھی کیا اور لکھوا بھی لیا کہ وہ آدھی رات کے بعد گھر آئے تھے۔ ان کے بیان الگ الگ کمروں میں ریکارڈ ہوئے مگر دونوں نے ایک ہی بات کہی کہ وہ شاہ عالم صاحب کی گاڑی میں گئے تھے۔ پینٹ زرد ہے سلور گرے رنگ کی۔ اسے بابر علی چلا رہا تھا۔ لیکن وہ واپس آئے ہرے رنگ کی ایک شیراڈ میں۔ شیراڈ پرانی شیپ والی یعنی چھیاسی کے بعد کا ماڈل۔ مگر رنگ جو انہوں نے بتایا وہ عجیب تھا۔ طوطے جیسا ہرا۔ پیرٹ گرین۔ بہرحال کم میں نے ایسی گاڑی آج تک نہیں دیکھی اور وہ بھی شیراڈ۔ دونوں نے کہا کہ گاڑی پر نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ گاڑی انہیں گیٹ کے سامنے اتار کے چلی گئی۔ انہوں نے خوش اخلاقی سے گاڑی کے ڈرائیور کو خدا حافظ بھی کہا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ انہی کا کوئی جاننے والا ہوگا۔ پھر وہ اندر چلے گئے تھے اور اس کے بعد رات بھر گیٹ بند رہا تھا۔ نہ کوئی اندر گیا تھا اور نہ باہر۔ سارے اسپتال میں پہلے ہی چیک کرچکا تھا۔ کہیں خالد عثمان یا خادم مرزا جیسے حلیے کے کسی آدمی کی لاش نہیں پہنچی تھی۔ سب تھانوں میں پوچھ لیا تھا۔"

"ظاہر ہے وہ سب جھوٹ تھا۔ تمہارا کیا قصور اس میں؟"

"میرا قصور یہ بنا کہ جتنا مجھ سے کہا گیا تھا' میں نے اس سے بڑھ کے کارکردگی دکھائی اور کچھ لوگوں کا کھیل چوپٹ کردیا۔ شاہ عالم کے خلاف کوئی ایف آئی آر نہیں تھی' تھوڑی بہت تفتیش ہوئی تھی۔ آپ کو ایک رات کے لیے روکا گیا تھا۔ اس طرح کہ بعد میں ثابت کچھ نہ ہو۔"

"لیکن مجھے میرے وکیل کے علاوہ بہت سے لوگوں کے سامنے گرفتار کیا گیا تھا اور ہتھکڑی لگا کے پولیس کی گاڑی میں بٹھا کے لے جایا گیا تھا۔"

"وہ ایس پی غلام محمد کی بے وقوفی تھی۔ معلوم نہیں اس نے ایسا کیوں کیا جب کہ اسے سب معلوم تھا۔"

"اسے کیا ذاتی عناد ہے مجھ سے؟"

"یہ تو آپ جانتے ہوں گے شاہ جی!" عباسی مسکرایا۔ "تھانے سے آپ کو ایک الگ جگہ لے جانا تھا۔"

"تم نے اپنی کوٹھی پیش کردی یا وہ کوٹھی کسی اور کی تھی۔ تم نے ایک کہانی سنادی۔"

وہ بولا "نہیں۔ میں نے غلط کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تفتیش سختی سے ہو اور ایسے کہ بعد میں ہم انکار کردیں۔ ہمیں افسروں کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوجاتی تو وہ کہتے کہ ہم انہیں بڑی عزت سے لے گئے تھے اور بڑے آرام سے رکھا تھا۔ بڑی خاطر تواضع کے ساتھ۔ بعد میں ڈی آئی جی صاحب کو اِدھر اُدھر سے فون آئے تو وہ پریشان ہوکے وہاں پہنچے اور مجھے انہوں نے ایک فضول کام سے بھیج دیا۔ باقی سب سے کہا کہ بھاگ جاؤ۔ غائب ہوجاؤ۔ شاید انہی میں سے کوئی عباسی بن کے آپ کے گھر آگیا اور ایک لاکھ وصول کرلیے' آپ کو وہاں لے جانے کے۔ ڈی آئی جی صاحب نے ایس پی غلام محمد کی ٹرانسفر کردی ایسے ہی ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے۔"

"لیکن تمہیں کیوں معطل کردیا گیا آخر؟ تم نے کیا کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا؟"

"میں نے ان چوکیداروں کے بیان حاصل کرنے کے بعد ان کے گھر والوں کو بلوالیا تھا اور بیانات ان کے سامنے رکھ دیے تھے۔ یہی غلطی ہوئی مجھ سے۔ اگر میں انہیں تھانے سے لات مار کے نکال دیتا اور کہتا اب جاؤ گھر تو ٹھیک رہتا۔ تھانے میں الٹا میری شامت آگئی۔ میرے خلاف چارج بنادیا گیا کہ میں نے کسی قانونی اختیار کے بغیر ان کے ملازمین کو اغوا کیا۔ تھانے میں ان پر تشدد کیا اور ان سے جبراً بیان حاصل کیا۔ مالکوں کے آتے ہی ملازمین بھی شیر ہوگئے اور انہوں نے کہا کہ تھانے دار عباسی نے جو ہم سے کہا وہی ہم نے لکھا۔ انہوں نے مجھ پر تشدد کا الزام عائد کیا اور کہا کہ انکار کی صورت میں ہمیں دھمکی دی گئی تھی کہ ہماری فیملی کو بھی اٹھالیا جائے گا۔ خالد عثمان اور خادم مرزا پیسے والے کاروباری لوگ ہیں اور ان کا خاصا اثر رسوخ ہے۔ مجھے خود ڈی آئی جی صاحب نے طلب کرلیا اور وضاحت مانگی۔ میں نے کہا کہ بابر علی نے ایک رپورٹ لکھوائی تھی جس کی بنیاد پر شاہ عالم کے خلاف دہرے قتل کی ایف آئی آر درج کی گئی تھی اور انہیں گرفتار بھی کیا گیا تھا مگر معمولی تفتیش کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب نے بابر علی کی رپورٹ میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں صرف یہ تھا کہ خالد عثمان اور خادم مرزا لاپتا ہیں اور اندیشہ یہ ہے کہ انہیں اغوا یا قتل نہ کردیا گیا ہو۔ انہیں آخری بار شاہ عالم کے ساتھ دیکھا گیا تھا اور کسی کاروباری معاملے میں ان کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے کہا کہ اس رپورٹ کی بنیاد پر ایف آئی آر کو کیوں درج نہیں ہوئی۔ شاہ عالم صاحب کا بیان لے لیا گیا اور وہ کافی تھا۔ میں نے کہا کہ شاہ عالم صاحب کے خیال میں دونوں گھر کے اندر ہی موجود تھے اور یہ رپورٹ لکھوانے کا مقصد ان کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب بہت خفا ہوئے کہ تم نے صرف شاہ عالم کے کہنے پر اتنی غیر قانونی حرکت کی۔ بس اس کے بعد مجھے وہیں کھڑے کھڑے معطل کردیا گیا اور سنا ہے میری برطرفی کی سفارش کی گئی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "یہ بات تو ایک بہانہ بن گئی۔ پولیس میں قاعدے اور قانون کی عمل داری ہوتی تو یہ محکمہ اتنا بدنام کیوں ہوتا۔ اب تو لوگ سنجیدگی سے کہتے ہیں کہ اس محکمے کو ختم کردیا جائے تو آدھے جرائم خود ہی ختم ہوجائیں گے۔ میرے جیسے لوگ جذباتی ہوکے اس محکمے میں آجاتے ہیں۔ اس خیال سے نہیں کہ وہ ساری خرابیوں کو دور کرسکتے ہیں' یہ سوچ کر کہ بڑے پانی جاتے رہیں اور ان کی جگہ نوجوان آئیں جو واقعی قانون کی حفاظت کا جذبہ رکھتے ہوں تو آہستہ آہستہ تبدیلی آئے گی۔ خرابی انتہا کو پہنچ جائے تو تبدیلی ناگزیر ہوجاتی ہے۔ کوئی نہ لانا چاہے تب بھی آتی ہے۔"

"مگر تم تو چھوڑ رہے ہو یہ محکمہ؟"

وہ ہنسا "میں نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے نکالا جارہا ہے۔ میں نے تو ہر قسم کے حالات سے اور افسر سے سمجھوتا کرنے کی ایک ایسی پالیسی بنالی تھی جس میں میری پوزیشن محفوظ رہتی تھی۔ ایس پی غلام محمد سے میرا براہ راست واسطہ تھا جب وہ ڈی ایس پی تھا تو میں نے پولیس فورس جوائن کی تھی۔ اب اس کی آنکھ میں کھٹکنے والا سب سے بڑا کانٹا میں بن گیا تھا۔ اوپر والے افسران اعلیٰ تو بادشاہ ہوتے ہیں۔ حکم دیتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ قانونی ہے یا غیر قانونی اور انہیں اس کا اختیار ہے یا نہیں۔ وہ جیسے چاہیں کسی ماتحت کو استعمال کریں۔ ماتحت مانے تو برا بنتا ہے نہ مانے تو یہ حکم عدولی ہے۔ پبلک سے گالیاں کھاتے ہیں اور مار کھاتے ہیں۔ نیچے والے اور کوئی غلط کام ہوجائے تو الزام بھی انہی پر آتا ہے۔ کبھی آپ نے کسی ایس پی کو معطل ہوتے دیکھا یا برطرف ہوتے زیادہ سے زیادہ انہیں ٹرانسفر کردیا جاتا ہے۔ ٹرانسفر کرتے وقت بھی پوچھ لیتے ہیں کہ بھئی کہاں جانا پسند کرو گے۔ اب رسمی کارروائی تو کرنی ضروری ہے' پریس اور پبلک کو دکھانے کے لیے۔"

میں نے کہا "تم نے کچھ سوچا ہے مستقبل کے بارے میں؟"

"ہاں۔ میرے ایک ماموں ہیں' ہیں کیا تھے۔ ان کی بڑی مشہور لیگل فرم ہے جس کو اب ان کا بیٹا اور میرا کزن چلا رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وکالت پڑھ لو اور آجاؤ ہمارے ساتھ مگر اس وقت مجھ میں کچھ ایڈونچر کا جذبہ زیادہ تھا۔ میرے والد ایک سماجی کارکن تھے۔ اصلاح معاشرہ کے چکر میں مارے گئے۔ سارے زمانے سے دشمنی مول لی۔ معاشرہ خاک ٹھیک ہوتا' جرائم پیشہ افراد نے جینا اجیرن کردیا۔ وہ کیس کرتے رہے۔ وفد بنا کے حکمرانوں کے پاس جاتے رہے۔ پریس کانفرنس سے بھوک ہڑتال تک سب کرتے رہے۔ ان کا ساتھ دینے والوں نے فائدہ اٹھایا۔ وہ پروفیشنل ہوگئے۔ کسی کے حق کے لیے آواز اٹھاتے تھے ظلم کے خلاف تحریک چلاتے تھے اور پھر مک مکا کرلیتے تھے

ظلم کرنے والے سے۔ انہیں پلاٹ مل گئے ٹھیکے مل گئے اور کمیشن۔ ہمارے ابا جی کے پاس جو تھا وہ بھی خدمتِ خلق کی نذر ہوگیا۔ ایک مکان تھا وہ بھی بیچنا پڑا۔ پھر کرائے کے گھر آئے دن بدلتے رہے۔ ہر جگہ سماج دشمن عناصر کے خلاف سرگرم ہوجاتے تھے۔ جوئے اور سٹے کے اڈے کیوں چل رہے ہیں فلاں جگہ۔ فلاں منشیات کا دھندا کرتا ہے۔ تھانے والے ان کی پشت پناہی کیوں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ جرائم پیشہ لوگ تھے۔ خبطی اور بے ضرر سمجھ کے زیادہ نہیں کرتے تھے۔ مار پیٹ کے چھوڑ دیتے تھے۔ اس میں بھی کئی بار اسپتال گئے۔ بالآخر ایک دن مارے گئے۔ ایسا کہنا تو غلط ہوگا کہ اچھا ہوا بچے بڑے ہوگئے تھے۔ دو بہنوں کی شادی ہوگئی تھی۔ ایک بھائی اختلافِ رائے کے باعث گھر سے چلا گیا تھا۔ صرف میں تھا جو کالج میں پڑھ رہا تھا اور ان کا پُرجوش حامی تھا۔ اماں تو ظاہر ہے کہ کبھی خوش نہیں تھیں۔ ہمیشہ ڈرتی رہیں اور ساری زندگی پریشان رہیں۔ مگر ابا کے مرنے کے بعد مجھ میں ایک انتقامی سا جذبہ پیدا ہوگیا تھا کہ ان مجرموں سے نمٹنا ہے جو قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر طاقتور بن گئے ہیں لیکن وہ سب نوجوانی کے جذبات اور میری خام خیالی تھی۔ پولیس کی نوکری میں رہ کے سب پتا چل گیا۔"

"سوال پھر وہی ہے میرا کہ اب کیا کرو گے؟"

اس نے کہا "اچھی بات یہ ہوئی کہ اس ملازمت کے دوران میں نے قانون پڑھ لیا۔ اس خیال سے کہ کام ہی قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا ہے تو قانون کا پتا ہونا چاہیے۔ تھانے کچہری میں رہ کے عدالتی نظام سے بھی واقفیت ہوگئی۔ مجھے کہا گیا کہ پی ایس آئی بن جاؤں۔ پراسیکیوشن سب انسپکٹر۔ سرکاری وکیل' میں نے انکار کردیا لیکن اب مجھے موقع ملا تب بھی نوکری نہیں کروں گا۔ اپنے کزن کی لا فرم میں کام کروں گا۔ پولیس کا تجربہ وہاں کام آئے گا۔ دراصل وہ میرا کزن ہی نہیں' فیصل میرا دوست بھی ہے اور بچپن سے ہم بے تکلف ہیں۔ اس کی نوکری کا خیال مجھے ٹھیک نہیں لگتا تھا مگر پولیس کی غلامی دیکھی تو اب اس کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ یار' تو کسی اور کی سن سکتا ہے اور برداشت کرسکتا ہے تو میری بھی سن لے اگر کبھی میں کچھ بولوں۔ ویسے تو میں بھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ تجھے ناجائز رعایت بھی نہیں دوں گا۔ یہ نوکری نہیں کھلا چیلنج ہے۔ صلاحیت ہے اور محنت کرسکتے ہو تو ترقی ضرور کرو گے۔ نام اور پیسہ دونوں کماؤ گے۔ آج میری اس سے بات ہوئی تو اس نے مجھے بہت گالیاں دیں کہ سو پیاز کھا کے سو جوتے کھانے آیا ہے۔ ضائع کردے عمر کے پانچ سال۔ پانچ سال میں پتا نہیں تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔"

"میں جانتا تو نہیں تمہارے کزن کو لیکن اس کی بات سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں" میں نے کہا "پولیس کی نوکری تم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دو کیسٹ نکالے "یہ ایک چیز میرے پاس اتفاق سے رہ گئی تھی جو میرے کام کی نہیں۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"میں نے جو اعترافِ جرم کی تحریر حاصل کی تھی' وہ تو پہنچ گئی ڈی آئی جی صاحب کے پاس اور وہی میری برطرفی کا پروانہ بنے گی۔ ان کا بیان میں نے الگ الگ بٹھا کے ریکارڈ بھی کیا تھا۔ اس کا انہیں علم نہیں تھا۔ فرق ہوتا تو میں پوچھتا ..... کہ پہلے کیا کہا تھا اور لکھ کر کیا دیا ہے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب یہ آپ کے کسی کام آسکتے ہیں تو رکھ لیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو عباسی۔ یہ ضرورت پڑنے پر میرے دفاع کی سب سے مؤثر دلیل بھی ہوسکتی ہے۔"

اس نے کہا "ان کا کچھ پتا چلا۔ مقتول ہوجانے والوں کا؟"

"پتا چل جائے گا" میں نے کہا "تم سے ایک درخواست ہے۔ اگر تمہیں کچھ پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا۔"

رخشی ہماری گفتگو کے دوران میں ہی اٹھ کے اندر چلی گئی تھی۔ عباسی جانے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ چائے کے ساتھ آگئی۔ وہ پھر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنے قانونی مشیر بیرسٹر سلطان محمود کے بارے میں بتایا۔

"یہ تو معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہوگا تو کچھ بھی نہیں لیکن آپ کے بھی تو کچھ ایسے دوست ہیں۔ رئیس خان اور ان کے ساتھی" وہ بولا۔

"وہ میرے ذاتی دوست ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ تم یہ بات اپنے تک محدود رکھو۔ کسی دن میں تمہیں اس سے ملواؤں گا پھر تمہاری سمجھ میں آئے گا ہماری دوستی کا مطلب" میں نے کہا "ابھی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا ہوں۔ میں سلطان محمود کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ واقعی ادائے فرض کی راہ میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ دھمکیوں کی پروا نہیں کریں گے اور میں جانتا ہوں کہ یہاں آئین میں زندگی کی ضمانت ضرور دی گئی ہے مگر قانون کسی کی زندگی بچا نہیں سکتا۔ لاقانونیت کی طاقت رکھنے والے تعداد میں زیادہ نہیں مگر ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور فرشتۂ اجل کی طرح وہ کسی کی گرفت میں نہیں آتے۔ خواہ وہ کسی طرح بھی جان لیں۔"

"ایسے کام بہت ہیں جن میں جان ہتھیلی پر اور کفن سر پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باندھ کے جینا پڑتا ہے" وہ بولا۔

"ہاں۔ لیکن بعض اوقات ایک جان کا نقصان ناقابل تلافی ہوتا ہے۔ یہ بات شاید عجیب لگے تمہیں کیونکہ ہر زندگی کے بارے میں ایسا ہی کہا جاسکتا ہے مگر میں دوسروں کے نقطۂ نظر سے کہہ رہا تھا۔ آپ کے بچے اور بھی ہوسکتے ہیں۔ کسی کے چار چھ یا دو بیٹے بھی ہوں تو وہ صبر کرسکتا ہے کہ ایک ابھی ہے۔ لیکن باپ تو سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ بیرسٹر سلطان محمود کی بیوی چاہتی ہے کہ میں ان کے بچوں کی خاطر کسی اور کو وکیل کرلوں۔ بیرسٹر صاحب خود تو مانیں گے نہیں۔ میں نے وکالت نامہ منسوخ کیا تو بے عزتی محسوس کریں گے' ناراض ہوں گے مگر بچ جائیں گے۔ بعد میں سمجھ بھی جائیں گے۔"

عباسی نے سر ہلایا "اگر اتنا احساس ہے آپ کو تو۔۔۔ آپ کا مسئلہ اور فیصلہ ہے۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں مجھے کسی دوسرے قانونی مشیر کی ضرورت پڑے گی۔ کیا تمہارے کزن میں اتنی ہمت ہے۔"

"ہمت تو بہت ہے بلکہ ذاتی رائے تو یہ ہے میری کہ ہمت ہی ہمت ہے۔ ذہانت کے کوٹے میں بھی ہمت ملی ہوگی اسے۔ پھر بھی اتنی بڑی اور مشہور لیگل فرم کو چلا رہا ہے۔ آپ مل کر دیکھ لیں۔" وہ بولا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے بیرسٹر سلطان محمود سے بات کی' انہوں نے کہا "وکالت نامہ منسوخ کررہے ہو' کیوں؟"

"بس میری مرضی" میں نے کہا۔

انہوں نے کہا "اس وقت بہت پی رکھی ہے تم نے۔ پھر بات کرنا" اور فون بند کردیا۔

میں نے پھر نمبر ملایا "میں سو فیصد ہوش میں ہوں اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے پینا پلانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

وہ سنبھل گئے "پھر اس فضول بات کا کیا مطلب ہے؟"

میں نے کہا "فضول آپ کے لیے ہوگی۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے۔ آپ کے اور میرے ذاتی مراسم اپنی جگہ۔ جتنی عزت میں آپ کی پہلے کرتا تھا۔"

"بھاڑ میں گئی تمہاری عزت" انہوں نے غصے سے کہا۔ "میں کیا محتاج ہوں تمہاری عزت کا اور یہ جو عزت افزائی کررہے ہو تم میری۔"

وہ باقاعدہ ناراض ہوگئے مگر میں نے بہت۔۔۔ سکون محسوس کیا اور رخشی سے کہا کہ وہ اسی وقت فون کرکے سلطان محمود صاحب کے گھر ان کی بیوی کو بتادے۔ رخشی اب بہت مصروف ہوگئی تھی۔ گھر کے سارے فون مسلسل بج رہے تھے اور اسے سب کو سننا پڑ رہا تھا۔ پہلے یہ کام ایک آپریٹر کرتا تھا یا کرتی تھی۔ اسے بتادیا جاتا تھا کہ اخبار والوں اور سیاسی کارکنوں کے سوالوں کا جواب کیا دینا ہے۔ وہ خود شاہ عالم ہاؤس میں رہ کے سمجھ لیتے تھے کہ کون کتنا اہم ہے اور کس سے کس لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ اہم کالیں آگے کسی فون میں ٹرانسفر ہوجاتی تھیں مگر شاہ عالم یا رخشی سے پوچھنے کے بعد ورنہ معذرت کے پرانے طریقے۔ وہ ٹائلٹ میں ہیں' بیڈ روم میں ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں' کسی مہمان کے ساتھ میٹنگ میں ہیں۔ آپ اپنا نام اور نمبر بتادیں۔ وہ آپ کو رنگ بیک کریں گے لیکن آج کل PABX کام نہیں کررہا تھا اور اس کے دوبارہ مرمت اور نصب ہونے تک اور کسی آپریٹر سیکریٹری اور پی آر او کے آنے تک ساری کالیں ڈائریکٹ تھیں۔ رخشی نے بڑی عمدگی سے سب کو ڈیل کیا۔ زیادہ تر کالیں خیریت معلوم کرنے والوں کی تھیں یا پریس کانفرنس کے متعلق۔

"اف" اس نے بالآخر تھک کے سارے ریسیور نیچے رکھ دیے "یہ کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن کیا تو پہلی بار میں ہی ثابت کردیا کہ صلاحیت اور کارکردگی میں تم سے بہتر کوئی سیکریٹری نہیں ہوسکتی۔"

اس نے ہاتھ جوڑے "مجھے معاف رکھو۔ ایک دن میں دماغ خراب ہوگیا ہے میرا۔ روز کون بک بک کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "پہلے سیکریٹری کون تھا۔۔۔ یا تھی۔۔۔ اور آپریٹر؟"

"ایک ہی خاتون تھیں۔ آپریٹر بھی اور سیکریٹری بھی۔" وہ بولی "جتنی کالیں شاہ عالم یا میرے لیے آتی تھیں' اس سے زیادہ ان کی ہوتی تھیں۔ ان کے پرستاروں کی۔"

میں نے کہا "کیا وہ بہت حسین تھی؟"

"میں کہوں گی کہ نہیں تو تم کہو گے کہ میں جلتی ہوں۔ اور ویسے بھی حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ تم خود تصویر دیکھ کے بتانا۔"

میں نے مایوسی سے کہا "تصویر دیکھ کے؟"

وہ ہنسی "بقلم خود دیکھنا چاہتے ہو تو نیک کام میں دیر کیسی۔ تم بلا کے دیکھو وہ کیسے دوڑی ہوئی سر کے بل آتی ہیں۔ نام تھا مہ پارہ اور تھی بھی پارے کی طرح مضطرب اور بے چین۔ زبان تو رکنا جانتی ہی نہیں تھی اسی لیے یہ کام اس کی پسند کا تھا۔ کوئی ایک بات پوچھے تو اس کا جواب ایسا ہوتا تھا کہ بات کرنے والا دو اور باتیں کرتا تھا۔ ہنستی بہت تھی۔ اس سے بڑی غلط فہمی پھیلتی تھی اور شاہ عالم تو اسے پھلجڑی

کہتا تھا۔"

"اتنے پھول جھڑتے تھے منہ سے۔۔۔ منہ کیسا تھا؟"

"منہ اچھا ہوتا تو وہ یہاں آپریٹر ہوتی' کسی بہت اونچی جگہ سیکڑوں' ہزاروں دلوں کے سنگھاسن پر مہارانی بنی بیٹھی ہوتی۔ شاہ عالم نے بھی اس لیے رخصت کردیا تھا۔ ویسے تھی بہت EFFICIENT۔ اَن تھک کام کرنے والی اور بھروسے کے قابل۔"

"تمہاری اس رائے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اسے بھی واپس بلالینا بہتر ہوگا" میں نے کہا۔

"تمہارا یہ دوست۔۔۔ فرید عباسی" وہ بولی۔

"کیا ہوا اسے؟"

"بہت اچھا آدمی لگتا ہے مجھے۔ اس نے پولیس کی نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ یہی ٹریجڈی ہے۔ وہ اتنا سچا اور کھرا ہے کہ اس محکمے میں فٹ نہیں ہوا۔ سخت باغیانہ خیالات رکھتا ہے کیونکہ بہت ذہین بھی ہے۔ اور پڑھا لکھا بھی۔"

"پھر اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟"

میں نے کہا "یقینی ملازم رکھ لوں اسے؟"

"ایک پی آر او چاہیے تمہیں" وہ بولی۔

"تم سفارش کررہی ہو تو میں انکار نہیں کرسکتا لیکن وہ مانے گا نہیں۔ مجھے معلوم ہے" میں نے کہا۔

"اس کے حالات سن کے افسوس ہوا۔"

"ابھی سب کہاں سنا ہے تم نے۔ آنسو نکل آئیں گے اگر اس کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا قصہ سنو گی' ابھی وقت نہیں ہے۔"

"وہ۔۔۔ شادی شدہ ہے؟"

"تمہارے لہجے میں مجھے کچھ مایوسی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اب پھر بے مہار اونٹ کی طرح پھر رہا ہے۔ اسے دلجوئی کی سخت ضرورت ہے" میں نے کہا۔

"دل جوئی کی ضرورت کسے نہیں ہے۔" اس نے کہا اور پھر اپنی بات پر خود ہی جھینپ گئی "جینے کے لیے بہانہ چاہیے۔"

میں نے کہا "تمہیں دیکھ کے رفتہ رفتہ میرے احساس جرم میں کمی آگئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ سب اتنا برا بھی نہیں ہوا۔ شاید اچھا ہی ہوا۔ تم آج پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آتی ہو۔ تمہارا دل لگ گیا ہے زندگی میں۔"

"میں کوشش کررہی ہوں دل لگانے کی۔ پہلے کوشش بھی نہیں کرتی تھی۔ بس یہی فرق پڑا ہے" وہ بولی۔

"تم تیار ہوجاؤ" میں نے گھڑی دیکھی۔

"کیا مطلب؟ میں بھی جاؤں گی تمہارے ساتھ پریس کانفرنس میں؟"

"تمہیں جانا چاہیے۔ میں اکیلا محسوس نہیں کروں گا۔"

"میں پہلے کبھی نہیں گئی۔ مجھے کوئی تجربہ نہیں" وہ کچھ گھبرائی۔

"آج ہوجائے گا۔ اور دیکھنے والے شاہ عالم کے مزاج کی اس تبدیلی کو خوشگوار قرار دیں گے۔"

اس نے اداسی سے کہا "جو کچھ ہم نے سوچا تھا اور طے کیا تھا' یہ اس کے برعکس نظر آئے گا" وہ نظر جھکا کے بولی۔ "شاہ عالم نے مجھے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی' تم بھی مت دو۔"

"شاہ عالم بدل گیا ہے۔"

"میرے لیے نہیں" وہ بولی "اگر بالآخر ہمیں الگ ہونا ہے تو اس کے اسباب نظر آنے چاہئیں۔"

"کیا اس کا فوری سبب کوئی نہیں ہوسکتا؟" میں نے کہا۔

"کم آن' ابھی وہ وقت دور ہے۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر آہستہ سے سر ہلا کے ڈریسنگ روم میں غائب ہوگئی۔ وہ اپنے لباس اور انداز آرائش کے معاملے میں کسی حد تک عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتی تھی تو یہ اس کے جذبات کی بے حسی کے سبب تھا۔ جب دیکھنے اور سراہنے والا کوئی نہ ہو تو عورت احساس حسن سے بھی بے گانہ ہوجاتی ہے لیکن اس کے باوجود رخشی میں خداداد حسن و شباب کی رعنائی کے ساتھ خوش لباسی کا ایک قدرتی انداز تھا۔ وہ کچھ بھی پہنتی تھی' سلیقے سے پہنتی تھی۔ وقت اور موڈ کی آج کل اسے پروا نہیں تھی مگر رنگوں کے انتخاب میں اس کا فطری ذوق جمال کارفرما رہتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر لباس میں اچھی لگتی تھی یا ایسے بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر لباس اس پر اچھا لگتا تھا۔

اس کے ساتھ اپنے جذباتی رویے کی راہ میں جانتے بوجھتے میں نے احتیاط پسندی کی ایک دیوار کھڑی کرلی تھی۔ میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ اس کے دل میں پھر جینے کی امنگ پیدا ہو۔ اسے یہ احساس ہو کہ ایک پوری عمر رائگاں نہیں گئی۔ جو گزارنی عمر قید جیسی مجبوری ہوگئی تھی' وہ عمر کا اتنا مختصر وقت تھی کہ اسے اپنے اختیار کے ساتھ جینے کی خوشی کی زکوٰۃ سمجھا جاسکتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس میں چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا بھرپور توانائی کے ساتھ ابھرے اور اس کی قوتِ تسخیر کا سارا غرور لوٹ آئے۔ جو ہر خوب صورت عورت کا حق ہے۔

لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اسے میں چاہوں یا وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے چاہے جانے کی تمنا کرے اور اپنی قوتِ تسخیر مجھ پر ضائع کرے۔ پہلی بات تو یہ کہ چندا کا خیال ہنوز میرے خوابوں اور خیالوں کے افق پر شفق کی روشنی بن کے پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ یہ طلوعِ آفتاب کا منظر ہے یا غروب کا۔ میں اسے بھولنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے حالات کا دھارا مخالف سمت میں بہا لیے جا رہا تھا اور میں چاہتا بھی تو اپنی زندگی کے کسی خوب صورت وقت کی طرف لوٹ کے نہیں جا سکتا تھا۔ گزر جانے والا وقت خوب صورت ہی ہوتا ہے مگر اس کا احساس بعد میں ہوتا ہے۔

دوسری زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں کسی طرح بھی چندا کی جگہ رخشی کو بہرحال نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے اپنے ضمیر کی ملامت بھری آواز کو دبانا پڑتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آواز دبانا بھی مشکل ہے تو اسے خاموش کرنا کس حد تک ناممکن ہوگا۔ وہ خلوت و جلوت میں موقع محل دیکھے بغیر چلانے لگے گا کہ تم نے شاہ عالم کی زندگی پر ہی نہیں، اس کی بیوی پر بھی قبضہ کر لیا اور اس کی دولت جائداد خود بخود تمہاری ہو گئی۔ یہ احساس ایک گالی بن جاتا جو میرے سوا کوئی نہ سنتا مگر ایسے میں جی نہیں سکتا تھا۔ میں اپنے احساسِ جرم و ندامت کو کم اور ختم کرنا چاہتا تھا۔ اسے بڑھانا اور قبول کر لینا میرے لیے خود کشی کے مترادف تھا۔

چنانچہ میں چاہتا تھا کہ بالآخر رخشی بھی خود کو آزاد محسوس کرے۔ گناہ کی خلش سے اور جرم کے آزار سے اور ندامت کے بار سے۔ اور وہ سزا کے جنبے اور ویسا ہی محسوس کرے جیسا کسی ناکردہ جرم کی سزا میں عمر قید کاٹنے والا اچانک رہائی پانے کے محسوس کرتا ہے۔ جب کسی اپیل کا خیال بھی مایوسی کو ختم نہیں کرتا اور کسی معجزے کی امید بھی ساتھ چھوڑ جاتی۔ اور معجزہ ہوتا ہے۔ رخشی پھر شباب کے سفر کا آغاز دل میں سنسنی پیدا کرنے والے اولین جذبات کی یلغار سے کرے کیونکہ ابھی اس کے پاس سب کچھ تھا۔ اس نے جو گنوایا وہ اتنا تھا جیسے سمندر کا وہ پانی جو ایک برسات میں بادل بن کے اڑ جائے۔

وہ کون ہوگا جو اسے ہاتھ تھامے اپنے ساتھ ارمانوں اور آسودہ تمناؤں کے شوخ رنگوں سے سجی قوسِ قزح کی دنیا میں اڑا لے جائے گا۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت تھا۔ وہ کوئی بچھڑ جانے والی یاد کا عکس بھی ہو سکتا تھا۔ وہ امیدوں کے افق سے طلوع ہونے والا نیلے گھوڑے پر سوار خوابوں کا شہزادہ بھی ہو سکتا تھا جس کا انتظار سب لڑکیاں کرتے ہوئے روتی دھوتی بیاہ گھر سدھار جاتی ہیں۔ خواب راستہ نہیں بھولتے مگر کیا وہ لوٹ کر آتے ہیں؟

رخشی جب تیار ہو کے آئی تو میرے خیالوں میں بجلی سی چمکی جس نے مجھے خیرہ نگاہ کر دیا۔ صرف چند لمحے تھے جب میں نے صرف اسے دیکھا مگر ہر عورت انہی چند لمحوں میں جان لیتی ہے کہ وہ آئی۔ اس نے دیکھا اور اس نے فتح کر لیا۔ جب وہ مسکرائی تو مجھے اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ پھر مجھے سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگی۔

میں نے ناگواری کے جذبات مسلط کر کے کہا "واٹ از دس رخشی۔ تم ایک سیاسی پریس کانفرنس میں جا رہی ہو یا کسی مقابلۂ حسن میں؟"

اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا "کیوں۔۔۔ ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "لوگ میری نہیں سنیں گے، تمہیں دیکھتے رہیں گے۔"

اس کی مسکراہٹ لوٹ آئی "اور یہ تمہیں پسند نہیں۔۔۔ جیسے شاہ عالم کو رقابت محسوس ہوتی تھی اگر کوئی مجھ پر ستائش کی نگاہ بھی ڈالے۔ ستائش تو دور کی بات ہے، تم بھی اتنے ہی تنگ دل ہو۔"

میں نے کہا "میں تو چاہوں گا کہ کوئی تم پر فریفتہ ہو جائے، دیوانہ وار۔ تاکہ میرے لیے آسانی پیدا ہو، کوئی وجہ بن جائے۔"

وہ خاموشی سے میرے ساتھ نکل آئی "یعنی تم برداشت کر رہے ہو مجھے؟"

"یہ ہم دونوں کی ایک سی مجبوری ہے۔ برداشت کرنا۔ قربت کو بھی اور دوری کو بھی۔ ہم چکی کے دو پاٹ بن کے بھی نہیں مل سکتے اور ندی کے دو پاٹ بن کے بھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ میں تمہارے لیے نہ سہی، ابھی تم میرے لیے ناگزیر ہو۔"

"اور جس دن تم ضرورت محسوس کرنا چھوڑ دو گے، اس دن مجھے اس طرح زندگی سے خارج کر دو گے جیسے وقتی طور پر سہارے کا محتاج ٹھیک ہوتے ہی بیساکھی کو پھینک دیتا ہے؟"

میں نے نرمی سے کہا "ہم اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہیں مگر اپنی نظر سے گرنا نہیں چاہتے؟ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر کیوں نہ ہم اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیں۔ شاید وقت اس کا کوئی بہتر حل پیش کر دے جو آج ہمارے ذہن میں نہیں۔ آؤ چلیں۔"

وہ میرے ساتھ گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ یہ نئی کار تھی۔ اس میں آگے ڈرائیور کے ساتھ ایک گن مین موجود تھا۔ باہر نکلنے کے کچھ دیر بعد میں نے ایک ٹیکسی کو دیکھا جو یکساں رفتار سے پیچھے آ رہی تھی۔

ہوٹل کے کانفرنس ہال کی ویرانی دیکھ کے مجھے تعجب ہوا۔ پریس کانفرنس کا وقت چھ بجے دیا گیا تھا اور اس وقت چھ

بجے تھے مگر وہاں گنے چنے چند چار چھ غیر معروف سے رپورٹر بیٹھے تھے جو ایسی ہر پریس کانفرنس میں بن بلائے پہنچ جاتے تھے لیکن پروگرام دیکھ کر، لنچ کہاں ہے۔ کہاں چائے پر ٹرخایا جائے گا، کہاں ڈنر بھی ہے۔

مجھے اخبار نویسوں کی نظریں بہت عجیب سی لگیں۔ شاید اس لیے کہ آج اس پریس کانفرنس میں میرے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ شاہ عالم جب چیئرمین کی حیثیت سے آتا تھا تو اس کے ساتھ پارٹی کے کارکن اور عہدے دار آتے تھے۔ اس کا ذاتی اسٹاف آتا تھا لیکن میں اکیلا آیا تھا۔ شمس اور قریشی جو میرے ہی نائب تھے، میرے خلاف مکمل بغاوت کر چکے تھے اور کسی حد تک ان کی بغاوت کامیاب ہو چکی تھی۔ سینئر نائب صدر کی پراسرار موت نے میری پوزیشن مزید خراب کر دی تھی۔ رہی سہی کسر شام کے خصوصی ضمیموں نے پوری کر دی تھی۔

مجھے امید تھی کہ اشرف جہاں بھی ہوگا یہاں ضرور پہنچے گا۔ وہ ابھی تک پارٹی کا سیکریٹری جنرل تھا اور اس کے ساتھ ہونے سے مجھے بڑا سہارا ملتا لیکن وہ بھی غائب تھا۔ میرے ساتھ سیکیورٹی اسٹاف ضرور تھا مگر پرسنل اسٹاف نہیں تھا۔ نہ سیکریٹری نہ پی آر او۔ یہ سب میرے ایک کامیاب سیاست داں کے امیج کو خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔ آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہن میں بڑے سیاست دانوں کا تصور یہ ہو گیا ہے کہ اس کی بڑی شان و شوکت ہو۔ بڑی گاڑی ہو، بڑی کوٹھی، دھوم دھام لاؤ لشکر۔ شاہانہ طرزِ زندگی اور خود نمائی کے سارے تکلفات نہ ہوں تو لیڈر کی شان نہیں بنتی۔ وہ کیا لیڈر جو معمولی کپڑے پہنے بس اور رکشا میں سفر کرتا یا پیدل مال پر پھرتا نظر آئے اور لکشمی چوک کے ہوٹلوں میں تکے کباب یا مرغ چھولے کھاتا نظر آتا ہو۔

ساڑھے چھ بجے میں نے ایک رپورٹر ٹائپ شخص سے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے۔ آپ کے اخبار نویس ساتھی وقت کے پابند نہیں رہے۔"

اس نے کسی فلسفی کی طرح سگریٹ کا کش لگایا "وقت بھی کسی کا پابند نہیں رہا۔"

میں نے دوسرے کی طرف دیکھا "لوگ ابھی تک آئے نہیں۔"

وہ بدتمیزی سے ہنسنے لگا "عقلمند لوگ نہیں آئے۔ ہم بے خبر اور بے قدر لوگ بیٹھے ہیں۔"

تیسرے نے سہلایا "ہمیں معلوم ہوتا تو ہم بھی نہ آتے مگر ہمیں یہاں آ کے پتا چلا کہ پریس کانفرنس کا وقت بدل گیا ہے۔"

فلسفی نے چائے کی پیالی میں جھانکا "وقت سب کا بدل جاتا ہے۔"

"لیکن وقت کس نے بدلا ہے؟ پریس کانفرنس چھ بجے تھی۔"

بدتمیز شخص نے سہلایا "کیا بے خبری بے خبری ہے۔"

میں نے رخشی کو ایک طرف لے جا کے پوچھا "کیا وقت دیا تھا تم نے پریس کانفرنس کا؟"

"چھ بجے۔ اخبار والے کیوں نہیں آئے؟"

"وہ کہتے ہیں وقت بدل گیا ہے" میں نے غصے کو دبا کے کہا "میں نیچے لابی میں دیکھ کے آتا ہوں۔"

لابی میں گیٹ کے سامنے ایک ٹانگ والے بورڈ پر پلاسٹک کے سفید حروف چھوٹی چھوٹی کیلوں سے لٹکا کے شاہ عالم، چیئرمین پی جے ایف کی پریس کانفرنس کا اعلان لکھا ہوا تھا۔ تاریخ کے ساتھ ہوٹل کے ہال کی نشاندہی کی گئی تھی۔ پھر میری نظر وقت پر گئی۔ وقت چھ بجے نہیں نو بجے تھا۔ میں سیدھا منیجر کے کمرے میں گھس گیا۔

"واٹ از دس۔ میں نے پریس کانفرنس کا وقت چھ بجے دیا تھا۔"

اس نے مجھے بٹھا کے کسی کو طلب کیا اور فون پر بھی بات کی "نوٹس کس نے لگایا تھا اور کیا وقت لکھا تھا؟ اسے بھیجو یہاں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "آپ کی شکایت بجا ہے، وقت چھ بجے ہی لکھا گیا تھا۔"

"پھر نو بجے کیسے ہو گیا؟" میں نے کہا "کیا کسی نے وقت کی تبدیلی کی اطلاع دی تھی؟"

صحیح صورتِ حال چند منٹ میں واضح ہو گئی۔ کسی نے بڑی صفائی سے ۶ کے ہندسے کو الٹ کر لگا دیا تھا اور وقت ۹ بجے کا ہو گیا تھا۔ شاید کچھ لوگ باہر ہی ایکٹو ہوں گے جو وقت سے پہلے آنے والوں کو یہ اطلاع دیتے رہے اور لوٹاتے رہے۔ باقی اندر آ کے نوٹس پڑھنے کے بعد لوٹ گئے۔ یہ شرارت نہیں سازش تھی۔ ہوٹل کی انتظامیہ صرف معذرت کر سکتی تھی کیونکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اندر سے میں آتش فشاں کی طرح ابلنے لگا تھا۔ رخشی مجھے پی روم میں لے گئی اور آخری گوشے میں بٹھا دیا۔ جو نسبتاً خاموش اور تاریک تھا۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا اور پھر کافی میں بدل دیا۔ میں نے ابوبکر آزاد صاحب کو فون کیا۔ "شبنم کہاں ہے؟"

"بھئی یہ تو عنوان ہے گویا اس اشتہار کا جو کل شائع کرانے کا سوچ رہے ہیں ہم۔ شبنم تم کہاں ہو، گھر آ جاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اور تم بھی بتا دینا اسے۔ تم کو کہیں جو غالب۔۔۔ یعنی شبنم آشفتہ سر ملے۔" آزاد صاحب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے فرمایا "ویسے تم شمی سے پوچھو۔"

"کون شمی؟"

"بھئی وہ جس نے اس مولانا ٹائپ پیی کی خودکشی کرادی گویا۔۔۔ مرنا تو طے تھا اس کا۔ سب ایڈز نے۔۔۔ شمی کے عین وقت پر زوجیت کے دام عقد سے ایسے نکل گئی گویا۔۔۔"

میں نے کہا "نمبر بتایئے اس کا۔ وہ کہاں ملے گی؟"

"ملے گی تو وہیں جہاں سب ملیں گے گویا۔ اپنے وزیراعظم۔۔۔ نہیں صحیح، عبوری وزیراعظم کی پریس کانفرنس ہے آٹھ بجے۔۔۔ بڑے مداری کا کھیل زیادہ رش لیتا ہے" آزاد صاحب نے کہا۔

میں نے موبائل فون بند کردیا اور ایک گہری سانس لے کر کافی پینے لگا۔ رخشی نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر بولی "کیا ہوگیا۔ بتاتے کیوں نہیں؟"

"بس ہوگیا جو ہوسکتا تھا" میں نے کہا "اور اب کچھ نہیں ہوسکتا اس لیے آرام سے کافی پیو۔"

"مجھے نہیں بتانا چاہتے۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"کسی نے یہاں وقت کو الٹ دیا۔ اس سے ساری بازی الٹ گئی۔ آٹھ بجے عبوری وزیراعظم صاحب نے ایک پریس کانفرنس بلالی۔ مجھے پتا چل جاتا تو میں چھ بجے شروع کرتا اور ایک گھنٹے میں سب سمیٹ لیتا تھا کہ سب رپورٹر وہاں وقت پر پہنچ جائیں۔ ظاہر ہے ان کے لیے وہ زیادہ اہم EVENT تھا۔ مگر مجھ سے پہلے کسی نے موقع سے فائدہ اٹھالیا اور سارا کھیل چوپٹ کردیا۔ لوگ یہاں سے واپس گئے۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ عین وقت پر کوئی پریس کانفرنس ملتوی یا منسوخ ہوجائے۔ ان کے لیے دوسری زیادہ اہم مصروفیت سامنے تھی۔ وہاں سب جلدی پہنچنا چاہتے ہیں۔ اب پریس کانفرنس آٹھ بجے شروع ہویا نو بجے۔ سرکاری مہمان سات بجے سے آف دی ریکارڈ گفتگو شروع کردیں گے اور ظاہر ہے خاطرداری سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔ اس کے بعد دس گیارہ بجے ڈنر مل جائے گا۔ رات کو وہ رپورٹ فائل کرکے جائیں گے اپنے اپنے اخبار کے دفتر۔"

رخشی کا چہرا اتر گیا "یہ سب کیوں ہورہا ہے آخر؟"

"مجھے احساس دلانے کے لیے کہ شاہ عالم سیاست سے دور ہی رہے تو اچھا ہے ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ اس سے بہت زیادہ ہوگا۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہونا چاہیے۔ مجھے ملکی سیاست سے آؤٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ اوپر نیچے دائیں بائیں کے سب لوگوں کے اتفاقِ رائے سے۔"

"لیکن اس کی وجہ؟" رخشی نے کہا۔

"وجہ!" میں نے کافی کا مگ خالی کرکے دھڑ سے میز پر رکھا "وجہ شاہ عالم ضرور جانتا ہوگا لیکن میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"خدا کے لیے آہستہ بولو۔"

"وجہ اور بھی کچھ لوگ جانتے ہوں گے۔ بہت سے لوگ بہت سی وجوہ جانتے ہوں گے۔ وجوہات جانتے ہوں گے۔" میں نے کہا "معلوم نہیں اس سے کیا غلطی ہوئی یا حکم عدولی کہ اوپر والے چاروں ناراض ہوگئے اور اسے دودھ کی مکھی کی طرح سیاست سے باہر نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔"

"چار کون؟"

"ایک اللہ تعالیٰ۔" میں نے اوپر انگلی اٹھائی "اور تین نیچے جو ٹرائیکا کہلاتے ہیں۔ جو سیاست کی بساط پر اپنے اپنے مہرے چلاتے ہیں، ہٹاتے ہیں، مارتے ہیں اور بدلتے ہیں۔ کبھی سیاہ مہرے تو اگلی بازی میں سفید۔ اور وہ وجہ بتاکے قائل بھی کرلیتے ہیں دیکھنے والوں کو کہ اب سیاہ مہرے کیوں ہوگئے اور سفید مہرے ان کو پھر کیوں اچھے لگنے لگے ہیں۔ ایک الیکشن کا ڈراما اس کے لیے ضروری تو نہیں مگر دنیا کو دکھانے کے لیے چلانا پڑتا ہے اور واقعہ ہویا حادثہ۔ اس کی وجوہ بتانے والے اور جتانے والے اپنی جگہ بے حد اہم اور معروف ہیں۔ وہ اتنی وجوہات پیدا کرلیتے ہیں کہ لوگ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ یہ وجہ نہیں، نہیں یہ وجہ ہے۔ ہم خود بڑے معصوم اور شریف ہیں۔ محبِ وطن اور ایماندار۔ لیکن ہمارے دشمن نہ جانے کیوں اتنے زیادہ ہیں اور خبیث ہم سے زیادہ چالاک بھی ہیں۔ را۔۔۔ موساد۔۔۔ اندرونی ہاتھ، بیرونی ہاتھ، سازشی عناصر۔ وطن دشمن، پاکستان کی سالمیت کے دشمن۔ وہ جنہوں نے نظریۂ پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ کافر، منافق، لسانی گروہ۔ صوبائیت کا نعرہ لگانے والے۔ فرقہ پرست، سب کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اصل مجرم ایک طرف اطمینان سے کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ اپنے ہوٹل، ڈرائنگ روم میں، میس میں، برج کی بازی لگاتے امپورٹیڈ سگریٹ اور شراب پیتا رہتا ہے اور خبریں نہیں سنتا۔ "لڑنے دو کتوں کو۔ تم BID دو۔ تمہاری وہ کل والی سویٹ ہارٹ کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے آج کس کے ساتھ ہے؟"

"شیطان کے ساتھ ہو مجھے کیا۔ کل کی بات نہیں کرتا میں۔ آنے والے کل کی سناؤ۔۔۔ سنانا کیا۔۔۔ وہ بھی اپنا ہے۔۔۔ چیئرز۔"

"اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں سمجھتی تم نے پی ہے اور بہت زیادہ پی ہے" رخشی مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ "تم اپنے آپ سے باتیں کررہے تھے۔"

میں نے کہا "فرض کرو۔۔۔ آج خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاشیں مل جائیں۔۔۔ تو مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوگا۔"

"کہاں سے مل جائیں" وہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔

"کہیں سے بھی۔ شاہ عالم ہاؤس کے پائیں باغ سے۔ میں اب ناممکن کچھ نہیں سمجھتا۔ ہر جنگ ایک مقصد کے لیے لڑی جاتی ہے۔ مقصد کے اچھا برا ہونے کا فیصلہ تو کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ لاکھوں لوگ مارے جاتے ہیں اس مقصد کے لیے جو حاصل نہیں ہوتا۔ پھر دو افراد کی کیا حیثیت ہے۔"

یہ بات کرتے ہوئے میں نے اپنے ڈرائیور کو دیکھا جو ہال کے دروازے سے اندر آکے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے تلاش کررہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کے اسے متوجہ کیا تو وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔

پریشانی اس کی صورت سے عیاں تھی۔ وہ بھی ریٹائرڈ فوجی اور تربیت یافتہ گارڈ تھا مگر اسے ڈرائیور کی سفید پتلون، بشرٹ والی یونیفارم دی گئی تھی، اس کے ساتھ رہنے والا گن مین کچھ نیم فوجی وردی پہنتا تھا۔

رخشی نے میری طرف اور اس نے رخشی کی طرف دیکھا "سر۔۔۔ ایک اطلاع ہے آپ کے لیے" اس نے موبائل فون میری طرف بڑھادیا۔

میں نے فون لے لیا۔ دوسری طرف سے بھی گارڈ بول رہا تھا "ہاں بھئی کیا مسئلہ ہے؟"

گارڈ نے کہا "سلام علیکم سر۔ مسئلے کا تو کچھ پتا نہیں جناب۔ مگر ادھر پولیس ہی پولیس ہے۔ ان کو ہم اندر داخل ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔"

"کیا کہتے ہیں وہ؟ ان کے ساتھ کوئی افسر ہے تو بلاؤ۔"

وہ بولا "انہوں نے ہم سب کو ایک کمرے میں بٹھادیا ہے جناب۔ کپتان صاحب ابھی آرہے ہیں۔ وہ خود افسر سے بات کریں گے۔ آپ کا وہ بندہ ہے جی گلاب دین، اس نے پوچھا تھا کہ وارنٹ ہے تو تھانے دار نے اس کے تھپڑ مارا۔"

"کیا وہ گھر کے اندر گھس گئے ہیں؟"

"نہیں جی۔ گھر میں تو نہیں گھسے۔۔۔ لیکن پیچھے کی طرف جو باغ کا حصہ ہے نا۔"

پس منظر میں کسی نے دہاڑ کے کہا "اوئے تم کس کو فون کررہے ہو" پھر بات کرنے والے سے فون لے لیا گیا۔ کسی اور نے پھاڑ کھانے والی آواز میں کہا "ہیلو۔!"

میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور فون بند کردیا۔ گارڈ کو واپس کردیا۔ وہ آسانی سے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے فوراً نکل جانا چاہیے۔ میں نے سوچا۔

O☆O

مجھے فوراً نکل جانا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ لیکن فرار اب ناممکن تھا۔ کمرے سے باہر جانے کے لیے اور اندر آنے کے لیے ایک ہی راستہ تھا اور وہ پس منظر کی روشنی میں دروازے کے فریم میں لگی ہوئی قد آدم تصویر کی طرح نظر آرہی تھیں۔ میں بے اختیار اٹھ بیٹھا اور انہیں بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا۔

"لیٹے رہو" انہوں نے نرمی سے مجھے حکم دیا اور آگے آکے اسی چارپائی کی پٹی پر ٹک گئیں۔ ان کے قرب کی جانی پہچانی حواس پر چھا جانے والی خوشبو میرے اعصاب پر حملہ آور ہوئی۔

میں نے ٹانگیں سمیٹ لیں "بیگم صاحبہ۔۔۔ آپ۔۔۔ یہاں۔"

انہوں نے اس فضول بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور مجھے نظر جما کے دیکھتی رہیں۔ مجھے وہ اپنے اس کمرے کی بے سروسامانی اور بدصورتی میں یوں لگیں جیسے کسی کباڑ خانے میں رکھا ہوا تازہ رنگ بھرے پھولوں کا گلدستہ۔ ان کی آنکھوں میں اداسی تھی، شکایت تھی اور دکھ کا اظہار تھا مگر ان کے ہونٹوں پر ایک پُرمسرت مسکراہٹ کا اجالا بھی صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ کسی تلاش کے ختم ہونے، اپنے اندازوں اور ارادوں کے غلط نہ ہونے اور کوئی متوقع کامیابی اچانک حاصل ہونے سے جو خوشی اندر پھوٹتی ہے، وہ اپنی جھلک باہر بھی دکھاتی ہے۔

"یہ تم نے کیا حال بنالیا ہے اپنا؟" انہوں نے بالآخر کہا۔

میں نے رکھائی سے کہا "کیا ہوا ہے مجھے، ٹھیک تو ہوں۔"

"یہ کسی اور کے سامنے کہنا۔ میرے لیے تم اجنبی نہیں ہو۔ پہلی بار نہیں دیکھ رہی ہوں میں تمہیں۔"

میں نے کہا "میرا۔۔۔ ایکسی ڈنٹ ہوگیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ایسا کیوں کیا تھا تم نے؟" وہ بولیں۔

"کیا۔۔۔ یعنی ایکسی ڈنٹ۔۔۔ اچھا سمجھ گیا۔ آپ کو بھی یہی بتایا گیا ہے کہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا" میں نے کہا۔

"کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے کہا "آپ کو دعویٰ ہے کہ مجھے جانتی ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں ایسا کرسکتا ہوں میں؟"

"اس لڑکی شادو کے لیے تم ہمالیہ پہاڑ پر چڑھ سکتے ہو اور پھر وہاں سے چھلانگ بھی مار سکتے ہو" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس کا نام مت لیں پلیز!" میں اٹھ بیٹھا "میں کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا، آپ جائیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیچھے سے ماسی ہیر نے چلا کے کہا "لے۔۔۔ جھلا نہ ہو تو۔ وہ آئی ہیں تیرا مجاز پوچھنے اور تیرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

بیگم صاحب نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ اس کا دماغ ٹھیک کرنا آتا ہے مجھے۔ پرانا مریض ہے میرا۔"

میں نے اپنی ہار مان لی اور لیٹ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب گئے تھے اسپتال۔" بیگم صاحب نے کہا۔ "وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر ہے صادقہ جعفری۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو بہت سی باتیں بتائیں۔"

"آپ یہاں کیسے پہنچ گئیں؟" میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں اسی راہ پر چلتی ہوئی آگئی۔"

مجھے اس جواب سے پسینہ آگیا۔ غصہ لاحاصل تھا۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ انہیں برداشت کروں۔ یہ بعد میں سوچا جا سکتا تھا کہ لاپتا ہونے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ فوری مسئلہ یہ تھا کہ میں انہیں انکار کیسے کروں گا۔ کچھ دیر میں وہ مجھ سے مطالبہ کرنے والی تھیں کہ چلو سامان اٹھاؤ۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو اور چلو گھر۔

"آپ کو نیلم نے بتایا ہوگا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں بھئی۔ تمہارے کچھ پرستار ہم سے بھی آگے آ کے کھڑے ہو گئے ہیں لائن میں" وہ بولیں "اور نیلم جیسی تو ہمیشہ نمبر وان ہی رہے گی تمہاری نظر میں۔"

میں نے کہا "میں تو نیلم کے نام سے بھی...... واقف نہیں تھا۔ آپ جانتی ہیں مجھے فلموں کا کوئی شوق نہیں۔"

"اب ہو جائے گا۔ ہر فلم کا پریمئر اس کے خاص مہمان کی حیثیت سے اس کے ساتھ بیٹھ کے دیکھو گے۔"

ان کے لہجے میں مذاق سے زیادہ جلن تھی جس کو وہ چھپانے سے قاصر تھیں۔ ان کی بات کو پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود ماسی ہیر مسکرا رہی تھی۔

میں نے کہا "بیگم صاحب۔ وہ ایک اداکارہ ہے۔ اور اتفاق سے نیک دل اور ہمدرد بھی۔ یا پھر قانونی چکروں سے بچنے کے لیے میری مدد کی تھی۔ مجھے معلوم ہے یہاں اس کا سارا اسپتال فین ہے۔"

"مگر سارا اسپتال یہ نہیں جانتا کہ وہ تمہاری فین ہے" آہستہ آہستہ ان کی شوخی کھل کر سامنے آنے لگی تھی "میری طرح۔"

"آپ کی بات اور ہے۔ وہ مجھے بھول گئی ہوگی اب تک۔"

وہ ہنسنے لگیں "میں نے اس سے تمہارے بارے میں صرف اتنا پوچھا تھا کہ تم کہاں رہتے ہو۔ وہ تمہارا پتا سمجھا سکتی تھی لیکن اس نے کہا کہ میں خود آپ کو وہاں پہنچا دوں گی۔ ایسے شاید راستہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے اور آپ اندر گلیوں میں بھٹکتی رہیں۔"

"پھر وہ آئی نہیں۔۔۔ ڈرائیور کو بھیج دیا۔۔۔ اس جن کو۔"

"ہاں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس کی شوٹنگ ایک سیٹ پر لمبی ہو گئی۔ یہ گھر کس کا ہے؟"

"کرائے کا۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"اور یہ ماسی کون پیدا ہو گئی تمہاری؟"

میں نے کہا "ماسی چالیس سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا نام ہیر ہے اور اس کے شوہر کا نام رانجھا۔ وہ بھی بڑا مشہور ڈاکٹر ہے۔"

"شادو کہاں ہے؟" انہوں نے اچانک سوال داغ دیا۔

سوال میرے دل پر گولی کی طرح لگا۔ "شادو گئی جہنم میں۔ آپ سے میں نے ابھی کہا تھا کہ میں اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"ظاہر ہے بات ایسی ہوگی جس سے تمہیں ناقابل برداشت تکلیف ہوئی ہے" انہوں نے بے رحمی سے کہا۔ "لیکن میں خود بھی ڈاکٹرنی تھی اور ایک ڈاکٹر کی بیوی ہوں۔" "یہ کہیں کہ بہت اچھی بیوی ہوں۔"

ان کا چہرہ خفت سے زرد پڑ گیا "مجھے گالی دے کے تمہاری تکلیف کم ہو سکتی ہے تو کھل کے دو۔ مگر اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ تم خود اپنی زبان سے ڈاکٹر صادقہ کو شادو کے بارے میں بتا چکے ہو۔"

"میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا" میں نے برہمی سے کہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ وہ طوائف ہے" بیگم صاحب نے کہا۔

"ہر عورت طوائف ہوتی ہے" میں نے چیخ کے کہا۔ "شاید میری ماں بھی تھی۔"

انہوں نے سکون سے کہا "ویسے تو ہر بیٹے کے لیے ماں صرف ماں ہوتی ہے مگر تمہیں کیا معلوم اس عورت کے کردار کی عظمت کو فرشتے بھی سلام کرتے ہیں جسے تم گالی دے رہے ہو جانے بغیر۔"

میں نے بے بسی سے کہا "مگر شادو کے بارے میں بھی ایسا ہی سوچتا تھا میں۔ جب اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا۔"

"اس راستے پر جسے زندگی کہتے ہیں کہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سب کچھ تمہاری خواہش اور مرضی کے مطابق ہوتا رہے تو تم دعا کا مطلب بھی بھول جاؤ گے۔ اور پھر لطف کیا رہے گا خواہش کرنے کا۔ اور کامیابی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی" انہوں نے مجھے پیار سے سمجھانا شروع کیا۔

میں رونے لگا "مجھے تو اپنی قسمت میں صرف ناکامیاں نظر آتی ہیں۔"

انہوں نے نفی میں سرہلایا "اپنی یتیم خانے کی زندگی کا تصور کرو۔ کتنے بچے تھے تمہارے ساتھ؟ ایک ناصر عظیم اور بھی تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ رئیس تھا تمہارے ساتھ۔ اس سے موازنہ کرو اپنی آج کی حالت کا۔ پھر اندازہ ہوگا کہ تم تقدیر سے کیا کچھ لے چکے ہو۔ ابھی تمہاری جتنی زندگی گزری ہے' اس کے تناسب سے تم کو زیادہ ہی ملا ہے۔ عزت بھی 'محبت بھی اور۔۔۔ دولت بھی۔ تم آگے جا رہے ہو۔ زندگی کا ہر تجربہ تمہیں نئی کامیابی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ نیلم کی گاڑی کے نیچے آ کے تم مرجاتے تو دنیا کو کیا فرق پڑتا کہ ایک اور ناصر عظیم مرگیا۔ یا وہ گاڑی نیلم کی نہ ہوتی 'پولیس کی ہوتی۔ وہ تمہیں ڈال دیتے کسی سرکاری اسپتال کی فٹ پاتھ پر۔ نیلم کی طرح تمہاری خبر گیری نہ کرتے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ خبر شائع ہو چکی ہے کئی اخباروں میں۔ جو اتفاق سے میں نے نہیں دیکھی۔ اس نے کہلوایا تھا کہ وہ بعد میں آئے گی تمہیں دیکھنے۔۔۔ یہاں۔۔۔ اس گلی کی اس کوٹھری میں۔ لاکھوں لوگ اس کی ایک نظر اور ایک مسکراہٹ کے لیے ترستے ہیں۔ اس کے باوجود تم خود کو ناکام کہتے ہو۔"

میں خاموش ہو کے ان کی صورت دیکھتا رہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے اچھے لوگ زیادہ ملے۔ مہربان اور محبت کرنے والے۔ آپ کی طرح۔"

ان کے چہرے پر لالی جھلکی "تم جیتنے کا ہنر جانتے ہو۔ یہ تم نے سیکھا بھی ہے مگر قدرت نے تمہاری فطرت اور مزاج میں بھی شامل کر دیا تھا۔ تم اگر ہارو گے تو اپنے غرور سے۔ صرف اس لیے کہ تمہیں خدا یاد رہے۔ یہ غرور نہ ہو کہ تم ناممکن پر قادر ہو۔ کبھی قدرت تمہیں اپنی اوقات... دلاتی رہے گی۔ میں سمجھتی ہوں شادو نے تمہیں یہ جھٹکا اسی لیے دیا۔"

"اگر وہ سمجھتی ہے کہ میں مر جاؤں گا اس کے بغیر تو یہ بھول ہے اس کی" میں نے غصے سے کہا۔

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں سمجھتی۔ شرط لگا لو تم مجھ سے۔ اگر وہ تم کو سمجھتی ہے تو اسے یہ معلوم ہوگا کہ تم اسے بھولنے میں زیادہ دن نہیں لگاؤ گے۔ تم نہ مرو گے نہ اس کی خاطر کسی کو مارو گے۔ تم اپنی زندگی کو اور اپنے مقاصد کو بہت زیادہ اہم سمجھتے ہو۔ اچھا۔۔۔ باقی باتیں بعد میں۔"

میں نے کہا "اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں تو یہ سمجھ لیں کہ میں الٹے پاؤں کہیں نہیں جاتا۔"

ان کا رنگ اڑ گیا "میں تم کو قید نہیں رکھوں گی۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ تو دبئی جانے کا جھوٹا بہانہ کیے بغیر چلے جانا۔ جہاں تمہارا جی چاہے۔ میں صرف تمہارے آرام کے خیال سے ایسا کہہ رہی ہوں۔"

"آرام کے لیے مجھے نیلم بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا گھر آپ کی کوٹھی کے مقابلے میں محل ہوگا۔ زیادہ ٹھاٹ باٹ سے رہتا میں اور غرور سے زمین پر پاؤں نہ رکھتا کہ میں نیلم کا مہمانِ خاص ہوں جس کے دروازے سے بڑے بڑے دھتکار دیے جاتے ہیں" میں نے کہا "لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ پھر وہ مجھے خریدنا چاہتی تھی۔ ایک لاکھ کا چیک میں نے اس کے سامنے پھاڑ دیا۔"

"تم پاگل اور بے وقوف ہو۔ جو تم سے محبت اور شرافت کا سلوک کرے' تمہیں اس کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ ایک تم ہی نادر نمونے ہو بازار میں برائے فروخت۔۔۔ سب خریدنا چاہتے ہیں تمہیں۔ میں بھی ہوں بس ایک خریدار۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

مجھے سخت شرمندگی ہوئی "ایسا نہیں ہے بیگم صاحب۔ آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔"

"یعنی اپنائیت کچھ نہیں ہے یا قیمت ہے یا احسان ہے؟"

"آپ نے میرے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار کیوں جمع کرائے تھے؟"

"اس لیے کہ میں نے سوچا تمہیں مالی پریشانی نہ ہو دبئی میں۔ اور خدانخواستہ تمہارے ساتھ بھی کوئی ریکروٹنگ ایجنٹ دھوکا کرے تو واپس آنے کے بعد تم کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا" انہوں نے برہمی سے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا "ڈاکٹر صاحب نے؟"

"ہاں۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے وہ لے گا نہیں۔ تم دے دو۔ میں نے کہا کہ مجھ سے کب لے گا۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ تمہارے حساب میں رقم جمع کر دیں۔ ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں تھی تم سے کہ ہم تمہیں خریدنے کی کوشش کرتے۔ اتنا عرصہ تم ہمارے گھر میں رہے۔ سب نے گھر کا ایک فرد سمجھا تمہیں اور اتنی ہی عزت بھی دی۔ مگر تمہارا کمپلیکس یہ ہے کہ تم عزت کرنے والوں کو بے عزت کر کے تسکین حاصل کرتے ہو اور بے عزت لوگوں کی عزت کر کے۔ یہ ایک انتقامی ردِعمل ہے۔" انہوں نے مجھے بری طرح لتاڑا۔ "کتا بھی ایک گھر میں رہے تو آسانی سے نہیں نکلتا۔ نکالا جائے تو لوٹ کے آجاتا ہے مگر تم بڑی آسانی سے لوگوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھلا دیتے ہو۔ شادو کو بھی بھول جاؤ گے۔"

ہیر نے چائے کی پیالی ان کے سامنے کی "غصہ چھوڑو بی بی۔ یہ تو جھلا ہے۔ دیوانہ ہے بالکل۔"

"دیوانہ بکار خویش ہشیار۔ زیادہ محبت مت کرنا اس سے ورنہ دکھ اٹھاؤ گی ایک دن۔ یہ کبھی تمہارا نہیں ہوگا کیونکہ اس کا کوئی نہیں تھا" انہوں نے سخت آزردگی سے کہا۔ پھر ایک اخلاقی فریضہ پورا کرنے کے لیے چائے کی پیالی خالی کی جو شاید ٹھنڈی ہو گئی تھی اور بیگ اٹھا کے جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

میں نے کہا "مجھے معاف کردیں اگر میں نے آپ کا دل دکھایا۔"

انہوں نے کہا "ہمارے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے ناصر۔" اور پلٹ کے باہر نکل گئیں۔

ماسی ہیر نے مجھ سے ان کے بارے میں بہت کچھ پوچھا اور پھر مجھے خوب بے نقط سنائیں۔ میں نے اس وقت اپنے دماغ کے پرزے کام کردئے تھے۔ آدھا حصہ ماسی ہیر کو جواب دے کے مطمئن کرنے میں مصروف تھا اور بڑی ہوشیاری سے جھوٹ میں سچ اور سچ میں جھوٹ کا تڑکا لگا رہا تھا۔ دوسرا حصہ خود اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔

یہ میں کس بے کار کے چکر VISCIOUS CIRCLE میں پھنس گیا ہوں جس سے نکل ہی نہیں پاتا۔ گھوم پھر کے ہر راستہ ڈاکٹر مشہود کی طرف جاتا ہے۔ شادو کے ساتھ نکلتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں ایک نئی دنیا میں ہوں مگر رئیس کے گھر میں ہیر رانجھا کے گھر پہنچا اور شادو پہنچی ہاشمی صاحب کے گھر۔ شادو تو نکل گئی اپنی زندگی کے ساتھ مستقبل کی طرف اور مجھے رئیس کے یار جیرے بلیڈ نے پہنچا دیا اسپتال۔ وہاں سے نیلم نے اٹھایا اور دوبارہ بیگم صاحبہ کے سامنے کردیا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

بیگم صاحبہ کے سامنے میرے احساسِ جرم و گناہ کی خلش ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ بے شک قصوروار میں نہیں تھا مگر اس خیال میں بھی میرے لیے طمانیت کا کوئی ساماں نہ تھا۔ میں ڈاکٹر مشہود کے سامنے سر اٹھا کے بات نہیں کرسکتا تھا اور یہ بات میں کسی کو نہیں سمجھا سکتا تھا کہ میں ان سے بیگم صاحبہ سے اور اس گھر سے دور کیوں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کی مجبوری اپنی جگہ۔ میں کسی طرح بھی انہیں کوئی آبرو باختہ عورت نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا خلوص اور محبت ان کی ضرورت کا شاخسانہ تھا جس پر انہیں مطعون کرنا بھی ظلم تھا۔ کم سے کم میں ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن میں ان کو اپنی عزتِ نفس کے زخموں کو کریدنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا تھا۔

ایک بار پھر میں نے سوچا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ مجھے سب سے دور چلا جانا چاہیے۔ گم ہو جانا چاہیے۔ شادو۔۔۔ شاہ جی۔۔۔ ہیر رانجھا اور ڈاکٹر مشہود کی دنیا سے بہت دور کوئی جگہ ہو جہاں کسی کے خیال کی رسائی بھی نہ ہو اور میں اپنے ماضی سے بالکل محفوظ ہو جاؤں۔

اندھیرا ہونے سے پہلے میں نے ماسی ہیر کو کچن سے باتھ روم جاتے دیکھا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ بیگم صاحبہ کے جانے کے بعد اس فیصلے پر پہنچنے میں مجھے تین گھنٹے لگے۔ مجھے نیلم کا بھی انتظار رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ یقیناً اس کی شوٹنگ مزید لمبی ہو گئی تھی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کے صرف تمہاری شکل ملاحظہ کرنے نہیں آسکتی مسٹر زیرو۔ وہ ہیرو کی بانہوں میں رومانی مکالمے بولنے میں زیادہ لطف محسوس کررہی ہوگی۔

پرانی انارکلی میں چنڈال چوکڑی کی بیٹھک تلاش کرنا بہت آسان کام تھا۔ جیرے بلیڈ عرف تھانے دار محمد نذیر نے مجھے تفصیل سے اس کا پتا اور وہاں کے معمولات سے آگاہ کردیا تھا۔ فائیو اسٹار ڈرائی کلینرز کی دکان میں داخل ہو کے میں نے کہا "میں چنڈال چوکڑی میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

ایک پتلون پر استری کرنے والا ایسے اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ میں کوئی پرچی پیش کرکے اپنے دھلے ہوئے کپڑے مانگوں گا "کون ہے تو باؤ۔۔۔ لگتا تو ٹھیک ہے۔"

میں نے اپنی بات دہرائی "مجھے رئیس خبیث نے اور جیرے بلیڈ نے یہاں بلایا تھا۔"

وہ ساکت کھڑا پلک جھپکائے بغیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے صرف ہونٹ ہلائے "چل لگ جا اندر۔"

میں دکان کے عقبی حصے کے دروازے سے گزرا اور چنڈال چوکڑی کی بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مصلے پر دوزانو بیٹھ کے تسبیح کے دانے شمار کرنے والے بزرگ نے اپنا نورانی چہرہ اٹھا کے مجھے دیکھا۔ ان کے چہرے پر بالکل سفید داڑھی تھی۔ کمرے میں اگر بتی اور لوبان کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ دیوار پر طغرے تھے اور مقاماتِ مقدسہ کی تصاویر۔ بزرگوار نے مجھے مسکرا کے شفقت سے دیکھا۔

میں نے اپنی آنکھیں جھپکا کے بے وقوفوں کی طرح انہیں دیکھا۔

بزرگ نے مجھے غور سے دیکھا۔ ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھا کے اور آنکھیں بند کرکے جھومتے ہوئے اس نے کہا "بدبختا۔ نامرادا۔ اب آیا ہے ہمارے پاس۔"

میں نے کہا "لگتا ہے میں غلط جگہ آگیا۔ میں تو جیرے بلیڈ یا رئیس خبیث سے ملنے آیا تھا۔"

بزرگ کا جھومنا بند ہو گیا۔ اس نے چلا کے کہا "اوئے سراج۔ حرامی، یہ کیا چیز بھیج دی ہے اندر۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ بزرگ کی آواز اور لب و لہجہ سب ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ اپنے نورانی چہرے اور پاکیزہ حلیے کے پیچھے سے یوں نکل آیا جیسے نئے اُجلے پردے کے ہٹاتے ہی پیچھے سے دھوئیں سے کالی، اکھڑے پلاستر والی بدوضع دیوار نمودار ہو جائے۔

سراج نے اندر منہ ڈال کے کہا "او خیر ہے چاچا۔ اپنا ہی بندہ ہے۔ ناصر لگتا ہے مجھے۔"

"لگتا ہے؟ اوئے تیرا کیا ہے، تو تاج محل کو دیکھ کے بھی کہہ سکتا ہے کہ مجھے یہ مقبرہ مینار لگتا ہے، دیکھے بغیر۔"

"چاچا۔ رئیس کا یار ناصر اور کون۔ اسی کی باتیں تو کرتا ہے وہ ہر وقت۔ دیکھ لو بالکل وہی ہے نا ہیرو" سراج مسکرایا۔

میں نے کہا "سراج نے بالکل ٹھیک سمجھا، میں ناصر ہوں اور تم ضرور چاچا پتنگ باز ہو مگر یہ کیا ڈراما ہے؟"

چاچا نے ایک قدم آگے آکے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ دبلا پتلا اور عمر رسیدہ آدمی تھا مگر اس کے ہاتھ کی گرفت جوانوں کی طرح تھی۔ اس نے میرے سوال کو نظر انداز کردیا۔ "بالکل ٹھیک، تو بھی صورت سے حرامی نہیں لگتا ہماری طرح لیکن اندر سے ہے۔ رئیس سب بتا چکا تھا۔"

میں نے کہا "رئیس کہاں ہے؟ چنڈال چوکڑی کے باقی ممبرز کہاں ہیں؟"

"اب تو آگیا ہے اڈے پر تو سب خود آئیں گے تجھ سے ملنے" چاچا پتنگ باز مسکرایا "اس وقت کون کہاں ہے؟ کون تھانے میں چھتر کھا رہا ہے اور کون... مٹھائی۔ کون عروہ خانے میں لیٹا ہے اور کون کسی معشوق کے ساتھ، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔"

باہر ایک شخص نے شور کیا "اوئے سراج۔ میں نے پھر دیکھا ہے اسے۔ قسم سے وہ میری شرٹ پہنے پھر رہا تھا۔ تو کہتا ہے گم ہو گئی۔"

"او باؤ جی۔ ہم سے تو گم ہو گئی۔ اب جس کے گھر چلی گئی غلطی سے، یہ اس کا فرض ہے۔ ہے یا نہیں کہ کپڑا واپس دے جائے مگر ایک قمیص کیا باؤ جی، ادھر تو ایک بٹن کے لیے ایمان خراب ہو جاتا ہے بندے کا۔"

"میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ میری بہت مہنگی شرٹ تھی۔ لندن کے ہیرڈز سے لی تھی میں نے۔ اس پر مونوگرام بھی ہے ہیرڈز کا۔"

"ایسا ہے تو پھر آپ نے اس کو پکڑا کیوں نہیں۔ ویسے پکڑتے آپ تو بے عزتی خراب ہو جاتی۔ ادھر بہت ہیں جو لندن جا چکے ہیں۔ لنڈے کی شرٹ پر لیبل لگا کے ایسا ہی کہتے ہیں۔"

گاہک چراغ پا ہو گیا "کیا مطلب؟ لنڈے کی شرٹ تھی میری۔ دو ہفتے سے کہہ رہے ہو تم کہ آج مل جائے گی، کل مل جائے گی۔ میں کچھ نہیں جانتا، بس تم میرا نقصان پورا کرو۔"

"او باؤ جی، اتنی گرمی میں گرمی کھانے سے تھکن پڑ جائے گی۔ آپ کو شرٹ چاہیے نا، میری جان تو نہیں؟ یہ لو، آپ بھی کیا یاد کرو گے؟ ہے کہ نہیں آپ کی شرٹ سے اچھی اور بے شک پہن کے دیکھ لو، فٹ بھی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں کسی اور کی شرٹ کیوں لوں؟ اور یہ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟ جس کی شرٹ ہے اسے کیا جواب دو گے؟"

سراج نے اطمینان سے کہا "یہ فکر آپ چھوڑو کہ وہ کیا بولے گا اور ہم کیا کہیں گے۔"

"مجھے پتا ہے تم کپڑے کرائے پر دیتے ہو۔"

"پتا ہے تو پھر شور کیوں کرتے ہو۔ تم لے کے نہیں گئے تھے شادی کے لیے ایک نمبر شیروانی۔ سو روپے میں کام چل گیا تھا ورنہ ہزار ضائع جاتے۔ نئی بنواتے تو تمہارے بعد تمہارا بیٹا ہی پہنتا اپنی شادی پر۔ بکس میں بند پڑی رہتی۔ یہ لو، موج کرو۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ وہاں سے لی ہے۔ ہیرڈز سے۔ ویسے یہ ہیرڈز کوئی بہت بڑا ڈرائی کلینر ہے لندن کا؟ یہی کام کرتا ہے وہ بھی۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب گاہک نے شرٹ لے لی "بھئی ہیرڈز لندن کا سب سے بڑا اسٹور ہے۔ ہر چیز ملتی ہے وہاں۔"

"اچھا جی۔ اب جاؤ تو رمضان شریف کے لیے ایک کلو ولایتی پھینی لے آنا۔ تمہاری بھابی کو ولایتی چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ سوائے ولایتی میموں کے۔" سراج ناراض گاہک کو منانے کے فن میں طاق تھا۔

میں نے کہا "چاچا۔ یہ بیٹھک اس وقت خانقاہ درویش کیوں بنی ہوئی ہے؟"

چاچا ہنسا "رپورٹ کردی تھی ایک حرامی نے۔ اخبار والا تھا، اس نے کچھ چھاپ دیا۔ علاقے کا تھانے دار آیا تھا بتانے کہ چھاپا پڑے گا۔ ہم نے پکا انتظام کیا ہے، باہر بورڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں دیکھا تم نے؟"

میں نے کہا "بورڈ پر فائیو اسٹار ڈرائی کلینرز لکھا ہوا تھا۔"

"اس کے نیچے دکان کے دروازے پر بورڈ لگا ہوا ہے۔ "سجادہ نشین درگاہ شریف پیر دھانسو رحمتہ اللہ علیہ' دھان پور بھارت سے تشریف لے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ دھان پور کہاں ہے؟"

چاچا نے قہقہہ مارا "کہیں بھی نہیں' یا ہو گا تو ہمیں کیا پتا۔ آج قوالی ہو گی۔ باقی سب تو دوڑ گئے ہیں ادھر سے۔ اچھا کیا تو نے آ کے' ہمارے مرید خاص کا رول کر سکتا ہے؟"

پریشانی کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے تھوڑی سی دل لگی میں۔ ایک ہفتے کی دل شکستگی' مایوسی اور بیزاری نے مجھے ڈپریشن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ شادو کی بے وفائی نے جو میرے نزدیک بے حیائی زیادہ تھی' میرے رومانی تصورات کا آئینہ خانہ ایسے چکنا چور کیا تھا کہ میرا دل پتھر ہو گیا تھا۔ عورت کی شرافت اور معصومیت پر سے میرا اعتبار ہی اٹھ گیا تھا اور محبت مجھے محض جذبات کا رنگین دھوکا لگتی تھی۔ قصے کہانیوں اور فلموں سے لڑکے لڑکیاں' مرد اور عورتیں فریب کاری کا یہ کھیل سیکھتے ہیں جس میں طلب کے سوا کچھ اور نہیں۔

"کس سوچ میں پڑ گیا ہیرو؟" چاچا نے چٹکی بجائی۔

میں چونکا "کچھ نہیں۔ میں تیار ہوں مگر مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"کبھی پیروں فقیروں کے ڈیرے پر نہیں گیا؟"

میں نے کہا "ضرورت نہیں پڑی۔ جو مانگا خدا سے مانگ لیا اور ملا بھی۔ لیکن آپ کی مراد ڈبا پیروں اور مریدوں سے ہے جو مداری اور بچہ جمورا کی طرح تماشا دکھا کے الو بناتے ہیں۔"

"اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں" چاچا نے سہلایا "چل پھر میری صورت مت دیکھ۔ چھاپا پڑنے کا ٹائم تو ہو گیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ کیسا چھاپا ہے؟"

"یہ بھی مداری کا کھیل ہے بیٹا۔ تو اپنا حلیہ بدل لے فوراً۔"

میں نے اپنے آپ کو دیکھا "اس حلیے میں کیا خرابی ہے۔ مریدوں کا کوئی خاص لباس ہوتا ہے؟"

"ہاں۔ وہ تیرے جیسے خوش باش اور خوش حال نہیں ہوتے۔ ان کی صورت سے اور حلیے سے صاف پتا چلتا ہے کہ انہوں نے زندگی میں صرف محرومی اور ناکامی' دکھ اور پریشانی ہی دیکھی ہے۔ وہ غریب ہی نہیں' عقل سے بھی پیدل ہوتے ہیں۔ سالوں کو نہ اپنے آپ پر بھروسا نہ خدا پر۔ کیا سمجھا؟"

"سمجھ گیا چاچا۔ ایسے ہی تو بے وقوف جب تک ہیں' دسواں عقلمند ضرور کوئی مداری ہو گا' وہ بھوکا نہیں مر سکتا۔"

چاچا نے ہانک لگائی "اوئے سراج۔ دیکھ اس ہیرو کو زیرو بنا دے دو منٹ میں۔ یہ اپنا مرید بنے گا۔"

سراج نے کہا "آجا ادھر میرے یار۔"

میں واپس دکان میں گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے دھلائی کے لیے آنے والے میلے اور گندے کپڑوں کا انبار سا لگا ہوا تھا۔ ایک چادر میں میلے کپڑوں کا ڈھیر باندھ کے رکھ دیا گیا تھا۔

"باؤ' اس میں سے دیکھ لے" سراج نے کہا "جو دل کرتا ہے پہن لے۔"

میں نے اس بدبو دیتے ہوئے ڈھیر کو دیکھا تو مجھے شاہ جی کے فقیر خانے کی یاد آئی۔ ایک بار پہلے بھی میں نے اپنا شہزادوں والا حلیہ بدل کے فقیری اختیار کر لی تھی۔ شادو کے عشق میں کیا نہیں کیا تھا میں نے اور اس کمینی نے کتنی آسانی سے وہ سب بھلا دیا۔

میرے دل سے ایک آہ نکلی اور ایک بددعا نکلی۔ تو نے مجھے اتنا دکھی کیا' خدا کرے تو بھی سکھی نہ رہے۔ اس عیار لومڑ جیسی شکل والے دولت مند بوڑھے وکیل کو ٹی بی ہو جائے' کینسر ہو جائے۔ میں نے پرانے کپڑوں کا انتخاب کرتے ہوئے اپنی بددعا پر دوبارہ غور کیا تو یہ مجھے دعا لگی۔ ایسے تو وہ بہت فائدے میں رہے گی۔ جوانی اور خوب صورتی کا جو بینک اس کے پاس ہے' اس میں سے ہاشمی صاحب ایک چیک بھی کیش کرائے بغیر چل بسا تو شادو کو اس کی ساری دولت کچھ گنوائے بغیر مل جائے گی۔ پھر کیا میں شادو کے لیے بددعا کروں کہ۔۔۔ کہ اس کو برص ہو جائے۔ اس کا یہ رنگ روپ غارت ہو جائے جس نے مجھے اور ہاشمی صاحب کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا تھا اور ہاشمی صاحب اس لیے جیت گیا تھا کہ اس بازی میں میرے پاس اپنے جذبات کے سوا لگانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ زندگی کی بازی جذبات کی نہیں' پیسے کا کھیل ہے۔ لیکن شادو کے لیے وہ سب چاہتے ہوئے مجھے ندامت اور وحشت ہونے لگی جو میں اپنے رقیب روسیاہ کے لیے چاہتا تھا۔ کیا اس سے مجھے کوئی تسکین مل سکتی ہے کہ شادو بدصورت ہو جائے یا ٹی بی میں مبتلا ہو کے مر جائے؟ میرے ساتھ ہونے والے ظلم کا احساس اس کی روح کا آزار بن جائے اور (جیسا کہ دردناک فلموں میں ہو سکتا ہے) وہ آہیں بھرتے' آنسو بہاتے اور مجھے یاد کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جائے۔ دم آخر اس کے لبوں پر

میرا نام ہو اور خدا سے اپنے اعمال کی معافی مانگنے کے بجائے وہ کہے۔ ناصر۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔

ایک الماری کے پیچھے کپڑے بدلتے ہوئے مجھے اس خیال پر شرم بھی آئی اور ہنسی بھی۔ یہ اچھی محبت ہے ہیرو' ایک دم ولن کا رول ہو گیا تمہارا۔ تم اس کا برا چاہنے لگے۔ یہی انتقامی جذبات کی کینہ پروری رہی تو کسی دن تم خود اس پر تیزاب پھینک کے اس کا چہرہ بگاڑ دو گے۔ لعنت ہے تم پر اور تمہاری محبت پر۔ کمینے آدمی۔

چاچا نے میرے سراپا کو ناقدانہ نظروں سے جانچا اور سہلایا "اچھا ہے مگر اداکاری بھی اچھی ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا "آپ سے اچھی نہ ہو تو کہنا۔"

میں نے ایک پاجامہ پہنا تھا جس کے داغ بتاتے تھے کہ وہ کسی موٹر مکینک یا کسی کھانا پکانے والے زن مرید گھر پھوہڑ شوہر نے استعمال کیا ہو گا۔ قمیص کی جگہ میں نے جو رنگین شرٹ پہنی تھی' وہ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار لگتی تھی۔ سر کے اوپر چار خانے والا سبز رومال لپیٹ کر میں چاچا عرف سجادہ نشین پیر دھانسو شریف کے سامنے دست بستہ اور دو زانو ہو کے بیٹھ گیا "سر۔ آپ کی نظرِ کرم ہو جائے۔"

چاچا نے سر پکڑ لیا "اوئے پاگل خانے۔ پیر سے دعا کی بات ایسے مت کر جیسے ڈپٹی کمشنر سے کچھ مانگ رہا ہے۔ ہم تجھے سر نظر آتے ہیں۔۔۔ اور تو ایسا عقیدت مند ہے جس کی مراد پوری ہو چکی ہے۔ نظرِ کرم کا رزلٹ آ چکا ہے۔ تو یہ نذرانہ لایا ہے ہمارے لیے۔"

چاچا نے گاؤ تکیے کے نیچے سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میری طرف پھینک دی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا سراج نے اندر منہ ڈال کے بڑی مسرت سے اعلان کیا "او چاچا۔ ایک بچ بچ کا مرغا پھنس گیا ہے بلکہ مرغی ہے۔ چوزے بھی ہیں ساتھ۔"

چاچا سنبھل کے بیٹھ گیا۔ باہر ایک عورت نے بچوں کے ہجوم کی آواز پر غالب آنے کے لیے چلانا شروع کیا "اوئے چپ کرو' پیر صاحب ناراض ہو گئے تو تم کو بھی بنا دیں گے تمہارے باپ جیسا۔"

سراج نے کہا "ماسی یہ جلوس اندر نہیں جائے گا۔"

"ماسی؟" عورت چمک کے بولی "دس بچے ہو گئے تو مجھے ماسی سمجھ لیا تو نے۔ تجھ سے تو کم ہی عمر ہو گی میری۔"

"اچھا بہن غلطی ہو گئی۔ جا اندر مگر اپنی قینچی زرا سوچ سمجھ کے چلانا۔"

وہ پھر بگڑ گئی "قینچی۔۔۔ کیا مطلب ہے آخر تیرا۔ میں قینچی سے گلا کاٹ دوں گی پیر صاحب کا یا قینچی گھونپ دوں گی۔۔۔"

"یا میرے مولا۔ کی پے گیا رولا" سراج پریشان ہو گیا "میرا مطلب تھا اپنی زبان کو بریک لگانا' الفاظ کم خرچ کرنا۔ پیر صاحب دل کا حال ویسے بھی جان لیتے ہیں۔ اب جاؤ بھی' اوئے تم نہیں۔ چلو باہر کھڑے ہو جاؤ سارے لائن بنا کے۔"

عورت اندر آئی تو پیر صاحب آنکھیں بند کیے مراقبے کی حالت میں جھوم رہے تھے اور میں دونوں ہاتھوں پر نوٹوں کی گڈی بڑے مؤدبانہ انداز میں پیش کر رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے نووارد کو دیکھا۔ کالے نیالے بادلوں کے برقع میں اس کا گہنائے ہوئے چاند جیسا طباق چہرہ بجھا بجھا لگتا تھا۔

میں نے کہا "حضور۔ آپ کی دعا سے میرے بگڑے کام بن گئے۔ میری مشکلات ختم ہو گئیں۔"

چاچا نے جھوم کے اوپر ایک انگلی اٹھائی "حق اللہ۔"

میں نے کہا "اللہ نے میری نہیں سنی' آپ کی سن لی۔ بالآخر میری بدزبان اور بدصورت گھر والی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

چاچا نے مجھے ایک آنکھ کھول کے گھورا "یہ۔۔۔ یہ کیا غلاظت اٹھائے بیٹھا ہے اپنے ہاتھوں میں۔ بدبو آ رہی ہے اس میں سے۔"

میں نے کہا "اس کا حق مہر ہے۔ آپ کے لیے نذرانہ لایا تھا۔"

چاچا نے جلالی لہجے میں کہا "دفع ہو جا مردود۔ نوٹ دکھاتا ہے ہمیں اپنی منحوس شکل کے ساتھ۔ مہاراج دھان پور ہمیں سونے میں تول رہے تھے۔ ہماری دعا سے ان کے اولاد ہوئی۔ بیٹا ہوا ان کے۔"

"کون سی دوا لکھی تھی حضور نے کہ مہارانی کے بجائے مہاراجا کے بیٹا ہوا؟"

"دوا نہیں' عقل کے دشمن۔ دعا۔" چاچا نے گرج کے کہا اور مجھے مارنے کے لیے ایک چھڑی اٹھائی جو ان کے قریب ہی رکھی تھی۔

میرے پیچھے ہٹتے ہی عورت آگے آ گئی۔ میں باہر سراج کی دکان میں آ گیا۔ سراج مجھے دیکھ کے افسوس سے سہلانے لگا۔ "کر دیا نا بیڑا غرق۔ تجھے پیروں سے بات کرنی نہیں آتی' کبھی گیا نہیں کسی مزار پر؟"

میں نے خفت سے کہا "جنیفر سیریل کے رول کیا تھا یار۔"

اس نے دس ہزار کی گڈی مجھ سے چھین لی "دیکھ یار۔ کہیں تھانے دار کے سامنے الٹی سیدھی مت بک دینا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے قطار میں کھڑے بچوں کو دیکھا۔ وہ ترتیب سے کھڑے کیے جاتے تو ایک سیڑھی سی نظر آتی۔ ان کے قد دو سے چار فٹ کے درمیان تھے کیلنڈر ضرور بدل جاتا ہوگا مگر لگتا ہے سب کی سالگرہ کی تاریخ ایک ہی ہے۔" میں نے کہا اور پھر اندر جھانکنے لگا۔

"ہائے جی یہ کیا بات ہوئی" عورت نے ہاتھ چلا کے کہا "بڑی امید سے آئی تھی میں تو۔"

"پھر امید سے ہو تم" چاچا نے متانت سے کہا۔

"توبہ کرو جی۔ اتنا لمبا بانس ہے میرے پاس اسے دور رکھنے کے لیے۔ پتا نہیں کس پیر سے تعویذ لایا تھا مجھے گھول کر پلانے کے لیے۔ پانچ سال تک چھوٹی کا بچہ نہیں پیدا ہوا۔"

"ہوتا بھی نہیں' چھوٹی انڈے دیتی ہے" پیر صاحب نے فرمایا۔

"اور جناب اس کے بعد تو دیکھ لو گیارہ سال میں دس ہوگئے۔ بڑے والے کو گھر چھوڑ کے آئی ہوں۔ آپ کوئی تعویذ لکھ دو کہ میری شکل سے نفرت ہو جائے اسے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ آدمی کی ذات بھی کیا مجموعۂ تضادات ہے۔ دنیا آتی ہے محبت مانگنے' کسی کا دل جیتنے کا آسرا تلاش کرنے۔ یہ الٹی کھوپڑی کی عورت تھی کہ شوہر اس پر مرتا تھا تو اس کے نزدیک یہ بھی شکایت کی بات تھی اور اس شکایت کا ازالہ جب وہ ایک بانس سے کر سکتی تھی تو اسے دعا یا تعویذ کی کیا ضرورت تھی؟ تاہم پیر صاحب نے اسے بھی مایوس نہیں کیا اور ایک طرف بیٹھ کر خاموشی سے ایک وظیفہ کرنے کی تلقین کی۔

مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب آدھے گھنٹے میں تین اور بے وقوف پیر صاحب سے مراد مانگنے آگئے۔ ان کی محرومیاں عام آدمی جیسی تھیں' جو عورت پہلے سے وظیفہ کر رہی تھی' اس کے سامنے دوسری آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی اور سر منہ کو دوپٹے میں لپیٹ کر نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔ اس کے شوہر کو بیوی کی شکل سے نفرت ہوگئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ پیر کا وظیفہ اس نفرت کو محبت میں بدل دے گا۔ ایک ادھیڑ عمر کا داڑھی دار آدمی اپنی اولاد سے نالاں تھا "بڑا لونڈا بالکل ہی گمراہ ہو گیا ہے جی۔ زبان چلاتا ہے میرے سامنے اور نافرمانی کرتا ہے سؤر کا بچہ۔ اسے دیکھ کر دوسرا بھی بگڑ رہا ہے۔"

چاچا پتنگ باز نے کہا "خربوزہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ چونک پڑا "خربوزہ۔ اس کا نام تو۔"

"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ پکڑتا ہے یا نہیں؟" پیر صاحب نے گرج کے کہا۔

"بالکل۔ پکڑتا ہے" وہ بولا۔

"جب تیری یہی عمر تھی خربوزے تو تیرے باپ کو تجھ سے کیا شکایت تھی اور پھر تو ٹھیک ہوا کہ نہیں' بول۔"

اس نے سر جھکا کے کہا "ہاں جی۔ میں تو آگیا تھا سیدھے راستے پر۔"

"وہ بھی آجائے گا۔ سب جوانی کے ٹیڑھے راستے سے ہو کے آجاتے ہیں' سیدھے راستے پر۔ جو تو نے کیا اور تیرے باپ نے کیا اور دادا نے کیا وہی کر رہا ہے تیرا بیٹا بھی۔ اس کا بیٹا بھی ایسا ہی کرے گا۔ تیری عمر کو پہنچ کے اسے لگے گا کہ وہ بگڑ گیا ہے لیکن تو مایوس مت ہو۔ ادھر بیٹھ کونے میں۔ ہم تیرے لیے کچھ کرتے ہیں۔"

چوتھے کو فکر تھی کہ دوسری کے بعد اس نے تیسری شادی بھی کرلی مگر سالی سارے جہان کی نکمی اور بانجھ عورتیں میرے گھر میں گھس کے بیٹھ گئی ہیں۔

پیر صاحب نے فرمایا "اچھا۔ زبردستی؟ تو خود نہیں لایا کسی کو؟"

اس نے جھینپ کے کہا "وہ جی۔ میرا مطلب تھا۔"

پیر صاحب نے دہاڑ کے کہا "آدمی لنڈے کی پتلون بھی دیکھ بھال کے پہنتا ہے کہ پہننے کے قابل ہے یا نہیں۔"

اس نے ایک آہ بھر کے سر کھجایا "سچ فرمایا آپ نے۔ نصیب ہی خراب ہوں تو آدمی کیا کرے۔"

"تو خود ٹھیک ہے؟"

وہ ایسے چونکا جیسے اس کی چوری سرعام پکڑی گئی ہو "جی؟"

"جی کے بچے۔ بعض اوقات زمین ٹھیک ہوتی ہے۔ کسان بھی ہل ٹھیک چلاتا ہے مگر بیج خراب ہو تو فصل نہیں ہوتی۔"

"پھر میں کیا کروں پیر صاحب۔ بڑی شہرت سن کے آیا تھا۔"

"چل بیٹھ جا ادھر کونے میں اور ایک ہزار بار یہ وظیفہ کر۔ مگر دیکھ' خبردار جو وظیفے کے دوران میں دل میں گدھے کا خیال آیا ورنہ وظیفہ پھر کرنا پڑے گا۔"

میں ہنس پڑا "چاچا پتنگ باز بھی کیا چیز ہے۔ پہلی والی عورت سے کہا تھا کہ بجلی کے کھمبے کے بارے میں مت سوچنا۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کو گدھا یاد نہ آئے اور دوسرے کو بجلی کا کھمبا۔"

سراج ہنسنے لگا "او یار' یہی تو سارا کھیل ہے۔ سب بیٹھے بار بار وظیفہ پھر شروع کرتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "پیر جی کی دکان کھلتے ہی گاہک آگئے' کمال ہے۔"

"اوئے کمال تو یاروں کا ہے" وہ کپڑوں پر استری پھیرتا رہا "ایک ہفتے سے سارے پبلسٹی میں لگے پڑے ہیں۔ جدھر بیٹھتے ہیں چار بندوں میں یہی بات کرتے ہیں۔ ہم نے بورڈ بھی ایک ہفتے سے لگایا ہوا تھا۔ بندے آکے پوچھتے تھے کہ پیر جی کب ملتے ہیں تو ہم بتا دیتے تھے کہ جمعرات کی شام نزولِ اجلال فرمائیں گے۔ ابھی تو اور آئیں گے۔ تو بھی.... اندر بیٹھ جا کے۔ رونق بڑھا کچھ دربار کی ورنہ ادھر کھڑا ہو کے استری کر۔"

میں نے اندر جا کے بور ہونے پر استری کرنے کو ترجیح دی۔ تھانے دار کے آنے تک عقیدت مندوں کی تعداد دوگنی ہوگئی تھی اور وہ سب بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ وظیفے میں مصروف تھے۔ اندر بڑا ایمان افروز قسم کا روحانی ماحول تھا۔ معصومیت کی ایسی فضا تھی جس میں معصیت کا تصور بھی گناہ لگتا تھا۔

علاقہ تھانے دار کی حد تک چھاپا ایک ڈراما تھا۔ وہ خود بھی چنڈال چوکڑی میں شامل سمجھا جا سکتا تھا۔ اسے سب معلوم ہوگا کہ کون کیا ہے اور کیا کر رہا ہے لیکن اس کو ایسے تمام اڈوں کی سرپرستی سے معقول آمدنی ہوگی چنانچہ وہ بھی "برامت دیکھو' برامت بولو' برامت سنو" کے دانش مندانہ فلسفے پر عمل کرتا ہوگا۔ وہ تین بندر آپ نے بھی ڈیکوریشن پیس شاپس پر دیکھے ہوں گے جن میں ایک آنکھیں بند کیے' دوسرا ہونٹوں پر انگلی رکھے اور تیسرا کانوں میں انگلیاں ٹھونسے نظر آتا ہے۔

تھانے دار کے ساتھ آنے والے ایس ڈی ایم کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ وہ کس حد تک انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے باہر سراج کو حاکمانہ دستور اور عادت کے مطابق بے عزت کیا "تمہاری دکان کے پیچھے بدمعاشی کا اڈا ہے' سٹہ اور جوا کراتے ہو؟"

"توبہ توبہ۔ عالی جاہ۔"

"زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ ہمیں رپورٹ ملی ہے کئی بار کہ یہاں چور ڈاکو' جیب کترے اور جعلساز۔ لوفر بدمعاش سب جمع ہوتے ہیں۔"

سراج تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ اتنے اطمینان اور بے نیازی سے کھڑا رہنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ پھر میں نے بھی کانپنا شروع کیا۔

"آپ خود ملاحظہ فرمائیں سرکار۔ اندر پیر صاحب دھانسو شریف کے سجادہ نشین تشریف فرما ہیں۔ یہ ان کی خانقاہ درویش ہے۔" سراج نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ کو دشمنوں نے غلط خبر دی ہوگی۔"

تھانے دار نے سہلایا "یہ پرانا ہے جی اس علاقے میں۔ سب معززین اسی سے کپڑے دھلواتے ہیں۔"

"یہ کون ہے؟" ایس ڈی ایم نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میرا سالا۔ ناصر' میرے ساتھ کام کرتا ہے۔"

تھانے دار نے پھر اس کی تائید کی "سب جانتے ہیں انہیں۔"

ایس ڈی ایم نے کہا "اندر جا کے تلاشی لو۔ وارنٹ دکھا دو اسے پہلے۔"

سراج نے پھر کان پکڑ لیے۔ "مائی باپ۔ آپ دن میں سو بار آؤ۔ آپ مالک ہو۔ وارنٹ کے بغیر بے شک پھانسی چڑھا دو۔"

سراج چرب زبان اور چالاک آدمی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو ایک معمولی ڈرائی کلینرز کی دکان چلانا ضروری نہ سمجھتا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ سارے کپڑے وہ کسی دھوبی سے دھلواتا تھا۔ یہ کپڑے استری کیے ہوئے آتے تھے اور

مصری تہذیب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ اور حیرتناک داستان
ایم اے راحت
فرعون
قیمت فی جلد 225 روپے
دو جلدوں میں مکمل
پروفیسر زاغ کون تھا؟ کوئی انسان یا بدروح؟
ایک ایسی دوشیزہ کا قصہ۔ جو لمحوں کی قیدی تھی۔
وہ بے بدن تھا، اسکا بدن تاریخ کا قیدی تھا۔
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر علی میاں پبلیکیشنز [illegible] اردو بازار لاہور 7247414
اسٹاکسٹ علی بکسٹال [illegible] لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الماریوں میں لٹکا دیے جاتے تھے۔ اس کام میں سراج کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جس میں پورا مہینہ محنت مشقت کے بعد اسے دو چار ہزار ملیں۔ اتنا تو شاید اسے ہر ہفتے بینک چلانے میں مل جاتا ہوگا۔ تاہم سب کے سامنے رزقِ حلال کا کھیل دکھانے کے لیے وہ کبھی کبھی استری پھیرتا نظر آتا تھا۔ دکان ہاتھی کے دکھانے والے دانت کی طرح تھی۔ کھانے کے دانت اور تھے۔ شاید ہر کاروبار میں اب ایسا ہی ہے کہ بقول غالب۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ ان کے نزدیک تو چاند سورج ستارے سب مداری تھے۔

ایس ڈی ایم اندر گیا تو کچھ حیران اور پشیمان ہوا۔ چچا پتنگ باز آنکھیں بند کیے' سر جھکائے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ عین ممکن ہے وہ زیرِ لب گالیاں ہی بک رہے ہوں۔ چچا مرید دیوار کے ساتھ ساتھ بیٹھے وظیفہ پڑھنے میں منہمک تھے۔ اگربتیوں کا اور لوبان کا سُرمئی دھواں بڑی پُراسرار خوشبو پھیلاتا' کمرے میں ایک روحانی دھند لکے کی طرح بھر رہا تھا اور دیواروں پر آیاتِ قرآنی کے طغرے ماحول کی پاکیزگی میں ایسی خاموش احترام کی فضا پیدا کر رہے تھے کہ سننے والے کو اس میں نورانی فرشتوں کے پیروں کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔

اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔ ایس ڈی ایم جو اپنے چہرے مہرے اور تیوروں سے بڑا بلا کو خان تھا یا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا' آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور چاچا پتنگ باز کے سامنے جا کے مؤدبانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چاچا آنکھیں بند ہونے کے باوجود سب دیکھ رہا ہوگا اور مختصر ہوگا کہ حاکم کو فقیری کا یہ ڈراما کس حد تک متاثر کرتا ہے۔ ڈراما فلاپ ہو جاتا تو وہ چاچا کی داڑھی پکڑ لیتا اور جھٹکے دے کر سب کے سامنے اسے نقلی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ چاچا کی سفید داڑھی اور سفید بال سب اصلی تھے۔

ایس ڈی ایم نے کہا "پیر سائیں۔ ہمارے حق میں دعا فرماؤ۔"

چاچا نے آنکھیں کھولے بغیر سر ہلایا "بڑے خسارے سے بچا لیا تو نے خود کو۔ جو تھا نہیں ہے' جو ہے وہ بھی جاتا' حق اللہ۔"

ایس ڈی ایم کے پیچھے کھڑا ہوا تھانہ انچارج اور اس کے پیچھے موجود تھانے کی نفری سب مجسٹریٹ صاحب پر طنزیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ دیگر عقیدت مند پیر سائیں کی اس کرامت سے مزید مرعوب ہو گئے تھے کہ چھاپا مارنے کے لیے اپنے اختیارات کی فرعونیت کے ساتھ آنے والا مجسٹریٹ کیسے پیر صاحب کا مرید ہو گیا تھا۔

"آپ سب جانتے ہو سائیں بادشاہ۔ آپ کو سب معلوم ہے کہ میری ساڑھے دس لاکھ کی مرسیڈیز تھی۔ بالکل نئی لی تھی میں نے۔" مجسٹریٹ نے ایسے فریاد کی جیسے عام آدمی تھانے میں جا کے روتا ہے۔

چاچا کو اندازہ تھا کہ ساڑھے دس لاکھ میں نئی مرسیڈیز نہیں مل سکتی۔ اس نے آنکھیں کھول کے ایس ڈی ایم کو دیکھا "ایک اور بھی دعوے دار ہے کہ اس نے نئی لی تھی' ہمیں سب پتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے کہا "وہ۔۔۔جی میرا مطلب ہے تقریباً نئی تھی۔"

"راجا کے ہاتھی کو چرا کے کوئی کہاں لے جا سکتا ہے" چاچا نے ہاتھ اٹھایا "جا' تیری سواری تیرے انتظار میں ہے۔ دریا پار' جہاں راجا رانی سوتے ہیں۔"

ایس ڈی ایم نے اس عارفانہ کلام پر غور کیا اور پھر چونکا "آپ کا مطلب ہے۔۔۔شاہدرہ کی طرف۔۔۔مقبرہ جہانگیر کے پاس؟"

"حق اللہ' حق اللہ" چاچا نے جھومتے ہوئے کہا۔

ایس ڈی ایم نے تھانہ انچارج کو مسکراتے ہوئے پکڑ لیا "تم سب یہاں کیوں مجمع لگائے کھڑے ہو۔ چلو باہر' اور دیکھو۔ باہر کسی یتیم خانے سے آئے ہوئے بچے کھڑے ہیں' ان کو کھانا کھلا دو کسی ہوٹل سے۔"

دس بچوں کی ماں نے خلاف توقع اپنے جگر کے ٹکڑوں کو یتیم قرار دیے جانے کے الزام پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

ایس ڈی ایم نے کہا "تم ذرا تھانہ شاہدرہ سے پوچھو۔"

ایس ایچ او نے بڑے یقین سے کہا "گاڑی مل گئی ہے سر۔"

"کیا۔۔۔کہاں ملی؟ تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

ایس ایچ او بولا "میرا مطلب ہے پیر سائیں نے فرمایا تو سمجھو مل گئی۔ بے شک آپ خود جا کے لے آئیں یا ڈرائیور کو بھیج دیں۔"

سراج نے اس کے کندھے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کہا "پتھر پر لکیر ہوتی ہے سر جی' اپنے پیر صاحب کی بات۔ آپ فون کر لو اور پوچھ لو۔"

سراج نے بڑی سعادت مندی سے فون تار سمیت ایک کانسٹیبل کی ٹانگوں میں سے اور تھانہ انچارج کے کندھے پر سے گزارا اور مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دیا۔ عقیدت مند

حاضرین کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ وہ پیر رحمانسو شریف کے سجادہ نشین کی روحانی کرامت کا ایک مظاہرہ بہ چشم خود دیکھنے والے تھے۔

مجسٹریٹ نے قدرے تذبذب کے ساتھ فون نمبر ملایا اور دو منٹ بات کی۔ اس کی گاڑی واقعی مل گئی تھی اور اسی سڑک پر جو نورجہاں کے نے چراغے نے گلے والے خستہ حال مزار سے بچ کر نکلتی ہوئی شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے پُرشکوہ اور بلند پھاٹک پر پہنچ کے ختم ہوتی ہے۔ اس میں سے صرف اے سی اور ٹیپ وغیرہ نکال لیے گئے تھے۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ مرسیڈیز جیسی گاڑی کو چرانے والا اسے بیچ نہیں سکتا۔ وہ کوئی عام گاڑی نہیں ہے۔ چاچا نے اسے بجا طور پر راجا کا ہاتھی قرار دیا تھا۔ اسے شوقیہ فنکار لے گئے ہوں گے جو مرسیڈیز کی شاہانہ سواری سے' پیٹرول ختم ہونے تک لطف اندوز ہوئے اور پھر آسانی سے نکالی جانے والی کار آمد اشیا نکال کے گاڑی چھوڑ گئے۔

مجسٹریٹ نے فرطِ عقیدت سے چاچا کے ہاتھ چوم لیے "آپ کی بڑی سرکار ہے۔ اللہ کے خاص بندے ہو آپ۔"

دیگر عقیدت مندوں کا حال اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔ وہ ہکا بکا منہ کھولے کبھی پیر سائیں کو دیکھتے تھے' کبھی اس لشکر کو جو بڑے گستاخانہ بلکہ کافرانہ عزائم کے ساتھ انہیں گرفتار کرنے آیا تھا۔ تاریخ پیروں اور درویشوں' صوفیوں اور اولیا کی کرامات کے تذکروں سے بھری پڑی ہے جہاں بدخواہوں اور طاقت پر گھمنڈ رکھنے والوں کو اسی طرح شرمندہ و ناکام ہونا پڑا۔ وہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ یہاں چند خوش نصیبوں نے بطورِ چشم دید گواہ ایک کرامت کا مظاہرہ دیکھا تھا۔ بہت جلد اس کی خبر شہر میں پھیلے گی۔ اپنی آنکھوں سے سب دیکھنے والے جہاں جائیں گے' خدا رسول کی قسم کھا کھا کے بتائیں گے کہ مجسٹریٹ اور تھانے دار کیسے کروفر کے ساتھ پیر سائیں کے ڈیرے پر حملہ آور ہوئے تھے اور کیسے پیر سائیں نے ان پر ایک نظر ڈالی تو سب پتھر دل والے پگھل کے موم ہو گئے۔ مجسٹریٹ نے خود ان کے سامنے دوزانو بیٹھ کے درخواست کی کہ اس کے لیے دعا کی جائے۔ اس کی دس لاکھ کی' نہیں جی میں لاکھ کی' یار نئی مرسیڈیز ملتی ہے چالیس کی۔ مجسٹریٹ کہہ رہا تھا کہ بالکل نئی تھی۔ خیر جی اس کی نئی گاڑی چوری ہو گئی تھی۔ آخر ایک مجسٹریٹ نے چالیس لاکھ کی مرسیڈیز کیسے خریدی تھی؟ یار' یہ الگ بحث ہے۔ تم مجسٹریٹ ہوتے تو تم بھی خرید لیتے۔ اس پھٹیچر سائیکل پر کتے کی طرح زبان نکال کر ہانپتے ہوئے دس میل نہ جاتے اور آتے۔ تم ذاتیات پر اتر آئے۔ تم بھی اصل بات سنتے نہیں۔ میرا کوئی اعتقاد نہیں پیروں پر۔ وہاں ہوتے تو قائل ہو جاتے۔ اس مجسٹریٹ کے سامنے ایک دو نہیں' سیکڑوں لوگوں نے دیکھا اور سنا۔ انہوں نے دعا کی اور آنکھیں بند کر کے وہ جگہ دیکھ لی جہاں چوری ہو جانے والی گاڑی موجود تھی۔ سارے لاہور کی پولیس ایک ہفتے سے۔۔۔نہیں' ایک مہینے سے تلاش کر کے مایوس ہو چکی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ جا۔۔۔جہانگیر کے مقبرے چلا جا' گاڑی اٹھا لے۔ ابے یار' انہی کے کسی چیلے چانٹے نے گاڑی وہاں کھڑی کی ہوگی۔

یہ بات درست تھی۔

میرے سامنے کھڑے ہوئے تھانے دار نے ایک کانسٹیبل سے پوچھا "اوئے' گاڑی ہے نا اپنی جگہ پر؟"

"بالکل۔۔۔ہے سر جی۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو نے خود دیکھی ہے؟"

"سر جی۔ میں بندے کے ساتھ تھا ورنہ وہ پکڑا جاتا۔"

"اور اس کا اے سی؟"

"آپ کی گاڑی میں لگ جائے گا سر جی لیکن ذرا صبر کریں۔"

تھانے دار خفگی سے بولا "اوئے صبر دے پُتر۔ ایک ہفتے سے گاڑی تمہارے پاس تھی۔ اس میں سے جو ٹیپ نکلا تھا۔ وہ اسی دن لگ گیا او قاف کے ٹھگے والے مشیر کی گاڑی میں۔ اندھی کمائی ہے اس کی مزاروں سے مگر لالچ نہیں چھوڑتا۔"

کانسٹیبل نے فلسفی بننے کی غلطی کی "لالچ کسے چھوڑتا ہے سر جی!"

تھانے دار نے اسے خود پر طنز سمجھا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا مگر اس وقت ایس ڈی ایم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت تک باہر اچھا خاصا مجمع لگ گیا تھا۔ سراج نے راستہ بناتے ہوئے بار بار اعلان کیا "اوئے چلو' جاؤ اپنے اپنے گھر۔ کوئی تماشا ہو رہا ہے ادھر؟ ایس ڈی ایم صاحب آئے تھے پیر صاحب کی زیارت کے لیے۔"

اس سے ان سب کو مایوسی ہوئی جو یہ سمجھ رہے تھے کہ سراج کی دکان پر چھاپا پڑا ہے اور مجسٹریٹ خود آیا ہے پولیس کے ساتھ۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ کیا برآمد ہوتا ہے اندر سے۔ سراج کو ہتھکڑی لگا کے لے جائیں گے اور آج رات تھانے میں پوچھ گچھ ہوگی ٹھیک ٹھاک۔ سب پتا چل جائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کچھ کا خیال تھا کہ اندر جعلی نوٹ چھاپے جاتے تھے۔ کچھ یہ سمجھتے تھے کہ سراج سپلائر ہے۔ ابھی اندر سے داد عیش دینے والے معزز جوڑے سرنگوں نکلیں گے۔ تاہم اکثریت کی رائے سراج کے حق میں نہیں تو اس کے خلاف بھی نہیں تھی۔ لوگ اسے ایک ڈرائی کلینر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اندر کا حال کون جانتا ہے جی خدا کے سوا، زمانہ ہی ایسا ہے۔

پولیس اور مجسٹریٹ کے جاتے ہی بھیڑ چھٹ گئی مگر یہ بات سارے محلے میں پھیل گئی کہ سراج دھوبی کی دکان کے پیچھے بڑے صاحب کرامات پیر صاحب نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ رہی سہی کسر ان عقیدت مندوں نے پوری کردی جو وہاں وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئے تو انہوں نے دس کے سامنے ذکر کیا اور دس نے سو کو بتایا۔ اس رات نذر نذرانے زیادہ وصول نہیں ہوئے مگر حاجت مندوں کی خوش فہمی اور اپنی ہوشیاری پر غور کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ کیوں نہ وہ کوئی موقع کی مزار سائٹ دیکھ کے ایک مستقل درگاہ شریف بنالے۔ کچھ کیے بغیر عزت، شہرت اور دولت گھر کی باندی ہوجائیں گی۔

چاچا پتنگ باز کے بارے میں رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ ضلع ہری پور کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ فیلڈ مارشل ایوب خان کے گاؤں ہریانہ میں ان کی آبائی حویلی اور جاگیر پر ملازم تھا۔ نجی زندگی میں وہ روایات کا احترام کرنے والے غریب پرور اور وضع دار لوگ تھے۔ چاچا پتنگ باز تو وہ بعد میں مشہور ہوئے۔ جب وہ باپ کے ساتھ حویلی میں جاتا تھا تو حکم داد تھا۔ اسے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ باہر کے چھوٹے موٹے کام کرنے اور آتے جاتے سلام کرنے کا انعام ملتا رہتا تھا۔ حکم داد یقیناً ذہین اور فطرت شناس لڑکا تھا۔ موقع پرستی اس نے باپ سے سیکھی تھی۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے وہی بات کرتا تھا جو مالکوں کو اچھی لگے۔ خوشامد کا فن جانتا تھا اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتا تھا۔ مسکراتا رہتا تھا۔ جب حکم داد کی عمر ملازمت کی ہوگئی تو اسے آسانی سے ہری پور میں واقع ٹیلی فون فیکٹری ٹریننگ کے لئے رکھ لیا گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ سپروائزر بن گیا جو E.S.P کہلاتے تھے یعنی انجینئرنگ سپروائزر فونز۔ اس کے باپ کی خواہش کے مطابق حکم داد کی پہلی پوسٹنگ بھی راولپنڈی میں کی گئی جہاں سرکاری حکام، وزیر سفیر، اعلیٰ فوجی افسران اور اسمبلی کے ارکان کی خدمت کرکے اور ان کی سفارش سے ترقی کے لامحدود امکانات موجود تھے۔ اس دور میں ٹیلی فون کنکشن اتنے عام نہیں تھے۔ ٹیلی فون بھی ایک اسٹیٹس سمبل تھا اور اس کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ حکم داد نے اپنی پوزیشن سے پورا فائدہ اٹھایا۔ شدید طوفانوں اور بارشوں والے اس علاقے میں ٹیلی فون لائن کے فالٹ کی شکایات آتی رہتی تھیں۔ اکثر کسی درخت کی شاخ ٹوٹ کر گرنے سے تار ٹوٹ جاتا تھا۔ حکم داد تمام شکایات کو دو حصوں میں تقسیم کرتا، عوامی شکایات کو وہ ماتحت لائن مینوں کے حوالے کردیتا تھا کہ جب چاہو جیسے چاہو ٹھیک کرو..." جیسے دام ویسا کام" والے اصول پر عمل کرنے میں سب کا فائدہ ہے۔ کوئی اعتراض، احتجاج یا شکایت کرتا ہے تو کرنے دو۔ آج کوئی شور مچاکے فون ٹھیک کرالے گا تو کتنے دن ٹھیک رہے گا؟ دو چار دن بعد پھر تقدیر کو روتا ہوا آئے گا تو ہمارے ہی پاس۔ اور کوئی زیادہ ہی پاٹے خان کا سالا بنے تو اس کے میٹر میں اِدھر اُدھر کی کالیں ڈال دیں گے۔ یاروں، دوستوں اور رشتے داروں کی ملکی اور غیر ملکی کالیں بھی تو فری کرانی پڑتی ہیں۔ جب سیکڑوں کے بجائے ہزاروں کا بل آئے گا تو چکر لگائے گا اکاؤنٹس آفس کے۔ ڈی ای کو درخواستیں دے گا لیکن ہوگا کچھ نہیں۔ بالآخر سوچا اور سوچتے والا معاملہ ہوگا۔ خوار ہونے کے بعد بل جمع کرائے گا ورنہ مزید خواری۔ پھر کس کس کو درخواست دے گا اور کہاں کہاں جائے گا اپنی فریاد لے کر۔ افسران اعلیٰ ملتے کہاں ہیں۔ اور خود افسران اعلیٰ بھی سب سمجھتے ہیں کہ فون خراب ہو تو لائن مین یا زیادہ سے زیادہ سپروائزر ہی اسے ٹھیک کرنے جائے گا۔ وہ خود اپنے ائرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کے احکامات جاری کرنے کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ عوامی شکایات سے ماتحت اسٹاف خوش تھا۔ قدرتی اسباب اپنی جگہ، ضرورت پڑنے پر آمدنی بڑھانے کے لیے شکایات میں اضافہ کرنا ہر وقت ان کے اختیار میں تھا۔ آمدنی کا نصف حصہ اوپر والوں میں حسب مراتب تقسیم ہوجاتا تھا۔ خواص کی شکایات سے دور رس فوائد حاصل ہوتے تھے۔ حکم داد خود طے کرتا تھا کہ کہاں اسے آدھی رات کے وقت شدید سردی یا طوفانی بارش میں بھی جانا چاہیے۔ شاہ سے زیادہ شاہ کا مصاحب اہم ہوتا ہے۔ وزیروں اور سفیروں کے فون تو ٹھیک رہنے ہی چاہئیں۔ ان کے پی اے اور پی آر او جیسے لوگوں کی خدمت میں اپنی مستعدی اور کارکردگی کا مظاہرہ بھی اتنا ہی اہم تھا۔ یہی لوگ بات آگے پہنچاتے تھے۔ حکم داد؟ اس کی کیا بات ہے سر، ہیرا آدمی ہے ہیرا۔ پورے ٹیلی فون کے محکمے میں ایسا قابل اور

فرض شناس محنتی اور ایماندار ملازم نہیں ہوگا۔ دن رات اور آندھی طوفان کی پروا کیے بغیر خود پہنچ جاتا ہے اور لائن مین کی طرح کھمبے پر چڑھ جاتا ہے۔ انعام مانگنا تو دور کی بات ہے، یہ تو چائے کی ایک پیالی قبول نہیں کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کی کنٹرول کا دائرہ پھیلتا گیا۔ ایوان اقتدار کے مکیں خود کوشش کرکے ای ایس پی حکم داد کو اپنے علاقے میں بلالیتے تھے۔ اس کی پوسٹنگ سیکریٹریٹ کے ایکس چینج میں ہوئی۔ پھر براہ راست ایس ڈی او بن کے وہ ایوان صدر کے ایکس چینج میں پہنچ گیا۔ ترقی کے راستے بھی روشن ہوئے تھے اور دو چار سال میں اسے ڈویژنل انجینئر بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ تنخواہ کی اس نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ بینک میں جمع ہوتی رہتی تھی اور اسے صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ ہر مہینے کتنی ملتی ہے۔ آمدنی کے وسائل لامحدود تھے۔ اس نے لاتعداد فون کنکشن دلوائے اور حسب توفیق اپنا معاوضہ یوں وصول کیا کہ فون لینے والوں نے اسے احسان مانا۔

اچانک سیاسی تبدیلی کی لہر اٹھی اور ایوب خان کے خلاف تحریک نے عوامی احتجاج کا انداز اختیار کرلیا۔ باہر سے ڈوریاں ہلانے والوں نے بڑی آسانی سے جذبات کے دھارے کا رخ توڑ پھوڑ کی طرف موڑ دیا اور اشتعال انگیزی کرنے والوں نے جلسے کیے، جلوس نکالے اور بڑے منفی انداز میں شاعرِ مشرق کے قول پر عمل کیا۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو۔ حکم داد نے ایک خاندانی سیاسی اثر رسوخ کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا تھا۔ جب اس خاندان کے سیاسی دشمنوں کو موقع ملا تو انہوں نے حکم داد کا بھی بینڈ بجادیا۔ حکم داد کے پاس سب غرض مند اور مجبور لوگ آتے تھے جو اس کے دوست نہیں ہوسکتے تھے۔ حکم داد نے غلطی صرف یہ کی کہ شاہ سے وفاداری میں حد سے بڑھ گیا اور اس کے دشمنوں سے دشمنی کو بھی اپنا فرض سمجھ کے نبھایا۔ یہ دشمنی اسے مہنگی پڑی۔ ایک مخالف جماعت کے سیاسی جلوس میں شامل کچھ لوگوں نے اس کے مکان پر دھاوا بول دیا۔ حکم داد کا عالی شان بنگلا بڑی مرکزی جگہ پر تھا۔ اسے وہ اپنی خوش قسمتی شمار کرتا تھا کہ اوپر والوں کی مہربانی سے اسے یہ جگہ کوڑیوں کے مول مل گئی تھی اور اس کی کمرشل ویلیو بھی بہت تھی۔ اگر وہ کسی دور افتادہ فیشن ایبل علاقے میں رہتا تو شاید اس کا گھر بچ جاتا۔ مظاہرین نے اس کا سامان لوٹ لیا اور گھر کو آگ لگادی۔ حکم داد کے دو بچے جل کے مرگئے اور بیوی اس صدمے سے پاگل ہوگئی۔ حکم داد گھر میں نہیں تھا اس لیے بچ گیا۔ اس نے بیوی کو ایک نفسیاتی امراض کے اسپتال میں داخل کرادیا مگر ایک ہفتے بعد وہ فرار ہوگئی اور کئی مہینے نظر نہیں آئی۔ پھر حکم داد نے اسے انتہائی افسوس ناک اور شرمناک حالت میں میاں پیر صاحب کے مزار پر پڑا دیکھا۔ اس کا پیٹ بے ہنگم طریقے پر پھولا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کس کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اس نے بیوی سے بات کرنے کی کوشش کی تو ایک مسٹنڈا فقیر غرانے لگا کہ کیا بات ہے بابو، میری گھر والی کو کیوں پریشان کررہا ہے۔ حکم داد نے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا اور اپنی بیوی پر اپنا قانونی حق جتانے کی کوشش نہیں کی۔ اب اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ فقیر نے بتایا کہ وہ اس عورت سے بری امام کے عرس پر ملا تھا اور اس سے شادی کرکے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ راولپنڈی سے پندرہ میل دور بری شاہ امام کے مزار پر وہ کتنا عرصہ رہی، اسے وہاں کس نے پہنچایا تھا اور اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟ یہ سب فقیر کو معلوم ہی نہیں تھا یا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ حکم داد اسی وقت خاموشی سے چلا گیا مگر وہ رات کو دو آدمی لے کر گیا

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول

قیمت فی جلد 150 روپے

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

محی الدین نواب

ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال۔
بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان۔
سندھ کے وڈیروں کی "خدائی" کی ناقابل یقین داستانیں۔

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: الرفاعی پبلشرز اینڈ جیسلرز، لاہور

اسٹاکسٹ: علی میاں پبلیکیشنز 7247414

اور اپنی پاگل بیوی کو اٹھالایا۔ اس کا شوہر ہونے کا دعویٰ کرنے والے فقیر کو پتا ہی نہیں چلا۔ وہ لمبی تان کے سو رہا تھا۔ عورت نے کلوروفارم والے رومال سے ایک سانس لی اور بے سُدھ ہو گئی۔ حکم داد نے اسے دھرم پورے کے پل پر سے نیچے پھینک دیا اور وہ عورت جو کبھی حکم داد کی بیوی تھی۔ جس کے ناز آفریں شباب کی ریشمی حرارت اور چاہت کی روشنی سے اس کی خواب گاہ میں زندگی کا سارا حسن سمٹ آتا تھا' جس کی ہنسی اور چوڑیوں کی جھنکار میں نغمگی تھی اور جس کے ساتھ اس نے مستقبل کے دور تک پھیلے ہوئے خوابوں کے آخری افق تک اجالے دیکھے تھے' اب بد صورتی کی نفرت انگیز تصویر بن گئی تھی۔ دو ٹانگوں پر چلنے والی ایک بے شعور اور بدبودار مخلوق جس کے ساتھ کوئی بھی حیوان نما مرد انسانیت کی پست ترین سطح پر جنگل میں یا غار میں یا ندی نالوں میں رہ سکتا تھا۔ وہ جو اس کے نام و نسب کے غرور کی ضامن تھی' اس کے لیے ناقابلِ برداشت ذلت اور اذیت کا خیال بن گئی تھی۔ اس خیال سے چھٹکارا اس کے وجود کو مٹائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

گردشِ حالات نے حکم داد کو پھر چین سے جینے نہ دیا۔ اس کے برے دن آئے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑنے لگا۔ اس کے خلاف بدعنوانی اور رشوت ستانی کے مقدمات قائم ہوئے۔ سابقہ حکمرانوں سے ذاتی مراسم اور حد سے بڑھی ہوئی وفاداری اس کا جرم بن گئی اور اس کے خلاف سیاسی انتقام لینے والے مستعد ہو گئے۔ اس کا سارا اثاثہ جو بینکوں میں جمع تھا' مختلف مقدمات میں زرِ ضمانت جمع کرانے میں صرف ہو گیا یا وکیلوں کی نذر ہو گیا۔ اسے ہر طرف سے اور جیل جانے سے کوئی نہ بچا سکا۔ اس کے خلاف ایسے مقدمات کھڑے کر دیے گئے تھے کہ وہ ایک میں ضمانت پر جیل سے رہا ہو کے نکلتا تھا تو اسے دوسرے کیس میں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ پولیس کے تشدد سے بچنے اور جیل میں سہولتیں حاصل کرنے کے لیے اس کے لاکھوں اٹھ گئے۔ بالآخر جیل کے اندر ہی ایک اے کلاس والے سیاسی قیدی نے اس کی مدد کی اور اسے اتنی مہلت مل گئی کہ وہ جعلی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا کے ملک سے ہی فرار ہو جائے۔ مقدمات اس کی عدم موجودگی میں بھی چلتے رہے۔ اس کی ضمانت ضبط ہو گئی اور اسے مفرور اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا۔ حکم داد نے دس سال باہر یوں گزارے کہ جیل جانے سے بچنے کے لیے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پناہ لیتا رہا۔ اس نے جعلسازی سے چوری ڈکیتی تک کی مگر قسمت اچھی تھی کہ پکڑا نہیں گیا۔ وہ اسمگلرز کے لیے کام کرتا رہا اور اس چکر میں کئی بار مرتے مرتے بچا۔ ایک بار لانچ ڈوب گئی۔ دوسری بار اسے جان بچانے کے لیے سمندر میں چھلانگ مارنی پڑی اور ایک تختے کے سہارے وہ دو دن تک تیرتا رہا۔ دن رات اسے سب سے بڑا خوف یہ تھا کہ اسے کوئی شارک یا وہیل نہ کھا جائے۔ وہ اسپتالوں سے فرار ہوا اور جیل گیا تو کسی نہ کسی نے اسے چھڑا لیا۔ عموماً اس کے باس حکم داد کی ذہانت اور کارکردگی سے خوش رہتے تھے۔ اس نے روپوشی کے لیے دگنی عمر کی ایک عورت سے شادی کر لی اور دو سال لندن میں گزار دیے بالآخر وہ بڑھیا کی قید سے فرار ہوا اور سرحد عبور کر کے فرانس چلا گیا۔ وہ ایک خوب صورت اور پُرکشش مرد تھا۔ ایک طوائف نے اسے سونے کے لیے جگہ فراہم کر دی۔ اس کے چھ مہینے سوتے ہوئے ہی گزر گئے کیونکہ وہ فرنچ کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا لیکن عورت انگلش سمجھتی تھی۔ اس نے حکم داد کو بتا دیا تھا کہ غیر قانونی تارکینِ وطن کو تاڑنے میں فرنچ پولیس کی چھٹی حس بہت تیز ہے۔ وہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی سونگھ کے بھی بتا دیتے ہیں کہ کس کے پاس دستاویزات نہیں ہیں یا جعلی ہیں۔ حکم داد کا سارا دن ٹی وی دیکھتے یا مختصر سے فلیٹ کی دیکھ بھال کرتے اور اخبار پڑھتے گزرتا تھا یا پھر اپنی لینڈ لیڈی کے ساتھ سوتے ہوئے۔ وہ خاصی حسین عورت تھی۔

دس سال کی جلاوطنی کے بعد حکم داد کو وطن واپس آنے کا موقع ملا۔ باہر اس نے جتنا کمایا تھا' اس سے زیادہ عیاشی میں اڑایا تھا لیکن اس دربدری میں جو تجربہ اسے حاصل ہوا تھا' وہ انمول تھا۔ اس نے دس سال میں اتنے پاپڑ بیلے تھے کہ وہ امریکن کوالٹی ایوارڈ یافتہ خالص امپورٹڈ سلاجیت کے نام سے مٹی پیک کر کے بیچنے سے بینک ڈکیتی کی منصوبہ بندی کرنے تک سب کام کر سکتا تھا مگر اس کی متلون مزاجی نے اسے جم کے کوئی کام نہیں کرنے دیا۔ ساری زندگی اس نے خانہ بدوشی میں گزار دی کیونکہ خانہ آبادی اس کے مزاج کو راس نہیں آئی تھی۔ پھر یہ کہ اسے حسبِ ضرورت کوئی گھر والی کسی شرط اور ذمے داری کے بغیر مل جاتی تھی۔ وہ خود بھی بڑا مشاق شکاری ہو گیا تھا اور اس میں کوئی ایسی بات تھی کہ شوہر سے شاکی' جذباتی یا جسمانی طور پر ناآسودہ' طبعاً ہوس پرست یا تنہا عورتیں خود بخود اس کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں اور ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کا خفیہ اور خاموش معاہدہ کبھی چھ دن چل جاتا تھا تو کبھی چھ ماہ۔ ایک عورت تو اس پر چھ سال مہربان رہی جس کا شوہر دبئی میں

تھا اور سال میں ایک ہی بار گھر آتا تھا۔

ایسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے گرگِ باراں دیدہ کو چنڈال چوکڑی کے چیف اور اس لاوارثوں کے خاندانی سربراہ کی حیثیت حاصل تھی تو یہ ان سب کے لیے خوش قسمتی کی بات تھی۔ وہ سب کو اکٹھا رکھتا' ماہرانہ مشورے دیتا' خطرات سے آگاہ کرتا' سمجھا بجھا کے غیر جذباتی انداز میں سوچتا۔ ان کی حفاظت کرتا اور انہیں ایک ٹیم کی طرح کوچ کرنا جانتا تھا۔ وہ گرم خون رکھنے والے جوانوں کی بات سننے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا اور انہیں ایسی سناتا تھا کہ سب کا دماغ درست کر دیتا تھا۔ وہ بیک وقت سب کا دوست' بھائی' باپ اور محافظ تھا۔ انہیں تھانے اور جیل جانے سے بچاتا تھا اور کوئی چلا جائے تو اس کی خبرگیری کرتا تھا۔

اس رات پیری مریدی کا ڈراما ختم ہوا تو سب سے پہلے محبوب عرف بوبی آیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ہر وقت ہنستے رہنے والا تیز طرار نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"تمہارے بارے میں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ رئیس بتاتا رہتا تھا اور چاچا کا خیال تھا کہ تم ایک دن ضرور یہاں آؤ گے۔"

چاچا نے اسے ٹوکا "خیال نہیں' پکی بات تھی۔"

میں نے کہا "رئیس کہاں ہے؟"

"رئیس حوالات میں ہے" بوبی نے بے نیازی سے کہا اور پھر مجھے چونکتے دیکھ کر بولا "فکر کی بات نہیں' ابھی آجائے گا۔"

"پھر وہی عمران خان اور گواسکر کی ہار جیت پر جھگڑا کیا ہو گا؟"

چاچا نے افسوس سے سر ہلایا "اس لڑکے کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ پُتر' کھیل کو کھیل سمجھنا چاہیے۔ کچھ مل جائے تو واہ واہ ورنہ بھی دل خوش ہو گیا کچھ دیر۔ اور کیا چاہیے۔۔۔ کون گیا ہے اسے چھڑانے؟"

"جیرا بلیڈ!"

"وردی پہن کے؟" چاچا نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے تو منع کیا تھا۔"

چاچا کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے جیرے کو ایک سو ایک گالیاں دیں "حرامی کتے کا پلا۔ وردی کے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ تھانے دار کی ناجائز اولاد۔ اچھا ہے آج اندر ہو جائے۔ کچھ زیادہ ہی بے خوف ہو گیا ہے۔ تھانے پہنچ گیا ہے وردی میں۔ وہ کھال بھی اتار لیں گے۔ چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ تو خود کیوں نہیں گیا؟"

بوبی نے سر کھجایا "وہ چاچا' میں نے ادھر ٹیپ ریکارڈ فٹ کیا' حاجی صاحب کی گاڑی میں۔ وہ جو اوقاف کے محکمے میں افسر ہیں۔ ان کی تیسری بیوی کے پاس جو گاڑی تھی' اس میں سے ٹیپ چوری ہو گیا تھا۔ ابھی نئی نئی ہے نا۔ نخرے بہت اٹھاتی ہے اور فرمائشیں بہت کرتی ہے۔ مگر ہے بہت کمینی۔ میں نے سلام کر کے انعام مانگا تو کہنے لگی کہ حاجی صاحب دیں گے تجھے انعام۔ دفع ہو ادھر سے نہیں تو جوتی ماروں گی منہ پر۔ میں نے کہا تھا کہ کین وڈ KENWOOD کا ڈیک چاہیے۔ لے آیا ہے اٹھا کے پائنیر کا۔"

چاچا مسکرانے لگا۔ "کہتا تھا کہ جس دن حاجی صاحب دوسری کے پاس ہوں اس دن بلا لینا رات کے وقت میرے چاچا کو۔ وہ خود فٹ کر کے جائیں گے کین وڈ کا ڈیک۔۔۔"

"چوری کا مال بھی مرضی کا چاہیے۔ ہزاروں کی آمدنی کھانے والے چور۔ ہمیں ایک نہیں ملتی' اس نے تیسری کر لی" بوبی نے ایک آہ بھری۔

"اوئے بے وقوف۔۔۔ کتنا سمجھاتا ہوں کہ بس ٹائم پاس کرو۔ گلے لگاؤ پیار سے مگر کسی کو گلے مت پڑنے دو۔ بعد میں روتے پھرو گے۔ جا کے پوچھو حاجی سے جس نے تین روگ پال لیے ہیں۔ بیوی پرائی اچھی۔ اپنا زندگی بھر یہی اصول رہا۔ ہمیشہ خوش رہے۔"

میں اس "خاندانی" بزرگ پر حیران ہوا جو اپنے بچوں کو الٹی پٹی پڑھا رہا تھا۔ بڑے بوڑھے بچوں کے جوان ہوتے ہی فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کسی خرابی سے پہلے ان کی شادی کر دیں۔ یہ فرما رہے تھے کہ شادی کی تو بڑی خرابی میں پڑ جاؤ گے۔ تاہم خود بچے بھی ایسے ہی تھے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔

رئیس اور جیرا بلیڈ آدھے گھنٹے بعد پہنچ گئے۔ جیرا اب شریف لباس میں تھا اور رئیس پولیس کی رسمی چھترول سے کچھ نڈھال نظر آرہا تھا۔ اپنا پرایا دیکھے بغیر اور جرم کی تفصیل جانے بغیر ہر تھانے میں لائے جانے والے کی آؤ بھگت کے طور پر جوتا کاری کی رسم پرانی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی رئیس پہلے چونکا اور پھر ساری تکلیف بھول کے مجھ سے لپٹ گیا۔ "ابے یار تو۔۔۔ قسم اللہ کی میرا دل کہتا تھا۔"

میں نے اسے ایک مکا مارا "دل کے بچے۔ بکواس مت کر میرے سامنے۔ مجھے چھوڑ کے بھاگ آیا تھا۔ صورت دیکھ کر دل کی بات کرتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مار پیارے ' ایک اور مار۔ اپنے مقدر میں مار ہی مار ہے۔ یاروں کی مار اور پیاروں کی مار تو نصیب والوں کو ملتی ہے" وہ بولا "تو کب آیا؟"

میں نے کہا "چاچا سے پوچھ۔ تین گھنٹے ہوگئے۔"

چاچا اس وقت تک جیرے بلیڈ کو ڈانٹ پھٹکار کے فارغ ہوگئے تھے اور وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا "رئیس نے مار کھائی۔ میں نے گالیاں کھائیں۔ تم سب نے کیا کھایا' مگر اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ چھاپا پڑا؟"

"پڑ گیا چھاپا بھی۔ آج جانی جن کو جرا نوالے گیا ہے۔ اس کا مقابلہ تھا وہاں کسی سے" چاچا نے کہا "گل خان بھی دو دن سے غائب ہے۔ تم جا کے باقی سب کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ اور دیکھو' آج چنڈال چوکڑی میں ایک مہمان بھی ہے۔"

"مہمان نہیں چاچا' اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ کیوں ناصر؟" جیرے بلیڈ نے کہا۔

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "ابھی ــــ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

رئیس نے مجھے غور سے دیکھا "یہ تیری حالت کیا ہورہی ہے۔ تو بیمار ہے۔"

"باہر چل میرے ساتھ پھر بتاؤں گا" میں نے کہا۔

"نہیں پیارے۔ اپن میں دم نہیں ہے اس وقت اور یہ سب بھی اپنے ہی ہیں۔ ان سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ انہیں پہلے ہی سب معلوم ہے۔" رئیس بولا۔

"میں نے تو دیکھتے ہی اندازہ کرلیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے مگر اس وقت یہاں بھی ایمرجنسی تھی۔ میں نے اسے لگادیا ایسے کام میں کہ دل بہل جائے۔ بعد میں پوچھ لیں گے کہ کیا مسئلہ ہے" چاچا نے کہا۔

"کیا مسئلہ ہے یار۔" جیرے نے کہا۔

"ابھی نہیں گدھے کے کھر۔" چاچا نے اسے ڈانٹا۔ "جلدی کس بات کی ہے آخر۔ جا پہلے کھانے کا بندوبست کر۔ اسے بھی لے جا اپنے ساتھ۔"

میرے انکار سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جیرا مجھے کھینچ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ "یار کلفٹی تک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ چاچا' آج دعوت کے موڈ میں ہے۔ تمہاری وجہ سے ورنہ باری میری تھی۔"

"کس چیز کی باری؟" میں نے اس ٹریکٹر جیسی بغیر مرمت والی جیپ میں سوار ہوتے ہوئے کہا جو گلی کے آخر میں کھڑی تھی۔

"ہر روز کوئی کھانا ساتھ لاتا ہے۔ چاچا ہوٹل میں کھانے کے خلاف ہے۔ کہتا ہے جو دل چاہے کرو مگر یہاں سب کے ساتھ بیٹھ کے کھاؤ۔" جیرے نے جیپ اسٹارٹ کی پھر ڈرائیونگ میرے سپرد کردی۔

اسی وقت رئیس اور ببلی دوڑتے ہوئے آئے اور چلتی جیپ کے پچھلے حصے میں سوار ہوگئے۔ پچھلے حصے کی سیٹوں کے اوپر لوہے کے موٹے پائپ لگے ہوئے تھے اور سامنے والے حصے کے اوپر چار اضافی لائٹس لگادی گئی تھیں۔ بدمعاشی کے اس اشتہار جیسی گاڑی پر میں نے ایک بار چنڈال چوکڑی کے تمام معزز اراکین کو سوار دیکھ کے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ آج میں خود اس کو چلا رہا تھا۔

جیپ ایک طاقتور وحشی جانور کی طرح تھی۔ غرا کے جست لگانے والی اور حملہ کرنے والی اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ اس کی سواری آدم خور شیر کی سواری جیسی خطرناک اور پُرلطف تھی۔ میں نے اسے اندھا دھند دوڑایا اور اس کی منہ زور طاقت سے لڑتے ہوئے ویسا ہی محسوس کیا جیسا کہ سرکش گھوڑی کا سوار اسے قابو کرنے کے بعد محسوس کرتا ہوگا۔ اس سے میرے اندر بھری ہوئی ٹینشن کچھ کم ہوئی اور میں نے اپنی سانسوں میں سکون نہ ہونے کے باوجود اعصابی سکون کا اثر دیکھا۔

وہ سب بے فکری سے ہنس رہے تھے' ایک دوسرے سے فحش مذاق کررہے تھے اور گزرے ہوئے دن کے واقعات کا تذکرہ کررہے تھے۔ وہ خود بھی جیپ کو ایسے ہی چلاتے تھے چنانچہ کسی نے میری خطرناک ڈرائیونگ کو نوٹ بھی نہیں کیا۔ وہ سب جاہل یا کم تعلیم یافتہ لوگ تھے' ان کی ذہنی توانائی اپنی زندگی کے آج کے مسائل کے لیے وقف تھی۔ وہ تاریخ ادب اور فلسفے یا سیاست پر اعلیٰ و ارفع خیالات سے واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے فکر و غم محدود تھے۔ چنانچہ وہ خوش رہ سکتے تھے اور چاچا چنگ باز کو خاندانی سربراہ کے طور پر قبول کرنے کے بعد اس کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی قبول کرتے تھے مگر اس کے سوا وہ ہر پابندی سے آزاد تھے۔

یہ اندازہ مجھے واپسی میں ہوا کہ میری جسمانی حالت ہرگز ڈرائیونگ کے قابل نہیں تھی اور اگر گاڑی میرے کنٹرول سے باہر ہوجاتی تو اس حادثے میں ہم سب اللہ کو پیارے ہوسکتے تھے مگر اس وقت میں ایسے گاڑی چلا رہا تھا جیسے شادو کی بے وفائی کا سارا غصہ گاڑی پر اتار رہا ہوں۔ واپسی پر میں نے خود ہی ڈرائیونگ ببلی کو دے دی۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ میرا سیدھا بیٹھنا بھی محال تھا۔

سراج دھوبی کی دکان ہی اس کے گھر میں داخل ہونے کا

راستہ تھی چنانچہ کبھی بند نہیں ہوتی تھی۔ رات بارہ ایک بجے بھی کوئی کپڑے لینے آجاتا تھا تو سراج کے ماتھے پر بل نہیں پڑتے تھے۔ بعض اوقات اسے کاؤنٹر پر میلے کپڑوں کی گٹھڑی پڑی ملتی تھی۔ وہ اپنے مخصوص نشانوں سے پہچان لیتا تھا کہ کپڑے کون چھوڑ گیا ہوگا۔ ایسے بھروسا کرنے والے گاہکوں کے کپڑے وہ کبھی غائب نہیں کرتا تھا۔ رات کو جب چنڈال چوکڑی کے ممبر اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے تو بیٹھک میں صرف چاچا چنگ باز رہ جاتا تھا یا اب رئیس رہنے لگا تھا۔ سراج اپنے کمرے میں سونے جاتا تھا تو دکان کی لائٹ آف کرکے شٹر گرادیتا تھا۔

سراج دھوبی کی بیوی جیسی صابر اور قوت برداشت رکھنے والی عورت میں نے ساری زندگی میں کہیں نہیں دیکھی۔ وہ شوہر کے کاروباری اور غیر کاروباری معاملات سے بے نیاز اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ اسے نہ شوہر کے دوستوں پر اعتراض تھا جو ہر وقت بیٹھک میں چوکڑی جمائے رہتے تھے اور وہاں دن رات بڑے اینڈتے تھے یا شور شرابا کرتے تھے۔ وہ اپنے آدھے گھر سے برضا و رغبت دستبردار ہوگئی تھی۔ اسے کسی کے مشاغل سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ جانتی ضرور ہوگی کہ کون کیا ہے اور کیا کرتا ہے مگر وہ اپنے شوہر سے سوال جواب نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سراج دھوبی اس پر عاشق تھا اور شادی کے سات سال بعد بچے نہ ہونے کے باوجود بیوی کی دلداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ فسادی اور زبان دراز عورت اپنے شوہر سے لڑ کے صرف اس کو گھر سے بیزار کرتی ہے۔ مرد کی فطرت گدھے جیسی ہے کہ اڑ جائے تو آگے کھینچنے سے پیچھے جاتا ہے۔ اسی لیے انگریز جیسی دانا قوم کا فلسفہ ہے کہ جو عورت محکوم اور مظلوم بن کے خوش رہنا جانتی ہو' وہ حکم بھی چلاسکتی ہے اور ظلم بھی کرسکتی ہے۔

سراج یار باش آدمی تھا لیکن بیوی نے اسے ایسا قابو کرلیا تھا کہ وہ اسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتا تھا۔ گپ شپ میں ضرور شریک ہوتا تھا مگر اپنی خواب گاہ میں گھسنے کے لیے اس کی بے تابی رات بارہ بجے کے بعد ناقابل برداشت ہوجاتی تھی۔ وہ سب کو چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ یار' گھر والی مارے گی۔ بہت دیر ہوگئی۔ سب جانتے تھے کہ گھر والی اللہ میاں کی گائے ہے چنانچہ سراج کی زن مریدی پر ہنستے تھے۔ ان سب کے پاس ہنسنے اور خوش رہنے کے اسباب کی کمی نہ تھی۔ اس وقت میں بہت دکھی تھا چنانچہ یہ بیٹھک مجھے بہت اچھی لگی۔

بیٹھک اٹھارہ فٹ لمبی اور بارہ فٹ چوڑی تھی۔ اس میں بہت موٹا قالین ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بچھا ہوا تھا چنانچہ قالین کی دبازت فوم کے گدے جیسی تھی۔ اس پر روز سفید چاندنیاں بچھائی جاتی تھیں اور گاؤ تکیوں پر اجلے سفید کور ڈالے جاتے تھے۔ یہ سب ڈیکوریشن کا سامان کرائے پر دینے والی ایک دکان سے فراہم کیا جاتا تھا اور اس کے بدلے میں سراج ڈیکوریشن والوں سے دھلائی کے پیسے نہیں لیتا تھا۔ یہ معاہدہ سراج کے مقابلے میں ڈیکوریشن والوں کے لیے فائدہ مند تھا۔

آج دیواروں پر قرآنی آیات اور اللہ محمدؐ کے طغرے بیٹھک کو خانقاہ درویش کا روپ دینے کے لیے آویزاں کیے گئے تھے ورنہ عام دنوں میں یہاں ریکھا سے عمران خان تک سب کی من پسند تصاویر نظر آتی تھیں۔ سراج کی بیوی نے رات گیارہ بجے کے بعد ہم تین افراد کے لیے چائے بنا کے بھیجی۔ ببلی اور جیرا بلیڈ کھانا کھاتے ہی چلے گئے تھے۔ میں تکیے پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا اور رئیس کو شادو کی بے وفائی کا حال سنا رہا تھا۔ رئیس کے ساتھ ہی چاچا چنگ باز ایک گاؤ تکیے پر کہنی ٹکائے نیم دراز تھا۔ سراج دھوبی کو میری داستانِ الم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چائے دے کر سونے چلا گیا۔

رئیس کو جتنا دکھ تھا' اس سے زیادہ شرمندگی تھی۔ وہ ایسے وقت میں مجھے چھوڑ کے آگیا تھا جب مجھے اس کی ضرورت زیادہ تھی لیکن میں اسے قصوروار نہیں سمجھتا تھا۔ خود مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس راہ پر میں عشق کے منہ زور گھوڑے کی طرح بگٹٹ بھاگتا جارہا ہوں' وہ تمام وفا کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہے۔ اس میں اچانک بے وفائی کا گڑھا منہ کھولے پڑا ہے اور اس کی تہ میں اذیت کے کانٹے ہیں جو روح میں اتر جاتے ہیں تو زندگی کا آزار بن جاتے ہیں۔

چاچا چنگ باز غور و فکر میں کھویا ہوا لگتا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ایسا شخص تھا جو زمانے کی مار کھا کے جذبات کی تندی اور جولانی کو اسی طرح عقل کی لگام سے کنٹرول کرنا سیکھ گیا تھا جیسے انجینئر دریا کے سیلِ آب کو ڈیم کی دیوار سے روک کے کسی سرنگ سے گزار دیتے ہیں۔ میرے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے یہ نہیں کہا کہ بے وقوفا' یہ کون سی رونے کی بات ہے۔ لڑکی ہو یا عورت۔ محبوبہ ہو یا بیوی۔ محبت میں دو ہی کام کرتی ہے یا وفا کرتی ہے یا بے وفائی۔ ففٹی پرسنٹ چانس تو لینا ہی پڑتا ہے اور تو پہلے سے سوچ لیتا یہ بات تو آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتنا دکھی نہ ہوتا۔ عقل آئے گی تو پتا چل جائے گا بیٹا کہ ہر لڑکی شادو ہے۔

فرق اپنی فطرت کا تھا۔ چاچا جذبات کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا اور میں فی الحال عقل کی دلیل سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد رئیس نے متاسفانہ لہجے میں کہا "بڑی حرام زادی نکلی وہ؟"

میں نے کہا "اسے گالی دینے سے کیا فائدہ۔ میں ہی بے وقوف تھا۔"

"اب تو کیا کرے گا؟"

میں نے کہا "میں کیا کر سکتا ہوں یار۔ جتنا رونا تھا رو لیا' مرنا ہوتا تو مر جاتا مگر میں زندہ ہوں۔ ایک لڑکی کے لیے جان تو نہیں دے سکتا میں۔"

چاچا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔ بیٹا' تیری زندگی کے ایک دن پر ایسی دس نہیں' ہزار لڑکیاں قربان۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھا ہی ہوا یہ بھی۔ ورنہ وہ بعد میں چھوڑ کے جاتی تو زیادہ خرابی ہوتی۔"

"اسے جانا ہی تھا چاچا۔" میں نے دکھی لہجے میں کہا "مجھے اب اس کے باپ کی بات یاد آتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی تیرے جیسے کنگلے سے شادی نہیں کرے گی' میں جانتا ہوں اسے۔"

رئیس کو کچھ مایوسی ہوئی "میرا خیال ہے کہ تو۔ کچھ کرے گا۔ شادو کو نہیں تو اس بوڑھے گدھ کو ضرور مار ڈالے گا۔ یا شادو کو۔"

"میں نے سب سوچا تھا مگر یار' ہاشمی صاحب نے زبردستی تو شادی نہیں کی اس سے۔ آہستہ آہستہ خود شادو نے اپنا رنگ بدلا۔ میں تو دیکھ رہا تھا۔ ہاشمی صاحب کو مار کے مجھے شادو نہیں پھانسی ملے گی۔ اور میں شادو کو کبھی دکھی نہیں دیکھ سکتا تو اسے قتل کیسے کر سکتا ہوں۔"

"تو اس سے پوچھے گا بھی نہیں۔ کہ یہ ڈراما کیوں کیا تھا اس نے تیرے ساتھ؟"

"پوچھوں گا۔" میں نے سوچ کے کہا "لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کے پاس کوئی لاجواب کرنے والا جواب ہوگا۔ اب تو وہ وکیل کی بیوی بن گئی ہے نا۔ ہاشمی صاحب نے اسے دلائل سمجھا دیے ہوں گے۔ دکھ مجھے صرف اپنے بے وقوف بننے کا ہے' کیا نہیں کیا میں نے شادو کے لیے۔ اچھی گزر رہی تھی میری ڈاکٹر مشہود کے گھر میں۔ میں نے عیش و آرام اور عزت سب چھوڑا اور اس فقیروں کے ڈیرے پر خوار ہوا۔ شاہ جی کے کتے کی طرح اس کے آگے پیچھے دُم ہلاتا رہا۔ اس کی دشمنی مول لی۔ جان پر کھیل کے شادو کو وہاں سے نکالا۔ آج میں پھر خوار ہوں اور وہ بیٹھی ہے مزے سے لندن کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔"

"بیٹھی ہے" چاچا ہنسا "ابے پھر رہی ہوگی اس وقت لندن یا پیرس کے شاپنگ سینٹرز میں۔ باپ کا مال سمجھ کے اڑا رہی ہوگی اس وکیل کی دولت کو۔ وہ ہے بھی تو باپ کے برابر۔"

میں نے درد کی ایک ٹیس کو دبا لیا "چھوڑو یہ باتیں چاچا۔"

رئیس نے کہا "تو ایسے ہی بھاگ آیا۔ انہیں بتائے بغیر' ہیر رانجھا تیرے لیے پریشان ہوں گے۔"

"میں پریشانی دور کرنے کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔ میں یہیں رہوں گا رئیس تیرے ساتھ۔"

وہ کھڑا ہو گیا "ہرگز نہیں۔ یہ جگہ تیرے لائق نہیں ہے' چل اٹھ۔"

میں نے انکار کر دیا "یار' میں اکیلا رہوں گا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں اور مجھے برے برے خیالات آتے ہیں۔ ہیر رانجھا بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن ان سے میرا دوستی کا رشتہ نہیں ہے۔ میں ان سے وہ ساری باتیں نہیں کر سکتا جو تو سمجھ سکتا ہے۔ تو خود وہاں کیوں نہیں رہا آخر؟ مجھ سے کہتا ہے کہ واپس جا۔"

رئیس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "دیکھ پیارے' ہم میں اور تجھ میں بڑا فرق ہے۔ اپنی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ بس جی رہے ہیں۔ زندگی کو اور تقدیر جیسی بھی ملی ہے اس پر خوش ہیں۔ خوش رہنا مجبوری بھی ہے اپنی کیونکہ اسے بدل بھی نہیں سکتے لیکن تیری بات اور ہے۔"

"اور کوئی بات نہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ میری تقدیر میں صرف خواب ہیں اور حسرتیں ہیں۔ محرومی اور ناکامی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اتنی بڑی دنیا میں اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔ وہ رشتے ہوتے جن سے انسانیت کی شناخت ہے۔ کیا فرق ہے مجھ میں اور ایک جانور میں۔ اس کے بھی ماں باپ' بہن بھائی اور چاہنے والے' کسی کا پتا نہیں ہوتا۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں اس لیے کر رہا ہے تو کہ شادو نے تیرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا مگر پیارے' وقت گزرے گا تو ہماری بات تیری سمجھ میں آئے گی۔ بڑے سے بڑا صدمہ بھول جاتا ہے آدمی ایک دن تو خود ہنس ہنس کے بتائے گا کہ پہلے عشق نے تجھے کیسا دیوانہ بنا دیا تھا۔"

"آدمی جب گڑھے میں گرتا ہے تو اس سے نکلنا سیکھتا ہے اور پھر یہ بھی پتا چل جاتا ہے اسے کہ زندگی کے راستے پر آنکھیں کھول کے چلنا چاہیے۔ ٹھوکر کہیں بھی لگ سکتی ہے۔" چاچا نے شفقت سے کہا "ہمیں دیکھو کہ صرف تجربے کے لیے ہر کام کیا۔ سارے کام اچھے نہیں تھے مگر برائی کا بھی شعور ہونا چاہیے۔ اگر لوگ دوسروں کے تجربات سے جینا سیکھ سکتے تو پھر نہ کوئی غلطی کرتا نہ گناہ اور نہ جرم۔"

میں نے لاجواب ہو کے کہا "ابھی تو مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا۔"

"دیکھ ناصر۔ تجھے جتنا ہم جانتے ہیں کوئی اور نہیں جانتا۔ جیسے ایک گھر میں پیدا ہو کے ہوش سنبھالنے والے ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ہم ہیں' نہیں ہیں تو بتا دے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ جب تو مجھے اکیلا چھوڑ آیا تو میں گھبرا گیا تھا۔"

"ہم نے وہ گھر چھوڑا تھا' تجھے نہیں چھوڑا تھا پیارے لیکن ہماری دنیا تیرے لائق نہیں ہے۔ مجھے یہ سب نہیں کرنا ہے جو تقدیر ہم سے کراتی ہے۔"

میں نے کہا "بار بار تقدیر کو الزام مت دے۔ تو جو کرتا ہے' اپنی مرضی سے کرتا ہے۔"

"تو نے ٹھیک کہا لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہماری تدبیر بھی سالی تقدیر کی طرح ہی ہوگی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ہم آج بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کریلے کی بیل آم کا درخت بننے کی سوچے۔ وہ اپنے سہارے پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ زمین پر رینگتی ہے اور اس کا پھل کڑوا ہی رہے گا۔ آم کے درخت کی طرح اس کا سایہ نہیں ہوگا اور نہ پھل میٹھا ہوگا۔"

"تو فلسفی ہو گیا ہے" میں نے ہنس کے کہا۔

"یہ فلسفہ نہیں پیارے' سیدھی سچی بات ہے۔ تو ترقی کرے گا اور بڑا آدمی بنے گا۔ یہ ہم جانتے ہیں اور پہلے بھی بتا چکے ہیں تجھے کہ ایک دن ہم ناز کریں گے تیری یاری پر۔ خواہ تو ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کر دے۔"

چاچا نے سنجیدگی سے پوچھا "تو وزیر اعظم بننا چاہتا ہے؟"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی "وہ بچپن کی نادانی کی بات تھی۔ یہ رئیس خبیث ہر ایک کو بتاتا پھرتا ہے۔"

رئیس نے کہا "تو چاچا' شرط لگا لو چاہو تو ہم سے۔ ایک دن یہ وزیر اعظم بن جائے گا۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں اس کے ستاروں کی چال اور اس کا چلن۔ اس کی سواری گزرے گی سڑک پر سے تو ہم بھی کھڑے ہوں گے کسی کونے میں اور ہاتھ ہلائیں گے۔ پھر سینہ تان کے بڑے فخر سے لوگوں کو بتائیں گے کہ یہ اپنا لنگوٹیا تھا' بچپن سے ہم ایک قالب دو جان تھے۔"

میں نے کہا "ایک جان دو قالب۔"

"ابے ہاں وہی اور لوگ سالے ہنسیں گے ہم پر کہ چریا ہے۔"

"چریا تو ہے آج بھی ورنہ ایسی باتیں کرنے کا فائدہ۔ آج اگر الہ دین کے چراغ کا جن بھی میرا غلام ہو تو میں اس سے نہیں کہوں گا کہ مجھے وزیر اعظم بنا دے۔"

"پھر کیا بنانے کا کہے گا؟" چاچا نے مجھے غور سے دیکھا "فرض کر' وہ کہے کہ تیری ایک خواہش پوری ہوگی' کیا مانگے گا تو اس سے؟"

"دولت" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا "اتنی دولت جس سے میں سب کچھ خرید سکوں اور سب کو خرید سکوں۔ عزت' شہرت' مرتبہ اور عہدہ۔ سب مل جاتا ہے دولت سے۔ دنیا کے بازاروں میں ہر چیز فروخت ہو رہی ہے۔"

چاچا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا "دولت سے تو عمران خان اور مہدی حسن نہیں بن سکتا۔ فیض اور ڈاکٹر قدیر خان نہیں بن سکتا یا بن سکتا ہے؟"

میں نے خود کو سخت احمق محسوس کیا۔ رئیس میری صورت دیکھ کے ہنسنے لگا "بس۔ بولتی بند ہو گئی۔"

چاچا نے کہا "ایک چیز ہوتی ہے بیٹا جو دنیا کے کسی بازار میں نہیں ملتی' صرف خدا دیتا ہے اور وہ ہے توفیق یا صلاحیت۔ مانگنی ہے تو یہ مانگ خدا سے۔ چل اب سو جا' صبح جا کے ہیر رانجھا کو بتا دینا کہ تو یہاں ہے۔"

"مگر چاچا۔ اگر ناصر یہاں رہا تو۔"

"تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" چاچا نے اس کی بات کاٹ دی "کوٹلا بن جاتا ہے ہیرا مگر ہیرا پھر کوٹلا نہیں ہو سکتا۔ وہ کچرے میں پڑا ہو یا بادشاہ کے تاج میں جڑا ہو' اس کی قدر وہی رہتی ہے۔ اسے کچھ دن ہنسنے کھیلنے دے۔ گھبرا گیا ہے چوٹ کھا کے۔ ہم سب کے ساتھ رہ کے اپنا غم بھول جائے گا اور کچھ سیکھے گا بھی۔"

چاچا نے تکیہ سر کے نیچے رکھا اور چادر کو سر تک تان کے سو گیا۔ لائٹ آف کرنے کے بعد میں اور رئیس بہت دیر تک چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ میری داستانِ رنج و الم سنتے ہوئے رئیس نے شوق اور تجسس کے جذبات کو دبایا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موقع ملتے ہی اس نے نیلم کے بارے میں پوچھا۔
"ابے تجھے پکا پتا ہے۔۔۔وہ نیلم ہی تھی؟"
میں نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔ مجھے لوگوں نے بتایا۔"
"قسم اللہ کی یقین نہیں آتا۔ سالے' تو نے بے ہوشی میں خواب تو نہیں دیکھا تھا" رئیس نے رشک سے کہا۔
"الو کے پٹھے' جا کے پوچھ لے ہیر رانجھا سے۔ سارے محلے کو پتا ہے۔ وہ مجھے گھر چھوڑ کے گئی تھی۔ وہاں بیٹھی رہی تھی اور چائے بھی پلائی تھی اسے ماسی ہیر نے" میں نے کہا "ایک لاکھ کا چیک دے رہی تھی مجھے۔"
رئیس اٹھ بیٹھا "یار' اتنی اونچی مت چھوڑ۔"
"میں تجھ سے جھوٹ بولوں گا رئیس؟" میں نے کہا۔
"مگر ایک لاکھ۔۔۔ آخر کس لیے؟"
"ایک تو اپنی عزت بچانے کے لیے۔ کوئی اور ہوتا تو خوب فائدہ اٹھاتا۔ وہ نشے میں گاڑی چلا رہی تھی' پولیس کیس بن سکتا تھا۔"
وہ ہنس پڑا "پولیس کیس تیرے خلاف بن جاتا بیٹے۔ نیلم ہے اس کا نام۔"
میں نے جھینپ کے کہا "اس کے علاوہ۔۔۔وہ مجھے میری تکلیف کا معاوضہ دینا چاہتی تھی۔۔۔ ہرجانہ مگر میں نے انکار کردیا۔"
"انکار کردیا۔۔۔ کیوں؟"
میں نے کہا "بس یار۔ اس نے اتنی شرافت دکھائی۔ مجھے اسپتال لے گئی۔ روز دیکھنے آتی رہی۔ بہت شرمندہ تھی اپنی غلطی پر۔ جتنی خوب صورت ہے وہ خود' اتنا ہی دل بھی حسین ہے اس کا۔ میں اس کا شکر گزار ہونے کے بجائے الٹا اس سے معاوضہ لیتا' جب کہ غلطی سو فیصد میری تھی۔ مجھے معلوم ہے' وہ ہوگی نشے میں لیکن میں کون سا ہوش میں تھا۔"
رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "سب قسمت کے کھیل ہیں پیارے۔ تجھے چیڑی بھی ملتی ہیں اور دودو۔ وہ ڈاکٹرنی ملی تو اس نے لاکھوں لٹادیے تجھ پر۔ پھر شادو کے ساتھ اس کے باپ کا مال بھی تیرے ہاتھ آیا' ہاتھ میں آکے نکل گیا یہ اور بات ہے مگر اس کے بعد مل گئی نیلم۔ وہ نیلم جس کی ایک جھلک خواب میں دیکھ کے لوگوں کی نیند اڑجاتی ہے۔ مجھے سخت جلن اور حسد محسوس ہورہی ہے تجھ سے۔"
"مایوسی کی کیا بات ہے رئیس! تو خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہورہا ہے" میں نے کہا۔
"خواہ مخواہ! ایسے روز ہی ہوتا ہے۔ میں بڑی امید لے کے اٹھتا ہوں کہ آج ضرور کوئی نظر ہم پر بھی اٹھے گی۔ گوری کالی' موٹی پتلی' کوئی تو پیار سے دیکھ کے مسکرائے گی۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میرے دل کی راہ کسی سے کیوں نہیں ملتی۔ سالی ون وے ٹریفک ہی کیوں جاتی ہے ہمیشہ۔ ایک سو ایک پر روز عاشق ہوتا ہوں میں۔ ان میں سے ایک بھی اپنی ماشوق بننے پر راضی نہیں ہوتی" وہ بہت اداس ہوتا۔
میں نے کہا "یار عشق کیا نہیں جاتا' ہوجاتا ہے۔"
"پھر مجھ سے کسی کو کیوں نہیں ہوتا۔ اب اس ہفتے میں قسمت نے تین بار تماشا کیا۔ ایک لڑکی نقاب چہرے پر ڈالے ہاتھ میں کتابیں اٹھائے جارہی تھی۔ بڑے گورے گورے مکھن ملائی جیسے ہاتھ تھے۔ آدھے چہرے کے نقاب سے اس کی آنکھیں دیکھ کے تو اپنا دل سالا قابو سے باہر ہوگیا۔ ہم چل پڑے اس کے پیچھے۔ ایک جگہ اس نے پلٹ کے دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو قسم اللہ کی دل لوٹن کبوتر ہوگیا۔ دوسری بار اس نے صاف اشارے سے پاس بلایا اور ایک دیوار کے ساتھ ٹھہر گئی۔ اب میں قریب گیا تو یہی بات ہے یار ٹانگیں کانپ رہی تھیں' آواز کانپ رہی تھی اور میں خود کانپ رہا تھا۔ اس نے برقع سے ہاتھ نکال کے مجھے ایک لفافہ پکڑا دیا اور بولی "یہ سامنے والے گھر میں شاہد صاحب کو دے آؤ۔ دس روپے دوں گی مگر دیکھو' ان کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں مت دینا۔ وہ تمہیں پچاس روپے دیں گے انعام میں ورنہ جوتے پڑیں گے۔ میں نے لفافہ واپس تھمادیا اسے کہ لعنت انعام لینے والے پر اور لعنت تمہارے شاہد صاحب پر۔ لے یار' وہ تو آگ بگولا ہوگئی کہ لعنت تیری شکل پر بھک منگے۔ چار چار آنے کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔"
مجھے بڑی ہنسی آئی "کیا اس نے پہچان لیا تھا؟"
"ابے یار' میں نے برسوں سے ہاتھ نہیں پھیلایا کسی کے سامنے۔ پتا نہیں سالی نے کیسے مجھے فقیر سمجھ لیا۔ اس کے بعد اگلے دن تو بہت بری ہوئی۔ قسم اللہ کی بالکل لڑکی لگ رہی تھی وہ۔ مگر وہ تھا خسرا۔ میں نے ذرا چھیڑا ہی تھا کہ وہ چمٹ گیا مجھ سے بھرے بازار میں اور چومنے لگا۔ اس کے ساتھ جو بکواس کی اس نے' میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے بھاگا تو پیچھے سے تالی بجا کے آواز لگانے لگا کہ ہائے ہائے' دیکھو لوگو۔ نکاح سے پہلے ہی میرا خصم بھاگ گیا۔ بہت لوگ ہنس رہے تھے مجھ پر۔"
"بات ہی ہنسنے کی تھی" ہنس ہنس کے میرا برا حال ہوگیا۔
رئیس بھی ہنستا رہا "اور ابھی کل کیا ہوا۔ سمن آباد میں ایک بڑی کراری جمعدارنی ہے۔ چولی گھگرے میں اس کی پتلی

کمر اور بھری جوانی کا زور دیکھ کے بڑے بڑے بزرگوں کے قدم رک جاتے ہیں اور نظر بہکنے لگتی ہے۔ سالی ہے بڑی نمکین اور تیز طرار۔ مجھ سے بھی ہنس ہنس کے باتیں کرتی تھی اور مانگ لیتی تھی کبھی پانچ دس کہ چائے پیوں گی۔ ایک ساتھ سو مانگ لیے سالی نے کہ دیکھ گھگرا کتنا پرانا ہوگیا ہے اور چولی بھی پھٹ رہی ہے۔ قسم اللہ کی پھٹی چولی دیکھ کے میرا ہاتھ خود جیب میں گیا اور ایک ہی سو کا پتا تھا اپنے پاس۔ وہ اس کی نذر کردیا لیکن میں نے پیار سے ہاتھ پکڑ کے پوچھا کہ نئی چولی میں کب تک اپنی ظالم جوانی کو قید رکھوگی تو بس غضب ہوگیا' ایک دم چلانے لگی کہ ارے حرامی ابھی بلاتی ہوں اپنے جوزف کو۔ یہ جھاڑو دیکھی ہے؟ ایک منٹ میں مورنہ بنادے تو میرا نام بھی وکٹوریا نہیں۔"
ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ چاچا نے ڈانٹ کے کہا "اوئے بس کر دبس کرو۔ سوجاؤ اب اور مجھے بھی سونے دو۔"
صبح میں رئیس کے ساتھ گھر گیا تو ڈاکٹر رانجھا مونچھوں پر موم جیسی کوئی چیز لگا کے انہیں نکیلا بنا رہے تھے اور آئینے میں دیکھ کے گنگنا رہے تھے "میرے نیناں کٹار۔ مری مونچھ تلوار۔ تیری کالی شلوار۔"
ماسی ہیر نے کچن سے چلا کے کہا "بیڑا غرق ہو تیرا۔ سر پر بال نہیں رہے' مونچھیں اکھاڑ کے لگالے سر پر۔ کون ہے یہ کالی شلوار والی بے حیا جس کے لیے ایسے بے شرمی کے گانے گاتا ہے۔"
ماسی کو چھیڑنے کے لیے ڈاکٹر رانجھا نے دوسرا گانا شروع کیا "قمیص تیری کالی' او سوہنے پھلاں والی" پھر اس کی نگاہ ہم پر پڑی جو دروازے میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اس نے خوشی سے چیخ ماری "اوئے واہ وا۔"
ماسی ہیر کچن سے لکڑی کی ڈوئی سے مسلح ہوکے نکلی "میں نکالتی ہوں تیری واہ وا۔" مگر ہمیں دیکھتے ہی اس کے طوفانی غصے کا رخ بدل گیا۔
ہم نے ایک ساتھ اسے سلام کیا "خیر ہے ناماسی۔"
اس نے ڈوئی کو تھانے دار کے ڈنڈے کی طرح ہلایا "پہلے اندر تو آؤ۔ پھر بتاتی ہوں کتنی خیر ہے۔ کہاں گیا تھا تو؟ پہلے تو بتا۔۔۔ رئیس خبیث!"
ہم دونوں کان پکڑ کے کھڑے ہوگئے۔ ماسی نے ایک ڈوئی رئیس کے عقبی حصے پر رسید کی۔ وہ شرارت سے بلبلایا "ہائے مار ڈالا۔ اُف ماسی کیا پہلوانوں والا ہاتھ مارا ہے۔ محمد علی کلے کا مکا بھی کچھ نہیں۔"
ماسی نے اس کو دوسری بار ڈوئی ماری "شور مت کر۔ گلا مت پھاڑ ایسے۔ ساری رات تھانے میں چھتروں میں اتنا رولا نہیں ڈالا' مکر کرتا ہے میرے سامنے۔"
میں نے کہا "جانے دو ماسی' بے چارہ یتیم ہے میری طرح۔"
ایک ڈوئی بڑی پھرتی سے میرے پڑی "تو بھی بڑا یتیم مسکین ہے۔ کہاں تھا رات کو سچ بتا نہیں تو ہڈیاں توڑ دوں گی۔"
میں نے کہا "وہ تو سب پہلے ہی ٹوٹی ہوئی ہیں۔ دل تک ٹوٹا ہوا ہے۔"
اب ڈاکٹر رانجھا نے تبسم فرمایا "بھئی زوجہ۔ وہ کیا قول ہے حکیموں کا' صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"
"پتا ہے مجھے۔ اسے کیا کہتے ہیں' وہی کہہ رہی ہوں انہیں۔ اور تو اپنے حکیموں کے قول اور نسخے اپنے پاس رکھ۔ شربت بیچتا تھا چار آنے گلاس۔ بن گیا ہے آج ڈاکٹر۔ گورکن اور کفن فروشوں کے ایجنٹ۔"
میں نے کہا "ماسی۔ ناشتے میں کچھ اور ملے گا؟ ڈنڈوں اور گالیوں کے سوا۔"
اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھا "ہائے میں مرگئی۔ تم نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟ بھوکے کھڑے ہو۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ چلو بیٹھو اندر جا کے' میں دو منٹ میں لاتی ہوں پراٹھے بنا کے۔"
ڈاکٹر رانجھا نے قدرے دل زدہ لہجے میں کہا "عزیزان۔ آدمی کی علمیت و فضیلت کی قدر و منزلت اس کے اپنے ہی گوشۂ عافیت میں کبھی نہیں ہوتی۔ کیا فرمایا ہے شیخ سعدی نے۔۔۔ رتبہ ملا اسے جو وطن سے نکل گیا۔ وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا۔"
میں نے کہا "یہ شیخ سعدی نے کہا ہے' اردو میں؟"
انہوں نے بڑے یقین سے سر ہلایا "تمام بڑے شاعر اردو اور فارسی میں یکساں دسترس رکھتے تھے۔ اپنے غالب صاحب اور ڈاکٹر اقبال' ایم بی بی ایس اور فیض صاحب۔۔۔ غالب کو بھی اپنی ناالیہ سے ایسی ہی قدر ناشناسی کا شکوہ تھا۔"
میں نے کہا "گھر کی مرغی دال برابر ہوجاتی ہے۔ اس سے مرغی کی روح کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی۔"
اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے دستِ شفا کی شہرت کا دائرہ کس حد تک پھیل چکا ہے۔ شہر کے کونے کونے سے لاعلاج مریض اس کے پاس آنے لگے ہیں۔ بہت جلد وہ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جدید طریقہ علاج کے بارے میں، جس کا وہ موجد ہے عالمی ادارۂ صحت کو لکھے گا اور اس سال کا نوبل پرائز برائے طب اگر اسے نہ دیا گیا تو ثابت ہوجائے گا کہ دنیا میں ہر جگہ دھاندلی اور سفارش چلتی ہے۔ اس نے مغزیات پر ریسرچ کو وسیع کردیا تھا۔ تمام پھلوں اور سبزیوں کے بیجوں کے مغز پہلے ہی وہ ہر قسم کے شربت میں ملا کے استعمال کررہا تھا مگر اب اس نے لحمیات پر بھی ریسرچ کی ہے اور کاکروچ سے بھینس کے مغز تک سب کے خواص ایسے امراض میں آزما رہا ہے جن کا علاج ابھی تک موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

ماسی ہیر نے دوبارہ پراٹھے رکھتے ہوئے اس عظیم مسیحا کی حوصلہ شکنی کی "موت ہی تو لاتی ہے بدنصیبوں کو کھینچ کر تیرے پاس۔"

ڈاکٹر رانجھا نے آہستہ سے کہا "کبھی دیکھ آ کے کیسے لائن لگتی ہے باہر مریضوں کی۔ لوگ سمجھتے ہیں نئی پشتو فلم کے پہلے شو کی بکنگ ہورہی ہے۔ سیکڑوں بندے روز آتے ہیں۔"

"یہ بھی بتادے کہ زندہ کتنے واپس جاتے ہیں اپنے گھر۔ کچھ خدا کا خوف کر رانجھے۔ پتا نہیں کیسے کیسے حرام جانور کا مغز کھلا رہا ہے لوگوں کو۔ چوہے کا اور چھپکلی کا 'توبہ توبہ۔"

"مرض الموت سے شفا کے لیے دوا میں حرام بھی حلال ہے۔" رانجھے نے فتویٰ صادر کیا "کئی علما سے استفسار کرچکا ہوں میں۔"

"پتا ہے مجھے 'وہ تیرے جیسے ہی علما ہوں گے۔ چور کا گواہ ڈاڈو۔"

ڈاکٹر رانجھا نے ناشتا ختم کرتے ہی رخصت ہوجانا بہتر سمجھا۔ رانجھا شربت فروش سے ڈاکٹر رانجھا بننے کے بعد ان کے حلیے میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ لنڈے کی سوغات ایک کالی سفید دھاریوں والی پتلون پہننے لگے تھے جو کمر اور پیٹ پر ڈھیلی ہونے کے باعث ہمیشہ نیچے کھسکنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ سر کی ویرانی کو خوب صورتی سے چھپانے کے لیے انہوں نے جوکیوں والی ایک چھجے دار ٹوپی استعمال کرنی شروع کردی تھی جس کے سامنے امریکی جھنڈا بنا ہوا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی قمیص پر ایک چوڑی شوخ پھولوں والی ٹائی لگانے کے بعد وہ اپنے مزاج سے زیادہ رنگین نظر آتے تھے۔ ماسی ہیر کا خیال تھا کہ اگر وہ ڈاکٹری چھوڑ کے سرکس میں مسخرے کی نوکری کرے تو ثواب کا کام ہوگا۔ لوگ ہنسیں گے 'رلائیں گے تو نہیں۔

ایک گھنٹے تک ماسی ہیر نے ہم سے ہمارے مستقبل کے عزائم کے بارے میں بھرپور جرح کی۔ ہم نے جی بھر کے جھوٹ بولا۔

"اس کم ذات گشتی شادو سے تو میں پوچھوں گی۔ ذرا واپس آجائے وہ ولایت سے۔ چونی کاٹ کے ہاتھ میں نہ پکڑا دی تو نام ہیر نہیں۔ تو دفع کر اسے 'تیرے لائق ہی نہیں تھی وہ۔"

رئیس نے کہا "ماسی۔ کوئی میرے لائق بھی دیکھو نا۔"

وہ مسکرانے لگی "ہائے کیوں نہیں۔ تم دونوں کے لیے دیکھوں گی۔ یہ بتاؤ تم آج کل کرتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "ہم ڈلیوری کا کام کررہے ہیں فی الحال۔"

اس نے پھر سینے پر ہاتھ مارا "ہائے میں مرگئی۔ ڈلیوری کا کام۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟ اور وہ کون بے شرم ہیں جو ڈلیوری کے لیے تمہیں بلاتی ہیں؟ ڈاکٹر یا دائیاں نہیں ملتی انہیں۔ گھر میں کوئی بڈھی عورت بھی ہوتی ہے۔"

ہم ہنس ہنس کے بے حال ہوگئے "میرا مطلب تھا ماسی کہ ہم گھوم پھر کے سامان بیچتے ہیں۔"

"کیا سامان۔ سائیکل پر برتن بھانڈے یا کپڑا رکھ کے گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے ہو۔"

"نہیں ماسی۔ ہم بڑی بڑی دکانوں پر جاکے آرڈر لیتے ہیں۔ صابن 'شیمپو' ٹوتھ پیسٹ جو ضرورت ہو' کمپنی سے لاکر دیتے ہیں۔ بہت جلد ڈلیوری وین لے لیں گے اپنی۔ میرا مطلب ہے گاڑی۔"

اس نے سر پر ہاتھ مارا "حے___ میری بھی مت ماری گئی ہے۔ ایک بندہ آیا تھا تجھے بلانے۔ اس گشتی شادو کے خصم کی کمپنی سے۔"

"ہاشمی صاحب کے آفس سے؟" میں نے کہا "کیا نام تھا؟"

"نام تو نہیں بتایا اس نے۔ کہہ گیا تھا کہ ناصر کو بھیج دینا۔ ضروری کام ہے" وہ بولی۔

دوپہر تک ہم نے گھوم پھر کے وقت گزارا۔ گزشتہ رات رئیس سے باتیں کرکے اور پیری فقیری کا ڈراما دیکھ کے میرے دماغ پر سے غم واندوہ کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ ماسی ہیر سے مل کے اور بے فکری سے شہری خاک چھان کے میں کچھ اور سبک روش ہوگیا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا نعمت کدے میں کھایا اور اس کے ساتھ نمکین لسی کا ایک جگ پی گئے۔ پھر میں نے اپنے لیے اور رئیس کے لیے انارکلی سے جوتے کپڑے خریدے۔ رئیس کے منع کرنے کے باوجود۔ رئیس لباس کے معاملے میں قلندرانہ وضع رکھتا تھا اور جو ملتا تھا' بلا تکلف پہن لیتا تھا۔ لباس اچھا لگے یا برا' میلا ہو یا مفلک

خیر' اسے پروا نہیں ہوتی تھی۔

شام کے وقت ہم ایک ساتھ ہاشمی صاحب کے دفتر پہنچے۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی آفس کا کام ویسے ہی چل رہا تھا۔ ان کے معاون جونیئر وکیل بھی الگ الگ کمروں میں بیٹھتے تھے۔ ان میں سب سے سینئر گل نواز خان کا کمرا نسبتاً بڑا اور بہتر طور پر آراستہ تھا۔ آفس کے چار فون نمبر تھے۔ ہاشمی صاحب کی کال پہلے ان کا پی اے ریسیو کرتا تھا اور ان سے پوچھ کے یا خود مطمئن ہوکے لائن ہاشمی صاحب کو دیتا تھا۔ گل نواز کا فون نمبر الگ تھا۔ باقی چار وکیل دو فون نمبرز کو شیئر کرتے تھے۔ آفس کے آخری حصے میں دو کلرک بیٹھتے تھے۔

ہاشمی صاحب کا کمرا سب سے شاندار اور شاہانہ انداز میں آراستہ تھا۔ اس میں داخل ہونے کا ایک راستہ کوریڈور میں سے تھا جو صرف ہاشمی صاحب جانے کے لیے استعمال کرتے تھے ورنہ یہ باہر سے یا اندر سے مقفل رہتا تھا۔ دن کے ملاقاتی پہلے پی اے کے کمرے میں جاتے تھے اپنی آمد کا اور ملاقات کا مقصد بتاتے تھے اور اگر ہاشمی صاحب کے پاس پہلے سے کوئی موجود ہو تو اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ پی اے ان کے خاص دوستوں کو اور وی آئی پی قسم کے مہمانوں کو پہچانتا تھا اور بہت ہوشیار' خوش اخلاق اور اسمارٹ آدمی تھا۔

اس نے مجھے بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کے اپنے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ چونکہ ہاشمی صاحب شہر کیا' ملک میں ہی نہیں تھے اس لیے انتظار کرنے والے ملاقاتیوں کے لیے لگائے گئے صوفے خالی پڑے تھے اور کھلنے والے دروازے پر کوئی چپراسی بھی نہیں بیٹھا ہوا تھا۔

"ہاشمی صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں" اس نے کچھ معذرت آمیز انداز میں کہا۔

میں نے حلق میں گھلنے والی تلخی کو پی لیا "مجھے معلوم ہے کب تک آئیں گے۔"

"ابھی کچھ معلوم نہیں۔ ایک ہفتے میں لوٹ آئیں یا ایک مہینہ لگ جائے۔ وہ خود ہی فون کرکے بتائیں گے۔"

میں نے کہا "مجھے آپ کے آفس میں کسی ضروری کام کے سلسلے میں بلایا گیا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب میرے خلاف تمام الزامات واپس لے لیے گئے ہیں اور اب کوئی مقدمہ بھی زیر سماعت نہیں ہے۔"

اس نے کہا "دراصل یہ سب میرے علم میں نہیں۔ ہاشمی صاحب کی عدم موجودگی میں خان صاحب سارے معاملات کی نگرانی کرتے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔"

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا
قلم سے ایک خوبصورت
ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں
اور ولولہ انگیز داستان۔
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس
میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۲۲۴۲۱۴،۲۲۲
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میوہسپتال لاہور۔ فون: ۲۲۲۸۵۳،۲۲۲

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گل نواز خان خالص سرحدی پٹھان تھا۔ قابلِ رشک صحت اور سرخ و سفید چہرے والا لیکن وہ انتہائی پُرسکون اور ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور بہت دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔

"آپ ہاشمی صاحب کے کرایہ دار ہیں" اس نے کہا۔

"جی ہاں۔ کیا مجھے مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا جائے گا؟ اگر ایسی بات ہے تو مجھے اجازت دیں۔ مکان کل خالی ہو جائے گا؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا "نوجوان۔ ویسے تو میں فیس لیے بغیر کسی کو مشورہ نہیں دیتا اور زمانہ ایسا ہے کہ مشورہ ضائع کرنا بھی نہیں چاہیے لیکن تم سے میں علم اور تجربے میں زیادہ ہوں اس لیے ایک بات کہتا ہوں۔ یہ جو غصہ ہے نا' یہ آدمی کی عقل کا سب سے بڑا دشمن ہے اور عقل ساتھ نہ دے تو تم دنیا میں کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے' اپنے لیے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"آئی لائک اٹ" وہ بولا "کہ تم مشورہ قبول کر سکتے ہو اور بات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ یہ پڑھ لو یا میں پڑھ کے سنا دوں۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے اسٹامپ پیپر پر ٹائپ کی تحریر پر ایک نظر ڈالی۔

"جس گھر میں تم بحیثیت کرایہ دار رہتے ہو' وہ ہاشمی صاحب نے تمہارے نام کر دیا ہے' یہ گفٹ ڈیڈ ہے۔"

میرا خون ابل کر دماغ میں آ گیا "گفٹ ڈیڈ۔ وکیل صاحب مجھے تحفے میں دینا چاہتے ہیں وہ مکان آخر کیوں؟ اور یہ گفٹ ہے یا خیرات؟ میری غیرت کا معاوضہ۔"

گل نواز خان سیٹ کی پشت سے سر لگا کے آہستہ آہستہ جھولتا رہا "تم پھر طیش میں آ گئے ہو۔ یہ ہاشمی صاحب کا اور تمہارا معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ اپنا مکان تمہیں کیوں دینا چاہتے ہیں اور اس بات پر تم اتنے مشتعل کیوں ہو۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ گفٹ ڈیڈ کے سلسلے میں تم کو بلا کے ساری قانونی کارروائی پوری کر لوں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو میں انہیں بتا دوں گا۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں اس کے تحفے پر۔" میں اسٹامپ پیپر کو پھاڑ کے پرزہ پرزہ کر دینا چاہتا تھا۔

رئیس نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ لیا "ٹھہریں۔ ان کاغذات کو کیوں پھاڑتا ہے' سیکڑوں کے ہوں گے۔"

"ہزاروں کے' ڈھائی ہزار کے" گل نواز نے کہا۔

رئیس نے کاغذات میرے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیے "ہم آپ کو سوچ کے جواب دیں گے وکیل صاحب۔"

میں نے رئیس سے کہا "کچھ نہیں سوچنا ہے مجھے۔ میں یہ خیرات کیوں قبول کروں۔ آخر کیا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو۔ کیا مجھے بھی خریدا جا سکتا ہے دولت سے۔"

گل نواز خان کا چہرہ سپاٹ اور جذبات سے عاری رہا "تمہارا یہ دوست ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم کل بھی انکار کر سکتے ہو۔ ایک ہفتے بعد بھی۔"

"میرا فیصلہ قطعی ہے۔ آپ بتا دیں اپنے باس کو" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

گل نواز خان نے کاغذات اٹھا کے اپنے سامنے رکھ لیے "اس کے باوجود میں انتظار کروں گا۔ کیا حرج ہے اگر تم ایک بار پھر مجھے بتا دو۔ خود نہیں آنا چاہو تو مجھے فون کر دو۔"

میں نے اٹھ کے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "مجھے جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔"

"ایک بات اور۔۔۔" اس نے چند سیکنڈ بعد کہا۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔

میں نے اسے پلٹ کے دیکھا "ایک اور مشورہ بلا فیس؟"

"ہاشمی صاحب میرے باس نہیں۔۔۔ پارٹنر ہیں" اس نے میری بات کو فضول سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا "لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم دوست ہیں۔"

میں رئیس کے ساتھ باہر آ گیا۔ غصے کا طوفان ابھی تک میرے وجود کو۔۔۔ تہس نہس کر رہا تھا۔ گل نواز خان کی آخری بات نے میرے احساسِ ذلت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اگر وہ دوست بھی تھا تو اسے یقیناً حالات اور حقائق کے سارے پس منظر کا علم ہو گا۔ ہاشمی صاحب کے آفس میں کام کرنے والا چپراسی تک جانتا تھا کہ میرے اور شادو کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور اس کھیل میں ریفری کا کردار ادا کرنے والے ہاشمی صاحب نے مجھے آؤٹ کر کے کیسے یہ بازی جیتی تھی۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا۔

گل نواز خان نے بڑے محتاط اور غیر جذباتی انداز میں بات کی تھی۔ اس کے سامنے میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ ہاشمی صاحب کو یا شادو کو گالیاں دیتا اور ہنگامہ کرتا تو خود اپنی ذلت کی تشہیر کرتا اور اپنی شکست کی شرمندگی کو تماشائے رسوائی بناتا تھا۔

آفس سے نکلتے ہی میں رئیس پر پھٹ پڑا "تو کیا افلاطون سمجھتا ہے اپنے آپ کو سؤر کے بچے۔ کیا سوچنے سمجھنے کی عقل اور صلاحیت تیرے پاس مجھ سے زیادہ ہے؟ آخر ہے نا

فقیر۔ خیرات دیکھتے ہی تیری غیرت مر جاتی ہے۔ ضمیر خاموش ہو جاتا ہے۔ لالچی کتے' تو کیا سمجھتا ہے میں اس طوائف کی کمائی کی یہ زکوٰۃ قبول کر لوں گا۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ یہ اس کے جسم کا میل ہے۔ جسم بیچ کے اس نے ایک ہوس پرست بڈھے کی دولت حاصل کر لی ہے تو خود کو رئیس زادی سمجھنے لگی ہے اور مجھے فقیر۔ فقیر بنا تھا میں اس کی محبت میں' الو کا پٹھا تھا میں۔"

میں بہت دیر تک بولتا رہا اور شادو کو وہ سب کہتا رہا جو لاحاصل اور بے مقصد تھا مگر اس سے میرے مجروح جذبات کی تسکین ہوتی تھی۔ رئیس نے سب کچھ خاموشی سے سنا' ہم ساتھ ساتھ پیدل چلتے رہے۔

اکیلا میں کب تک بولتا۔ بالآخر میں خاموش ہو گیا تو رئیس نے کہا "بس یا کچھ باقی ہے؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم چڑیا گھر کے سامنے سیمنٹ کے ایک بہت بڑے بے کار پڑے ہوئے پائپ پر بیٹھ گئے اور گزرتے ہوئے لوگوں کو اور ٹریفک کو دیکھتے رہے۔ ایک گھر کے در و دیوار' ایک شہر کے کوچہ و بازار' موسم اور صبح دوپہر یا شام کتنے اداس اور اجنبی اور بے رحم لگتے ہیں جب دل کے اندر جذبات کے رنگوں میں امید کا اجالا نہ رہے۔

رئیس نے اچانک کہا "کل پرسوں کسی وقت ان کاغذات پر دستخط کر دینا۔"

میں نے چونک کے کہا "بکواس مت کر۔"

رئیس سامنے دیکھتا رہا "تیرے انکار سے کیا ہو گا؟"

"اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں اس کے پیسے پر تھوکتا ہوں۔"

رئیس نے کہا "یہ تو اسے پہلے ہی معلوم ہو گا پیارے۔"

"اس طرح میرے جذبات کی تلافی نہیں ہو سکتی" میں نے کہا۔

"جو ہونا تھا' ہو گیا۔ اب گزرا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا۔"

"یار' تو سمجھتا کیوں نہیں۔ اس فاحشہ نے پھر ذلیل کیا ہے مجھے۔ پہلے میری محبت کو ٹھوکر مار کے چلی گئی۔ اب اپنے دولت مند خصم سے کہا ہو گا کہ میرا چاہنے والا بہت رو پیٹ رہا ہو گا۔ اسے کچھ دے دلا کے خاموش کر دو۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ شادو کو معلوم بھی نہ ہو۔ خود ہاشمی صاحب نے سوچا ہو کہ ناصر کا اپنا گھر نہیں ہے کوئی۔۔۔"

"میں اپنا گھر بنا لوں گا۔ اور وہ ایسا اینٹ چونے کی دیواروں والا فضول مکان نہیں ہو گا جس کے مقابلے میں ہاشمی صاحب کا سرونٹ کوارٹر بہتر ہے۔ خیرات میں بھی مجھے وہ پھٹا پرانا جوتا دے رہا ہے جو اس کے کسی کام کا نہیں۔ اتنا ہی دل والا ہے تو گفٹ میں دیتا گلبرگ کی ایک کنال والی کوٹھی۔ اتنی کم قیمت لگائی اس نے میرے جذبات کی۔ یہ دوسرا طمانچہ مارا ہے اس نے مجھے۔ پہلے مجھ سے میری محبت چھین لی' اب دو لاکھ دے کے کہہ رہا ہے کہ چلو بھول جاؤ محبت کو۔ تمہیں اس کی قیمت مل گئی۔ محبت کو تم کیا کرتے۔ مرچ مسالا لگا کے چاٹتے۔ چار دن میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا تو محبت بن جاتی مصیبت۔ یہ مکان تو رہے گا اور اس کی قدر و قیمت بھی بڑھتی رہے گی۔ وہ پہلے ہی مخالف تھا میری اور شادو کی شادی کا۔"

"میں مانتا ہوں تیری بات۔ مگر اس کمینے آدمی سے کچھ مل رہا ہے تو چھوڑ مت۔ تجھے ضرورت نہیں ہے تو کسی کو گفٹ کر دے۔"

"کس کو گفٹ کروں' تجھے چاہیے یہ خیرات؟"

"ہمیں کچھ نہیں چاہیے پیارے۔" رئیس ہنسنے لگا "ہم تو سالے فقیر ہیں۔ جہاں جی چاہا ڈیرا ڈال لیتے ہیں اور دل بھر جائے تو چل پڑتے ہیں ادھر ہی جدھر تقدیر لے جائے۔ مجھے معلوم ہے تیرا دل کتنا بڑا ہے۔ تو نے ایک لاکھ کا چیک کاغذ کے پرزے کی طرح پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ ہاشمی صاحب کو پتا چلے گا کہ تو نے یہ مکان کسی اور کو دے دیا۔ تو نے خیرات کو آگے خیرات کر دیا۔ اس کا مال چھوڑا بھی نہیں اور رکھا بھی نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں' تو کیا چاہتا ہے آخر؟"

"دیکھ پیارے۔ ویسے تو دنیا میں لاکھوں ہوں گے جو بے گھر پیدا ہوتے ہیں اور بے گھر ہی مر جاتے ہیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر عمر گزار دیتے ہیں۔ جھونپڑی تک نصیب نہیں ہوتی انہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے لوگوں کو گندے نالے کے کسی پل کے نیچے رہتے ہوئے۔ جانوروں کی طرح کسی پہاڑی کے غار میں۔ جہاں وہ رہتے ہیں اور پھر وہ بچے بھی تو رہتے ہیں جن کو وہ جنتے ہیں۔۔۔ ہم کیا کر سکتے ہیں اگر کسی کے نصیب میں ایسا ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

"میں دو سال رہا ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ایک سر چھپانے کا آسرا بنا لیا تھا۔ اسے بھی میونسپلٹی والوں نے بلڈوز کر دیا۔ تجھے اندازہ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ ہیر کتنی دکھی ہے۔ وہ ساری عمر ایسے ہی ٹھکانوں کی تلاش میں بھٹکتے رہے ہیں۔ اور اس بے سروسامانی غربت اور اکیلے پن کے باوجود وہ دل کے بڑے غنی ہیں۔ کرایہ تو نام کا تھا۔ اس سے دگنا وہ مجھ پر خرچ کردیتے تھے۔ میرا کھانا پینا' دوا دارو۔ جو محبت انہوں نے مجھے دی اس کا کیا مول۔"

"تو چاہتا ہے میں یہ گھر ان کے نام کردوں۔" میں سوچ میں پڑگیا۔

"ہاں۔ گل نواز خان سے کہہ کہ تیری یہی خواہش ہے۔ ہاشمی صاحب کو پتا چل ہی جائے گا کہ تو نے ان کا احسان قبول کرکے بھی قبول نہیں کیا۔ اس کے پاس تو کروڑوں ہوں گے۔ دو لاکھ اس کے نزدیک کیا ہیں۔ مگر جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو وہ دو لاکھ ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے کسی کو دے دے' اور ایسے کہ دوسرے ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا تیری بات۔"

"تو سوچ کہ ہیر رانجھا کتنے خوش ہوں گے۔ ان کی خوشی کا اندازہ کر اور جتنی دعائیں ان کے دل سے نکلیں گی۔۔۔ وہ تیرے کام آئیں گی پیارے۔"

میں نے سرہلایا "ٹھیک کہتا ہے تو شاید۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا' مجھے ضرورت ہے ان دعاؤں کی جن سے میرے دل کو سکون ملے۔"

رئیس نے میرا بازو پکڑلیا "ابے ادھر دیکھ۔"

مال روڈ پر رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ دو رویہ لگے ہوئے مرکری بلبوں کا اجالا صرف اس حصے کو روشن کررہا تھا جس پر خیرہ کن روشنی کی لکیریں بنانے والی گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ ان کے چمکیلے سرخ اور سیاہ' نیلے اور سلور یا گولڈ پیلے رنگ اجالوں کو منعکس کررہے تھے مگر سڑک کے دونوں کناروں پر گھنے پھیلے ہوئے درختوں کے نیچے گہرے سایوں کا اندھیرا ٹھہرا ہوا تھا جس میں فٹ پاتھ پر چلنے والے اکادکا راہ گیر سایوں کی طرح متحرک نظر آتے تھے۔

میں نے گہرے دھندلکے میں ایک ہیولا سا دیکھا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ نیچے پھسلتا گیا۔ فٹ پاتھ پر ٹانگیں پھیلا کے اس نے کھمبے سے پیٹھ لگالی اور سر کو یوں جھکالیا جیسے اس پر غنودگی طاری ہے۔

"کون ہے یہ؟" میں نے کہا۔

رئیس کچھ حیران ہوا "ابے پہچانا نہیں تو نے' غور سے دیکھ۔"

اسی وقت واپڈا ہاؤس کی طرف سے پڑنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر چمکی "یہ۔۔۔ یہ تو شاہ جی ہے۔"

رئیس نے کہا "ہاں۔ آہستہ بول۔ اس نے سن لیا تو۔۔؟"

"تو کیا ہوگا" میں نے کہا "کیا کرسکتا ہے وہ آخر۔ اس کی اپنی حالت کیا ہورہی ہے؟"

شاہ جی کے کپڑے میلے اور بے ترتیب تھے۔ وہ ہمیشہ دو گھوڑا بوسکی کے بے داغ ٹش پش کرتے شلوار قمیص میں نظر آتا تھا یا پھر اجلے سفید کلف لگے چیز مین لٹھے کے سوٹ میں۔ اس کی قمیص کا گریبان کھلا ہوتا تھا اور آستینیں لٹک رہی ہوتی تھیں جن میں وہ سونے کے کف لنک لگاتا تھا۔ اس کے کانوں سے نیچے تک آنے والے سیاہ چمکیلے بال جن کو وہ درمیان سے مانگ نکال کے دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا' جھاڑ جھنکاڑ ہورہے تھے۔ وہ ایک ہارا ہوا آدمی تھا جسے شکست نے توڑ پھوڑ کے تصویر عبرت بنادیا تھا۔ طاقت پر غرور کی سربفلک عمارت کا ڈھانچا زمیں بوس ہوکے کھنڈر ہوگیا تھا۔

رئیس نے افسوس سے سرہلایا "لگتا ہے صدمے نے اسے پاگل کردیا ہے ورنہ یہ اس طرح یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔"

میں نے ایک بے رحمانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہاں۔ انسان کو اسی دنیا میں اپنے اعمال کی سزا مل جاتی ہے۔ قدرت خود اس کے اسباب پیدا کرتی ہے۔ کیا میں اس سے پوچھوں کہ اے فقیروں کے شہنشاہ معظم۔ کہاں ہے تیری وہ گداگری کی سلطنت جس کا تو بے تاج بادشاہ تھا۔ کہاں ہے تیرا وہ رعب اور دبدبہ جس کے سامنے تیری فقیر رعایا کا پیشاب خطا ہوتا تھا۔ تجھے نذرانے اور صدقے دینے والے اور تیرے ظالم ہاتھوں سے کوڑے کھاکے اپنے زخم چاٹنے والے کہاں ہیں۔ تیری دولت اور بدمعاشی کہاں گئی۔"

"چھوڑ یار۔ سب کچھ وہیں ہوگا۔ وہ ڈیرا بھی' فقیر بھی۔ صدمے سے دماغ چل گیا ہے سالے کا یا پھر اس نے اتنی پی لی ہے کہ اسے اپنا ہوش بھی نہیں۔ میں پوچھتا ہوں اس سے۔"

میں نے اسے روک لیا "یار لعنت بھیج اس پر۔ پولیس اٹھاکے لے جائے گی یا ہوش آئے گا تو خود چلا جائے گا۔ اس کے خراج گزار خود۔۔۔ بھی اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

لیکن میرے منع کرنے کے باوجود رئیس اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں اس کے پیچھے ایک درخت کی اوٹ میں چھپ کے کھڑا ہوگیا۔

رئیس نے اسے آہستہ سے ہلایا "شاہ جی۔"

شاہ جی نے چونک کے سر اٹھایا "کون۔۔۔ ہے" اس نے ایک گالی دی۔ نشے کی زیادتی سے اس کی آواز میں لکنت آگئی تھی۔

"میں رئیس ہوں۔"

"اچھا۔۔؟ بہت بڑا رئیس ہے؟ کتنا رئیس ہے تو۔۔۔ لا۔" اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا "اللہ کے نام پر۔ ایک فقیر کو۔۔۔ شادو دے دے۔ شادو تیرے پاس ہے' میرے پاس۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے" اس نے اپنی خالی جیب الٹ کے دکھادی۔

"چلو میں تم کو گھر چھوڑ آؤں" رئیس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ پہلے شادو۔۔۔ اللہ کے نام پر مجھے میری بیٹی دے دے۔"

"شادو میرے پاس نہیں ہے شاہ جی۔"

شاہ جی نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی اور چلّانے لگا "جھوٹ بکتا ہے تو۔ تجھے معلوم ہے۔۔۔ تو جانتا ہے کہ وہ۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔ جو میری شادو کو لے گیا تھا۔ حرامی باپ کا حرامی بیٹا' نطفہ ناتحقیق۔"

گزرتے ہوئے چند لوگوں نے اسے نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ ایک شخص جو حلیے سے فوجی یا پولیس مین لگتا تھا' رئیس کے پاس رک گیا "یہ کیا ہنگامہ ہے؟"

"کچھ نہیں سر۔۔۔ یہ نشے میں ہے۔۔۔ بہت پی گیا ہے۔ میں اسے گھر لے جارہا ہوں" رئیس نے لجاجت سے کہا۔

اس نے سرہلایا اور آگے بڑھ گیا "جلدی سے لے جاؤ ورنہ پولیس لے جائے گی بڑے گھر۔ سارا نشہ اتار دے گی۔"

شاہ جی اب زار و قطار رو رہا تھا "مجھے ناصر عظیم کے پاس لے جائیں۔ میں نے غلط سمجھا تھا اسے۔ میں خود کروں گا شادو سے اس کا بیاہ۔ تو حلف اٹھوالے مجھ سے۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کرتا ہوں۔"

"اب کوئی فائدہ نہیں شاہ جی۔۔۔ شادو چلی گئی۔ اس نے ناصر کو بھی چھوڑدیا۔"

شاہ جی پھر چلّانے لگا "حرام زادے۔ جھوٹ بولتا ہے مجھ سے۔"

میں اچانک درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ کچھ دیر مجھے لال لال آنکھوں سے۔۔۔۔ گھورتا رہا۔

میں نے کہا "رئیس جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ تمہاری بیٹی نے وہی کیا جو وہ کرسکتی تھی۔ تم نے کہا تھا نا کہ میں جانتا ہوں اسے۔ اس نے میرے جیسے کنگلے کو چھوڑ کے ایک دولت مند شادی شدہ بوڑھے کے ساتھ شادی کرلی۔ اس وکیل کے ساتھ ولایت چلی گئی جس کے گھر میں وہ رہتی تھی' فاحشہ۔"

رئیس نے کہا "ابے چھوڑ یار۔ اسے کیا بتارہا ہے۔ یہ ہوش میں کہاں ہے۔"

میں نے کہا "یہ سب اس کی وجہ سے ہوا۔ اگر اس نے میری تذلیل نہ کی ہوتی تو آج خود اپنی نظر میں ذلیل نہ ہوتا۔ اس نے مجھے کتے کی طرح حقارت سے نہ دھتکارا ہوتا تو آج خود بھی خوار نہ ہوتا۔ اس سے پوچھ رئیس کہ کیا ملا آخر اسے میری محبت کو میرا جرم بناکے۔ یہ ذمے دار ہے ساری خرابی کا۔"

شاہ جی عجیب طریقے سے ہنسا۔ یہ پُرحقارت' پُرتمسخر اور زہر آلود ہنسی تھی۔ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "سالے محبت کے گھوڑے۔ سؤر کے بچے' کتے کی اولاد' وہی ہوا نا تیرے ساتھ جو میں نے کہا تھا۔ اس نے تھوک دیا تیری اوقات پر۔ ہاہاہا۔۔۔ اب جاکے عشق کی گھاس کھا۔ مجنوں بن جا' کپڑے پھاڑ کے گلیوں کی خاک چھان' اپنا سر پھوڑ دیواروں سے۔ وہ تو عیش کررہی ہوگی ولایت میں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ارے لوگو' اس بے چارے کو دیکھو۔ یہ جس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے لات مار کے اسے کتے کی طرح بھگادیا۔ اس کی شکل دیکھو' یہ اس صدی کا سب سے بڑا عاشق تھا۔ شادو کو چاہتا تھا' سالا لاوارث یتیم خانے کی پیداوار۔"

رئیس نے گھبرا کے کہا "یار ناصر' خدا کے لیے تو جا۔"

شاہ جی اب زار و قطار رونے لگا تھا۔ کچھ لوگ چلتے چلتے وہاں رک گئے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ شاہ جی کا نشہ ہرن ہوگیا تھا اور وہ اذیت سے چیخ رہا تھا۔ میں نے اس کے زخم دل کو کھرچ کے اس پر نمک چھڑک دیا تھا۔

اچانک ایک گاڑی اس کے قریب آکے رکی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ یہ شاہ جی کی گاڑی تھی' اس میں سے شاہ جی کا ڈرائیور باہر آیا۔ پھر مُلّا ٹھیکے دار اور ایک شخص جسے میں نہیں جانتا تھا۔

مُلّا ٹھیکے دار اب پہلے سے بہت زیادہ بیمار اور کمزور نظر آرہا تھا۔ وہ شاہ جی کا سب سے پرانا کاروباری حریف تھا اور وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پھر اچانک مُلّا ٹھیکے دار کو کینسر ہوگیا اور اسے معلوم ہوا کہ وہ اب زیادہ دن نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیے گا۔ اس کی بیٹی رفیق عرف فیکے کو چاہتی تھی اور اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جب فیکے نے شادی سے انکار کیا تو ملا نے شاہ جی سے مدد مانگی۔ شاہ جی نے بھی ساری عمر کی دشمنی کو بھلا دیا اور ملا ٹھیکے دار کی بیوی کو بہن بنا کے اس کی بیٹی کی ذمے داری بھی قبول کرلی۔

ملا ٹھیکے دار نے رئیس کو دیکھا اور پھر شاہ جی کو "یہ تیرے ساتھ تھا۔۔ کب سے؟"

رئیس نے اپنا دفاع کیا "قسم اللہ کی۔۔ میں نے تو ابھی دیکھا ہے شاہ جی کو۔ ہم ادھر سے گزرے تو۔۔ یہ یہاں بیٹھا تھا۔"

"تین دن سے ہم اس کو تلاش کررہے ہیں۔ سارے شہر میں۔ تو نے کسی کو بتایا بھی نہیں" ملا نے غرا کے کہا۔

"ملا جی۔ میری بات نہیں سنی تم نے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے بھی دیکھا تھا شاہ جی کو۔ میں اسے واپس گھر لے جا رہا تھا۔" رئیس گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

ملا نے شاہ جی کا بازو تھام لیا "چلو شاہ جی۔ گھر چلو میرے ساتھ۔"

شاہ جی نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "گھر نہیں جاؤں گا میں۔ میں ولایت جاؤں گا' اپنی شاردہ کے پاس۔"

شاہ جی کے ڈرائیور اور اس کے ساتھ آنے والے نے ملا کے اشارے پر آگے بڑھ کے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا اور کھینچ کر گاڑی کی طرف لے گئے۔ شاہ جی چلاتا رہا "چھوڑو مجھے۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ مجھے ولایت جانا ہے اپنی بیٹی کے پاس۔"

ملا نے جمع ہوجانے والے لوگوں سے کہا "بیٹی اسے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ اس صدمے سے دماغ چل گیا ہے اس کا" پھر وہ خود بھی کار میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

رئیس افسردہ سا میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ تماشا دیکھنے والے بھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے منتشر ہوگئے۔ وہ سب متفق تھے کہ بڑا خراب زمانہ آگیا ہے۔ اچھا زمانہ کب آتا ہے؟ شاید کبھی نہیں۔ جو زمانہ گزر جاتا ہے' وہی اچھا ہوجاتا ہے۔ صدیوں سے بوڑھوں کو قربِ قیامت کی نشانیاں صرف نئی نوجوان نسل کے اعمال میں ہی دکھائی دے رہی ہیں۔ جب نئی نوجوان نسل کا وقت گزر جائے گا تو وہ بھی ایسا ہی سمجھیں گے۔

رئیس کا جذباتی ردِعمل میرے جذبات کے برعکس تھا۔ شاہ جی کی شکستہ سامانی اور زبوں حالی نے مجھے ایک انتقامی قسم کی خود غرضانہ خوشی دی تھی۔ میرے نزدیک یہ مکافاتِ عمل تھی اور قدرت کے نظامِ انصاف کی سزا تھی کہ شاہ جی کی فرعونیت کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ میں اس لیے بھی خوش تھا کہ شاہ جی میرے عذاب کا ذمے دار تھا اور اب خود عذاب کاٹ رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھی تھا جس نے ان گنت انسانوں کو حشرات الارض کی طرح اپنے پیروں سے کچل دیا تھا مگر پھر ایک چیونٹی نے اسے گرا دیا تھا اور وہ چیونٹی میں تھا۔

اس رات میری نیند کئی بار خراب ہوئی۔ میں نے ڈراؤنے خواب دیکھے جو میرے پریشان خیالات کا عکس تھے۔ میرے ماضی کی پرچھائیں تھے یا میری نا آسودہ خواہوں کی تصویر تھے۔ میں نے دیکھا کہ شاہ جی کو ایک ٹرک نے کچل دیا ہے اور وہ بدصورت خون آلود گوشت کے ڈھیر کی طرح پھڑک رہا ہے۔ پھر میں نے شاردہ کو دیکھا۔ وہ لباسِ عروسی میں تھی اور دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے ہنسی اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا اور پھر مجھے اس بیڈ پر لے گئی جس پر ہاشمی صاحب کروٹ لیے بے سُدھ پڑے تھے۔ "یہ بڈھا تو ایویں ہے" اس نے سرگوشی میں بتایا۔ میں بہت ڈرا ہوا تھا مگر شاردہ کے قرب کی خوشبو نے میرے وجود میں آگ سی بھردی۔

صبح غسل کے بعد میں نے اذانِ فجر سنی اور نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلا گیا۔ مجھے ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب کی ضرورت تھی۔ یہ بازار میں ملنے والی چیز ہوتی تو شاید مجھے خدا یاد نہ آتا۔ یہ اس کی بے نیازی اور بندہ پروری تھی جو دلوں کا حال جانتا ہے کہ اس نے میرے سجدۂ نیاز کو قبول کیا اور مجھے وہ سکون کی دولت عطا کی جس میں امان تھی۔

میں واپس آیا تو ہیر دروازہ کھولے باہر گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی "کہاں دفع ہوگیا تھا سویرے سویرے؟"

میں نے کہا "ماسی۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ نماز پڑھنے گیا تھا۔"

"جوتی ماروں گی جو مجھ سے جھوٹ بولا" اس نے بڑی محبت آمیز خفگی سے کہا۔

میں ہنسنے لگا "خود جا کے مولوی صاحب سے پوچھ لو۔ اور جوتی مارنی ہے تو اس کے گنجے سر پر مارو جو مرا پڑا ہے ابھی تک۔۔ نہ خدا کا نہ رسولؐ کا۔"

"تیرا بیڑا غرق۔" اس نے سچ مچ جوتی اتار کے میری طرف پھینکی مگر میں بچ کے نکل گیا۔ "شرم نہیں آتی رانجھے کے بارے میں زبان سے ایسی بات نکالتے ہوئے۔"

میں نے کہا "حد کرتی ہو تم بھی۔ میں نے کیا کسی کا نام لیا ہے۔ اس شہر میں کیا اس محلے میں نہ جانے کتنے سوئے پڑے ہوں گے جو ڈاکٹر رانجھا کے مقابلے میں کہیں زیادہ گنجے ہوں

گے۔ اس کے سر پر تو خاصے بال ہیں۔ کل پورے نو دو گیارہ تھے' میں نے خود گنے تھے۔"

ڈاکٹر رانجھا منہ پھاڑ کے جماہی لیتے نمودار ہوئے "بھئی یہ کیا بھگدڑ ہے گھر میں صبح صبح۔ بندہ چین سے سو بھی نہیں سکتا۔"

ماسی ہیر کی آتش فشانی کا رخ بدل گیا "اور کب تک سوتا تھا تو نے رانجھے؟ صور اسرافیل تک؟ اسے دیکھ ناصر کو۔ مسجد گیا تھا نماز پڑھنے' دیکھ کیسا نور ہے اس کی شکل پر۔ اور اپنی شکل دیکھ' جیسے فیوز بلب۔"

ڈاکٹر رانجھا دھوتی سمیٹ کے اور آلتی پالتی مار کے فرش پر بیٹھ گئے "چل تو اسے لٹکا لے بلب کی جگہ اگر اتنا ہی نورانی چہرہ ہوگیا ہے آج اس کا۔ مگر مجھے چائے بنا دے دھواں دھار قسم کی۔ پتی زیادہ دودھ کم۔"

وہ بڑبڑ کرتی کچن میں چلی گئی "آنکھ کھلی نہیں کہ چائے۔ خالی پیٹ یہ زہر پی پی کے روز اپنا جگر جلاتا ہے۔"

"او نیک بختے' ایک جگر کیا۔۔ سارا دن اپنا دل جلاتا ہوں۔ خون جلاتا ہوں۔ جی جلاتا ہوں یہ سوچ سوچ کے کہ رب نے تقدیر ایسے ہی بنا دی۔ کسی فارمولے کے بغیر۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "فارمولے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

اس نے اپنے سر کو گرد جھاڑنے کے انداز میں صاف کیا "پُترجی۔ دوائی دیسی ہو یا ولایتی۔ اس کا ایک فارمولا ہوتا ہے۔ ایک نسخے میں اگر سات چیزیں بھی پڑتی ہوں تو ان کا تناسب ہوتا ہے تولے ماشے میں۔ یہ نہیں کہ مٹھی بھر بھر کے جتنا بھی چاہا سب ملا کے پکڑا دیا۔ لیکن تقدیر کے معاملے میں ایسا ہی نظر آتا ہے مجھے برخوردار' رب نے خیال نہیں رکھا کہ کس کو کتنا دینا چاہیے۔"

"رانجھے۔۔ رانجھے' کیوں کفر کا کلمہ نکالتا ہے منہ سے" ہیر نے ہمارے درمیان چائے کے دو کپ رکھ دیے جن کی سطح پر ملائی تیر رہی تھی اور روغن کے ننھے ننھے قطرے نظر آرہے تھے "توبہ کر توبہ۔"

"اس میں کون سی بات غلط ہے" ڈاکٹر رانجھا نے شڑپ سے ایک گھونٹ لیا "دیکھ لے دولت مل گئی بدنیت لوگوں کو۔ چوروں اور بدمعاشوں کو۔ خود غرض اور کنجوس لوگوں کو۔ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے۔ میری طرح خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔ جن کو نیکی کرنے کی توفیق ملی ہے ان کے پاس بس توفیق ہی توفیق ہے۔ وہ کیا فرما گئے ہیں اپنے علامہ اقبال صاحب کہ۔۔ نام مطلوب ہے تو کچھ فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا۔۔ چاہ بنا۔۔ مسجد و تالاب بنا۔"

میں نے کہا "یہ علامہ اقبال کا شعر نہیں ہے۔"

ایم۔اے۔راحت کا ایک شاہکار ناول
پارس
اُس شخص کا قصہ جو اپنی تلاش میں نکلا تھا
عشق' جُرم اور جنُون سے جنم لینے والا ہنگامہ خیز ناول
۱۲۰ روپے

"او یار' اپنے فیض صاحب کا ہوگا۔ ان کا تخلص بھی آیا ہے شعر میں" ڈاکٹر رانجھا نے فوراً معذرت کرلی۔

میں نے ہنس کے کہا "فیض کا بھی نہیں ہے۔"

وہ جھنجلا گیا "اچھا میاں' کسی کا بھی نہیں ہے۔ شعر تو ہے' مجھے مل جاتا شاعر تو میں کہتا کہ جناب عالی' باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ یہ سب بنانے کے لیے بندو بست تو ہو سرکاری ٹھیکے دار' دو پل بنائے دو سڑکیں بنائے' چار ٹیوب ویل لگائے تو اللہ میاں کو راضی رکھنے کے لیے ایک مسجد بھی بنا دی یا کوٹھی پر موٹا موٹا لکھوا دیا کہ ہٰذا من فضل ربی۔ فیض کے اسباب بنانے سے پہلے مال بنانے کا مشورہ کیوں نہیں دیا آپ نے؟"

میں نے کہا "سب کچھ پیسے سے نہیں ہوتا ڈاکٹر صاحب!"

"او کاکا جی! ابھی دنیا کہاں دیکھی ہے تم نے" اس نے چائے کی پیالی کو لہرا کے کہا "مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کرے جس کے دل میں قوم کا درد ہو مگر جیب خالی ہو۔ کوئی قوم کی حالت سدھارنا چاہے' تعلیم کی روشنی پھیلانا چاہے۔ خدمتِ خلق کرنا چاہے ہماری طرح۔ خدا نے ہاتھ میں شفا بھی دی ہو مگر مال نہیں تو خالی نیت اور ارادے سے کیا ہوتا ہے؟ مال ہے اسمگلروں کے پاس اور رشوت خوروں کے پاس۔"

اس کی ٹھنڈی آہ سے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی "دکھی انسانیت کی خدمت کررہے ہیں آپ۔ جس حد تک ممکن ہے۔ پھر افسوس کی کون سی بات ہے؟"

"افسوس کی بات یہ ہے پُترجی کہ ابھی جو کچھ میں کررہا ہوں' وہ بہت کم ہے۔ فرض کرلو کہ بندے کے پاس ٹھنڈے میٹھے شربت روح افزا کا بہت بڑا ڈرم بھرا ہوا ہو اور پیاس بجھانے والوں کا ایک جمِ غفیر ہو لیکن پلانے والے کے پاس گلاس ایک ہی ہو۔ یہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دستِ شفا دیا ہے اس سے ابھی سو فیض یاب ہورہے ہیں۔ اس سے دو سو چار سو یا ہزار کو شفا مل سکتی ہے مگر تم نے وہ جگہ دیکھی ہے' دس بندے آجائیں وہاں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر اب تو ادھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بھی ڈیرا اٹھانا پڑے گا۔"

میں نے کہا "کیوں؟ مالک مکان نے نوٹس دیا ہے کوئی؟"

اس نے پھر آہ بھری "نوٹس ہی سمجھو۔ وہ جگہ بیچ رہا ہے۔ پوری جگہ' چار دکانیں ہیں نیچے' اوپر چار کھلے کمرے۔ مجھ سے خود مالک مکان نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب' آپ لے لو یہ جگہ۔ چاروں دکانوں میں کلینک بناؤ اوپر مزے سے رہائش رکھو۔ پہلا حق آپ کا ہے' اسے بڑی جلدی ہے۔ دبئی کا ویزا لگ گیا ہے اور وہ دبئی میں کسی کے ساتھ مل کے بزنس کرنا چاہتا ہے۔ یوں سمجھو کہ مجھے کوڑیوں کے مول دے رہا تھا وہ جگہ۔"

ماسی ہیر نے کچن میں سے کہا "حرص نہیں کرتے رانجھے۔ جو نصیب میں نہ ہو اس کے لیے رونے سے کیا فائدہ۔ اللہ کرے گا سب ہو جائے گا۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "کیا مانگ رہا ہے وہ اس جگہ کا؟"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "ڈھائی۔"

"ڈھائی ہزار ہمارے پاس کہاں؟" ماسی ہیر نے وہیں سے کہا۔

"بے نا عورت ذات' بے عقل۔ ڈھائی ہزار میں تو بندے کو قبر نہیں ملتی اچھی۔ یہ اتنی اچھی جگہ ڈھائی ہزار میں چاہتی ہے۔"

میں نے کہا "تم بات کرو اس سے۔"

رانجھا چونکا "کیا بات کروں؟"

"سودا کرنے کی بات کرو۔ اس سے پوچھو کاغذات کب تک تیار ہو سکتے ہیں؟ بیعانہ وہ چاہے تو آج لے لے۔ ہم خرید لیں گے وہ جگہ۔"

رانجھے نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شک ہے یا میری نیت پر۔ شاید میں اس کی حسرت کی دیوانگی کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ میری فراخ دلانہ پیشکش میں خلوص نہیں تمسخر کا انداز ہے۔ "ہم۔۔۔ ہم کون۔۔۔؟"

میں نے ہنس کے کہا "ہم یعنی میں اور تم۔ اگر تم نہیں تو میں اور میں نہیں تو تم۔ کیا فرق ہے ہم میں اور تم میں؟"

ماسی ہیر نے پراٹھوں کی چنگیر بالآخر نیچے رکھ دی۔ وہ بہت دیر سے ہکا بکا کھڑی میری صورت کو تک رہی تھی۔ "ہم تم کی دُم۔ ڈھائی لاکھ کتنے ہوتے ہیں' کچھ پتا ہے۔ سو سو والے کتنے نوٹ ہوتے ہیں۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "یہ تو حساب لگانا پڑے گا۔"

"چلو ناشتا کرو۔ ڈھائی لاکھ کا سودا کریں گے آج ہی۔ دماغ خراب ہو گیا ہے دونوں کا۔" وہ پھر کچن کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑائی۔

رانجھا کی بھوک میری بات سن کر ہی اڑ گئی تھی "تم مذاق کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "مذاق کرنے کی بیماری تو ہے مجھے مگر میں اس وقت تم سے زیادہ سنجیدہ ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہارے ساتھ جا کے خود اس سے بات کر سکتا ہوں۔ اور ہم اسے بیعانے کی رقم کا چیک بھی دے سکتے ہیں۔ پچیس ہزار میں ہم سے سودا پکا کرے۔ باقی رجسٹری کے وقت' کیا خیال ہے؟"

"کیسا خیال؟ کس کا خیال۔۔۔ یہ تمہارا خیال ہے" رانجھا بے وقوفوں کی طرح بولا "کیا تم نے کہیں ڈاکا ڈالا ہے۔ یا ڈالو گے؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اطمینان سے ناشتا کرو۔ تم بہت زیادہ گھبرا گئے ہو۔"

ماسی ہیر ہمارے پاس آ کے بیٹھ گئی "تو پہلے مجھے یہ بتا کہ ڈھائی لاکھ تیرے پاس کہاں سے آئے؟"

میں نے کہا "ماسی۔ تم کو آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے۔ پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت کیسے نہیں؟" وہ بگڑ گئی "تو چوری کر کے لائے گا آم تو میں ان پر تھوکوں گی بھی نہیں۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کوئی ایسا کام کروں گا؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے کہا "دیکھو ناصر' تو ایسا نہیں ہے مگر دنیا میں سب تیرے جیسے نہیں ہیں۔ بندہ محبت سے بگڑتا ہے۔ باہر کوئی بھی تجھے بہکا سکتا ہے۔ شیطان دشمن ہے انسان کا۔ اس نے بڑے بڑے پیغمبروں کو اور ولیوں کو بہکا دیا۔"

رانجھے نے ہیر کی تائید میں سر ہلایا "کاکا جی۔ بے شک خواب دیکھنا بندے کی مجبوری ہے اور اس کے لیے ضروری بھی ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ میں محل خریدنے اور مرسیڈیز کار میں پھرنے کے لیے ڈاکے ڈال کے دولت اکٹھی کروں۔"

میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا "اور پھر کہاں سے آئے گی دولت؟ اللہ میاں بھی گھر بیٹھے کو چھپر پھاڑ کے نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ اب چھپر ہیں کہاں؟ اوپر چار پانچ منزلیں ہوں تو سب کی چھت آر سی سی کی ہوتی ہے۔"

رانجھے نے کہا "میرا کوئی پرائز بانڈ نکل سکتا ہے۔ یا میرے ہاتھ وہ نسخہ کیمیا لگ جائے جس سے پیتل کو سونا بنانا ممکن ہو۔ کہیں سے میرے ہاتھ کسی مدفون خزانے کا نقشہ لگ جائے۔ میرا کوئی دور کا کروڑ پتی عزیز سب کچھ میرے نام

کر کے فوت ہو جائے۔"

ہیر نے کہا "در فٹے منہ۔ تیرا کوئی ہے اس دنیا میں اور ہو گا تو تجھ سے زیادہ ہی کنگلا ہو گا۔"

"اور تیرے خاندان میں تو جیسے سب کے پاس حویلیاں تھیں۔ ہاتھی گھوڑے تھے۔" رانجھے نے خفگی سے کہا۔

انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ میرے پاس ڈھائی لاکھ نقد بھی ہو سکتے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں یقین دلایا کہ میرے پاس اتنی رقم ہے تو وہ میرے پیچھے پڑ گئے کہ آخر یہ دولت کہاں سے آئی اور میں نے جمع کی تو کیسے کی جبکہ میرا ذریعۂ آمدنی بظاہر کچھ بھی نہیں ہے۔

میں نے جھوٹ سچ بول کے انہیں مطمئن کر دیا تو خوشی سے ہیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ڈاکٹر رانجھا تو تقریباً پاگل ہی ہو گئے۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا اور مجھ سے یا اپنے آپ سے کوئی سوال کر کے خود ہی جواب دیتا تھا یا اپنے آپ پر ہنستا تھا اور بار بار پوچھتا تھا "یار' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ جو سوچے وہ اتنی جلدی سچ ہو جائے۔" اور سر ہلاتا تھا "واہ جی' سوہنے رب کے کھیل نیارے ہیں' کیوں بھئی اپنی ہیر یئے' مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

اس وقت اگر میں اس سے یہ کہہ دیتا کہ میں کلینک کی جگہ اپنے نام سے نہیں بلکہ اس کے نام سے خریدوں گا تو شاید وہ سچ مچ پاگل ہو جاتے یا میری بات ماننے سے انکار کر دیتے۔ جس گھر میں ہم سب رہتے تھے وہ میں ان کے نام کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کی بات سن کے میں نے اپنا فیصلہ صرف اس حد تک تبدیل کیا کہ اسے وہ جگہ دے دی جو اس کے خوابوں کا حاصل تھی۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ ڈھائی لاکھ فوری طور پر نقد ادا کر دوں۔ یہ مکان بعد میں بیچا جا سکتا تھا اور کم و بیش اتنی ہی قیمت کا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا میرے ساتھ بڑی بیچ دیچ سے نکلے اور ان کی ہیر نے انہیں خوشی سے تمتماتے چہرے اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بلائیں لے کر ایسے رخصت کیا جیسے ساری دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوتے وقت سکندر اعظم کو اس کی بیوی نے (یا بیویوں نے) رخصت کیا ہو گا۔ مجھے اس نے دوبارہ گلے لگا کے چوما اور دوپٹے کا پلو پھیلا کے مجھے اتنی دعائیں دیں جتنی اسے یاد تھیں اور اس نے سنی تھیں۔ یہ دعا کے رسمی جملے نہیں تھے۔ ہیر کے لبوں سے ادا ہونے والے دعا کے الفاظ اس کے دل کی گہرائی سے نکلے تھے اور سمندر کی بے پایاں گہرائی سے نکلنے والے سچے موتیوں جیسی آب رکھتے تھے۔ اسے خوش دیکھ کے مجھے بڑی انمول خوشی ملی تھی اور اس کی دعاؤں کے حصار میں مجھے بڑی عافیت محسوس ہوئی تھی۔ اتنی سچی دعا ایک ماں کے سوا کون دے سکتا تھا اور اپنی شادی کے بعد کسی بچے کی ماں نہ بننے والی ہیر بھی مامتا کے جذبات سے دنیا کی ہر ماں کی طرح مالا مال تھی۔

ڈاکٹر رانجھا کے قدم جیسے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ خواب زدہ آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں سے بے یقینی کی کیفیت عیاں تھی۔ شاید کسی بے نام سے خوف کا خیال اسے اندر سے پریشان کر رہا تھا کہ یہ حقیقت نہیں ہے خواب ہے۔ میں نے پہلے انہیں ایسے وقت میں سر چھپانے کا ٹھکانا فراہم کیا تھا جب ان کے گھر کو میونسپل کارپوریشن نے بلڈوز کر دیا تھا اور وہ بہ مشکل تمام ہی وہاں سے تن کے کپڑے اور دو چار برتن لے کر نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ میں ان کے حق میں فرشتۂ غیب ثابت ہوا تھا جس نے ان پر خدا کی رحمتوں اور نعمتوں کے سارے بند دروازے کھول دیے تھے۔

میں نے بینک سے پچیس ہزار نقد نکلوائے تو ڈاکٹر رانجھا کا اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رہا "میں تمہارے احسانوں کا بدلہ کیسے اتاروں گا پتر جی۔"

میں نے کہا "پتر جی بھی کہتے ہو اور احسان کی بات بھی کرتے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اور کیا کہوں۔۔۔ اللہ نے اولاد شاید اسی لیے نہیں دی تھی۔ وہ آزمانا چاہتا تھا مجھے۔۔۔ شکر ہے میں اس آزمائش میں پورا اترا۔ میں راضی برضا رہا۔ میں نے کبھی دوسری شادی کرنے کا سوچا تک نہیں۔ اور دیکھو سوہنے رب کی شان۔ اس عمر میں میرے مولا نے مجھ پر کیسا کرم کیا۔ اس نے مجھے پلا پلایا جوان بیٹا دے دیا۔ اس کی مصلحت کو کون جان سکتا ہے۔ کیا پتا میرا اپنا بیٹا ہوتا تو نافرمان' آوارہ اور بد چلن ہوتا۔ وہ تم جیسا نہ ہوتا' میں پچھتاتا کہ وہ میرا بیٹا کیوں ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ بس کرو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں پتر جی! مجھے بڑا فخر ہے تم پر۔ اور بڑا غرور ہے اپنے نصیب پر۔" وہ بولا "ایک بات پوچھوں اگر برا نہ مانو۔"

"برا کیسے مان سکتا ہوں میں' آپ پوچھیں۔"

"تم کرایہ کتنا لو گے۔ کلینک کا اور مکان کا۔ دراصل میری آمدنی بھی اتنی نہیں ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے برہمی سے کہا "آپ بے عزتی کر رہے ہیں میری۔ آپ کا گھر ہوتا تو کیا اپنے والدین کو آپ کرائے پر رکھتے؟ کہہ دیں کہ ہم تمہارے والدین نہیں ہیں' غیر ہیں۔ پھر میں کرایہ لے لوں گا۔ کہہ دیں کہ آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔"

"اوئے ایویں خفا مت ہو پترجی۔۔۔ میرا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔۔۔ میں کہہ سکتا ہوں ایسی فضول بات" وہ مجھے منانے لگا "چل تو جیسے کہے گا وہی ہوگا۔ ہم پہلے کی طرح اکٹھے رہیں گے۔ اور وہ تو اتنا بڑا گھر ہے کہ جب ہم تیری ووہٹی لائیں گے تو بھی وہ ہمارے لئے بڑی جگہ ہوگی۔ جگہ ہوتی ہے بندے کے دل میں۔ رونق ہوگی گھر میں جب بچے کھیلیں گے وہاں۔۔۔ اور میں ڈاکٹری سکھاؤں گا تجھے۔"

میں ہنس پڑا "میرا ارادہ ڈاکٹری کرنے کا ہے اور نہ شادی کرنے کا۔"

وہ مسکرانے لگا "ابھی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وقت آنے پر سب ہو جاتا ہے۔ ارادہ بھی بن جاتا ہے پترجی۔"

وہ شاید سات مرلے جگہ تھی۔ چار دکانوں میں سے ایک میں "ہیئر کلینک" تھا۔ دوسری میں ایک ہیئر ڈریسر تھا۔ تیسری بند پڑی تھی اور چوتھے میں خود مالک مکان نے پرچون کی دکان پر "شاہین جنرل اسٹور" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ ہیئر ڈریسر بھی "شاہین حمام گرم" تھا۔ ڈاکٹر رانجھا نے مجھے بتایا "مالک مکان کے دل میں علامہ اقبال صاحب کے شاہین کے لیے بڑی عقیدت کے جذبات ہیں۔ اس کی شرط تھی کہ میں کلینک کا نام "شاہین کلینک" رکھوں۔ اس کے بغیر دکان کرائے پر نہیں مل سکتی۔ میں نے اسے بتایا کہ رانجھے کے دل میں ہیر کے لیے جو جذبات تھے وہی میرے بھی ہیں۔ چنانچہ میں شاہین کی طرح پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کر سکتا ہوں مگر بورڈ پر "شاہین کلینک" نہیں لکھ سکتا۔ اس سے ہیر رانجھا کے علاوہ وارث شاہ کی روح کو جتنی تکلیف ہوگی اس سے زیادہ میری منکوحہ کو ہوگی۔ پھر مالک مکان کیسے نہ مانتا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ جو دکان بند پڑی ہے اس کو ایک پنکچر لگانے والے نے کرائے پر حاصل کرلیا تھا مگر اس نے "شاہین پنکچر شاپ" لکھنے سے انکار کردیا۔ اس کی دلیل تھی کہ شاہین پنکچر نہیں ہو سکتا۔ اور دکان خالی کر گیا تھا۔"

مکان کی بالائی منزل پر "شاہین ہاؤس" کے ساتھ ہی برائے فروخت کا بورڈ لگا دیا گیا تھا بلکہ مالک مکان ابھی بقلم خود بورڈ لکھ کے اسے صحیح جگہ اور زاویے پر لٹکانے کے عمل میں مصروف تھے کہ ڈاکٹر رانجھا نے اسے نیچے سے آواز دی

"اوئے صوفی' ہٹالے یہ برائے فروخت کا بورڈ۔"

مالک مکان ایک دبلا پتلا شریف النفس صوفی تھا "کیوں ڈاکٹر صاحب' مکان تو بیچنا ہے۔ بورڈ نہ لگاؤں تو کیا خود آواز لگاؤں؟"

ڈاکٹر رانجھا نے میرے ہاتھ سے لے کر نوٹ لہرائے "مکان ہم خرید چکے ہیں۔ نیچے آجا فٹافٹ۔۔۔ اور رسید بنا۔"

صوفی کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے ہاتھ سے بورڈ چھوٹ گیا۔ ایک شخص کا سر بال بال بچ گیا جو بال کٹوانے کے لیے شاہین گرم حمام میں داخل ہونے والا تھا۔ صوفی نے نیچے آکے اس سے معذرت کی۔ وہ اتنا خوش تھا کہ کسی وجہ کے بغیر کسی سے بھی معذرت کر سکتا تھا۔

مجھے اس علاقے میں پراپرٹی کی قیمت کا کوئی اندازہ نہ تھا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ڈھائی لاکھ کے عوض یہ سودا فائدہ مند تھا یا نہیں۔ یہ ہوسکتا تھا کہ صوفی نے ایک اچھے سیلز مین کی چرب زبانی سے ڈاکٹر رانجھا کو قائل کرلیا ہو کہ وہ واقعی اشد اور فوری ضرورت کے تحت یہ مکان کوڑیوں کے مول بیچ رہا ہے اور اسے دبئی نہ جانا ہوتا تو اسے مکان کی زیادہ اچھی قیمت مل سکتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جگہ ڈاکٹر رانجھا کو پسند تھی اور اس کی ضرورت پوری کرتی تھی۔ اسی جگہ وہ رانجھا شربت فروش کی حیثیت سے برسوں ریڑھی لیے کھڑا رہا۔ یہیں اس نے شربت فروشی کے ساتھ اپنی حکمت کے تجربات کا آغاز کیا اور حسن اتفاق' خوبی تقدیر یا تائید ایزدی کے باعث اس کے دست شفا کی شہرت عام ہوئی تو وہ ڈاکٹر رانجھا ہوگیا۔ موقع ملتے ہی اس نے ٹھکانا بدلے بغیر سڑک کے دوسرے کنارے پر اپنا "ہیئر کلینک" کھول لیا۔ اس کے پاس آنے والے سب گردونواح کے لوگ تھے۔ اگر اسے "ہیئر کلینک" کو کسی دوسرے علاقے میں منتقل کرنا پڑتا تو اس کی ساری حکمت اور ڈاکٹری چوپٹ ہو جاتی۔

بیعانہ ادا کرنے کے بعد رانجھا کی خودی اور خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ایک بہت بڑے کلینک اور اسپتال کے مالک کی نظر سے اس نے عمارت کا دورہ کیا۔ مجھے بتایا کہ اوپر کے چار کمروں میں کون کہاں رہے گا۔ رنگ و روغن سے آرائش و زیبائش کے تمام لوازمات پر غور فرمانے کے بعد اس نے "شاہین گرم حمام" کے پروپرائٹر سے مذاکرات کئے اور اسے کہا کہ وہ دکان خالی کردے۔

"ان چاروں دکانوں کو ایک کرکے یہاں بہت بڑا کلینک اور اسپتال بنایا جائے گا۔ میں نے یہ بلڈنگ خریدلی ہے" اس نے یوں کہا جیسے وہ سات مرلے کی عمارت شاہ دین بلڈنگ ہے۔

گیسو تراش نے بڑا واویلا کیا "یہ تو بڑا ظلم ہے ڈاکٹر صاحب۔"

رانجھا نے اس سے اتفاق کیا "ہاں۔ دنیا میں بڑا ظلم ہے ہر جگہ۔"

"آپ ہمارے پیٹ پر لات مار رہے ہو جی۔"

رانجھا نے میری طرف دیکھا "ابھی تک تو ہم نے کہیں بھی لات نہیں ماری ہے مگر ایک جگہ ہے جہاں لات مار کے ہم تمہیں باہر نکال سکتے ہیں۔"

"ایسے کیسے نکال سکتے ہو جی۔ نوٹس دو باقاعدہ۔ ہمارا بھی روزگار کا معاملہ ہے۔ ہم عدالت میں جائیں گے" باربر نے غصے میں استرے کو شمشیر آبدار کی طرح چلانا شروع کیا اور بالوں کو دشمن کی سپاہ کی طرح صاف کرنے لگا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دیکھو خلیفہ۔ یہ تھانے کچہری کی بات ہم سے مت کرو۔ تمہیں شوق ہے تو تم ضرور رپورٹ لکھوا دینا کہ حملہ آوروں نے سارا سامان توڑ دیا۔ ساری ہڈیاں توڑ دیں اور پھر ساری ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے ساتھ مجھے بھی ٹرک میں ڈال کرلے گئے اور پھینک آئے واہگہ میں انڈیا پاکستان کی بارڈر پر۔ اگر کوئی چشم دید گواہ حملہ آوروں کی حیثیت سے ہمیں پہچان سکا تو کیا ہوگا۔ ہم ثابت کردیں گے کہ وہ جھوٹا ہے۔۔۔ یا ضمانت کرالیں گے اپنی۔"

"تم۔۔۔ تم کون ہو۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا" وہ ہکلانے لگا۔

"مگر مجھے ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھ لائے ہیں اور دس ہزار اسی لیے دیے ہیں کہ اپنی بات تمہیں سمجھا دوں۔ ہم یہی کام کرتے ہیں۔ بات کسی کی سمجھ میں نہ آرہی ہو تو خرابی دماغ میں ہوتی ہے۔ ہم دماغ درست کردیتے ہیں اپنے طریقے سے۔۔۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بڑے سرد و سفاک لہجے میں کہا پھر بڑے قاتلانہ انداز میں مسکرا دیا۔

اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔ زیر حجامت شخص نے دوسری بار کراہ کے کہا "ہائے او ظالما" باربر نے دوسری بار سر کی صاف سطح پر خون کو اسپرٹ میں بھیگی ہوئی روئی کے پھاہے سے صاف کیا تھا۔ تاہم یہ آخری چرکا تھا۔ فارغ ہوتے ہی مجروح شخص نے پانچ کا نوٹ پھینکتے ہوئے باربر کو خوں آشام نظروں سے گھورا اور یہ اعلان کرکے نکل گیا کہ جو پھر وہاں قدم بھی رکھے وہ۔۔۔

میں نے جو کچھ باربر سے کہا تھا' چنڈال چوکڑی پر بھروسا کرتے ہوئے کہا تھا۔ اگر وہ میری بدمعاشوں والی اداکاری سے متاثر نہ ہوتا تو پھر دکان خالی کرانے کے لیے انسپکٹر جیرا بلیڈیا جانی جن اور چاچا پتنگ باز جیسے فنکار اپنا کام دکھاتے۔ باربر نے بھی ہمیں قانون سے ڈرانے کی کوشش ضرور کی تھی مگر لاقانونیت کے مظاہرے کی دھمکی سے وہ خود ڈر گیا۔ اس نے ایک مہینے میں دکان کہیں قریب ہی منتقل کرنے کا وعدہ کرلیا تو میں نے بھی دوستانہ خیرسگالی کے جذبے سے کام لیا اور اسے کہا کہ وہ فکر نہ کرے۔ ہم اس کی مدد کریں گے اور جو یہاں رزق دیتا ہے وہاں بھی دے گا۔

صوفی بہت خوش تھا کہ اس کا مکان منہ مانگی قیمت پر اتنی جلدی فروخت ہوگیا۔ میرے خیال میں یہ قیمت مناسب ہی تھی چنانچہ میں نے بھی زیادہ بحث و تکرار سے گریز کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سودے میں غیر ضروری تاخیر کے نتیجے میں کوئی اور اسی قیمت پر یہ جگہ خرید لے اور ڈاکٹر رانجھا کے خواب کی تعبیر محض دس بیس ہزار کی خاطر ناقابل حصول ہو جائے۔

خود ڈاکٹر رانجھا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا "پترجی' سودا تو ہوگیا۔ ہزار شکر سوہنے رب کا۔"

میں نے کہا "ابھی صرف بات ہوئی ہے۔ سیل ایگریمنٹ آج ہی بن جائے تو اچھا ہے۔ اس کے بعد سیل ڈیڈ کی رجسٹری میں ایک مہینہ لگے گا۔ قبضہ اس وقت ملے گا جب ہم باقی ادائیگی کریں گے۔"

صوفی نے کہا "مہینہ تو مجھے بھی لگ جائے گا۔ شاہین جنرل اسٹور کا سامان بھی نکالنا ہے۔ دراصل مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب اتنی جلدی ادائیگی کردیں گے۔"

"ایک مہینے کی کوئی بات نہیں" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "مگر مہینے سے اوپر نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہاں۔ ہم تو کل ہی باقی رقم بھی ادا کرسکتے ہیں" میں نے کہا "تم ایسا کرو' شام کو آجاؤ ہاشمی صاحب کے آفس۔ وہ بہت بڑے وکیل ہیں۔ وہ کرادیں گے سارا کام۔"

اس دن ڈاکٹر رانجھا نے اپنا کلینک نہیں کھولا۔ واپسی میں اس نے جالندھر موتی چور ہاؤس سے ہیر کے لیے چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے لڈو خریدے۔ تندوری چرغہ اور روغنی نان لیے اور چاندی کے تاروں والا پھولوں کا ایک ہار لیا جو اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی ہیر کے گلے میں ڈال دیا۔ "مبارک ہو ہیرے۔ لاکھ بار مبارک ہو۔ تیرے نا سرِ پتر نے وہ کام کیا ہے کہ۔۔۔" پھر فرط جذبات سے اس کی آواز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلوگیر ہوگئی۔

ہیرے نے وہ ہار میرے گلے میں ڈال دیا اور میرا ماتھا چوما۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "رب تجھے بری نظر سے بچائے۔ رب تیری حفاظت کرے۔ تجھے ہر مصیبت سے دور رکھے۔ تجھے ہر خوشی دے۔"

میرا خیال ہے کہ جیسی سچی' روح کو طمانیت سے سرشار کرنے والی' بھرپور اور انمول خوشی مجھے اس دن ملی تھی وہ پھر زندگی میں کبھی نہیں ملی۔ اس خوشی نے میرے سارے غم بھلادیے تھے۔ سارے درد سمیٹ لیے تھے اور شاید یہ ہیرے رانجھے کے لیے بھی ان کی زندگی کا سب سے پرمسرت دن تھا جس نے ان کی ساری محرومیوں کے دکھوں کی تلافی کردی تھی۔

شام کو میں ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ ہاشمی صاحب کے آفس گیا تو صوفی پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ اتنی بڑی لیگل فرم تھی کہ ایک معمولی سے مکان کی خرید و فروخت کے لیے ان کی خدمات حاصل کرنا حماقت تھا۔ شاید وہ خود بھی انکار کردیتے مگر میرے ہاشمی صاحب سے خصوصی مراسم کے پیش نظر گل نواز خان نے ایک جونیئر وکیل کو طلب کیا اور صوفی اور ڈاکٹر رانجھا کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "تنگ تو نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔"

"یہ اندازہ کیسے کرلیا آپ نے؟"

اس نے دراز سے کاغذات نکالے۔ "ایسا نہ ہوتا تو تم لوٹ کر ہی نہ آتے۔ جہاں پنسل سے کراس لگا ہوا ہے وہاں دستخط کرتے جاؤ۔"

میں نے کہا "سوری سر۔ میں یہاں دستخط کرنے نہیں آیا تھا۔"

گل نواز اپنی جھولنے اور گھومنے والی گدے دار کرسی پر پیچھے ہوگیا۔ "اچھا! پھر کیا اسی کام کے لیے آئے تھے۔ یہ تو عدالت کے باہر بیٹھا ہوا منشی بھی کرادیتا۔"

"یہ بات نہیں' مجھے ویسے بھی آنا تھا۔"

"یعنی صرف یہ بتانے کے لیے کہ تم نے اپنا ارادہ بدلا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ مکان آپ میرے نام نہ کریں۔ اسے بیچ کے مجموعی رقم کا بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر بنادیں۔ نام اور اکاؤنٹ نمبر میں آپ کو بتادوں گا۔"

وہ سوچ میں پڑگیا "فوری طور پر شاید یہ ممکن نہ ہو۔"

"وائے از دی پرابلم؟"

"یوسی..... یہ فیصلہ خود ہاشمی صاحب کرسکتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کے لیے بھی ایک ہی بات ہے۔ وہ مکان دیں یا مکان کی نقد قیمت۔ پھر بھی ان سے پوچھے بغیر میں خود تمہیں کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ آپ پوچھ لیں جب بھی ان کا فون آئے۔"

"ابھی وہ اسپتال میں ہیں۔"

"کیا ہوا ہے انہیں؟" میں چونکا۔

"ہارٹ اٹیک" گل نواز خان نے کہا "میری بات ہوئی تھی مسز ہاشمی سے۔ انہوں نے کہا کہ کنڈیشن سیریس نہیں ہے۔"

شادو کے لیے مسز ہاشمی سن کے مجھے وہ اذیت ہوئی جو نفرت اور احساسِ ذلت کے جذبات کا ردِعمل تھی۔ گل نواز خان اس کا ذکر بڑے احترام سے کررہا تھا۔ ایک فقیر زادی' جسے کل تک میں اس حد تک اپنا سمجھتا تھا کہ تو کہہ کے مخاطب کرتا تھا۔ کبھی پیار سے تو کبھی غصے میں الو کی پٹھی تک کہہ دیتا تھا۔ میں اس پر حکم چلاتا تھا اور اس سے روٹھ جاتا تھا تو وہ رونے لگتی تھی۔ اچانک وہ مسز ہاشمی ہوگئی تھی۔ ایک بہت بڑی لیگل فرم کی مالک انتہائی معزز اور اہم۔ پہلے وہ اس آفس میں میرے ساتھ آتی تھی تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن اب اسے دیکھتے ہی خود گل نواز خان احتراماً اٹھ کے کھڑا ہوجاتا۔ اس آفس کا سارا اسٹاف باادب اور خاموش کھڑا رہتا۔ اس کی خوشنودی پاس کی خوشنودی سے زیادہ اہم تھی کیونکہ خود پاس اس کے اشارۂ ابرو کا غلام تھا۔ بندہ بے دام تھا۔ شادو کے معاملے میں میری عقل اور ذہانت (جس کا آئی کیو ایک سو تیس تھا۔ مائی فٹ) دھوکا کھاگئے تھے۔ میں اس عیار اور موقع شناس' حرص مند اور جاہ پرست عورت کو نہ پہچان سکا جس نے محبت کا سارا کھیل مجھے اسی طرح اپنے اشاروں پر نچانے کے لیے رچایا تھا جیسے اب وہ ہاشمی صاحب کو نچا رہی تھی۔ ایک ہوس کے مارے بوڑھے اور تنہا شخص کی فہم و فراست کو اس نے بڑی آسانی سے اپنے حسن و شباب سے مات دے دی تھی اور وہ سب کچھ حاصل کرلیا تھا جس کے خواب وہ چوری چھپے دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی جب وہ میرے ساتھ محبت کے ارمانوں کی جنت میں ہوتی تھی۔ اس نے مجھے انتہائی پستی سے انتہائی بلندی تک پہنچنے کے لیے ایک راکٹ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ آج وہ بلندیٔ افلاک پر جلوہ نما تھی اور میں اسی زمین پر اپنی بے توقیری کے ساتھ اور ندامتوں کے ساتھ پڑا رہ گیا تھا۔ راتوں رات وہ مسز ہاشمی

بن کے ہوائی جہاز کی فرسٹ کلاس میں پرواز کرکے سات سمندر پار پہنچ گئی جہاں تک میرے خیالوں کی رسائی بھی نہ تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے پُرتعیش شاہانہ بیڈ روم' چم چم کرتی سبک خرام لیموزین کاریں' لندن اور پیرس کے جگمگاتے سُپر اسٹورز کی شاپنگ' خوب صورت ملبوسات' ڈائمنڈ جیولری اور تحائف۔ اس کی ایک نگاہِ انتخاب پر وہ سیکڑوں ہزاروں ڈالر اور پاؤنڈ لٹادیتا ہوگا۔ اور اس سب کے بدلے شاہ جی' فقیروں کے ٹھیکے دار کی بیٹی شادو کو کیا دینا پڑا؟ صرف اپنا جوان شاداب جسم۔ اس کا کچھ بگڑنے سے پہلے ہی عمر کی مسافت میں چالیس سال آگے جانے والے ہاشمی صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ شاید وہ افسردہ چہرہ بنائے شوہر کے پاس موجود ہوگی مگر اس کے دل میں خواہش کا طوفان کتنا شدید ہوگا کہ اچانک اس کی حالت بگڑ جائے۔ اس کو پھر دل کا دورہ پڑ جائے جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ دو چار سال کیا' دو چار مہینے بھی نہیں۔ بس دو چار ہفتوں میں مشکل آسان ہوجائے تو کیا بات ہے۔ ایسی تقدیر بھی خدا کس کو دیتا ہے مسز ہاشمی۔

جب ڈاکٹر رانجھا اور صوفی لوٹ کر آئے تو میرے خیالات کی پُرشور آندھی یک لخت تھم گئی۔ میں نے دیکھا کہ گل نواز خان بڑی محتاط اور خاموش دلچسپی کے ساتھ میری صورت کے تغیرات سے میرے جذبات کو پڑھ رہا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "چلو چرچی' اپنا کام تو ہوگیا۔"

گل نواز خان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "اگر تم آسان راستہ اختیار کرو تو پھر کسی وقت آکے کاغذات پر سائن کردینا۔ مکان تم خود بھی بیچ سکتے ہو۔ کان کو ہاتھ گھما کے پکڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہاشمی صاحب آئی سی یو میں ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "نہیں۔ جیسے ہی ڈاکٹرز نے ان کو ہوائی سفر کی اجازت دی وہ لوٹ آئیں گے۔ مائلڈ سا اسٹروک تھا۔"

گل نواز خان کی آنکھوں میں اور اس کے لہجے میں ملامت کا انداز بہت مبہم تھا مگر میں اسے محسوس کرسکتا تھا۔ کچھ نہ کہنے کے باوجود اس نے کہہ دیا کہ یو باسٹرڈ' سن آف اے بچ' تم کیا آس لگائے بیٹھے ہو کہ وہ مرجائے گا۔ تم چاہتے ہو کہ وہ مرجائے مگر تمہارے چاہنے سے پہلے کچھ نہیں ہوا۔ وہ معمولی لڑکی تمہیں نہیں ملی جس کے عشق نے تمہیں پاگل کردیا تھا۔ ہاشمی صاحب لندن کے کراموِیل اسپتال میں ہیں جہاں دنیا کے سب سے قابلِ فزیشن اور سرجن موجود ہیں۔ وہ اسپتال عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ سرکاری اسپتال نہیں ہے جس کی سیڑھیوں پر تم جیسے دم توڑ دیتے ہیں اور کوئی لاش اٹھانے نہیں آتا۔

مجھے مایوسی ہوئی کہ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے میرے تصور میں اسپتال کا ایک بیڈ تھا جس پر ہاشمی صاحب موت و زیست کی کشمکش کا شکار بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے منہ پر آکسیجن ماسک تھا اور جسم کے مختلف حصوں سے منسلک ٹیوبیں اور تار سرہانے نصب آلات تک جارہے تھے۔ چھوٹے سے ٹی وی اسکرین جیسے مانیٹر پر ان کے دل کی بے ترتیب دھڑکن کا گراف بناتی لکیر مسلسل حرکت میں تھی اور اوپر نیچے ہورہی تھی۔ ہر دھڑکن کے ساتھ ہلکی سی بیپ سنائی دیتی تھی۔ مانیٹر کے ایک کونے میں بدلنے والے اعداد سے بلڈ پریشر' ہارٹ بیٹ اور نبض کی رفتار ظاہر ہورہی تھی۔ شادو اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ بیپ' بیپ کی آواز کسی بھی لمحے ایک مسلسل کرب ناک نالۂ مرگ کی صدا بن سکتی تھی۔ ای سی جی کی لکیر سپاٹ اور سیدھی ہوسکتی تھی۔

گل نواز خان کی بات سن کے یہ سب بدل گیا۔ ہاشمی صاحب صاف ستھرے بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہے تھے یا شادو سے مذاق کررہے تھے اور شادو انہیں آرام سے لیٹنے کی تاکید کررہی تھی یا زبردستی انہیں سیب کے ٹکڑے کھلا رہی تھی۔ سوپ پلا رہی تھی یا ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ بھئی معمولی سا صدقہ تھا تمہارے عشق کا جسے دل ناتواں برداشت نہ کرسکا۔ چند روز میں بالکل ٹھیک ہوجاؤں گا میں تو پاکستان چلیں گے۔

آخر میں کیوں چاہتا تھا کہ ہاشمی صاحب مرجائیں؟ کیا اب بھی مجھے امید تھی کہ شادو مجھے مل سکتی ہے؟ مجھے اپنے خیال کی کمینگی پر شرم آئی۔ کیا میں چاہتا ہوں کہ شادو کا سہاگ اجڑ جائے؟ وہ بیوہ ہوجائے؟ مگر وہ خود بھی تو ایسا ہی چاہتی ہوگی۔ اس نے صرف دولت کے لیے ہاشمی صاحب سے شادی کی تھی۔ ان کے عشق میں مبتلا ہوکے نہیں۔ یہ دولت اسے جتنی جلدی مل جائے اچھا ہے۔ بے شک آج بھی سب کچھ اسی کا ہے مگر دینے والا ہاتھ ہاشمی صاحب کا ہے جو بہت کچھ وصول بھی کرتا ہے۔ پھر کچھ لینے والا کوئی نہیں ہوگا اور وہ خود مختار ہوگی۔ سہاگ کا اجڑ جانا عین اس کے دل کی مراد بر آنے کے مترادف ہے۔ بیوگی بھی انعام ہے اس قربانی کا جو اس نے باپ سے زیادہ عمر والے بوڑھے شخص کو نذرانۂ حسن و شباب پیش کرکے دی تھی۔ اگر وہ غمزدہ نظر آئے گی یا اشک فشاں ہوگی تو یہ محض دنیاداری کے لیے اداکاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگی۔ ہاشمی صاحب کو مری جانا چاہیے۔

ٹیکسی میں واپس جاتے جاتے میرا ذہن انہی خیالات کے گرداب میں غوطہ زن رہا۔ ہاشمی صاحب کے ہارٹ اٹیک کی خبر نے مجھے بہت EXCITED کردیا تھا۔ امکانات کے بہت سے دریچے وا ہوگئے تھے اور ہر دریچے سے نظر آنے والا منظر جدا تھا۔ میں نے شارو کو دیکھا۔ وہ لندن سے آنے والی فلائٹ سے اتری تھی اور سر جھکائے اس تابوت کے پیچھے چل رہی تھی جسے ہوائی جہاز سے اتار کرلایا گیا تھا۔ دوسرے منظر میں باوقار دولت مند بیوہ کی طرح وہ تعزیت کے لیے آنے والوں کا شکریہ ادا کررہی تھی۔ بار کے صدر' جنرل سیکریٹری' ہائی کورٹ بار کے اراکین۔ اہم سیاسی اور سرکاری شخصیات۔ مقتدر اور بااثر حلقۂ احباب میں شامل لوگ۔ سب ایک جیسے غم زدہ چہرے بنا کے رسمی الفاظ ادا کرتے جارہے تھے۔ کیا ہو اگر ان میں شامل ہوکے اچانک میں شارو کے سامنے پہنچ جاؤں اور طنزیہ مسکراہٹ کو دبا کے بڑی مصنوعی دکھ بھری آواز میں کہوں "انتہائی قلق ہوا مجھے مسز ہاشمی۔ خدا مرحوم کو جہنم رسید کرے اور آپ کو صبرِ جمیل کے علاوہ ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین"۔ میں ہنس پڑا۔ کیا کرے گی وہ؟ چوکیدار سے کہے گی کہ یہ کون ہے؟ باہر نکال دو اسے جوتے مار کے۔ الو کی پٹھی۔ میرے سامنے بھی ایکٹنگ۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔ آزادی۔۔۔ دولت مندی۔۔۔ عیاشی۔

منظر پھر بدل گیا۔ وہ ہاشمی صاحب کے آفس میں ان کی کرسی پر مالکانہ غرور کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ کیا ہو اگر میں اس سے ملنے جاؤں اور اسے چٹ پر اپنے نام کے ساتھ لکھ بھیجوں۔ تمہارا پہلا اصلی اور سچا چاہنے والا۔ جو آج بھی تمہارے نام کی مالا جپتا ہے۔ وہ گھنٹی بجائے گی اور کسی کو حکم دے گی کہ سائل کو ایک امپورٹڈ مالا فراہم کردی جائے۔ ہزار دانوں والی تسبیح ٹھیک رہے گی۔ اور دیکھو' اسے کوئی ائرکنڈیشنڈ کمرا دے دو میرے نام کی مالا جپنے کے لیے۔ میں پھر ہنس پڑا۔

ٹیکسی رکی تو ڈاکٹر رانجھا کا متفکر چہرہ میرے سامنے آیا۔ صوفی شاید راستے میں ہی اتر گیا تھا مگر مجھے اپنی محویت یا بے خبری میں پتا نہیں چلا تھا۔ رانجھے کی تشویش کا سبب میری ذہنی کیفیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"کیا بات ہے پترجی!" اس نے اندر جاکے مجھے پلنگ پر بٹھادیا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے؟"

"سارے راستے تو چپ رہا۔ اپنے آپ سے بولتا رہا اور خود ہی ہنستا رہا۔ ہماری بات تو نے نہیں سنی۔"

"ہائے میں مرگئی۔" ہیر نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا "لگ گئی نا اس کو کسی کی نظر۔ بیڑا غرق ہو جلنے والوں کا۔ اچھا بھلا ہنستا کھیلتا گیا تھا گھر سے۔ رانجھے تو اس کے ساتھ تھا؟"

"سارا دن تو ساتھ تھا۔ ہم وکیل کے دفتر گئے اور لوٹ آئے۔" رانجھا نے کہا۔

"اچھا تو جا دوڑ کے مولوی صاحب کو بلا کر لا۔ اس پر دم درود کریں۔ کوئی تعویذ دیں۔ میں نظر اتارتی ہوں اس کی" وہ چلانے لگی۔

رانجھے نے ٹوپی اتار کے سر کھجایا "کس مولوی کو لاؤں۔ یہاں والا تو ایویں ہے۔ جھلا سا۔ میں دوائی دیتا ہوں۔"

میں نے سختی سے کہا "کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ خدا کے لیے آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں کچھ پریشان ہوگیا تھا ایک خبر سن کے۔"

"اوہ۔ میں سمجھ گیا" رانجھا نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "میرے سامنے ہوئی تھی ساری بات اور مجھے خیال نہیں آیا۔"

"مجھے بھی بتا رانجھے کیا بات تھی ایسی؟"

"او نیک بختے۔ وہ جو ہاشمی صاحب ہیں نا۔ وہی وکیل جس نے شارو سے شادی کی تھی' اور اس کے ساتھ چلی گئی تھی ولایت۔ اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ دل کا معمولی سا دورہ پڑا تھا مگر سب ٹھیک ہے۔"

ہیر کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ شاید یہ طے کرنا اس کے لیے مشکل ہوگیا تھا کہ اب وہ مجھ سے کیا کہے' مجھے تسلی دے' مجھ سے ہمدردی کرے یا کہے کہ لعنت بھیج اب شارو کے نام پر۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو' تجھے کیا۔ اس نے ایک بار بھی سوچا تیرے لیے۔۔۔

وہ میرے جذباتی انتشار کی وجہ سمجھ گئی تھی۔ لاتعلق ہونے کے باوجود میں شارو کے طلسمِ خیال کا اسیر تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود اسے چاہتا تھا۔ میرے زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ شارو کا نام آج بھی مجھے بے قرار کرتا تھا۔

ہیر نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "سودا ہوگیا؟"

"ہاں ہوگیا۔ انشاءاللہ اسی مہینے قبضہ بھی مل جائے گا۔ پھر جناب عالی' ہیر کلینک ہوجائے گا ہیر کلینک اینڈ اسپتال" رانجھے نے ہیر کے اشارے کو سمجھ لیا "اب نیا بورڈ بھی بنوانا پڑے گا۔ بیس فٹ کا۔ اور اوپر والی منزل دیکھ کے تو دل خوش

ہوجائے گا تیرا۔ چار کھلے ڈلے کمرے ہیں۔ سامنے ویہڑا۔ اوپر اپنی چھت۔ کبوتروں کی چھتری بھی لگی ہے۔"

ہیر نے بے تاب لہجے میں کہا "مجھے ایک نظر دکھا کے لا رانجھے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ کیوں پترجی! کیا خیال ہے۔ او بھئی ہیرے۔ یہ سب کمال ہے اس کا۔ اسے دعائیں دے۔"

"ہائے اس کے لیے تو میں جتنی دعائیں کروں کم ہیں" اس نے مجھے سینے سے چپٹا کے پیار کیا "چل پتر' تو آرام کرلے تھوڑی دیر۔ میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔ چائے پی کے چلیں گے۔"

اس وقت تک میں بھی سنبھل گیا تھا۔ "ضرور چلیں گے ماسی بلکہ ابھی اسی وقت چلتے ہیں۔ چائے کا کیا ہے' باہر پی لیں گے۔"

"باغ جناح میں چلیں گے۔ سموسے بھی کھائیں گے" وہ خوش ہوگئی۔

ہیر ایک سیدھی سادی جاہل اور گھریلو قسم کی عورت تھی مگر اس کی سب سے بڑی دولت تھی وہ قناعت' آسودگی اور فطری نیک دلی جس نے اسے احساسِ محرومی کے ہر دکھ سے بچا رکھا تھا ورنہ اس کے پاس کیا تھا۔ اس نے کبھی خوش حالی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پاس ایسے کسی چھوٹے سے گھر کی چھت کا سایہ نہیں تھا جسے وہ حقیقی معنوں میں اپنا کہہ سکے۔ خانہ بدوشی میں وہ ایک جگہ سے اٹھائے جاتے تھے تو دوسری جگہ جا بیٹھتے تھے۔ شادی ہوئے ایک زمانہ بیت گیا تھا مگر اس کی گود خالی تھی اور خالی ہی رہی۔ اس نے کبھی رانجھے سے کچھ نہ ہونے کا گلہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے والی عورت تھی۔

میرے آنے کے بعد اچانک ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آگیا تھا۔ انہیں وہ خوشیاں مل گئی تھیں جن کا وہ انتظار بھی چھوڑ چکے تھے۔ میرے ساتھ نئی خریدی ہوئی عمارت کا معائنہ کرتے ہوئے ہیر اتنی پُراعتماد تھی کہ مجھے وہ ایک نئی عورت لگی۔ وہ میرے ساتھ اسی غرور سے سربلند چلتی رہی جیسے ہر جوان اور لائق بیٹے کی ماں چلتی ہے۔ غیرارادی طور پر اس نے ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ لیا تھا اور مسلسل بول رہی تھی۔ یہ کیا ہے' یہاں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں یہ ہوگا۔ رانجھے بڑا کام ہے یہاں تو۔ کیا حال ہورہا ہے پلستر کا۔ اور کیا منحوس رنگ ہے دیواروں کا پیلا زرد۔ اچھا بھلا آدمی یرقان کا مریض نظر آنے لگے۔

صوفی نے متعدد اعتراضات کو مسترد کرنے اور نقائص کو خوبی قرار دینے کی فضول سی دفاعی کوشش کی مگر ہیر نے اسے ڈانٹ کے خاموش کردیا۔ "رہنا تم نے ہے یا ہم نے۔ تم نے تو حشر نشر کر رکھا ہے گھر کا۔ ہم نے تمہاری مجبوری کو دیکھتے ہوئے اس کھنڈر کے ڈھائی لاکھ دے دیے۔ تم کو جانا تھا دبئی۔ اب اسے ٹھیک کریں گے تو یہ بندوں کے رہنے لائق ہوگا۔"

صوفی خون کے گھونٹ پی کے چپ ہوگیا ورنہ پوچھتا کہ پہلے یہاں بندے نہیں تو کیا کھوتے رہتے تھے۔

چلتے چلتے ماسی نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ سیل ایگریمنٹ نہ ہوتا تو شاید سودا منسوخ ہوجاتا "یہ کیا ہے شاہین منزل۔ کون ہے یہ شاہین۔۔۔ تمہاری بیوی یا بیٹی؟"

صوفی نے تلملا کے کہا "علامہ اقبال کا شاہین۔"

"ہم تو یہاں لکھوائیں گے ناصر منزل۔"

"قصرِ ناصر" ڈاکٹر رانجھا نے تجویز پیش کی "یا ناصر محل۔"

"یہ نہیں ہوسکتا" صوفی پیر پٹخ کے بولا۔

"کیوں؟ کیسے نہیں ہوسکتا؟" ہیر نے کمر پر ہاتھ رکھ کے اسے للکارا۔

"جب میں نے کہہ دیا کہ نہیں ہوسکتا تو نہیں ہوسکتا۔ بے شک تم سودا مت کرو۔" صوفی چراغ پا ہوگیا "یہ شرط ہے میری۔"

"سودا تو ہوگیا صوفی صاحب؟" میں نے کہا "اور معاہدے میں ایسی کوئی شرط آپ نے نہیں رکھی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

وہ چلانے لگا "کیسے نہیں ہوسکتا۔۔۔ میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔"

"تا۔۔۔ مجھے بتا کیا کرے گا تو" ہیر اڑ گئی "تو قبضہ دے ہمیں اور پھٹا کھا۔ بعد میں ہم کچھ بھی کریں' سب سے پہلے میں لکھواؤں گی ناصر محل اور تو نزدیک آیا نا تو اوپر سے اینٹ ماروں گی تیرے سر پر۔"

بے بس اور مجبور صوفی بال نوچتا دھم دھم سیڑھیاں چڑھ گیا۔

ہیر رانجھا کے دل میں میرے لیے ممتا اور شفقتِ پدری کے جذبات کا طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ میرا احسان وہ اسی دن سے تسلیم کرتے تھے جب میں نے انہیں بے سروسامانی اور دربدری سے بچایا تھا۔ میں ایک رات اجنبی مہمان بلائے جان بن کے وارد ہوا تھا لیکن صبح ہونے تک میری حیثیت غیب سے نمودار ہونے والے فرشتۂ رحمت جیسی ہوگئی تھی۔

• Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کارپوریشن والوں نے قانونی کارروائی کرتے ہوئے وہ پوری بستی بلڈوزر چلا کے زمیں بوس کردی تھی جس پر لوگ برسوں سے ناجائز قبضہ لیے بیٹھے تھے اور اسی میں ہیر رانجھے کا گھر بھی نیست و نابود ہو گیا تھا۔ اس وقت انہیں سر چھپانے کا یہ ٹھکانا فراہم کرکے میں نے اس رشتے کی بنیاد رکھی تھی۔ پہلے میرے لیے ان کے دل میں شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات تھے۔ وہ میری دل سے عزت کرتے تھے اور مجھ سے ڈرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تعلق میں جذبات کی وابستگی شامل ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ بالکل نامعلوم طریقے پر ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور ایک دوسرے کی ضرورت بنتے گئے یہاں تک کہ ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح ہو گئے۔

آج اچانک میرے ساتھ ان کا رشتہ خون کے رشتوں سے زیادہ اہم اور مضبوط ہو گیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا' نیک نیتی سے کیا تھا۔ اس کے لیے مجھے کوئی تردد نہیں کرنا پڑا تھا اور نہ میں نے اپنی دن رات کی محنت سے جمع کی ہوئی خون پسینے کی کمائی صرف کی تھی۔ جیسا کہ رئیس نے کہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے وصول کیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے انہیں دے دیا تھا۔ درحقیقت جو ہاشمی صاحب نے مجھے دیا تھا وہی میں نے ہیر رانجھے کو بخش دیا تھا کیونکہ میں اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہاشمی صاحب نے وہ مکان میرے نام کرنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا جس کی ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن ایک ناپسندیدہ چیز کو ناگواری سے قبول کرتے ہوئے کسی اور کے حوالے کرنے کا یہ عمل میرے نامۂ اعمال میں بہت بڑی نیکی بن گیا تھا۔ ایک احسانِ عظیم ہو گیا تھا اور اس نے ہیر رانجھے کو ان کی عمر رائگاں کے سارے خوابوں کی دہری تعبیر کی خوشی عطا کردی تھی۔ انہیں ایک فرشتہ سیرت' سعادت مند اور خدمت گزار' کماؤ اور ہر لحاظ سے قابلِ فخر پلا پلایا جوان بیٹا مل گیا تھا جس نے انہیں صاحبِ جائداد ہونے کا غرور بھی دیا تھا اور ان پر مستقبل کی کامیابی اور خوش حالی کے دروازے بھی کھول دیے تھے۔

میں بھی نقصان میں نہیں رہا تھا۔ مجھے جو خوشی ہیر رانجھا کو خوش دیکھ کے ملی تھی وہ میں ڈھائی لاکھ روپے میں بھی بازار سے نہیں خرید سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر ہیر رانجھا کے جذبات تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے بالآخر میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔ مجھے میرے ماں باپ مل گئے ہیں۔ میں لاوارث نہیں رہا۔ وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی میرے اپنے والدین اور سب والدین کرتے ہیں۔

تاہم اس سوال کی خلش اپنی جگہ تھی کہ میں کون ہوں اور جنہوں نے مجھے پیدا کیا تھا وہ ہیں تو کہاں ہیں۔

ہیر رانجھا کا بس چلتا تو وہ مجھے ایک لمحے کے لیے اپنی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ انہیں ڈر تھا کہ شاید کا آسیب ابھی تک مجھ پر سوار ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پھر دیوانگی کے کسی دورے میں کچھ کر بیٹھوں۔ پھر گھر سے غائب ہو جاؤں یا کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں لیکن میں بے کار گھر میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ امتحان کا رزلٹ آنے میں دو ڈھائی مہینے تھے اور یہ وقت ماسی ہیر سے باتیں کرکے' بلکہ اس کی کبھی ختم نہ ہونے والی باتیں سن کے کاٹنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔

ایک رات تو انہوں نے مجھے کہیں نہیں جانے دیا۔ رانجھے نے ہیر کو سمجھا دیا تھا کہ آج اس نے شاہدہ کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں سنی۔ پتا نہیں باہر جا کے یہ کیا کرے۔ ہیر نے فوراً اعلان کردیا کہ وہ رات کو ایک خصوصی دعوت کے لیے مکھڑ روسٹ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ صبح وہ میرے ساتھ داتا صاحبؒ کے دربار جائے گی اور چادر چڑھائے گی۔ دوپہر کو میاں پیر صاحب کے مزار پر لنگر تقسیم کرے گی۔ ظہر اور عصر کے درمیان قرآن خوانی کا پروگرام ہو گا اور اس کے بعد میلاد شریف۔ پھر رات کا کھانا جس میں محلے والے بھی شریک ہوں گے اور مجھے یتیم خانے سے ساتھ بچوں کو بھی لانا ہو گا۔

"تو نے جانا نہیں ہے کہیں۔ یہ سارے کام میں اکیلی نہیں کر سکتی۔ میں جا کے محلے کے ہر گھر میں کہہ دوں گی مگر باہر کا انتظام تو تجھے ہی کرنا ہے" ہیر نے فرمان جاری کردیا "رانجھا توہڑ حرام کسی کام کا نہیں۔"

"پتر جی۔ اس پاگل کی بچی کو سمجھاؤ کہ ہم مردان چکروں میں پڑ جائیں تو کما کے کون لائے۔ مجھے کلینک نہیں جانا؟" رانجھا بولا۔

"ایک دن نہیں گیا تو کون سی قیامت آجائے گی؟"

"دو دن ہو جائیں گے۔ آج بھی نہ جانے کتنے مریض مایوس ہوئے ہوں گے۔" وہ بولا "ویسے تو موت کا ایک دن معین ہے لیکن آج میرے نہ جانے سے خدانخواستہ کوئی لاعلاج اللہ کو پیارا ہوا تو اس کا گناہ لکھا جائے گا میرے نامۂ اعمال میں۔"

"میں تو کہتی ہوں کہ آج تیرے نہ جانے سے کسی کی قضا ٹل گئی ہو گی۔" ہیر نے کہا "قضا بھی لاتی ہے بے وقوفوں کو تیرے جیسے ڈاکٹر کے پاس۔"

اس سے پہلے کہ ان کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی' میں نے ریفری کی طرح مداخلت کی "ماسی' تمہارا ہر حکم سر آنکھوں پر۔ صبح میں تمہارے ساتھ داتا دربار بھی جاؤں گا۔"

"رانجھا بھی جائے گا' میں نے کہہ دیا۔"

"جاؤں گا لیکن اس کے بعد سیدھا کلینک جاؤں گا" رانجھے نے کہا۔

میں نے کہا "تم ختم قرآن کراؤ۔ میلاد کراؤ۔ سارا انتظام میں کروں گا۔ شامیانے قناتیں' شیرینی' پلاؤ' زردے کی دیگ پکوانے کا بندوبست بھی ہو جائے گا مگر ایک کام میں نہیں کروں گا" میں نے کہا۔

"ہائے۔ اب ایسا کیا کام رہ گیا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولی۔

"میں یتیم خانے سے ساٹھ بچوں کو کھانے کے لیے یا پڑھنے کے لیے نہیں بلاؤں گا" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟ نیکی ہے یہ بھی۔"

"یہ نیکی نہیں ماسی۔ برائی ہے۔ بہت بڑی" میں نے تیز لہجے میں کہا "تو نہیں جانتی مگر میں جانتا ہوں کیونکہ میں یہ ذلت دیکھ چکا ہوں۔ برداشت کر چکا ہوں اس کی اذیت۔ میں خود بھی جاتا تھا خیرات کھانے۔ بڑے بڑے دولت مند ہم یتیموں کو بلا کے ہمارے ہاتھوں میں سپارے تھما دیتے تھے کہ لو پڑھو۔ ہمارے جنتی گنگار باپ یا دادا کی بخشش کے لیے زبردستی پڑھو۔ یہ بات کتنا کوئی نہیں تھا مگر کیا جاننے والے نہیں جانتے ہوں گے کہ مرنے والا ساری عمر کیا کرتا رہا تھا؟ ہم واقعی زبردستی پڑھتے تھے۔ ہمیں اس کے گناہ ثواب' بخشش اور عذاب سے کیا جس کا نام تک ہم نہیں جانتے۔ ہماری ساری دلچسپی اچھے مرغن کھانے میں ہوتی تھی۔ اس کے لیے وہ لڑکے منتخب کیے جاتے تھے جو مولوی صاحب کو پسند ہوتے تھے۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ کیوں پسند ہوتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ خوشامدی' عیار اور چالاک قسم کے لڑکے ہوتے تھے یا خوب صورت لڑکے۔ ہم میں سے بہت کم پڑھتے تھے۔ زیادہ تر کھانے کی خوشبو سے' کھانا شروع ہونے کے انتظار میں ہلتے رہتے تھے اور بڑبڑاتے رہتے تھے۔ آدھا ادھورا پڑھتے تھے۔ بغیر پڑھے صفحے پلٹ دیتے تھے اور سپارے پر سپارہ ختم کرکے اپنی افادیت ثابت کرتے تھے۔ ہم شرارتیں کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی چیزوں کو دیکھتے رہتے تھے۔ آرائشی اشیا' نوادرات' تصاویر' بیش قیمت فرنیچر' قالین اور پردے۔ ہم ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے اور یوں باتیں کرتے تھے کہ لگتا تھا بلند آواز میں تلاوت کر رہے ہیں۔ اور پھر ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ایک دوسرے سے بوٹیاں چھینتے تھے اور اتنا کھا جاتے تھے کہ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ نہیں ماسی' میں وہ سب پھر نہیں کر سکتا۔ دیکھو یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ ہم خوش ہیں تو خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے خود ہمیں ہی کچھ کرنا چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ ساری رات شکرانے کے نفل پڑھوں گا۔ ہم سب مل کے ختم قرآن کرلیں گے۔"

ہیر رانجھا دم سادھے میری بات سن رہے تھے۔ میری آواز بہت اونچی ہو گئی تھی اور میں شدتِ جذبات سے دکھی ہو گیا تھا۔

ماسی نے نرمی سے کہا "چل جیسی تیری مرضی۔"

رانجھا بولا "تمہاری بات سولہ آنے سچی پتر جی۔ لیکن یتیموں اور مسکینوں کا حق تو بنتا ہے۔"

"بالکل بنتا ہے۔ آپ کسی ایک یتیم خانے کا انتخاب کرلیں۔ وہاں سب بچوں کی دعوت کردیں۔ سب کے لیے کپڑے بنوا دیں۔ کسی کو یہاں پڑھنے کے لیے مت بلائیں۔ پہلے میں تماشا تھا۔ اب تماشائی بن کے خود اپنی نظر سے گرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

دوسرا دن بڑی مصروفیت میں گزر گیا۔ ہم ایک ساتھ داتا صاحبؒ کے دربار گئے جہاں ہیر نے بڑی عقیدت سے چادر چڑھائی۔ ایک سو ایک روپیہ نذرانہ ڈالا اور آدھا گھنٹا ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کیے دعائیں مانگتی رہی۔ میں اسے دوسری طرف عورتوں والے حصے میں اپنی ساری دعائیں میرے لیے وقف کرتے دیکھتا رہا۔ اس میں میرے لیے بڑی راحت تھی اور تسکین تھی۔ احساس کا یہ تجربہ میرے لیے نیا تھا اور روح کو طمانیت سے سرشار کرنے والا تھا۔

باقی دن میلاد شریف اور محلے والوں کی دعوت کے ہنگامے میں گزرا جس کا سارا انتظام کرتے ہوئے میرا تھکن سے برا حال ہو گیا۔ یہ سارا خرچ ماسی ہیر نے خود برداشت کیا۔ اس نے مجھ سے ایک پیسہ بھی لینے سے صاف انکار کردیا۔ "جو تو نے کرنا تھا کردیا۔ کچھ مجھے بھی کرنے دے۔"

تیسرے دن موقع پاتے ہی میں نکل کھڑا ہوا۔ رئیس کا ملنا کچھ طے نہیں تھا مگر وہ مجھے بیٹھک میں مل گیا "آپ رے' کہاں اڑتا پھر رہا ہے۔"

میں نے کہا "وہ پیر صاحب کدھر گئے۔ یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔"

رئیس نے قہقہہ مارا "ابے اصل نقشہ تو یہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درگاہ نہیں یہ جلوہ گاہ ہے۔ جلوے ہی جلوے ہیں۔ دیکھو اور جی جلاؤ۔"

"اور حلوے ہی حلوے" اس کے سامنے تاش کے پتے تھام کر بیٹھا ہوا نوجوان بولا "کھاؤ تے جان بناؤ۔"

ان دونوں کی بات غلط نہیں تھی۔ دیواروں پر ملکی اور غیر ملکی فلم ایکٹریسوں اور ماڈلز کے علاوہ ایسی خواتین کی رنگین تصاویر کے جلوے بکھرے پڑے تھے جو اپنے حسن و شباب کی جلوہ نمائی میں کسی انتہا کی قائل نہ تھیں۔ ایک پلیٹ میں جو تھال جیسی تھی' چنے کی دال کا حلوا گھی میں تیر رہا تھا۔ یا گھی حلوے میں تیر رہا تھا۔

"شانو لایا ہے ابھی ابھی اپنی ہی درگاہ سے" رئیس نے تین پتوں کے کھیل میں شریک تیسرے شخص کی طرف اشارہ کیا "تو ملا ہے ان سے پہلے۔ یہ بوبی ہے' حرامی نمبرون۔ اور یہ شانو۔"

"یہ بھی حرامی نمبرون ہے۔ یہاں کوئی کسی سے کم نہیں" بوبی نے کہا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟ چاچا چینگ باز۔ اور سراج؟" میں نے کہا۔

"سراج تو ابھی گیا ہے کپڑے لانے کے لیے۔ چاچا کا ڈراما اچھا چل گیا تھا۔ اس نے ڈیرا منتقل کردیا شالا مار باغ سے آگے۔ بڑی موقع کی جگہ ہے۔ بزنس اچھا چلے گا۔ ہم سب وہیں مصروف تھے' ابھی آئے ہیں۔ باقی سب کون۔ پیر صاحب کے ساتھ جانی جن ہے بس۔"

میں نے سہلایا "اچھا تو چھوڑ یہ تاش۔ میرے ساتھ چل۔ مجھے باتیں کرنی ہیں کچھ تجھ سے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "مجھے پتا تھا۔ آج سالے پتے اچھے آرہے تھے تو اپنا یار آگیا رنگ میں بھنگ ڈالنے۔"

بوبی نے پتے پھینک دیے "اوئے تو یار ہے اس کا تو ہم کون ہیں؟"

"بوبی ہنڈریڈ پرسنٹ ٹھیک کہتا ہے۔" شانو نے کہا۔ "ایسی کون سی بات ہے اس کے بارے میں جو ہم نہیں جانتے اور ہماری کون سی بات اس سے چھپی ہوئی ہے۔ یہ یہاں آتا ہے تو پھر یہاں بیٹھ کے بات کیوں نہیں کرسکتا۔"

بوبی نے سہلایا "اور تمہیں ہم سے چوری کوئی بات کرنی ہو تو مت آیا کرو یہاں۔"

میں وہیں بیٹھ گیا "آئی ایم سوری۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تم کو غیر نہیں سمجھتا۔ نہ تم سے کوئی بات چھپانا چاہتا ہوں۔ میں نے تو اس خیال سے کہا تھا کہ شاید تمہیں دلچسپی نہ ہو۔۔۔ تم ۔۔ بور کریں ہم۔"

شانو ہنسنے لگا "ڈیئر سر۔ یہاں کوئی بور نہیں ہوتا۔"

"بوریت کا علاج ہے ہمارے پاس۔ لگے دم ٹوٹے غم" بوبی بولا۔

شانو نے نعرہ لگایا "کھاؤ حلوا تے دیکھو جلوہ۔"

وہ سب تھال درمیان میں رکھ کے ہاتھوں سے حلوا کھانے لگے۔ پیر دھانسو کی خانقاہ پر آج کسی عقیدت مند نے لنگر تقسیم کیا تھا۔ "اب ہر جمعرات کو قوالی کے بعد حلوے کی نیاز تقسیم ہوگی" رئیس نے بتایا۔

یہ دیسی گھی کی افراط والے حلوے کا اثر تھا کہ بوبی اور شانو پر دس منٹ بعد ہی غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے رئیس کو ڈاکٹر رانجھا کے عظیم الشان کلینک اور اسپتال کے بارے میں بتانا شروع ہی کیا تھا کہ وہ خراٹے لینے لگے۔ رئیس کے سوا کسی کو بھی میری بات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جب خود رئیس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو ہم سراج دھوبی کی کھلی ہوئی دکان سے گزر کے باہر آگئے۔ پرانی انارکلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کے چائے پیتے ہوئے میں نے اسے باقی بات بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔

"یار' یہ تو نے ایسا کام کیا ہے کہ تیری تو مغفرت ہو گئی ورنہ سالے وہاں بھی ہمارے ساتھ ہوتا جہنم کی بیٹھک میں" وہ بولا۔

پھر میں نے اسے ہاشمی صاحب کے ہارٹ اٹیک کے بارے میں بتایا۔

رئیس نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا "ابے وہ منحوس بوڑھا گدھ مرا نہیں۔ بڑا افسوس ہے یار۔"

"یار' شارو۔۔۔ پریشان ہوگی۔"

"ابے بھاڑ میں گئی شارو۔ اور تو لکھ لے۔۔۔ وہ ذرا بھی پریشان نہیں ہوگی۔ وہ تو چاہتی ہوگی کہ کل کا مرتا آج مرجائے۔ اس کا خصم تو وہ دوسرا کرے۔ پھر مل جائے گا اسے ایسا ہی کوئی۔ تو اگر یہ سمجھتا ہے بیٹا کہ وہ لوٹ کر تیرے پاس آجائے گی تو علاج کرا اپنے دماغ کا سالے۔ ایسی عورت سے خدا نے بچالیا تجھے پیارے' شکر کر شکر" رئیس تلخ ہو کے بھڑک اٹھا۔

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "پتا نہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "دیکھ ناصر۔ ایک بات مجھے بھی کہنی تھی تجھ سے۔ مجھے تیرے جانے کے بعد خیال آیا۔ یہ مکان تو اسی کا ہے۔ تیرے دوست ناصر عظیم کا۔ ایک وقت تھا کہ تجھ پر بھوت سوار تھا اس کے قاتل چچا سے بدلہ

لینے کا لیکن اس وقت ہم کچھ نہیں کر پائے تھے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اب ہم کیا کرسکتے ہیں؟ خون تو آج بھی کھولتا ہے میرا اس منظر کے تصور سے جب میں نے اس کی خون آلود لاش دیکھی تھی۔"

"سالے تو چاہتا تھا' ہم اس گھر کے صحن کو کھودیں۔ ناصر کی ماں کی لاش وہاں ہے یا نہیں۔ اس کا ثبوت مل جائے پھر ہم ناصر کے چچا کے گلے میں پھانسی کا پھندا ابھی ڈال سکتے ہیں۔"

"لیکن یار۔ تو نے ہی کہا تھا۔۔۔ یہ قانونی معاملات ہیں۔ ہمارے بس کے نہیں" میں نے کہا۔

"اب اسے پھانسی چڑھا کے ہمیں کیا ملے گا۔ ناصر تو واپس آنے سے رہا مگر کیا تو اسے سزا دینا بھی نہیں چاہتا۔ تیرے وہ جذبات نہیں رہے؟"

"یہ ٹھیک ہے یار۔۔۔ کہ شارو کے عشق نے مجھے سب بھلا دیا تھا۔" میں نے شرمندگی سے کہا "لیکن میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے۔"

"تو پھر میری بات دھیان سے سن پیارے۔ تو اس مکان کو بیچنے کا خیال دل سے نکال دے۔ سیدھی طرح جا کے کاغذات پر دستخط کردے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بڈھا لڑھک جائے اور یہ معاملہ کھٹائی میں پڑجائے۔ جب مکان تیرا ہوگا اور وہاں ہیر رانجھا بھی نہیں ہوں گے تو پھر ہم بات کریں گے ناصر کے چچا سے۔"

"واہ یار۔ بڑی دور کی سوجھی تجھے" میں نے کہا۔

"ایک بات بتاؤں۔ ہوسکتا ہے خود شارو نے تجھے موقع فراہم کیا ہو۔ وہ بھی جانتی تھی کہ تو اپنے دوست کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "چل پھر میرے ساتھ ہاشمی صاحب کے آفس۔"

گل نواز خان سے ملنے کے لیے ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ وہ کسی مؤکل سے بات کررہا تھا۔ فارغ ہوتے ہی اس نے ہمیں بلالیا۔

میں نے کہا "میں ان کاغذات پر دستخط کرنے آیا ہوں۔"

وہ مسکرایا "ویری گڈ ینگ مین۔ تمہاری سوچ میں لچک ہے۔ تم RIGID نہیں ہوا اپنے ATTITUDES میں۔"

رئیس نے کہا "میں نے سمجھایا اسے وکیل صاحب۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی پر گل نواز خان نے کہا "ایک منٹ پلیز۔" اور ریسیور اٹھالیا "یس۔۔۔ کون مسز ہاشمی۔ معاف کیجیے میں فون پر ابھی تک آپ کی آواز نہیں پہچانتا۔ گڈ آفٹرنون۔ لندن میں تو دوپہر ہوگی۔"

میں نے اور رئیس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رئیس نے گل نواز خان کی نظر بچا کے میز کی اوٹ سے مجھے ایک فحش اشارہ کیا۔

گل نواز خان کا شگفتہ لہجہ ایک دم پُر تشویش ہوگیا "اچھا! کب۔۔۔ اوہ مسز ہاشمی' آئی ایم سو سوری۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن ایسی حالت میں ڈاکٹر ان کو ہوائی جہاز سے سفر کی اجازت نہیں دیں گے۔ اچھا دیکھیے' میں کوشش کرتا ہوں آنے کی۔ اگر سیٹ مل گئی۔"

اس نے فون رکھ کے کاغذات دراز سے نکالے "آپ کو بتایا تھا نا میں نے۔ جہاں بھی پنسل کا کراس ہے وہاں دستخط کردیں۔"

وہ اٹھا اور باہر نکل گیا تو رئیس نے کہا "ابے کیا ہوگیا؟ کہیں پھونک تو نہیں سرک گئی سالے کی۔"

میں کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ "باتوں سے تو ایسا نہیں لگتا۔"

"ابے تو مت مان مگر مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ بڈھا گیا۔ تو نے دیکھا گل نواز خان کو۔ کیسا خطمہ ریشمی ہو رہا تھا سالا۔"

"ریتہ نظمی۔۔۔ جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ جانتا ہے نا کہ شارو ہی پارٹنر ہوگی اس کے بعد۔ اور قسم اللہ کی پیارے۔ شرط لگا لے بے شک تولا کھ روپے کی۔ یہ جو شارو ہے نا۔۔۔ اس کا اگلا شکار ہوگا گل نواز خان۔"

میں نے برہمی سے کہا "بکواس مت کر۔"

گل نواز خان دس منٹ میں واپس آگیا "ہوگئے دستخط؟"

میں نے کہا "ہاشمی صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "ہی از اوکے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ گل نواز نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا۔۔۔ پھر اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ وہ دھم سے کرسی پر گر گیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اب ہم جاسکتے ہیں مگر مجھے خوف اور اندیشوں نے گھیرلیا تھا۔

O☆O

مجھے خوف اور اندیشوں نے گھیرلیا تھا۔ کیا واقعی میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلاف مسلسل سرگرم عمل سازشی عناصر اپنے شیطانی عزائم میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ میں اس پہ سالار کی طرح رہ گیا تھا جو جنگ ہارے بغیر تنہا رہ گیا ہو۔ اس کی سپاہ نے ساتھ چھوڑ دیا ہو اور غنیم سے جا ملی ہو۔

میں نے موبائل فون اپنے محافظ کو واپس کردیا۔ وہ منتظر تھا کہ میں گاڑی کی طرف جاؤں گا یا اسے کہوں گا کہ گاڑی کو ہوٹل کے گیٹ پر لے آئے مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم جاؤ۔ ہم بعد میں آجائیں گے ٹیکسی لے کر۔"

ڈرائیور متذبذب نظر آنے لگا "سر... کپتان صاحب نے بولا تھا..."

میں نے کہا "انہیں میں بتادوں گا۔ تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ ابھی ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں۔"

"خطرہ پہلے سے نظر نہیں آتا سر۔" وہ ضدی آدمی تھا۔ "آپ کو کہیں جانا ہے تو میں لے جاؤں گا۔ میں انتظار کرسکتا ہوں۔ اگر ساری رات بھی رکنا پڑے۔"

رخشی نے کہا "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گھر نہیں جانا ہے تب بھی ٹیکسی میں تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں اسے ایک طرف لے گیا "رخشی۔ اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو مجھے گرفتار کرلیا جائے گا اور اس بار میری ضمانت پر رہائی بھی نہیں ہوگی۔"

"کیوں۔ اب کیا نئی بات ہوگئی؟" وہ پریشان ہوگئی۔

"بات نئی نہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "شاہ عالم ہاؤس میں پولیس زبردستی داخل ہوگئی ہے۔ وہ پچھلے حصے کے باغ میں زمین کھود رہے ہیں۔"

رخشی کا رنگ اڑ گیا "وہاں کیا ہے؟ کون سا مدفون خزانہ ہے؟"

میں نے کہا "مرزا خادم اور عثمان کی لاشیں تو مل سکتی ہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ وہ سب ہو رہا ہے جو نہیں ہوسکتا تھا۔ کیا پہلے ایسا ممکن تھا یا آج تک کسی کے ساتھ یہ ہوا کہ اس کی پریس کانفرنس یوں ناکام بنادی گئی ہو۔ یہ شرارت نہیں 'سازش تھی۔"

"لیکن... پچھلے حصے کے باغ سے دو لاشیں کیسے برآمد ہوسکتی ہیں۔ جب وہاں کچھ بھی نہیں۔ ایک انچ زمین کسی نے نہیں کھودی ورنہ پتا چل جاتا۔ لان اور باغ کی گھاس تک ٹھیک تھی اور اب اتنے سیکیورٹی گارڈ بھی ہیں نگرانی کے لیے" رخشی بحث کرنے لگی۔

میں نے کہا "اچھا یہاں سے چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لیے یہاں پہنچ جائے۔ انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں پریس کانفرنس میں مصروف ہوں۔ کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں' کچھ سوچتے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ جس گاڑی میں ہم یہاں آئے تھے وہ دوسری بہت سی گاڑیوں کے درمیان موجود تھی۔ ڈرائیور کی سفید وردی میں گارڈ نے رخشی کے لیے دروازہ کھولا۔ "اب کہاں جانا ہے سر؟"

میں دوسرے دروازے سے رخشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "فی الحال کہیں بھی نہیں۔ تم ہوٹل کے گیٹ پر انتظار کرو۔ یہ دیکھو کہ کوئی ہم سے ملنے آتا ہے یا ہمارے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ پھر خاموشی سے ہمیں یہاں آکے پوری رپورٹ دو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں گاڑی میں۔"

"یس سر۔ لیکن یہاں روشنی زیادہ ہے۔ میں گاڑی ادھر لگادیتا ہوں۔ وہاں شیشے بند ہوں گے تو آپ نظر نہیں آئیں گے" اس نے کہا۔

ڈرائیور چلا گیا تو میں نے رخشی سے کہا "میرا خیال ہے کہ اس بار شاہ عالم کو سچ مچ مار دیا جائے گا۔ پہلی بار اس کی موت حادثاتی تھی۔ یا کم سے کم حادثاتی نظر آتی تھی۔ یعنی اور واقعاتی شہادت کے مطابق اس کی گاڑی کو ایک مشتعل ہجوم نے گھیر لیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ہجوم میں بھی کرائے کے قاتل شامل تھے۔ شاہ عالم کی وطن واپسی سے پہلے ہی طے کرلیا گیا تھا کہ اس کا وجود خطرناک یا غیر ضروری ہوگیا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ خادم مرزا اور عثمان جیسے کاروباری لوگوں کے حریف شاہ عالم کو راستے سے ہٹانا چاہتے ہوں۔ ہر کاروبار میں مخالف اور حریف ہوتے ہیں۔ کاروبار خطرناک ہو تو دشمن بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ یا پھر شاہ عالم کے سیاسی عزائم کو ناکام بنانے والوں نے طے کرلیا تھا کہ اسے سیاست سے بے دخل کردیا جائے۔ اس کا آسان اور مؤثر طریقہ یہی تھا کہ اسے زندگی سے بے دخل کردیا جائے۔ اس کے لیے شاہ عالم کے دشمن اور دوست اپنی تیاری مکمل کرچکے تھے اور انتظار تھا صرف اس کے واپس آنے کا۔ انہوں نے قاتل رستے یعنی DEATH SQUADE ایئرپورٹ پر بھی متعین کررکھے تھے۔ جب وہ ایئرپورٹ پر بچ نکلا تو انہوں نے دوسرے راستوں پر بھی اس کا انتظام کردیا کہ وہ جس راستے سے بھی جائے' عدم آبادی پہنچے۔ انہوں نے شاہ عالم کو تیور

کی گاڑی میں روانہ ہوتے دیکھا اور اس کا تعاقب کیا یا پھر انہوں نے راستوں پر نظر رکھی اور اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے شاہ عالم کو ریلوے کراسنگ پر گاڑی میں دیکھ لیا اور اس کا کام وہیں تمام کردیا۔ یہ انہیں کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ پاکستان سے جاتے ہوئے شاہ عالم ایک تھا مگر واپس آنے والے شاہ عالم دو تھے۔ جو لوگ ریلوے اسٹیشن پر شاہ عالم کو موت کے گھاٹ اتارنے پر مامور تھے انہوں نے اسے ٹرین سے اترتے دیکھا اور اس پر فائر کیا مگر شاہ عالم کی یعنی میری خوش قسمتی کہ نشانہ خطا ہوگیا۔ شاہ عالم مارا بھی گیا اور بچ بھی گیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کا جشن منانے والوں نے تو شاہ عالم کو بڑی دھوم دھام سے دفن کردیا تھا اور اس کے شایانِ شان مزار بنانے کے لیے مزار کمیٹی بھی بنادی گئی تھی مگر ایک لڑکی شبنم نے شاہ عالم کے ڈبل رول پر شک کا اظہار کردیا۔ اس کی وجوہ ذاتی تھیں اور اس نے جو کچھ کیا' جذباتی دباؤ میں کیا۔ مگر اس کی وجہ سے شاہ عالم کی موت مشکوک ہوگئی۔ عدالتی فیصلہ آنے کے بعد شاہ عالم پھر زندہ ہوگیا۔ یہ اس کے دشمنوں کے لیے بڑی مایوسی اور ناکامی کی خبر تھی۔ دوسرا شاہ عالم زیادہ محتاط اور ہوشیار تھا اور اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔ دشمنوں کو نئے سرے سے منصوبہ بندی کرنی پڑی۔ انہوں نے شاہ عالم کے خلاف سازشوں کا نیا جال بُنا۔ شاہ عالم اکیلا رہ گیا۔ اس کی سیاسی ساکھ ختم ہوگئی۔ سیاسی طاقت ختم ہوگئی۔ اس کے پرانے ساتھی بھی اس کے دشمن ہوگئے۔ انہوں نے پارٹی پر قبضہ کرلیا۔ شاہ عالم کے وفاداروں کو مار دیا۔ شاہ عالم کے خلاف ہر قسم کے مقدمات اور الزامات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پریس اور پبلک کو اس کے خلاف کردیا گیا۔ اس کے گھر پر فائرنگ ہوئی' پہلے اسے دہرے قتل کے ایک جھوٹے الزام میں گرفتار کرنے کا ڈراما کیا گیا تھا مگر اب وہ ڈراما نہیں رہا۔ شاہ عالم ہاؤس سے مقتولین کی لاشیں مل جانے کے بعد شک کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے۔"

رخشی نے میری پوری بات خاموشی سے مگر سخت ٹینشن میں سنی تھی۔ وہ اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کاٹ رہی تھی اور بعض اوقات یوں لگتا تھا جیسے وہ میری بات بھی سن رہی ہے مگر اس کا ذہن کہیں اور ہے۔

"یہ کیوں فرض کرلیا ہے تم نے آخر؟" اس نے کہا۔

"تم چاہو تو تصدیق بھی ہوجائے گی۔ اس وقت شاہ عالم ہاؤس میں کون ہے؟ پولیس اور مجسٹریٹ کے علاوہ۔ لاشیں وہ اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ وہ صرف گڑھا کھودیں گے اور اعلان کریں گے کہ لاشیں اسی میں سے نکلی ہیں۔ ان کی بات کو جھٹلانے والا وہاں کون ہے؟ اس کی تصدیق مجسٹریٹ کرے گا۔ ہم ہوتے یا ہمارا وکیل ہوتا تو شاید کچھ فرق پڑتا مگر ہم پریس کانفرنس میں تھے جب پولیس نے چھاپا مارا۔ ہم اس کی تردید نہیں کرسکتے۔ ہمارے اپنے سیکیورٹی گارڈ بے بس ہیں۔ ان حالات میں شاہ عالم ہاؤس جانا میرے لیے نہیں' تمہارے لیے بھی خطرے کی بات ہوگی۔ پولیس تمہیں بھی شاملِ تفتیش کرسکتی ہے۔"

رخشی کا رنگ زرد پڑ گیا "اور ہم کہاں جاسکتے ہیں آخر؟"

اچانک گاڑی کا دروازہ کھول کے ایک اجنبی ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا "آپ وہاں جائیں گے جہاں میں آپ کو لے جاؤں گا۔"

پھر دوسرے دروازے سے ایک اور شخص اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خطرناک قسم کا ریوالور تھا۔

رخشی نے چیخ کو دبانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔

میں نے اس کے گھٹنے پر تھپکی دے کر اسے خاموش اور پُرسکون رہنے کی ضرورت سمجھائی "کون ہو آخر تم لوگ؟"

ریوالور والے کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "ہم دوست ہیں آپ کے سر' دشمن نہیں۔"

"ایسے دوست۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ میں نے کبھی تمہیں دیکھا تک نہیں" میں نے ایک جارحانہ متانت کا انداز برقرار رکھا۔

ڈرائیور نے ریورس گیئر لگا کے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"آپ پریشان نہ ہوں سر!"

میں نے پیچھے سے اس کی گردن کو اپنے بازو میں جکڑ لیا۔ "پریشانی تم اپنے لیے پیدا کررہے ہو۔ گاڑی بند کرو اور تم یہ گن خاموشی سے نیچے ڈال دو۔"

انہوں نے بلا مزاحمت تعمیل کی "ٹیک اٹ ایزی سر!"

دوسرے نے کہا "ہم آپ کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ ہمارا تعلق اسی سیکیورٹی ایجنسی سے ہے جس کی خدمات آپ نے حاصل کی ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"کیپٹن عادل نے بھیجا ہے ہمیں۔ آپ ان سے معلوم کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ اپنی شناخت کے لیے کیا ہے تمہارے پاس؟ میں نے یہاں کسی اضافی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیکیورٹی کی درخواست نہیں کی تھی۔"

ڈرائیور کا سانس رکنے لگا تھا "پلیز سر۔ مجھے موقع دیں۔ سب بتا رہا ہوں۔"

دوسرے نے ریوالور رخشی کو پیش کردیا "میڈم۔ میں آپ کو کمپنی کا شناختی کارڈ دکھاتا ہوں۔"

میں نے ڈرائیور کو چھوڑ دیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور سر کو دائیں بائیں گھمایا "بڑا ظالم ہاتھ ہے جی آپ کا۔ میری تو گردن ٹیڑھی ہوگئی۔"

رخشی نے شناختی کارڈ میری طرف بڑھا دیا "تم بات کرلو کیپٹن عادل سے۔"

میں نے شناختی کارڈ کو روشنی کے رخ کرکے دیکھا۔ "ذرا نمبر ملاؤ اس کا۔"

رخشی نے موبائل فون پر نمبر پنچ کرکے مجھے تھمادیا۔ دوسری طرف سے میں نے عادل کی آواز سنی۔ "ہیلو!"

میں نے کہا "کپتان صاحب! میری حفاظت کے لیے دو نئے نمونے آپ نے بھیجے تھے۔"

"حالات کے پیش نظر ایسا ضروری ہوگیا تھا۔"

"لیکن آپ نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ وہ ایسے اچانک نازل ہوئے کہ میں نے انہیں دشمن سمجھ لیا۔ اس سے تھوڑی سی خرابی ہوگئی۔۔۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں" میں نے کہا۔

"کیا خرابی ہوگئی؟" وہ کچھ پریشان ہوا۔

"وہ۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا۔ میں نے سوچا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتے۔"

"WHAT HAPPENED?" کیپٹن عادل چلّا کے بولا۔

"میں نے انہیں ناک آؤٹ کردیا۔۔۔ بس ہاتھ ذرا بھاری پڑگیا۔ آئی ایم سوری۔ ایک اٹھ گیا۔"

"کیا مطلب۔۔۔ ایک مرگیا۔۔۔ او مائی گاڈ!"

"ایک اٹھ گیا چند منٹ بعد۔ دوسرا بھی اٹھ کھڑا ہوگا کچھ دیر میں انشاء اللہ مگر کپتان صاحب۔ جو خود اپنی حفاظت نہ کرسکے، وہ میری حفاظت خاک کریں گے۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں مذاق کررہا ہوں۔ "وہ اتنی آسانی سے مار کھانے والے بندے نہیں تھے سر اور اتنے بے وقوف بھی نہیں تھے۔"

"یو آر رائٹ۔" میں نے کہا "لیکن انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی جو غلط ہے۔ وہ میرے ساتھ جائیں گے۔ جہاں میں جاؤں گا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ شاہ عالم ہاؤس میں کیا ہوا تھا؟"

"ہاں۔ مجھے ایک سیکیورٹی گارڈ نے اطلاع دی تھی کہ پولیس زبردستی میرے گھر میں گھس گئی ہے اور وہ پچھلے حصے کی کھدائی کرکے کچھ برآمد کرنا چاہتے ہیں" میں نے کہا۔

وہ بولا "کیا میڈم آپ کے ساتھ ہیں؟"

"سائے کی طرح" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

وہ ہنسنے لگا "آپ کی پریس کانفرنس ختم ہوگئی۔"

"جو چیز شروع ہی نہ ہو، اس کا ختم ہونا کیسا۔"

"یہ بہت سیریس معاملہ ہے سر۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اپنی مسز کو ساتھ نہ لائیں۔ انہیں آج رات کہیں ڈراپ کردیں۔"

میں نے کہا "مثلاً راوی کے پل پر۔"

"میرا مطلب تھا سر کہ انہیں اپنے کسی عزیز یا دوست کے گھر چھوڑ کر یہاں آجائیں۔ اس معاملے کو آپ ہی ڈیل کرسکتے ہیں۔ جب مجھے اطلاع ملی تو میں شاہ عالم ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ میں وہیں سے بات کررہا ہوں۔ پولیس کو بھی اطلاع دے دی تھی میں نے۔ اچھا ہے ان سے پہلے آپ آجائیں۔"

"مجھے بتاؤ آخر معاملہ کیا ہے؟"

"یہ فون پر بتاؤں گا تو بہت وقت ضائع ہوگا۔ آپ فوراً آجائیں اور بیگم صاحبہ کو ساتھ لانے کی غلطی نہ کریں۔ وہ بہت UPSET ہوں گی۔"

میں نے اس کے لہجے سے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے کہا "اوکے، میں آتا ہوں۔"

رخشی غور سے میری صورت دیکھ رہی تھی اور نو وارد بیزار بیٹھے منتظر تھے کہ میں احکامات صادر فرماؤں۔ میں نے ایک کو اس کا ریوالور اور دوسرے کو شناختی کارڈ واپس کرتے ہوئے ان سے معذرت کی "اب یہاں سے کسی ایسی جگہ چلو جہاں کوئی نہ ہو۔ خلوت ہو اور خاموشی ہو۔ سکوتِ شب کی رومان آفریں سرگوشی ہو۔ جہاں موجِ آب کی آغوش میں چاندنی مچل رہی ہو۔"

زباں سے نہ سہی آنکھوں آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے سوال کیا "یار، صاحب کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔ یہ تو ہمیں کسی نے نہیں بتایا تھا۔"

اور دوسرے نے بزبانِ خاموشی جواب دیا "ہوٹل سے نکلا ہے نا۔ بہت پی لی ہوگی مفت کی۔"

رخشی نے بھی میری شاعرانہ خوش بیانی کو پسند نہیں کیا

"یہ کون سا وقت ہے مذاق کا۔"

"رائٹ۔ یہ وقت ہے گلہائے ناز کا۔ میاں کوچبان تم ذرا چلو راوی پارک کی جانب۔"

راوی پارک کے کنارے والی سڑک اس وقت ویران تھی۔ کبھی کوئی گاڑی گزرتی تھی تو اندھیرے میں بچھی ہوئی سیاہ سڑک روشن ہوجاتی تھی۔ یہاں سو دو سو گز کے بعد کوئی گاڑی یوں کھڑی نظر آجاتی تھی جیسے پٹرول ختم ہوجانے کے بعد چور اسے لاوارث چھوڑ گئے ہوں اور اصل مالک ابھی تک اسے کہیں اور تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔ ان سب میں محبت کے متوالے یا نئے شادی شدہ جوڑے معروفِ راز و نیاز نظر آتے تھے چنانچہ معاشرے کی اخلاقی قدروں کے پاسبان پولیس والے گشت کرتے ہوئے آجاتے تھے تو انہیں اظہارِ محبت کا حق عطا کرنے اور ان کی خلوت کا احترام کرنے کے لیے سب ایک ہی سوال پوچھتے تھے۔ میاں بیوی ہو تو نکاح نامہ ہے؟ اور ننانوے فیصد خالص میاں بیوی بھی اس قانونی مسئلے پر پہلے حیران ہوتے تھے اور پھر پریشان کیونکہ ثبوت کے بغیر تعلقات ہی ناجائز ہوجاتے ہیں اور مشکوک حالت میں پکڑے جانے والے لیلیٰ مجنوں ہوں یا میاں بیوی سب تھانے جانے کی رسوائی سے بچنے کے لیے ایک ہی راستہ اختیار کرتے تھے۔ نکاح نامہ نہیں ہے تو نکالو اجازت نامہ قائداعظم کی تصویر والا۔ شاید بہت جلد سڑکوں پر چیکنگ ہونے لگے گی۔ گاڑی آپ کی ہے؟ کاغذات دکھائیے۔ بیوی آپ کی ہے؟ کاغذات دکھائیے۔ بچہ آپ کا ہے، کاغذات دکھائیے۔

میرا ادھر آنے کا مقصد ہرگز وہ نہیں تھا جو نظر آتا تھا۔ رخشی حیران تھی کہ یہ مجھے کیا سوجھی۔ ایک جگہ گاڑی روک کے میں نے رخشی سے کہا "آؤ کچھ دیر ٹہلتے ہیں" پھر اپنے ڈرائیور اور سیکیورٹی گارڈ سے کہا کہ وہ ہمارے واپس آنے تک وہیں موجود رہیں مگر ہر طرف نظر رکھیں۔

رخشی خاموشی سے اتر آئی "چند قدم دور جاکے اس نے خفگی سے کہا "یہ کیا حرکت ہے۔ کیا مقصد ہے آخر اس وقت یہاں آنے کا؟"

میں سیمنٹ کے تختے جیسی ایک بینچ پر بیٹھ گیا "بیٹھو یہاں۔ میں بتاتا ہوں۔"

وہ کچھ محتاط ہوکے فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھ گئی "ایسی کون سی بات ہے؟" اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی "دیکھنے والے کیا سمجھیں گے؟"

میں نے کہا "یہی کہ اس رومینٹک ماحول میں ہم بھی جذباتی باتیں کررہے ہیں لیکن اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ لوگ جو دیکھتے ہیں وہ اصل حقیقت نہیں ہوتی۔ میرے یہاں آنے کے تین بنیادی مقاصد تھے جن کا جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہیں میری نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔"

"آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی" اس نے رکھائی سے کہا۔

"رائٹ مگر میں آدمی نہیں ہوں، انسان ہوں، آدمی ایک حیوان ہے۔ زیادہ سے زیادہ حیوانِ ناطق لیکن میں انسانیت کا شرفِ احساس اور لحاظ رکھتا ہوں۔ اگر مجھے اس کا خیال نہ ہوتا تو جب سے تم میرے ساتھ ہو، مجھے ہر وقت ہر جگہ ہر قسم کے مواقع میسر تھے جن سے میں پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے رخشی کہ میں دل سے تمہاری عزت کرتا ہوں کیونکہ تم نے جو احسان کیا ہے مجھ پر، اس کا بدلہ اتارنا میرے بس کی بات نہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "یہ تم کس احسان کی بات کررہے ہو؟"

میں نے کہا "آج میں زندہ ہوں اور آزاد ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے۔ تم نے بقا کی اس جنگ میں میرا ساتھ دیا تھا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا۔"

اس نے نظر چرا کے کہا "تم جانتے ہو کہ میں مجبور تھی۔"

"ہاں۔ تمہاری مجبوری دہری تھی۔ میں نے تمہیں گن پوائنٹ پر مجبور کردیا تھا۔ یہ جسمانی مجبوری تھی۔ تمہارے شوہر نے اپنے رویے سے تمہیں بغاوت پر مجبور کردیا تھا۔ یہ جذباتی مجبوری تھی لیکن اس حقیقت سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج میں شاہ عالم ہوں تو صرف تمہاری مہربانی سے۔ ایسے مواقع بہت آئے تھے جب تم مجبوری کی زنجیر کو توڑ سکتی تھیں۔ اس وقت تم آزاد تھیں اور میں بے بس تھا لیکن تم نے میرے جھوٹ کے حق میں گواہی دی۔ یہی وجہ بہت ہے میرے لیے کہ میں تمہارا احسان مانوں، میں نے پہلے بھی تسلیم کیا ہے کہ شاہ عالم ایک بدقسمت شخص تھا۔ اس اعتبار سے بھی کہ اسے تم جیسی حسین، ذہین اور مثالی شریکِ حیات ملی جو زندگی میں ہر قدم پر اس کی رفاقت کا حق ادا کرنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتی تھی مگر اس نے تمہاری قدر نہ جانی۔"

اس نے تلخ لہجے میں کہا "کیا فائدہ ہے اب ایسی باتوں سے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "مجھے یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اگر ہم بہت پہلے ملے ہوتے۔ اس وقت جب تقدیر نے ہماری زندگی کے راستے متعین نہیں کیے تھے تو شاید ہم ایک ہی راستے کے مسافر ہوتے۔"

"نہیں' میں تو یہ سوچتی ہوں کہ ہمارا یہ ساتھ کسی عارضی ضرورت کے لیے بھی نہ ہوتا تو بہت اچھا تھا۔"

"دو مسافر اگر غلطی سے کسی گمنام اسٹیشن پر اتر جائیں تو اگلی ٹرین کے آنے تک ایک دوسرے سے بات بھی نہ کریں تو کیا کریں۔" میں نے کہا "اس کے بعد اپنا سفر اور اپنی اپنی منزل۔"

"مگر تم چاہتے ہو کہ میں اسی طرح تمہارے ساتھ چلوں۔ آخر کیوں چاہتے ہو تم ایسا؟" اس نے بے رخی سے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہتا اور میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ناممکن ہے' شرع قانون اور اخلاقیات کے علاوہ ہمارے حالات کا بھی یہی تقاضا ہے۔"

"میں بھی تنگ آگئی ہوں تمہارے ان حالات سے جن پر تمہاری گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ میں تمہاری کیوں مدد کروں جب تم خود اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے جا رہے ہو۔ میں تمہیں شاہ عالم کیسے بنا سکتی ہوں جب خود تم میں اس کی صلاحیت ہی نہیں۔ تمہارے پاس نہ اس کی سیاسی بصیرت ہے' نہ کاروباری سمجھ بوجھ۔ وہ میرے لیے بُرا شوہر تھا۔ بدنام ضرور تھا مگر ناکام نہیں تھا۔ تم نے سوچے سمجھے بغیر اس کی جگہ لینے کی حماقت کی۔"

میں نے برہمی سے کہا "حماقت کیسے کہہ سکتی ہو تم۔ اس نے خود مجھے دلدل میں کھینچا تھا۔ میری کون سی دلی خواہش تھی کہ شاہ عالم بنوں۔ میں ناصر عظیم ہی اچھا تھا۔ مگر اس نے زبردستی مجھے ڈبل رول کرنے پر مجبور کیا اور پھر خود ہی طے کر لیا کہ میرا کردار ختم ہو تو میری زندگی کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ میں کیا اپنا دفاع کیے بغیر کی خواہش پر مرنا قبول کر لیتا؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمہیں فرار ہو جانے اور روپوشی اختیار کر لینے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔" وہ سکون سے بولی "لیکن تمہارے اپنے دل میں چور تھا۔ تم شاہ عالم بن کے اقتدار کی منزل تک پہنچنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ تمہیں وزیراعظم بننے کے لیے ایک شارٹ کٹ مل گیا۔"

"میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔"

"یہ خواہش تمہارے لاشعور میں بچپن سے موجود تھی اور ہے۔ تم نے نیچے سے اوپر تک جانے کے لیے بہت بلندی سے اڑان لی۔ اس بلندی سے جہاں شاہ عالم برسوں میں پہنچا تھا۔ ہر چیز تمہیں ریڈی میڈ ملی۔ شہرت' سیاسی ساکھ' اسمبلی کی سیٹ' ووٹ' سیاسی جماعت اور کارکن۔ تم خود یہ سب کرتے تو تمہاری آدھی عمر اس میں گزر جاتی اور تم شاید پھر بھی کامیاب نہ ہوتے۔ آدھی کامیابی تمہیں شاہ عالم کے نام کے ساتھ ہی مل گئی۔ اس کو بھی تم گنوا رہے ہو۔ میری جان الگ عذاب میں ہے۔"

میں نے غصے کو ضبط کیا اور اسے بولنے کا موقع دیا۔ اپنے اندر کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے میں نے ایک سے سو تک گنا پھر ستاروں کو دیکھا اور چاندنی میں ڈوبی ہوئی رات میں گہری سانس لی۔

"میڈم۔" میں نے بالآخر کہا "اٹ از اوور۔ اٹ از آل اوور ناؤ۔ میرا خیال تھا کہ تم ہنسی خوشی اپنی مرضی سے میرا ساتھ دے رہی ہو۔"

وہ طنز سے ہنسی "تم کو شاید یہ خوش فہمی بھی ہو گی کہ میرا ساتھ دینا بھی بے سبب نہیں...... میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ مرنے لگی ہوں تم پر اور کسی دن تم سے درخواست کروں گی کہ صرف نام کے نہیں' میرے حقیقی شوہر بن جاؤ۔"

میں نے اس کے جھانپڑ رسید کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ چندا کے سوا میں کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا اور نہ کسی کو اجازت دے سکتا ہوں کہ وہ چندا کی جگہ لینے کی کوشش کرے۔ دنیا میں دوسری چندا...."

"چندا... چندا... چندا۔ مائی فٹ" اس نے جھلا کے کہا "کس محبت کی بات کرتے ہو تم؟ ایسی محبت ہوتی اس سے تو تم چندا کو چھوڑ کے نہ آتے۔ کتنی آسانی سے تم نے اپنا نام اور شخصیت ہی نہیں' اپنی دنیا تج دی۔ بھول گئے کہ تم کیا تھے اور تمہاری چندا؟ ایک بار بھی اس نے تمہیں یاد کیا۔ کبھی فون کر کے بھی پوچھا کہ کیا حال ہے میرے مجنوں۔ سنا ہے کوئے سیاست میں بھی تم لیلیٰ لیلیٰ پکارتے پھرتے ہو۔"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی "دیکھو۔ اسے کچھ مت کہو۔"

اس نے ایک تلخ زہر میں بجھا ہوا قہقہہ مارا "کیوں؟ یہ سچ تمہیں اپنے منہ پر تھپڑ کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے تمہیں اپنی زندگی سے ایسے نکال پھینکا جیسے

دودھ سے مکھی۔ اس نے تمہیں کک آؤٹ کر دیا کہ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ تم ناصر عظیم نہیں ہو تو میرا کسی شاہ عالم سے کیا تعلق؟"

میں نے کمزور سا احتجاج کیا "یہ... کس نے بتایا تمہیں...؟"

"خود تم نے۔ تمہارے دل کے چور نے.... ہر بات الفاظ میں نہیں بتائی جاتی مسٹر شاہ عالم۔ جو ہے وہ نظر آتا ہے۔"

"او کے۔ اسٹاپ اِٹ ناؤ" میں نے چلا کے کہا "میں تمہیں یہاں یہ سمجھانے کے لیے لایا تھا کہ اب میرے پاس تمہیں خطرات سے دور رکھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ سوائے اس کے کہ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔ میں نے شاہ عالم بن کے غلطی کی' جرم کیا یا گناہ' اس کی سزا تمہیں کیوں ملے۔ تمہارا یہ احسان باقی رہے گا کہ تم نے مجھے اس اجنبی راستے پر قدم رکھنے کی اجازت دی جو تمہاری زندگی سے گزرتا تھا۔ میں ایک TRESPASSER تھا جسے تم نے قانون کے یا موت کے حوالے نہیں کیا لیکن آگے میری قسمت۔ اگر میں محض اپنی بدقسمتی یا بے وقوفی سے دشمنوں میں محصور ہو گیا ہوں اور جان لیوا خطرات سے دوچار ہوں تو تمہیں مجھ سے لاتعلق ہو جانا چاہیے۔"

"بڑی مہربانی ہو گی تمہاری اگر تم خود مجھے چھوڑ دو۔ نہ میں تمہاری دوست نہ دشمن۔ میں تمہاری سیکریٹری' پی آر او کچھ بننا نہیں چاہتی۔ شاہ عالم کے سیاسی اور کاروباری مسائل کو خود سمجھو اور ان سے خود نمٹو" وہ بیزاری سے بولی۔

اس کے رویے اور لہجے میں رونما ہونے والی اس تبدیلی نے مجھے جتنا مایوس اور مشتعل کیا تھا' اتنا ہی حیران' اور شرمندہ بھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب تک وہ مجھے برداشت کر رہی تھی اور آج اچانک اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ خود میں بھی یہی بات کہنے والا تھا مگر میں اسے زیادہ خوش دلی اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کرنا چاہتا تھا۔ ہمارے درمیان جذبات کی یہ تلخی نہ آتی تو اچھا تھا۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ ہوٹل میں ہی گرفتار نہ ہو جاؤں۔ اس لیے میں نے فوراً وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں میں اس لیے آیا تھا کہ اگر کوئی ہمارے تعاقب میں ہو گا تو مجھے پتا چل جائے گا۔ یہاں بیٹھ کے تم سے بات کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ڈرائیور اور گارڈ ہماری باتیں نہ سنیں۔ شاہ عالم ہاؤس کا مالک میں نہیں ہوں۔ اصل مالک تمہارا شوہر تھا اور اس کی موت کے بعد وہ تمہارا ہے مگر میں وہاں رہنے پر مجبور ہوں۔"

وہ تلخی سے بولی "کیونکہ اب شاہ عالم بھی تم ہو اور میرے شوہر بھی بہرحال کہلاتے ہو۔"

"میں تمہیں اس کی پوری قیمت ادا کروں گا یا وہ تمہارے نام کر دوں گا جو بھی تمہیں منظور ہو" میں نے کہا۔

"میں اس منحوس جگہ سے بہت دور جانا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں اس کی مارکیٹ ویلیو کے حساب سے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ڈال دوں گا یا اسے بیچ کے ساری قیمت تمہیں ادا کر دوں گا۔ اس کے علاوہ بھی جو شاہ عالم کا تھا' وہ تمہارا ہی رہے گا۔ یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ میں اپنے وکیل سے کہوں گا کہ سب تمہارے نام ٹرانسفر کرا دے۔ اس کے لیے یقیناً وقت چاہیے۔ یہ وقت تم مجھ سے الگ رہ کے گزارو گی۔ میں اپنے اور تمہارے اختلافات کی خبر کل تک عام کر دوں گا۔ بات پھیلتے دیر نہیں لگے گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں سب کو معلوم ہو جائے گا کہ ازدواجی تعلقات میں خرابی کے باعث اب ہم ایک ساتھ بھی نہیں رہ سکتے۔ اخبار والے ایسی خبروں میں سنسنی خیزی کا پہلو تلاش کرتے ہوئے خود ہر جگہ یہ سوال اٹھائیں گے کہ اتنا عرصہ ساتھ گزارنے کے بعد ہمارے درمیان اختلافات کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ سب میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ میرے اور تمہارے بیان میں کوئی فرق نہ رہے۔ کچھ اخبار والے تم سے بار بار پوچھیں گے کہ کیا اس کا سبب دوسری عورت ہے اور مجھ سے سوال کریں گے کہ... خیر چھوڑو۔"

"تم اپنی فکر کرو۔ میرا کسی اخبار والے سے سامنا نہیں ہو گا اور ہوا تو میں کسی کے سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔"

"بالکل ٹھیک۔ تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری ذات پر کوئی الزام نہ آئے۔ سارا قصور میرا سمجھا جائے۔ آج جس قسم کے حالات پیدا کیے جا رہے ہیں' اس میں تمہیں بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ بدمعاشی کی سیاست میرے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے اور میرے بس کی بات نہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ صورتِ حال کو سمجھنے اور اپنے قدم جمانے کے لیے مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔ میں نے دنیا میں رہ کے زندگی کے ہر دن کے ساتھ نیا تجربہ حاصل کیا ہے اور کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ جسے تم دلدل کہتی ہو' ایسی نہ جانے کتنی دلدلوں کو عبور کیا ہے میں نے۔ میں خطرات کے جنگلوں سے تنہا گزرا ہوں۔ اپنی ذات اور خدا کے سوا میں نے کسی پر بھروسا نہیں کیا۔ آج پھر میرے سامنے حالات کا نیا چیلنج ہے اور وقت کی نئی آزمائش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ تو میرے لیے بزدلی کے ساتھ شکست قبول کرتے ہوئے فرار ہوجانے کا تصور بھی خود کو گالی دینے اور اپنے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہے کیونکہ میں خطرناک حد تک ضدی اور انا پرست ہوں۔ دشمن مجھے مار سکتے ہیں مگر روک نہیں سکتے۔ ڈرا نہیں سکتے اور خرید نہیں سکتے۔ کوئی زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتا ہے؟ میری زندگی لے سکتا ہے مگر زندگی کے بارے میں آپ کا ایمان یہ ہو کہ وہ کسی انسان کی نہیں خدا کی ملکیت ہے تو پھر ڈر کیسا۔ خدا چاہے گا تو عزت دے گا' وہ چاہے گا تو ذلت دے گا۔ اگر وہ نہیں چاہے گا تو فرشتۂ اجل کی نظر میری طرف اٹھے گی ہی نہیں۔"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی "تم بڑے عجیب آدمی ہو۔"

"ابھی تم نے مجھے دیکھا ہی کہاں ہے' سمجھنا تو دور کی بات ہے۔ شاید اب یہ ممکن نہیں رہا لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا بشرطِ زندگی۔ جب میں اپنی عمر رفتہ کی کتاب میں اس زندگی کی کہانی لکھوں گا جس کا ایک باب تم بھی ہو۔ صرف ایک باب۔ میرے ماضی کے ہر باب کی کہانی الگ ہے اور اس کہانی کے کردار ایک دوسرے سے اتنے ہی نا آشنا ہیں جیسے ایک سیارے کی مخلوق دوسرے کسی سیارے کی مخلوق سے ناواقف ہے۔ سندباد نے تو سات ہی سفر کیے تھے۔ میری زندگی کا ہر دن ایک نیا سفر تھا۔ جب میں یہ کہانی لکھوں گا تو اس کے سارے باب کسی حویلی کے بند دروازوں کی طرح کھل جائیں گے اور وہ سارے کردار جو میری کہانی کا حصہ تھے' ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھیں گے۔ جانیں گے اور پہچانیں گے۔ ابھی تم کوئی دروازہ کھول کے میرے ماضی میں نہیں جھانک سکتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اپنے مستقبل کی منزلوں کو نہیں دیکھ سکتا مگر جیسا کہ میں نے کہا کہ بشرطِ زندگی' یہ کہانی پوری ہوگی تو..... معلوم ہوگا کہ تمہیں اس مداری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا جس نے زندگی کو بس ایک تماشا سمجھا اور خود کو تماشائی۔ اب آؤ' یہاں سے ہم راستے بدلتے ہیں۔ مجھے بتادو کہ تم کو کہاں جانا ہے؟"

"کیا۔ کیا مطلب۔ ہم واپس شاہ عالم ہاؤس نہیں جائیں گے؟"

"تم شاہ عالم ہاؤس نہیں جاؤ گی" میں نے زور دے کر کہا۔ "آج رات تم کسی ہوٹل میں بھی قیام کرسکتی ہو۔ کوئی اور جگہ ہے' تمہارے کسی عزیز کا گھر' کسی سہیلی کا یا دوست کا گھر۔"

"مگر تم اس طرح مجھے میرے گھر سے نہیں نکال سکتے۔"

"وہ گھر تمہارا ہی ہے لیکن تمہارا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ پولیس نے اب تک شاہ عالم ہاؤس کے عقبی حصے کا باغ کھود کے خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاشیں نکال لی ہوں گی۔ نہ میں نے انہیں قتل کیا تھا اور نہ وہاں گاڑا تھا مگر سچ وہ ہے جو ثابت کردیا جائے۔ میری گرفتاری یقینی ہے لیکن گرفتاری کے ڈر سے میں بھاگوں گا نہیں۔ میرا یہ اعتماد ناقابلِ شکست ہے کہ جھوٹ سے سچ ختم نہیں ہوتا۔ آدمی ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ سچائی ازلی و ابدی ہے اور دائم و قائم ہے۔ یہ نظامِ کائنات ایک حقیقت ہے۔ خدا کی خدائی برحق ہے پھر میں جھوٹ سے کیوں ڈروں۔ مجھے بتاؤ میں تمہیں کہاں چھوڑوں؟"

وہ سخت مشکل میں پڑ گئی تھی۔ "شاہ عالم' اس گھر میں میری بہت سی چیزیں ہیں۔ جو میں چھوڑ نہیں سکتی۔"

میں نے کہا "تمہاری ہر چیز محفوظ رہے گی اور تمہیں مل جائے گی۔ پہلے تم خود محفوظ ہوجاؤ۔"

اس نے کچھ دیر سوچ کے کہا "اچھا پھر یہ موبائل فون مجھے دے دو اور مجھے چھوڑ دو کسی ہوٹل کے قریب۔ کل میں کہیں شفٹ ہوجاؤں گی۔ میری چیک بکس اور جیولری وغیرہ بھجوا دینا اور میرے کپڑے۔"

"خدانخواستہ تمہارا داخلہ بند نہیں ہوا ہے شاہ عالم ہاؤس میں۔ ایک دو دن میں تم خود وہاں آکے جو بھی ساتھ لے جانا چاہو لے جاسکتی ہو۔ تمہیں روکنے والا کون ہوگا؟ تم وہاں کی ہر چیز کی مالک ہو" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ اس کی الجھن اور پریشانی' خوف اور گھبراہٹ کی جگہ اب ایک خفت آمیز پُرسکون خاموشی نے لے لی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ پہلے پریشان تھی تو اب پشیمان ہے۔ وہ زندگی کی کیمسٹری کے پرانے معمول سے مطمئن نہیں تھی۔ میرے ساتھ مجبوری میں گزرنے والے روز و شب کے معمولات میں اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ بھی اہم ہے اور اس کی سوچ کا احترام کیا جاتا ہے۔ وہ مشورے دے سکتی ہے اور فیصلے بدل بھی سکتی ہے۔ اپنی شخصیت کی پہچان کا حق اسے شاہ عالم کی موت کے بعد ہی ملا تھا لیکن یوں حاصل ہونے والی خود مختاری کی خوشی میں احساسِ جرم بہرحال شامل تھا۔ وہ افشائے راز سے ڈرتی تھی۔ اپنی مجبوری اور بے بسی سے ڈرتی تھی کیونکہ وہ عورت تھی اور اگر میرے اندر کا حیوان جاگ اٹھتا تو اس کی روح تک کو بھنبھوڑ سکتا تھا۔ یہ سارے اعصابی دباؤ بڑھتے بڑھتے اس انتہا تک آگئے تھے کہ ذرا سی بات پر وہ ایسے پھٹ پڑی جیسے پیپ سے بھرا ناسور پن چبھوتے ہی بہنے لگتا ہے۔

گاڑی سے کچھ فاصلے پر سیکیورٹی گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ رخشی اچانک رک گئی "ہمارے حق میں یہی بہتر تھا' ایک باعزت سمجھوتا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ہمارا ساتھ ممکن ہی نہیں تھا۔"

"میں اگر کچھ عرصہ اور ایسے ہی گزارتی..... تو شاید پاگل ہوجاتی۔ آہستہ آہستہ احساسِ جرم مجھ پر حاوی آنے لگا تھا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کسی دن شدید ذہنی دباؤ میں آکے میں وہ سب کچھ کہہ جاؤں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے۔ لوگوں کے سامنے یا اخبار والوں کے سامنے یا عدالت میں حاضر ہوکے۔ ضمیر کا بوجھ اتنا بڑھ جائے کہ اسے اٹھانا میری قوتِ برداشت سے باہر ہوجائے۔ میں جانتی تھی کہ تم شاہ عالم نہیں ہو مگر میں تمہیں شاہ عالم کہتی تھی۔ ایک اندر کا دباؤ تھا اور ایک باہر کا۔"

میں نے کہا "میرا مشورہ مانو تو کہیں باہر چلی جاؤ۔ دو چار مہینے یا سال بھر تک اس ماحول سے ہی نکل جاؤ۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے۔ تمہارے لیے تو واپس آنا بھی ضروری نہیں۔ تم باہر آزادانہ زندگی بڑے آرام سے گزار سکتی ہو۔"

"نہیں۔ ایسی جلاوطنی میں بھی کوئی تفریح نہیں جو کسی مجبوری کے تحت قبول کی جائے" وہ بولی۔

"پھر یہ نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

وہ مسکرائی "مجھے معلوم ہے' تم کیا کہو گے' یہی نا کہ اس تنہا زندگی کے سفر میں کسی کو شریکِ سفر بنالو۔ ابھی عمر کا لمبا راستہ تمہارے سامنے ہے اور تمہیں جس چاہت کی کمی ہمیشہ محسوس ہوئی' وہ تمہیں ضرور ملے گی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کمال ہے۔ کیا تم خیالات پڑھ سکتی ہو؟"

"ان حالات میں ہر عقلمند اور کیا مشورہ دے گا؟ اور اب تم سے کیا چھپانا' میں خود بھی ایسا ہی سوچتی ہوں۔ دنیا میں اکیلا کون جی سکتا ہے۔ خصوصاً عورت۔ صرف دوست کا سہارا کافی ہوتا تو الزتھ ٹیلر شادی کے ایک ناکام تجربے کے بعد دوسرا تجربہ کیوں کرتی۔ آٹھویں بار بھی کسی کو شوہر بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ کون تھا اسے روکنے ٹوکنے والا اگر وہ ہر روز شوہر بدلتی اور ہمیشہ مس الزتھ ٹیلر رہتی۔ انڈیا پاکستان کی ہر بڑی فلم ایکٹریس نے بالآخر شادی کرکے گھر میں پناہ لی اور اپنی عزت' شہرت' دولت سب کے ساتھ اپنی آزادی خود اپنی مرضی سے قربان کی۔ آخر کیوں؟"

"شاید انتہائی طاقتور عورت بھی مرد کی رفاقت کے بغیر خود کو کمزور اور نامکمل محسوس کرتی ہے" میں نے کہا۔

"تمہاری طرح میری زندگی کی کتاب بھی ہے۔ اس میں بھی ماضی کی کہانی کے باب جدا جدا ہیں اور تم بھی میری کہانی کا ایک باب یقیناً ہو مگر فرق صرف اتنا ہے کہ تم اپنی کہانی سنا سکتے ہو اور لکھ سکتے ہو' میں ایسا نہیں کرسکتی کیونکہ میں عورت ہوں۔"

"اگر یہ مردوں کا معاشرہ ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" میں نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

اسی وقت قریب سے گزرنے والی ایک جیپ نے بریک لگائے۔ یہ سفید رنگ کی پوٹھوہار جیپ تھی جسے فرید عباسی چلا رہا تھا۔

لائٹس آف کرکے اور انجن بند کیے بغیر وہ کود کر باہر آیا "ہیلو ایوری باڈی۔ کیا حسنِ اتفاق ہے' تمہارا یہاں ملنا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "دنیا بہت چھوٹی جگہ ہوگئی ہے۔"

"میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" فرید عباسی نے میری یا رخشی کی طرف دیکھے بغیر شوخی سے کہا۔

رخشی مسکرائی "میرا تو خیال ہے کہ آپ بڑے صحیح وقت پر آئے' ابھی میں آپ کو ہی یاد کررہی تھی۔"

میں رخشی کے جھوٹ کو جھوٹ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کیا پتا اس کے دل میں فرید عباسی کا خیال آیا ہو۔ خیال بے وجہ نہیں آتا۔ جیسا کہ شاعر نے فرمایا ہے' حادثہ بے سبب نہیں ہوتا لیکن مجھے وجہ اور سبب جاننے کی کیا ضرورت ہے۔

عباسی کا چہرہ روشن ہوگیا "زہے نصیب!"

میں نے کہا "کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اُدھر انہوں نے یاد کیا اِدھر تم پہنچ گئے۔ ایک ایسی جگہ جہاں سے اس وقت کوئی نہیں گزرتا۔"

عباسی نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔ مجھے یاد نہیں آخری بار میں ادھر کب آیا تھا اور کیوں؟"

"اور کس کے ساتھ؟" میں نے کہا۔

رخشی ہنسنے لگی "کیا اس سڑک پر کہیں بورڈ لگا ہوا ہے کہ یہ شاہراہِ عام نہیں ہے۔ کوئی اکیلا نہیں آسکتا ادھر؟"

رخشی کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی اور اعصابی کشیدگی کی کیفیت میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ اس کا چہرہ ہی نہیں' آنکھیں بھی مسکرانے لگی تھیں۔ فرید عباسی کے لیے اس کی نظر میں پسندیدگی کے جذبات کا عکس میں نے پہلے بھی دیکھا تھا اور عباسی نے تو محل کے رخشی کی تعریف کی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا کہ یہ سب ایک ڈرامے کا ایسا سین ہے جس کو لکھنے والے تقدیر کے ہاتھ ایک کہانی کا پورا اسکرین پلے کہانی کے انجام تک تمام تفصیلات کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مکمل کر چکے ہیں اور یہ سب ایسے ہی ہونا تھا جیسے پہلے سے اس کی ریہرسل ہو گئی تھی۔ مجھے رخشی کو ساتھ لے کر یہاں آنا تھا اور ہیرو عباسی کو بھی عین اس وقت نمودار ہونا تھا جب ہیروئن رخشی گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہونے والی تھی۔ اگر سڑک پر آ کے رخشی مجھ سے کوئی بات نہ کرتی تو عباسی کو اس سڑک پر کوئی نہ ملتا۔

اور اس وقت میں نے سوچا کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر کیوں نہ میں خود اس کہانی کو آگے بڑھاؤں جس میں ابھی تک میرا کردار ولن جیسا ہی رہا تھا۔ میں نے رخشی کو نیک نیتی کے ساتھ ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا لیکن رخشی نے شاید کسی رفیقِ تنہائی کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہوئے کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا تھا چنانچہ اس نے از خود ہی کہہ دیا تھا جو اس کے دل میں تھا۔

اس نے کہا "پولیس آ ہی جاتی ہے کسی نہ کسی بہانے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے۔"

میں نے کہا "نہ یہاں رنگ ہے نہ بھنگ محض جنگ چل رہی تھی۔ رخشی مجھے زبردستی کھینچ لائی تھی یہاں ورنہ میرے پاس ان فضولیات کے لیے وقت کہاں۔ میں سارا دن اپنے چمکوں میں رہتا ہوں اور ان کے کسی کام کا نہیں۔"

رخشی نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ "ہم یہاں تفریح کے لیے نہیں آئے تھے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ ہم اتنی دیر سے صرف لڑ رہے تھے۔ اب عباسی آ گیا ہے تو تم بیٹھو یہاں جب تک جی چاہے، میں چلا۔"

عباسی گڑبڑا گیا "تم کہاں چلے؟"

میں نے کہا "یار، ان کا تو کہنا تھا کہ یہ کوئی وقت ہے واپس جانے کا مگر میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم بیٹھ سکتے ہو ان کے ساتھ یہاں اور کچھ چاندنی کی یا بھیگی ہوئی رات کی اور افشاں جیسے ستاروں کی شاعرانہ باتیں کر سکتے ہو تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ شاید اسی لیے یہ تمہیں یاد کر رہی تھی سہ"

رخشی سنجیدہ ہو گئی "یہ بات نہیں ہے فرید۔"

وہ اس انداز تخاطب پر چونکا "پھر۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"کیا تم مجھے کسی ہوٹل تک چھوڑ آؤ گے؟" رخشی نے کہا۔

عباسی کی صورت پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے "ہوٹل۔۔۔!"

"ہاں فی الحال میں ہوٹل ہی جا سکتی ہوں۔"

"مگر کیوں شاہ عالم ہاؤس جانے میں کیا ہے؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں۔ بس میں جانا نہیں چاہتی وہاں۔" رخشی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں بتا دوں گی راستے میں۔"

فرید عباسی نے میری طرف دیکھا "شاہ جی۔ آخر معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "عباسی۔ تم سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ بس اب ہم نے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اس طرح۔۔۔ اچانک۔۔۔!"

میں نے کہا "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ سمجھ لو وہ وقت آ گیا۔ اچھا ہے تم ہی انہیں ہوٹل پہنچا دو" میں نے کہا۔

"مگر ہوٹل کیوں۔۔۔" عباسی نے پھر کہا۔

"اس وقت میں کسی کے گھر جا کے لوگوں کی مشکوک نظروں کا اور فضول سوالات کا سامنا کرنا نہیں چاہتی" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "ابھی کچھ دن ایسے ہی چلے گا پھر طلاق کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ ہمارے لیے ایک دوسرے کو برداشت کرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔"

عباسی نے باری باری ہم دونوں کی نفرت اور بیزاری کے جذبات کا اندازہ کیا اور پھر بولا "او کے۔ اگر یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے آپ نے تو۔۔۔ ٹھیک ہے لیکن رخشی، کیا ہوٹل میں تمہیں پہچاننے والا کوئی نہیں ہوگا۔ بہت لوگ جانتے ہیں تمہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی اخباری نمائندے کی نظر پڑ گئی تو۔۔۔؟"

"تو کیا ہوگا؟" رخشی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "جو بات کل لوگوں کو معلوم ہونا تھی، وہ آج معلوم ہو جائے گی۔"

"اگر تم برا نہ مانو۔۔۔"

"اتنی برائی قبول کرنے کے بعد میں نے برا ماننا چھوڑ دیا ہے فرید!"

"میرے گھر میں صرف میری ماں رہتی ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ ماں بہت خوش ہوگی۔ جب بھی کوئی ہمارے گھر آتا ہے، وہ خوش ہو جاتی ہے۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہے نا۔ اس سے بات کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ایک رات بھی ہوٹل میں گزارنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مسئلہ صرف ایک رات کا نہیں ہے۔ لیکن کل میں کوئی ایسی جگہ تلاش کر لوں گی جہاں میں خود کو محفوظ سمجھ سکوں۔"

"تم جب تک چاہو وہاں رہ سکتی ہو۔" فرید عباسی نے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "تھینک یو یار، تم نے میرا مسئلہ بھی حل کر دیا۔"

رخشی اس وقت تک جیپ میں آگے بیٹھ چکی تھی۔ عباسی کی تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی مگر میرے سامنے اس نے اپنی جذباتی سرخوشی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس کی جیپ روانہ ہو گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ یقیناً خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کے سوچا۔ اسباب اور واقعات کے فرق کے ساتھ ان کی ازدواجی زندگی میں ایک جیسی ناکامی کا دکھ مشترک تھا۔ شاید قدرت نے انہیں ملایا ہی اس لیے تھا کہ وہ ایک دوسرے کے درد کا درماں بن سکیں۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ رخشی کا معاملہ اس حد تک خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اسے عباسی کے سپرد کر کے مجھے یوں لگا جیسے میں نے بروقت کسی بم کو پھٹنے سے پہلے بم ڈسپوزل والوں کے حوالے کر دیا ہے جو اسے ناکارہ بنا سکتے ہیں۔ اب میں اپنے معاملات سے نمٹنے کے لیے آزاد تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس راہ کی مشکلات میری توقعات اور اندازوں سے بہت زیادہ ہوں گی جس پر میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔ اتنا آگے کہ اب واپسی کی راہ پر بھی صرف گردِ سفر ہے جس میں سب کچھ اوجھل ہو گیا ہے۔ گزری ہوئی منزلوں کے نشان، بچھڑ جانے والے ہم سفر اور وقت کی راہ گزر پر اپنے نقشِ قدم۔

میرا شاہ عالم ہاؤس جانے کا پہلے بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہاں پولیس پوری تیاری کے ساتھ مجھے گرفتار کرنے کے لیے موجود ہوگی اور اب تک ان کا انتظار بھی تشویش میں بدل گیا ہوگا۔ انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ جس پریس کانفرنس سے مجھے خطاب کرنا تھا وہ ہوئی ہی نہیں۔ میں وہاں پہنچا ضرور تھا مگر اس کے بعد لاپتا ہو گیا۔ شاید کسی نے مجھے پولیس کی کارروائی کی اطلاع دے دی اور گرفتاری سے بچنے کے لیے میں نے روپوشی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ اب میں اس وقت نظر آؤں گا جب میرے لائق فائق وکیل کسی سیشن کورٹ سے میری ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر لیں گے لیکن اس بار یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ پہلی بار مجھے صرف شک کی بنیاد پر تفتیش کے بہانے زیرِ حراست رکھا گیا تھا اور عدم ثبوت کی بنا پر میری بے گناہی کو سیاسی تائید و حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ پولیس مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اب صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ میرے خلاف سازش کرنے والوں نے بڑی محنت سے اور سوچ بچار کے بعد پوری تیاری کے ساتھ جال پھیلایا تھا۔ خادم مرزا اور خالدہ عثمان کی لاشیں دس گواہوں کی موجودگی میں میرے گھر سے

ایم اے راحت
کی
ایک خوبصورت تحریر

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ۔۔۔ ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

قیمت -/۱۵۰
ڈاک خرچ -/۲۰

ناشر علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکالی جاچکی تھیں جن کو میں نے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں زمین کھود کے گاڑ دیا تھا۔ وہ عام سپاہی کارکن یا میرے نمک خوار اور پاپوش بردار نہیں' شہر کے معزز تاجر اور بااثر لوگ تھے۔ انہیں آخری بار میرے ساتھ ہی دیکھا گیا تھا اور عینی شاہدوں کا بیان پہلے سے موجود تھا کہ کاروباری معاملات میں اختلافِ رائے کے باعث ان کے اور میرے درمیان تلخ کلامی اور مارپیٹ تک ہوئی تھی۔ میں ہی انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا مگر اس کے بعد وہ لوٹ کر گھر نہیں پہنچے تھے۔ یہ پولیس کی ذہانت اور فرض شناسی کا قابلِ قدر کارنامہ تھا کہ اتنے کم وقت میں انہوں نے قتل کا سراغ لگالیا اور قاتل کے خلاف ثبوت شہادت کے سارے قانونی لوازم پورے کرلیے۔

میں نے چشمِ تصور سے ایس پی غلام محمد کی اکڑی ہوئی گردن پر فخر و غرور سے اٹھا ہوا سر اور اس کے لبوں کی سفاک فاتحانہ مسکراہٹ کو دیکھا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا سر' جناب شاہ عالم صاحب سابق چیئرمین پی جے ایف' سابق ایم پی اے' ہم اتنے نالائق اور بے اختیار بھی نہیں ہوئے کہ کسی کو تخت سے اتار کے تختۂ دار تک پہنچانا چاہیں تو کوئی مائی کا لال ہمیں روک سکے۔ تمہاری ابھی اوقات ہی کیا تھی۔ اگر پھانسی نہ چڑھتے تو صوبائی اسمبلی سے صوبائی وزارت یا قومی اسمبلی تک پہنچنے اور وزیر سے وزیراعظم بننے کے ہر خواب کی تعبیر پانے کے لیے تمہیں دس بیس سال اور انتظار کرنا پڑتا اور پھر سیاست کے سنگلاخ راستے کے نشیب و فراز سے گزرتے' بغض اور منافقت کے کانٹوں پر چلتے پولیس کے ڈنڈے کھاتے اور جیل کاٹتے وزیراعظم بن گئے تو کون سے ہمالیہ پہاڑ ہو جاؤ گے۔ پتا نہیں کتنے وزیراعظموں کو ہم نے جیسے اوپر والوں نے چاہا ویسے ٹھکانے لگادیا۔

تو کیا میرا انجام بھی کسی آغاز سے پہلے ہی ہوگا؟ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ میرے جیسے شرافت اور اصول پرستی کی سیاست پر یقین رکھنے والے۔ ملک اور قوم کی خیرخواہی کا عزم رکھنے والے مخلص اور باضمیر لوگ اسی طرح راستے سے ہٹائے جاتے رہیں گے یا خود ہمت ہار کے یہ میدان انہی بے کردار' بے ایمان اور بے اصول گدھوں اور گدھوں کے لیے خالی رہ جائے گا جو پچھلے پینتالیس سالوں میں پاکستان کو اس کے قیام کی منزل اور مقصد سے اتنا دور کرچکے ہیں کہ آج ملک میں آپ جتنے قومی نغمے اور ترانے چاہیں گالیں' باہر کی دنیا میں پاکستانی ہونا اور کہلانا باعثِ شرمندگی و رسوائی ہے۔

نہیں۔ میں نے کسی تذبذب کے بغیر فیصلہ کیا۔ یہ مسئلہ اجتماعی سے زیادہ انفرادی ہے۔ میں کسی اور پر انگلی اٹھانے کے بجائے خود اپنی ذمّے داری پوری کرنے میں اپنے ساتھ دیانت دار ہوں۔ ڈاکٹر انجینئر' پروفیسر جج' سرکاری افسر' کلرک اور مکینک' علما اور تاجر۔ سب کسی کا سے کچھ کے بغیر اپنے فرائض اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے سرانجام دیں تو پھر خرابی کیسی لیکن عدالت میں انصاف کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد جج کہے کہ یہ تو بڑا مشکل ہے کہ میں دباؤ اور لالچ کی پروا کیے بغیر فیصلے سناؤں اور پروفیسر کہے کہ میں اس تنخواہ میں اس طالب علم کو کیسے پڑھاؤں جو پڑھے بغیر پاس ہونا چاہتا ہے اور ڈاکٹر کہے کہ میں نے لاکھوں خرچ کرکے ڈگری دکھی انسانیت کی مفت خدمت کرنے کے لیے تو نہیں لی تھی۔ تو وہ اپنے ضمیر کو کیسے مطمئن کرے گا؟ پھر کیا اسے یہ پیشہ بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ ایسے تو عدالت کی ہر کرسی پر ایک کرپٹ جج قابض ہو جائے گا اور کالج' یونیورسٹی میں نااہل اور حرام خور اساتذہ آجائیں گے اور ڈاکٹروں کی جگہ لالچی قسائی۔

ایسی کی تیسی' مجھے سیاست سے باہر رکھنے کا فیصلہ کرنے والوں کی۔ میں سیاست کو مس اور قریشی جیسے لوگوں کے لیے چھوڑ دوں گا تو خود بھی ملک و قوم کا مجرم۔ میں اتنی آسانی سے پھانسی چڑھ گیا تو ان کا کام مزید آسان ہو جائے گا۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ اس ملک پر صرف چور ڈاکو حکومت کریں اور انہیں روکنے ٹوکنے والا ایک بھی باہمت' محبِ وطن پاکستانی نہ ہو۔ کسی میں اتنی ہمت بھی باقی نہ رہے کہ چور کو چور کہہ سکے عوام۔ کوئی سوچ نہ رکھنے والے بزدلوں کو بھوکا ننگا ہجوم ہو جسے بدمعاشی کی لاٹھی سے کسی بھی عذاب کے جہنم کی طرف ہانک دیا جائے تو وہ اسے ہی اپنی تقدیر سمجھ لے اور خاموشی سے شرمندگی کی زندگی اور ذلت کی موت قبول کرنا سیکھ جائے۔

شاہ عالم ہاؤس سے چند سو گز کے فاصلے پر میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کے لیے کہا "جوان۔ کیا تم چھٹی حس پر یقین رکھتے ہو؟"

گارڈ نے سرہلایا "کیوں نہیں سر۔ خطرات سے نمٹنا جن کا پیشہ ہو' انہیں چھٹی حس پر زیادہ بھروسا کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ اس وقت اچانک مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کیا ہے کہ آگے خطرے کی سرحد ہے۔ مجھے اس کو عبور نہیں کرنا چاہیے۔"

"پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے سر!" ڈرائیور بولا۔

میں نے کہا "تم مجھے یہاں اتار دو۔ میں ادھر چھپ کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ تم وہ ٹیلی فون والوں کی کیبنٹ دیکھ رہے ہو' وہ جو لوہے کی الماری سی کھڑی ہے۔ میں اس کے پیچھے انتظار کرتا ہوں۔ تم گاڑی لے کر جاؤ' بالکل اسی طرح جیسے میں گاڑی میں موجود ہوں۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ تم سے

کوئی کس قسم کے سوال پوچھتا ہے' تمہیں آگے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ تم سیکیورٹی ایجنسی کے ملازم ہو اور بس۔

"ہم کیا بتائیں آپ کے بارے میں؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ ہوٹل سے صاحب اور بیگم صاحبہ کہیں چلے گئے تھے کسی کے ساتھ اور ہمیں حکم دیا تھا کہ واپس جائیں۔ تم کسی کو نہیں پہچانتے اور تمہارا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ تم نئے ہو اور ہر سوال کے جواب میں کہہ سکتے ہو کہ ہمیں نہیں معلوم۔ اب جاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر خود آؤ یا کسی کو یہاں بھیج دو جو مجھے صحیح صورتِ حال بتاسکے۔ رائٹ۔ اب جاؤ' میں اسی جگہ ملوں گا تمہیں" میں نے کہا۔

جب گاڑی نظر سے اوجھل ہوگئی تو میں پلٹ کر چلنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد میں کئی موڑ کاٹنے کے بعد اتنی دور نکل گیا تھا کہ فوری طور پر مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا تھا پھر مجھے ایک ٹیکسی مل گئی جس نے مجھے آدھے گھنٹے میں رئیس خانے پہنچادیا۔

رئیس خان نے ایک یتیم خانے سے میرے ساتھ دوستی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت وہ رئیس خبیث تھا اور میں ناصر عظیم۔ افتادِ طبع' عادات اور مزاج' خیالات اور مقصدِ حیات کے بارے میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے بالکل مختلف تھے۔ شاید یہ ایک دوسرے کے لیے نیک نیتی اور خلوص کے جذبات تھے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بنائے رکھا اور ہم زندگی کے الگ الگ راستوں پر چلتے رہے۔ ٹھوکریں کھاتے' گرتے اور سنبھلتے' بچھڑتے اور کتنے برسوں بعد بھی بقول رئیس خان' ایسے تھے جیسے نٹ بولٹ۔ وضاحت اس کی وہ یوں فرماتے تھے کہ پیارے' دیکھنے میں بالکل الگ صورت ہے دونوں کی۔ نٹ چھوٹا بڑا ہو سکتا ہے۔ موٹا یا پتلا ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی بولٹ لوہے کا ہو یا سونے کا' کوئی چوکور ہوگا تو کوئی چھ پہلو والا۔ کسی کی چوڑی باریک ہوگی کسی کی موٹی لیکن ہر نٹ کے لیے ایک بولٹ لازمی ہے اور ہر بولٹ بے کار ہے اگر نٹ نہ ہو۔ معاملہ پکا وہاں ہوتا ہے جہاں چوڑی بیٹھ جائے۔ اپنی یاری بھی بس ایسی ہی ہے۔ اللہ میاں نے تجھے بنادیا سونے کا اور ہم تھے لوہا پھر زمانے کی بھٹی نے تجھے کردیا کندن تو ہمیں بنادیا فولاد۔ اب دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں کہ اس سونے کے نٹ سے یہ فولادی بولٹ کیوں لگا ہوا ہے مگر یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ اصل بات ہے چوڑی کی۔ اپنی چوڑی ایک ہے اور وقت کے ساتھ چوڑی پر چوڑی چڑھنے سے یاری اتنی پکی ہوگئی ہے کہ اب نٹ ٹوٹ جائے یا بولٹ تو الگ بات ہے ورنہ کون الگ کرسکتا ہے ہمیں۔

رئیس کا قلعہ نما گھر سمن آباد کے علاقے میں تھا۔ باہر سے یہ لال پتھروں کی ایک دیوار تھی جس کا بہت بڑا فولادی گیٹ تھا۔ اندر سے عمارت کا حلیہ بدلتا رہتا تھا۔ اس کا نقشہ خود رئیس خان نے بنایا تھا اور میرے اس مشورے کو صاف مسترد کردیا تھا کہ وہ کسی سول انجینئر یا ماہرِ تعمیرات کی خدمات حاصل کرے۔ اس کا موقف بہت واضح تھا۔ پیارے' رہنا مجھے ہے یا تیرے اس آرکی ٹیکٹ کو۔"

میں نے کہا "آرکیٹیکٹ!"

"ابے ہاں وہی۔ پہلے سالے راج کہلاتے تھے اب ہوگئے ہیں سول انجینئر اور آرکی ٹیکٹ۔ بھائی' بہت بنگلے اور کوٹھیاں دیکھ چکے ہیں ہم بھی۔ ویسے نہیں رہنا ہمیں۔ اپن کو چاہیے ایک کمرا یاروں کے لیے جہاں سب ہلا گلا کریں اور دل چاہے تو لمبی تان کے سوجائیں۔ ایک کمرا اکیلے سونے کے لیے اور ایک بیوی کے ساتھ سونے کے لیے۔ ابھی نہ سہی لیکن ایک نہ ایک دن کوئی سالی ضرور مل جائے گی رئیس خان کو بھی پھر پیارے ایک کمرا کسی ماشوق کے لیے بھی ہونا چاہیے" اس نے ایک آنکھ دبا کے کہا تھا۔

"تیرا دماغ خراب ہے۔ اب بیڈ روم تو بیڈ روم ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں پیارے' اب جو بیوی چاہتی ہے وہ ماشوق کی پسند کیسے ہو سکتی ہے اور پھر اپنے شوق کے لیے ایک تو ہوگا عمران خان کا کمرا۔ اصیل مرغ ہوں گے اور ان کی تربیت کے لیے استاد۔ ان کے کھانے پینے کا خاص انتظام۔ دوسرے کمرے میں ہم کبوتر پالیں گے۔ جس کمرے میں ہم گھر والی کے ساتھ رہیں گے۔ اس کا ایک دروازہ کھلے گا مرغ روم میں تو دوسرا کھلے گا کبوتر روم میں۔"

اس نقشے میں رئیس خان حسبِ خواہش تبدیلی بھی کرتے رہتے تھے۔ صرف بیوی والا بیڈ روم ابھی تک ویسا ہی تھا جیسا بنایا گیا تھا۔ سال چھ مہینے میں کوئی ماشوق ترقی کرکے منگیتر کے عہدے پر فائز ہو جاتی تو ماشوق روم میں اس کی پسند کے مطابق تبدیلی لائی جاتی تھی۔ پردے قالین یا فرنیچر بدلنا تو عام سی بات تھی مگر ایک بار دیواروں پر ٹائل لگائے گئے کیونکہ یہ ماشوق کی فرمائش تھی۔ اس سے پورا بیڈ روم ایک بہت وسیع باتھ روم نظر آنے لگا پھر ایک ماشوق نے سارے ٹائل ہٹا کے چاروں طرف اور چھت پر آئینے لگانے پر اصرار کیا۔ یہ غالباً گیارھویں منگیتر تھی جس کے لیے رئیس نے پورے بیڈ روم کو آئینہ خانہ بنادیا۔ جب بالآخر یہ منگنی ٹوٹی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طیش میں آکے رئیس خان نے سارے آئینے توڑ ڈالے۔ بارھویں ماشوق نے ٹائل ہٹا کے دیواروں پر وال پیپر لگوایا جو باہر سے منگوایا گیا تھا۔ بڑے بڑے ٹکڑوں کو جوڑنے سے دیوار پر ایک ہی تصویر بن جاتی تھی جس میں جنگل' پہاڑ' آبشار' دریا اور سبزہ زار۔ برفانی تودے اور دلکش مناظر اپنے شوخ قدرتی رنگوں میں نظر آتے تھے۔

باہر کے حصے کی تبدیلیاں رئیس خان کے موڈ کی عکاسی کرتی تھیں۔ وہ اب پہلے جیسا پھکڑ رئیس نہیں تھا۔ بچ بچ کا رئیس اعظم تھا۔ اس کی آمدنی کے ذرائع لامحدود تھے حالانکہ نہ اس کا کوئی باقاعدہ بزنس تھا اور نہ وہ کوئی کام کرتا تھا۔ یہ سارے ذرائع غیر شریفانہ تھے لیکن اب وہ کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش نہیں تھا۔ وہ سرکاری درباری بدمعاش تھا اور بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ پے جیرو جیسی گاڑیوں میں گھومتا تھا جن پر بعض اوقات جھنڈا لہراتا نظر آتا تھا۔ میری طرح اس کے کچھ پرانے دوست ابھی تک رئیس کے ساتھ تھے۔

سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ رئیس نے اپنے قلعے اور حویلی جیسے گھر کا نام جو بیک وقت مرغی خانہ کبوتر خانہ اور کسی حد تک میخانہ اور بالا خانہ بھی تھا' رئیس خانہ رکھا تھا۔ اس کے حق میں رئیس کے دلائل بڑے مضبوط تھے۔ "ابے ساری عمر ہوگئی ہر ایرے غیرے کو کہتے کہ غریب خانے پر تشریف لایئے۔ اب بھی نہ کہیں کہ رئیس خانے پر حاضر ہوجاؤ۔ کسی خاندانی رئیس کے پاس تو اب سر چھپانے بلکہ منہ چھپانے کی جگہ بھی نہیں۔ یہ جو نودولتیے ہیں' ان سے کیا کم ہیں ہم پھر نام بھی ہمارا رئیس خان ہے تو ہماری رہائش گاہ کو رئیس خانہ کیوں نہ کہا جائے۔ شوق بھی ہمارے جتنے ہیں' رئیسوں والے ہیں۔"

منگول نسل کے اور چنگیز خان نظر آنے والے چوکیدار نے پہلے تو عادت کے مطابق چلا کے کہا "اوئے کون آتی جاتی ہے۔" پھر اس نے مجھے قریب سے دیکھا اور پہچان کے اپنے کان پکڑنے لگا "میرا بادشاہ' میرے کو معاف کرتی۔ تم پاؤں پاؤں آتی (یعنی پیدل) ہم سمجھتی۔"

میں نے کہا "میری گاڑی بھاگ گئی ہے' مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "گاڑی چلا گیا۔ کیسے؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "جیسے بیوی بھاگ جاتی ہے' چھوڑ جاتی ہے۔ تمہاری اپنی کوئی بیوی ہے؟"

میرے سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے اس نے حلق سے ایک غصیلی دردناک کراہ جیسی آواز نکالی اور دروازہ کھول دیا "بادشاہ اندر ہوتی۔"

وہ سر' صاحب یا سرکار وغیرہ کے بجائے بادشاہ کے خطاب سے نوازنے کا عادی تھا۔ مذکر کے لیے مؤنث کا اور مؤنث کے لیے مذکر کا صیغہ بلاارادہ استعمال کرتا تھا اور ماری اس نے شاید کبھی بھی نہ ہو مگر اپنی ہر کہانی میں وہ ایک دو بندے پھڑکا تا رہتا تھا۔ کبھی خاندانی دشمنی' کبھی چور ڈاکو' کبھی رقیب یا اپنے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت میں۔ رئیس نے اس کو تمیں مار خان کا نام بالکل ٹھیک دیا تھا۔ تمیں مار خان کے دو شوق یا جنون تھے۔ ایک وہ طوالت میں عالم چنا کا ریکارڈ توڑ کے پٹھانوں کا نام روشن کرنا چاہتا تھا کیونکہ پاکستان کا نام تو پہلے ہی روشن تھا۔ روشن خان کی وجہ سے بھی جو اس کے "ملک" کا تھا۔ اس کے لیے وہ قد بڑھانے والی سب دوائیں استعمال کرتا تھا جس کا وہ اشتہار دیکھتا تھا لیکن ابھی تک اس کا قد جوں کا توں تھا بلکہ ایک بار تو اس پر اتنا ڈیپریشن طاری تھا کہ اس نے "خدائی خوار' دغاباز" دوائی ایجاد کرنے والے اس کا اشتہار دینے والے اور بیچنے والے سب کو ٹھکانے لگا کے خود بھی فوت ہوجانے کا عزم صمیم کرلیا تھا۔ اس کا قد دوا کے استعمال سے ایک انچ کم ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ رئیس خان نے یہ ثابت کیا کہ پرانا فیتہ کثرتِ استعمال سے کھنچ کر کچھ لمبا ہوگیا تھا اور نیا فیتہ ایک انچ کم تھا۔ اس میں گز پینتیس انچ کا تھا۔

تمیں مار خان کا دوسرا خبط طویل ترین مونچھیں پالنے کا تھا۔ دنیا میں نہ سہی' کم سے کم پاکستان میں اس کی مونچھ کا مقابل کوئی نہ ہو۔ وہ سب ہیئر ٹانک اور آئل جو لوگ سر کے بالوں کی فصلِ خزاں میں استعمال کرتے ہیں وہ اپنی مونچھوں کو پلاتا تھا۔ بلاشبہ اس کی مونچھیں ملک میں کرپشن کی طرح بڑھ رہی تھیں۔

میں نے بالا خانے پر لات ماری تو رئیس گالیاں بکتا نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کے واپس دوڑا۔ کوئی خادم ہوتا تو شاید وہ اس سے لباسِ قدرت میں بات کرتے ہوئے نہ شرماتا۔ اس کا ایک زریں قول یہ بھی تھا کہ یار' بہت شرم آتی تھی جب ہم پھکڑ اور بے عزت تھے۔ اب کیسی شرم' یہ سالے جتنے کھاپی کے ڈکار بھی نہیں لیتے اور جو غلطی سے حلال کا لقمہ کھالیں تو انہیں جلاب لگ جاتے ہیں۔ بلٹ پروف گاڑیوں میں پھرنے والے۔ یہ کیا شرم پروف نہیں ہوتے۔

وہ دوبارہ الٹا پاجامہ پہنے نمودار ہوا۔ "آدھی رات کو پہلے بھوت پریت آتے تھے تنگ کرنے۔"

"ایسا شریف انسانوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھوتوں کے ساتھ نہیں۔ اندر کون ہے؟" میں نے جوتوں سمیت بستر پر دراز ہوکے کہا۔

"تیری خالہ۔ تو پھر آگیا نا کباب میں بھنگ ڈالنے۔"

میں نے کہا "رنگ میں بھنگ کہہ یا کباب میں ہڈی۔ کیا میں اندر جھانک کے ایک نظر دیکھ لوں؟"

"خبردار!" اس نے میرے اور دروازے کے بیچ میں آکے کہا "مجھے ہول اٹھ رہا ہے یار' تیرا آنا بے سبب نہیں ہوسکتا۔"

"ہاں۔ میں اب ہمیشہ کے لیے آگیا ہوں یہاں۔ میں نے بیوی کو طلاق دے دی ہے اور شاہ عالم ہاؤس چھوڑ دیا ہے۔" میں نے کہا "کیونکہ رخشی کو لے گیا ہے سابق انسپکٹر پولیس فرید عباس اپنے گھر۔ میرے گھر سے پولیس نے دو لاشیں برآمد کی ہیں جو میں نے شاہ عالم ہاؤس کے پچھلے حصے میں دفن کردی تھیں۔ خالد عثمان اور خادم مرزا کی۔ یہ تھیں اب تک کی خبریں۔ اب پہلے مجھے کھانا کھلا' پھر میں ان کی تفصیل سناؤں گا۔"

اندر سے کسی عورت کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "تم کہاں چلے گئے رئیس!" پھر وہ دروازے میں نمودار ہوئی اور ایک چیخ مار کے غائب ہوگئی۔

میں نے قہقہہ مارا "یار' یہ خود ہی دس نمبری ہے نا۔ رس ملائی۔"

رئیس خفت سے مسکرایا "ابے نہیں۔ یہ تو برفی ہے برفی' کھوئے والی۔"

"سالے' پہلے جلیبی' پھر رس ملائی۔ پچھلی بالوشاہی تھی اور یہ ہوگئی برفی۔ حلوائی کی اولاد" میں نے کہا "یہ ایک جیسے ہیوی ویٹ ماڈل کہاں سے لے آتا ہے تو۔ بس دو چار تولہ کا فرق ہوتا ہے۔"

"پھر تجھے کیا تکلیف ہے۔ اپن کو ایسی ہی گدے دار گاؤ تکیے جیسی اچھی لگتی ہیں" رئیس بولا "اور نام میں خود ایسے رکھتا ہوں کہ منہ میں پانی بھر آئے سن کرہی۔ بس یہ آخری ہے قسم اللہ کی۔ سب سے اچھی۔ شادی اسی سے ہوگی میری۔"

اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے اس کی برفی کو چودھویں کے چاند جیسا کہا۔ وہ پھر ہمارے پاس آکے بیٹھ گئی تھی اور گزشتہ تیرہ منگیتروں سے واپس لی جانے والی انگوٹھی پہن کے بہت خوش تھی۔ یہ چاند مجھے ویسا ہی لگا جیسا کہ چاند پر اترنے والے خلاباز کو نظر آیا تھا۔ تاہم ایک مہذب انسان اور شریف دوست کی طرح میں نے اسے مبارک باد دی اور دل پر جبر کرکے دو سو پاؤنڈ کی توم سے بنی ہوئی ایک جیسی لمبائی چوڑائی والی عورت کو نازک اندام گلبدن حسینہ بھی کہا۔ ایسے ہی تیرہ جھوٹ' اللہ معاف کرے' میں پہلے بھی بول چکا تھا۔ وہ نشے میں نہ ہوتی تب بھی اسے سچ ہی مانتی۔

کھانے کے بعد ہم مہمان خانے میں آگئے تو گل بدن' جو اس کا اصل نام تھا۔ جھومتی اٹھی اور واپس اندر جا کے سوگئی۔ مہمان خانے میں اس وقت دو افراد مدہوش پڑے تھے۔ ان میں سے ایک جانی جن تھا جو ایک انڈرویئر پہنے فرش کے قالین پر الٹا لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا اور طلسماتی کہانیوں کا کالا دیو لگتا تھا۔ دوسرا محمد نذیر عرف جیرا بلیڈ تھا۔ یہ دونوں رئیس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ چنڈال چوکڑی کے باقی معزز اراکین میں سے سراج دھوبی تائب ہوگیا تھا اور اس نے یاروں کی "صحبتِ بد" سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ یاروں نے بھی اسے بڑی فراخ دلی سے معاف کردیا تھا کیونکہ وہ شروع سے جورو کا غلام تھا اور اس سے یہی توقع تھی۔ چاچا پتنگ باز فی الحال مفرور تھے کیونکہ ان کی خانقاہِ درویش پر بی بی سی یا کسی ایسے ہی ادارے نے فلم بنا کے سارے زمانے کو دکھادی تھی اور سارا بزنس چوپٹ کردیا تھا۔ چاچا پتنگ باز جس نے پیر گنڈی والا کے نام سے بڑی شہرت حاصل کرلی تھی' اپنے مریدوں کو پولیس کے رحم وکرم پر چھوڑ کے نکل گیا تھا۔

میری بات نے رئیس کو متفکر کردیا "یہ تو ہونا ہی تھا پیارے' ہم تو جانتے تھے۔ تو نے سب سے پنگا لے لیا تھا ایک ساتھ۔"

"وہ تو مجھے سیاست سے ہی نہیں' اس دنیا سے بھی آؤٹ کرنا چاہتے ہیں۔ پکا بندوبست کرلیا ہے مجھے پھانسی چڑھانے کا۔"

رئیس تاؤ میں آگیا "ابے ایسی کی تیسی' اپنے یار کو پھانسی چڑھانے والوں کی۔ قسم اللہ کی ایک ایک کو اس کے گھر میں گھس کر لٹکادوں گا۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی میں کیا کروں؟"

"تو نے کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "دیکھ یار۔ اپن بھی اتنی آسانی سے پھانسی چڑھنے والے نہیں ہیں۔ میں کل ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دائر کرادوں گا۔ اب مجھے کوئی اور وکیل کرنا پڑے گا۔ بیرسٹر سلطان محمود کو مجھے مجبوراً الگ کرنا پڑا ورنہ میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چکروں میں وہ بھی مارے جاتے۔"

"ابے ایسے تو کوئی وکیل ہی نہیں ملے گا تجھے۔ تو جسے وکیل کرے گا اسے وہ دھمکی دیں گے کہ شاہ عالم کی وکالت مت کرو ورنہ ہم تمہیں گووینٹ گون کردیں گے۔"

"یار' اب یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ وہ سلطان محمود صاحب کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن میں نے خود ہی ان کی فیملی کی پریشانی دیکھ کے یہ فیصلہ کرلیا۔ سلطان محمود صاحب خفا ہوگئے مجھ سے مگر میں نے انہیں اس فیصلے کی وجہ نہیں بتائی۔ ایسے وکیلوں اور ججوں کو دھمکیاں ملنے لگیں اور وہ ڈر جائیں تو عدالتوں میں کیا تالے پڑجائیں گے۔"

"یہ تو ہے پیارے۔ یہ جو پرانے سیاسی لیڈروں کے وکیل ہیں اور بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ خالد انور اور خالد اسحاق' یا دو عبدالحفیظ ہیں' پیرزادہ اور لاکھو۔ یہ سب تیری طرف سے پیش ہوسکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "یار' وہ ایسے معمولی قتل کے کیس کہاں لیں گے۔ یہ جو فرید عباسی ہے نا' اس کا کزن ہے کوئی۔ اس کی بھی بہت بڑی لیگل فرم ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بندہ جی دار ہے۔ کیوں نہ میں اس سے بات کرلوں عباسی سے۔ اسی وقت۔"

"یار' پہلے اخبار والوں سے تو پوچھ لے کہ معاملہ کیا ہے۔ آخر کیا کیس بنایا گیا ہے تیرے خلاف۔"

"کیس وہی پرانا ہے۔ بس خبر نئی ہوگی" میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ابوبکر آزاد کے اخبار کا نمبر ملایا۔

حسبِ توقع وہ موجود تھے مگر ذہنی طور پر غیر حاضر تھے۔
"کون ہے یہ دنیا کا بادشاہ اس وقت گویا۔ شاہ عالم۔"

میں نے کہا "حضرت۔ میں چلبلی کا مسیحا ہوں۔"

انہوں نے چلا کے کہا "اخاہ۔ تو آپ ہیں۔ بھئی خوب۔ جی مار مار کے کھال ادھیڑدوں گا۔ یہ کیا خرافات ہے۔"

میں نے بوکھلا کے کہا "جی؟ میں نے تو ابھی کچھ نہیں کیا۔"

"وہ۔ معاف کرنا' ہم ذرا اس جواہر لال نہرو کی گویا بدروح سے بات کررہے تھے۔ نامعقول نے حنا کو چنا لکھ دیا۔ اک ہتھیلی پہ چنا ایک ہتھیلی پہ لہو۔ اُف۔"

میں نے کہا "چلیں' معاف کردیں۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے۔"

"بالکل ہوتی ہے گویا مگر ایک تو یہ انسان نہیں جواہر لال ہے۔ جواہر رقم لکھتا ہے خود کو پھر یہ غلطی نہیں گناہ ہے بلکہ گناہ کبیرہ۔ خیر' تم نے کیوں ڈسٹرب کیا اس وقت ہمیں۔ بیس سیکنڈ میں عرض کرو۔"

میں نے کہا "آج شاہ عالم ہاؤس سے دو لاشوں کے برآمد ہونے کی خبر کیا ہے؟ دراصل وہ سب میری عدم موجودگی میں ہوا تھا۔"

"موجودگی نہیں۔ موجوری۔ موجوری" انہوں نے خفگی سے کہا "خیر خبر تو گویا کوئی خاص نہیں۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ مجھ پر جن افراد کے قتل کا الزام تھا' ان کی لاشیں شاہ عالم ہاؤس کے پائیں باغ سے کھود کے نکال لیں پولیس نے۔"

انہوں نے قہقہہ مارا "بھئی یہ بھی لطیفہ ہے گویا۔ یعنی جس کی خبر ہے اسے خبر نہیں۔ جیسے کوے کو علم نہ ہو کہ وہ روسیاہ ہے۔"

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔"

"بھئی' وہ کیا کہتے ہیں۔ معاملہ الٹا ہوگیا گویا۔ شکار کرنے کو آئے شکار ہوکے چلے گویا۔ وہ جو تمہارے محافظین خصوصی ہیں' انہوں نے ساری سازش کو ناکام کردیا۔ جائے وقوعہ پر ہی دھرلیا سب جعلساز دھوکے بازوں کو گویا۔"

"آخر آپ مجھے پوری خبر پڑھ کے کیوں نہیں سنادیتے؟ آپ کو قسم ہے چلبلی کی ہیڈلائنس کی" میں نے کہا۔

"اچھا۔ قسم دے دی ہے تو پھر سنو" وہ آہ بھر کے بولے۔

خبر کی نوعیت بدل گئی تھی مگر اس کی سنسنی خیزی میں کمی نہیں آئی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز نے جو شاہ عالم ہاؤس پر مامور تھے' کسی وجہ سے یہ محسوس کیا کہ چھاپا مارنے والے پولیس مین کچھ نروس ہیں اور ان کی حرکات و سکنات بھی مشکوک ہیں۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک کو پکڑلیا اور ایسے غائب کردیا کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ جو کچھ اس نے بتایا' وہ ناقابلِ یقین تھا مگر اس کے بعد سیکیورٹی گارڈز نے اسلحہ نکال لیا اور کمانڈو ایکشن اسٹائل میں ہر طرف سے فائرنگ کرکے انہیں پکڑلیا۔ انہوں نے بھی جوابی فائرنگ کی لیکن وہ کھلی جگہ پر تھے۔ کمانڈوز دیواروں پر چڑھ گئے اور انہوں نے سرچ لائٹس کے رخ موڑ دیے۔ ایک اسی کوشش میں زخمی ہوا لیکن مقابلہ کرنے والوں کے تین آدمی ہلاک ہوگئے۔ باقی زخمی ہوئے۔ وہ سب پولیس کی وردی میں ضرور تھے مگر پولیس والے نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھ دو لاشیں لائے تھے جو معلوم نہیں کس کی تھیں۔ گڑھا کھود کے لاشیں اس میں ڈال دی جاتیں تو شاید اصل پولیس بھی پہنچ جاتی اور یہ ثابت

کردیتی کہ لاشیں خالد عثمان اور خادم مرزا کی ہیں مگر ڈراما فیل ہوگیا۔

سیکیورٹی کمپنی نے اپنے آفس اطلاع کی۔ انہوں نے مجھے پیغام دیا تھا مگر بعد میں وہ مجھے تلاش نہ کرسکے۔ انہوں نے پولیس کے اعلیٰ حکام سے اور اخبار والوں سے رابطہ کیا۔ آدھے گھنٹے میں پولیس کے سینئر افسران کے ساتھ علاقہ پولیس اور مجسٹریٹ بھی پہنچ گئے لیکن اخباری رپورٹر پہلے پہنچ کر تصویریں بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس نے آنے کے بعد صحافیوں سے ان کے کیمرے چھین کر فلمیں نکال دیں اور اس افراتفری میں ایک صحافی زخمی ہوا۔ دوسرے کا کیمرا ٹوٹ گیا لیکن صورتِ حال کو خراب ہوتا دیکھ کے کچھ لوگ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس لاشوں اور زخمیوں کو اٹھا کے لے گئی اور شاہ عالم ہاؤس کے گرد بھاری نفری تعینات کردی گئی لیکن آخری خبریں آنے تک شاہ عالم اور ان کی بیوی لاپتا تھے۔ وہ پریس کانفرنس کی ناکامی کے بعد روپوش ہوگئے تھے اور ان کا کسی سے بھی رابطہ نہیں تھا۔

یہ تفصیلات جان کے غصے سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ آدھی رات کا وقت نہ ہوتا تو میں پولیس کے افسرانِ اعلیٰ سے اپنے ہم پیشہ اور حامی سیاست کاروں سے اور اخبار والوں سے ضرور بات کرتا اور نام لیے بغیر ان سب کو خوب سناتا جو مجھ سے ذاتی دشمنی میں اتنے پاگل ہوچکے تھے کہ کچھ بھی کرسکتے تھے۔ انتظامیہ جانتے بوجھتے تغافل برت رہی تھی اور ایک طرح سے انہیں تحفظ فراہم کررہی تھی اور میرے خلاف ایک فریق بن گئی تھی۔

"یہ تو حد ہوگئی یار!" میں نے میز پر مکا مارا "خواہ مخواہ دو قتل میرے سر منڈھنا چاہتی ہے پولیس۔ وہ دونوں زندہ ہیں۔ میرے گھر میں گھس کر خانہ تلاشی لے چکے ہیں اور پھر غائب ہوگئے ہیں۔ ان کی لاشیں کیسے مل سکتی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہورہا ہے۔"

رئیس متفکر ہوگیا۔ "پیارے یہ کیوں والی بات کو چھوڑ دے۔ اپن اتنا بتاسکتے ہیں کہ اب آخری صورت یہ رہ گئی ہے کہ شاہ عالم ہاؤس میں بم رکھ دیا جائے اور ایک دھماکے میں تو تیچ گووینٹ گون ہوجائے۔ باقی سب تو کرکے دیکھ لیا انہوں نے۔ فائرنگ ہوئی اس وقت جب تو اندر تھا پھر وہ دندناتے ہوئے اندر گھس گئے اور قسمت اچھی تھی کہ تو موجود نہیں تھا۔ رخشی نے تہ خانے میں چھپ کے جان بچائی۔"

"وہ اسی چکر میں آئے تھے۔ مجھ سے اپنے بزنس کا سارا قصہ ریکارڈ حاصل کرنے اور وہ فلمیں لینے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ مجھے یا رخشی کو پکڑلیتے تو مجھے مجبور کردیتے کہ میں تجھ سے سب ان کے حوالے کرنے کا کہوں۔"

"اس کے بعد کیا ضمانت رہ جاتی تیرے پاس یا میرے پاس؟"

"یہ ٹھیک کہا تو نے۔ وہ سب چیزیں کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرے لاکر میں" رئیس بولا "اور لاکر کی چابی میں اپنے پاس کبھی نہیں رکھتا۔ میرے بینک کا منیجر ہی رکھتا ہے اپنے پاس۔ وہ فلمیں اور ان کے بریف کیس جیسے لیپ ٹاپ کمپیوٹر بالکل محفوظ ہیں۔"

"لیپ ٹاپ۔ جاہل۔"

"ابے ہاں وہی لیکن یار' یہ خادم مرزا اور خالد عثمان آخر کہاں ہیں۔ کیا ہے وہ' صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں۔ یہ سارا حرامی پن انہی کا ہے۔ یہ معاملہ اپن کو سیاسی نہیں لگتا پیارے۔"

میں نے کہا "مجھے بھی اس میں قریشی یا شمس کا ہاتھ براہِ راست نظر نہیں آتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دشمنی میں وہ بھی میرے دشمنوں کی مدد کرتے ہوں مگر ان کا مقصد تھا پارٹی پر قبضہ کرنا۔ وہ انہوں نے کرلیا۔ وہ آفس پر قابض ہیں اور عدالتی فیصلے تک خود چیئرمین صاحب اندر نہیں گھس سکتے۔ عہدے داران کے ساتھ ہیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی ان کی ہے۔ کارکن اور ممبر ہوتے ہیں لیڈر کے ساتھ۔ زیادہ تر ان کی طرف لڑھک گئے ہیں۔ انہیں جھوٹ سچ کا پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرسکیں۔ میرے خلاف پروپیگنڈا بھی خوب ہوا۔ الزامات کی تشہیر کی گئی۔ تیمور کے قتل اور اشرف کی روپوشی نے معاملہ اور بگاڑدیا پھر تیمور کے جنازے میں شرکت کے لیے جانے سے میری اور بے عزتی ہوئی۔ پارٹی کی طاقت ایف اے ایف میرے خلاف ہے پھر میرے پاس کیا رہا۔ صرف پارٹی کا ریکارڈ۔ اگر اس کا پتا چل جائے تو ایف اے ایف کے جوشیلے اور مسلح کارکن رات کے وقت کیا دن دہاڑے اٹھاکے لے جائیں۔ ورنہ قانونی طریقے پر شمس یا قریشی عدالت کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ عدالت اپنی تحویل میں ضرور لے سکتی ہے وہ ریکارڈ۔"

"پیارے۔ ویسے اپن تیرے جیسی عقل نہیں رکھتے اور بے وقوف ہیں شروع سے مگر جو بات تیرے فائدے کی ہے وہ کہیں گے ضرور۔ تو اس سال پارٹی پر لعنت بھیج۔ چولہے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے سیاست۔۔۔ ان سالوں سے کہہ دے کہ ۔۔ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پاندان اپنا۔۔۔" رئیس نے کہا۔

میں بیڈ پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ "تیری آدھی بات سے اتفاق کر سکتا ہوں میں۔ یعنی پارٹی چھوڑ دوں۔"

"تیرے لیے شاہ عالم بننا بہت مشکل ہے بیٹا!"

"شاہ عالم تو میں بن گیا" میں نے کہا "یہ کام مشکل تھا لیکن میں نے منوالیا کہ میں ناصر عظیم نہیں' شاہ عالم ہوں۔"

رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اور یہ منوانے کی ضد پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا' ہار دیا۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی طرف اشارہ کر رہا ہے "جسے تو ہار سمجھ رہا ہے۔ وہ بس ایک وقفہ ہے۔ ایک کامیابی اور دوسری بہت بڑی کامیابی کے درمیان۔ ساری دنیا ایسا سمجھ رہی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ نہ میں چندا کو اور اس کی محبت کو ہار سکتا ہوں نہ وہ مجھے بھول سکتی ہے۔ دیکھ لینا' ایک دن میں لوٹ کر اسی کے پاس جاؤں گا۔ شاید اس سے پہلے ہی وہ خود چل کے میرے پاس آجائے۔ ایسے کیا دیکھ رہا ہے مجھے؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ تو نے نام ہی نہیں بدلا' تو اندر سے بھی بدل گیا ہے۔ قسم اللہ کی تو ناصر عظیم نہیں رہا۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے سور کے بچے۔ کیا تیرے ساتھ میرے رویے میں فرق آتا ہے؟"

اس نے سوچ کے کہا "نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں آیا۔۔ لیکن۔۔"

"آئے گا بھی نہیں" میں نے اس کی بات چلّا کے کاٹ دی۔

"میں کچھ اور کہنے والا تھا۔ پہلے ایک بات تھی۔ تو خواب کو خواب سمجھتا تھا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "اور اب۔۔ کیا میں حقیقت کو نہیں سمجھتا؟"

"مجھے ایسا ہی نظر آرہا ہے۔۔" وہ افسردگی سے بولا "یہ خواب ہی ہے بیٹا جو تو دیکھ رہا ہے۔ آنکھیں کھول کے دیکھ تو۔۔"

"تو کیا ہوگا۔۔ کیا نظر آئے گا جو اس وقت میری آنکھیں نہیں دیکھ رہی ہیں؟" میں نے غصے سے کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا "میں کافی کے لیے کہتا ہوں۔ ہم تو اپنی چائے پئیں گے۔"

مجھے یوں لگا جیسے رئیس کچھ بتانا چاہتا ہے مگر بتاتے ہوئے تذبذب اور خوف کا شکار ہے۔ اس بات کا تعلق چندا سے ہو سکتا تھا۔

وہ واپس آکے میرے سامنے دبیز قالین پر سید ھا لیٹ گیا "قمر کی شادی ہو رہی ہے ڈاکٹر فاروقی سے۔۔۔ کل۔"

میں تڑپ کے اٹھ بیٹھا "کل۔۔؟"

"ہاں کل۔۔ اب تو کہے گا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک ہی بہن تھی تیری۔ اس کی رخصتی بھائی کے بغیر کیسے ہو سکتی ہے مگر ہو رہی ہے۔ جن کو کارڈ بھیجے گئے ہیں ان سب کو معلوم ہوگا' بھائی کو پتا ہی نہیں۔ کسی نے فون کر کے اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔"

میرے دل پر دکھ کا بھاری پتھر اچانک آگرا تھا "میں کیسے جا سکتا تھا اس شادی میں رئیس۔ ان سب نے انکار کر دیا تھا مجھے پہچاننے سے بھی۔ چندا اور خان اعظم' میری بہن قمر سب نے کہا کہ تم ناصر عظیم نہیں ہو۔ تم شاہ عالم ہو۔ ہم نہیں جانتے تمہیں۔ آنا ہے تو ناصر عظیم بن کے آؤ ورنہ ہمیں بھول جاؤ۔"

"پھر کیا ہوا؟ کیا تو بھول گیا انہیں؟"

میں نے کہا "یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے' میں بھول سکتا تھا انہیں؟"

"مگر وہ بھول گئے تجھے بیٹا" رئیس نے کہا "معلوم ہے کیوں؟ انہیں تیرے خان اعظم نے سمجھا دیا کہ یوں جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ کسی اور کی زندگی جینے والا اپنی پرانی زندگی سے ناتے توڑ لے تو سمجھ لو کہ وہ مر گیا اور جیسے دوسرا جنم لینے والے کو اپنے پہلے جنم کی زندگی نہیں مل سکتی' ایسے ہی شاہ عالم اب کبھی ناصر عظیم نہیں بن سکتا۔"

"یہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں نے خود اپنی آواز کو اجنبی محسوس کیا۔

"میں جاتا رہا تیرے یار ڈاکٹر فاروقی سے ملنے۔۔۔ اس کے کلینک میں۔"

"خان اعظم سے یا چندا سے بھی ملا کبھی؟"

"نہیں۔ اتنی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔ ابھی تین دن پہلے میرا اتفاق سے گزر ہوا ادھر سے۔۔ جہاں ڈاکٹر کمال فاروقی خدمتِ خلق کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اس کی وہ نرس' قسم اللہ کی یوں لگتا ہے جیسے فرشتہ اتر آیا ہے آسمان سے' انسان کے روپ میں۔ اتنی معصوم اور نیک۔۔ کہ مجھے خواہ مخواہ شرم آتی ہے اس کے سامنے۔ جیسے وہ مہکتے تازہ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ ہے اور میں اس کے سامنے کوڑے کا ڈھیر۔"

"اس نے بھی نہیں پوچھا میرے بارے میں؟"

"نہیں۔ اسے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔ میں بس دیکھتا

رہا۔ ایک بجے تک بیٹھنا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ کوئی بات کرو۔ میں نے وہی کہا جو ابھی کہا تھا کہ مجھے تو شرم آتی ہے اس کے سامنے۔۔۔ وہ ہنسنے لگی اور بولی "ایسا کیوں سوچتے ہو آخر۔ میں بہت عزت کرتی ہوں تمہاری۔ مجھے اور شرمندگی ہوئی۔ ظاہر ہے میرا دل رکھنے کے لیے اس نے ایسا کہا ورنہ وہ سب جانتی ہے میرے بارے میں۔ فاروقی نے مجھے اپنی شادی کے بارے میں بتایا اور۔۔۔ کارڈ بھی دیا۔"

"کارڈ دیا؟۔۔ تجھے بلایا ہے انہوں نے شادی میں۔۔۔؟"

میں نے اپنی سخت تذلیل محسوس کی۔

"مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میں وہی رئیس خان ہوں۔ ناصر عظیم کا دوست جسے وہ جانتے ہیں" وہ بولا۔

"تو نے بھی نہیں پوچھا۔۔ کہ ناصر کو خبر نہیں دی۔ کیا شادی میں بلاؤ گے بھی نہیں۔ کیا دشمن ہو گیا ہے وہ تمہارے لیے۔۔۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"دشمن نہیں' اجنبی۔ وہ ایسے لوگ کہاں ہیں یار کہ کسی کو بھی اپنا دشمن کہیں یا کوئی انہیں دشمن کہے۔۔ مگر پھر بھی میں نے یہ پوچھا تھا کہ ناصر کا کوئی کارڈ بھی نہیں۔ وہ اداس ہو گیا اور بولا کہ اس نام کا کوئی شخص اب کہاں ہے۔ تم جس کی بات کر رہے ہو وہ شاہ عالم ہے۔ جو پہلے صوبائی اسمبلی کا رکن تھا۔ شاید اس بار قومی اسمبلی میں منتخب ہو جائے گا۔ اس کے بارے میں بہت کچھ آتا رہتا ہے اخباروں میں۔ کئی مہینے سے آرہا ہے۔ اگر شاہ عالم صاحب آنا چاہیں تو ان کی بندہ پروری ہے۔ یہ ان کا کارڈ۔ تم دے دینا۔"

رئیس اٹھ کر گیا اور ایک الماری میں سے خوب صورت رنگین لفافہ نکال لایا۔ اس پر میرا نام "جناب شاہ عالم صاحب' چیئرمین پی جے ایف" لکھا ہوا تھا۔ میں نے کارڈ نکالا تو مضمون دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں رونا نہیں چاہتا تھا مگر آنسوؤں نے میرا کہنا نہیں مانا۔

ایک زخم خوردہ' کراہوں سے بھری ہوئی دکھی خاموشی میں ناصر عظیم اکیلا روتا رہا۔

رئیس نے کہا "رو لے' جی بھر کے رو لے آج بیٹا۔ کل یہ آنسو بھی نہیں ہوں گے تیرے پاس پھر ایک دن تجھے سوچنا پڑے گا کہ چندا؟ ہاں ایک لڑکی تھی۔ پورا نام یاد نہیں آرہا ہے اس وقت۔ اس کا باپ ایک فوجی تھا' ریٹائرڈ کرنل۔ کہاں ہے وہ۔۔"

"ایسا مت کہہ رئیس۔ تجھے میں دوست سمجھتا ہوں اپنا۔ تو بھی میری تذلیل کر رہا ہے۔ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے۔۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں تیرے بھلے کی بات کر رہا ہوں۔ حقیقت کو تسلیم کر لے۔ اس طرح جیسے تو ڈاکٹر صاحب کی مہربانیوں کو بھول گیا۔ ان کی بیگم کو بھول گیا۔ شادو کو بھول گیا اور نیلم کو بھول گیا۔ اپنے آپ کو دھوکا مت دے اس جھوٹ سے کہ تو چندا کو نہیں بھول سکتا اور ایک دن اس کے پاس لوٹ جائے گا اور کس کے پاس لوٹ کر گیا تو۔۔ اتنے لوگ تھے۔ سب کو چھوڑ۔۔۔ تو نے کبھی خبر لی ماسی ہیر کی اور ڈاکٹر رانجھا کی۔ وہ کہاں ہیں' کس حال میں ہیں' زندہ ہیں کہ مر گئے؟"

میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے "وہ ٹھیک ہیں۔"

"ٹھیک کے بچے۔ آخری بار تو ایک سال پہلے گیا تھا ان سے ملنے۔ میرے ساتھ ہی گیا تھا۔ ان کا خیال آتا ہے تجھے کہ تو نے کتنا ظلم کیا ان کے ساتھ۔ وہ اب تک اکیلے تھے' ان کو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بے اولاد ہیں۔ وہ راضی برضا تھے کہ چلو خدا نے سب دیا' ایک اولاد نہیں دی تو کیا ہوا پھر اچانک تو ان کا بیٹا بن گیا۔ ان کو ایک جوان چلا چلایا بیٹا مل گیا جسے وہ سچ مچ اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور پورے غرور کے ساتھ بیٹا کہنے لگے۔ تو نے مکان خرید کے ان کے نام کر دیا۔۔ اور انہوں نے صرف اس لیے قبول کر لیا کہ بیٹے پر حق ہوتا ہے ماں باپ کا۔ وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ آخری بار تو میرے ساتھ گیا تھا تو انہوں نے تیری پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ تو انہیں ایک بہت بڑی کوٹھی اور اسپتال بنوا کے دینا چاہتا تھا کیونکہ تیرے پاس بہت پیسہ تھا۔۔ مگر انہیں اب پیسے کی ضرورت کہاں ہے۔ پہلے بھی نہیں تھی۔ وہ قناعت کرنے والے اس کے بغیر بھی خوش تھے۔ اب وہ دکھی ہیں کہ ان کا بیٹا ان سے چھن گیا۔ ہم تو سالے زندگی بھر نہ کسی کے ہوئے نہ کسی نے ہمیں اپنایا۔ تجھے دو کوڑی کے آدمی تھے۔"

"یار رئیس' تو جانتا ہے کہ میں کہیں رکنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں ساری عمر ان کے ساتھ اسی گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے آگے جانا تھا' بہت آگے مگر وہ میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو اس میں میرا کیا قصور۔ کیا صرف ان کے جذبات کی خاطر میں کامیابی کا راستہ چھوڑ دیتا؟ جدوجہد ترک کر دیتا' جہاں تھا وہیں ٹھہر جاتا۔ میں نے تو بہت کوشش کی تھی انہیں اپنے ساتھ رکھنے کی مگر وہ پیچھے رہ گئے۔"

رئیس نے تلخی سے کہا "ہاں۔ ایسے ہی یہ سب بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ چندا اور خان اعظم' قمر اور فاروقی۔ یہ سب تیرا ساتھ کیسے دیتے۔ وہ اپنی زندگی جینا چاہتے تھے۔ اب اس خیال میں مت رہنا کہ دنیا گول ہے۔ تو ایک دن چلتے چلتے پھر وہیں پہنچ جائے گا پرانے راستوں پر' جہاں پر پرانے لوگ مل جائیں گے۔ نہیں بیٹا' زندگی اتنی مہلت کس کو دیتی ہے۔ زمانے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ایک سال میں سب بدل جاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ وہی نہیں ساں مل پڑ رہا تھا ... نہ وہ عمر نہ ہی محلے۔ نہ لوگ اور نہ وہ جذبات۔ کیا فائدہ مجھ سے جھوٹ بولنے کا اور اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کا۔"

میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ یہ سچ کا کڑوا زہر تھا جو قطرہ قطرہ میرے حلق سے اترتا جا رہا تھا۔ عذاب بن کے میرے رگ و پے میں بھر رہا تھا اور احساسِ ذلت و ندامت کے ساتھ میرے لہو میں شامل ہو رہا تھا۔ میرے پاس رئیس سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں چیخ چلا سکتا تھا۔ اسے گالیاں دے سکتا تھا اور جھوٹا کہہ سکتا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی اور یہ سب لاحاصل تھا۔ اس سے حقیقت نہیں بدلتی تھی۔

"ناصر عظیم ہی جائے گا اس شادی میں شرکت کرنے۔" میں نے خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد کہا "کارڈ پر شاہ عالم لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔"

رئیس ہنسا "اچھا؟ اور سب کے سامنے کہے گا کہ حضرات و خواتین' آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ اچھے خاصے معززین اس شادی میں شریک ہوں گے۔ ان کی وجہ سے اخباری فوٹوگرافر بھی ہوگا۔ وہ کیا کہیں گے؟ یہی ناکہ شاہ جی' بہت زیادہ چڑھا کے آئے ہیں کہیں سے۔ یہ خبر ضرور آجائے گی اخبار میں لیکن وہ لوگ جن کے سامنے تو ناصر عظیم بن کے جانا چاہتا ہے' وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ شاید فاروقی ایک اچھے میزبان کی طرح تجھے معززین کی اگلی صف میں لے جائے کہ شاہ عالم صاحب' بڑی عزت افزائی کی آپ نے تشریف لا کے۔"

"پھر میں کیا کروں رئیس!"

"بس چھوڑ دے گزرے ہوئے وقت کی باتیں۔ بھول جا سب' آگے دیکھ بیٹا ادھر جہاں دشمن کھڑے ہیں تیری جان کے۔ ایسے بہت دعوت نامے آتے ہیں وی آئی پی قسم کے لوگوں کے پاس۔ دو دو ٹکے کے لوگ چپٹنی کے لیے انہیں بھی تقریبات میں بلا لیتے ہیں تاکہ اخبار میں ان کے ساتھ بنائی ہوئی تصویر چھپ جائے تو وہ فخر سے ہر ایک کو بتائیں۔"

"ایسی باتیں مت کر۔ میں پاگل ہو جاؤں گا" میں نے چلا کے کہا۔

"اب ہو جاؤں گا کیا مطلب۔ کئی بار ہو چکا ہے تو۔ چل ابھی تو سو جا' میں دیتا ہوں تجھے دو گولیاں" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "صبح کریں گے باقی بات۔"

میں نے گولیاں کھانے سے انکار نہیں کیا۔ مجھے ان کی ضرورت تھی۔ صرف پرسکون گہری بے ہوشی کی نیند ہی مجھے میرے ذہنی انتشار اور خلفشار سے پناہ دے سکتی تھی اور اس مصنوعی سہارے کے بغیر سکون میرے اختیار کی بات نہیں

[illegible]

اچانک خیال کے صحرا میں اگ آئے تھے جن پر چلنا ایک مجبوری بن گیا تھا۔ رئیس کی ہر بات مجھے کچوکے دے رہی تھی اور میرے احساس کو لہولہان کر رہی تھی۔ اس اذیت نے خواب آور گولیوں کی طاقت کو شکست دے دی تھی۔ شاید اب مجھے بے ہوشی کے انجکشن کی ضرورت تھی۔

وسیع ہال میں بچھے ہوئے دبیز قالین پر جانی جن کے خراٹے کسی اژدہے کی پھنکار کی طرح سنائی دے رہے تھے۔ جیرا بلیڈ منہ کھولے پڑا نہ جانے خواب میں کس کو دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔ اندر رئیس خان کھوئے والی ہری کھا رہا تھا اور گلبدن اپنے دو سو پاؤنڈ کے شتر غمزے دکھا رہی تھی۔ اس کوٹھی میں جہاں ایک رات مجھے قتل کے الزام میں تفتیش کے لیے لے جایا گیا' شاہ عالم کی بیوہ اور دنیا کے سامنے میری بیوی' مطمئن سو رہی تھی کہ بالآخر وہ محفوظ ہے اور آزاد اور ایک گھر میں اپنے سارے خوابوں کی تعبیر رکھنے والی مسکراہٹ چہرے پر سجائے قمر دلہن بنی سو رہی ہوگی۔ عروسی جوڑا پہننے سے پہلے بھی لڑکی دلہن بن جاتی ہے جب اسے مایوں کا پیلا جوڑا پہنا کے بٹھا دیا جاتا ہے۔ ابٹن ملے اور ہاتھوں میں مہندی رچائے وہ آنے والی رات کے کتنے قریب ہے جو اس کے لیے مرادوں کی آخری منزل ہوگی اور شاید اس کے ساتھ ہی چندا گٹھڑی بنی لیٹی ہوگی اور ان خوابوں کو دور بھگانے میں مصروف ہوگی جن کا آسیب سوتے جاگتے اس کا پیچھا کرتا تھا مگر وہ خان اعظم کی بیٹی ہے۔ وہ آسیب سے ڈرنا نہیں جانتی۔ اس نے زندگی میں ڈرنا نہیں سیکھا۔ وہ موت سے بھی نہیں ڈرتی۔

صبح کے آخری پہر میں مجھے بھی نیند آگئی۔ نو بجے رئیس نے مجھے لات مار کے جگایا۔ میری حالت اس وقت بھی بہتر نہیں تھی اور آنکھ کھولتے ہی مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ آج قمر کی رخصتی ہے پھر رئیس نے میرے سامنے بہت سے اخبارات پھینک دیے۔

ان سب میں شاہ عالم ہاؤس کی واردات کی رپورٹ تقریباً ایک جیسی تھی۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ صحافی میرے طرف دار ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک احمقانہ انتقامی کارروائی تھی جس میں مذموم سیاسی عزائم رکھنے والوں نے ساری اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا اور انتظامیہ کے کچھ بدنام عناصر نے کھل کر ان کا ساتھ دیا۔ صحافی برادری اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر برہم تھی۔ پولیس نے انہیں کسی ملزم سے نہیں ملنے دیا تھا۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ ایسے پولیس کی وردی پہن کے اور مسلح ہو کے شاہ عالم ہاؤس میں گھسنے والے کون تھے۔ انہیں مرنے والوں یا زخمی ہونے

والوں سے دور رکھا گیا تھا اور کسی کی تصویر بنانے سے روکنے کے لیے ان کے کیمرے چھین کر فلمیں ضائع کر دی گئی تھیں۔ ایک صحافی کا کیمرا توڑ دیا گیا تھا اور پولیس نے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا تھا۔ انہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ دو لاشیں کس کی تھیں اور انہیں شناخت اور پوسٹ مارٹم کے لیے کس اسپتال میں رکھا جائے گا۔

پریس اچانک میرے حق میں فعال ہو گیا تھا۔ میرے خلاف ہونے والی ہر کارروائی کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ بیرونی آقاؤں کے اشارے پر ملک کے اقتدار کی مافیا میرے خلاف ہو گئی ہے اور مجھ پر قاتلانہ حملے سے اب تک جو کچھ ہوا ہے' وہ صرف مجھے سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اتفاقِ رائے سے یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سیاست میں تشدد کے رجحان پر قابو نہ پایا گیا تو ووٹ سے ہرانے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور گولی سے ہٹانے والے غالب آ کے ملک میں جنگل کا قانون نافذ کر دیں گے۔ یہ اشارہ براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر شمس اور قریشی کے اندازِ سیاست پر ایک منطقی ردِ عمل بن کر سامنے آیا تھا۔

دو اخبارات نے صاف الفاظ میں اسے انتظامیہ کی ذمے داری قرار دیا تھا کہ وہ میری حفاظت کرے ورنہ آخری حربے کے طور پر مجھے قتل بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس قتل سے کس کو فائدہ حاصل ہوگا۔ جناب ابوبکر آزاد نے تو میری حمایت میں دو کالم کا پورا اداریہ لکھنے میں سارا زورِ علم صرف کر دیا تھا اور اول تا آخر سیاسی سازش کرنے والوں کے عزائم بے نقاب کرنے کے بعد واضح کر دیا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری پولیس پر عائد کی جائے گی۔

یہ سب پڑھ کے میری گزشتہ رات کی ساری کوفت اور بیزاری دور ہو گئی۔ یہ بات صرف میں سمجھتا تھا کہ پارٹی پر قبضے کی جنگ میں شمس اور قریشی کا پلہ کس قدر بھاری ہے لیکن وہ عدالتی معاملہ ہو گیا تھا۔ میری جان کے دشمن دوسرے لوگ تھے اور ان کا مقصد بھی مجھے ہلاک کرنا نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک دشمن کاروبار کا راز افشا ہونے سے ڈرتے تھے۔ وہ اپنے سارے راز مجھ سے واپس لینا چاہتے تھے۔ منہ مانگی قیمت دے کر یا میری جان لے کر۔ وہ جرائم پیشہ اسمگلر تھے جن کا سیاست سے براہِ راست تعلق نہیں تھا لیکن ان کا ہر جرم شمس اور قریشی کے نامۂ اعمال میں ڈال دیا گیا تھا۔ اب وہ لاکھ تردید کریں' ان کی سننے اور ماننے والا کون ہوگا۔

یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ پریس کی تائید و حمایت سے مجھے وہ طاقت حاصل ہو گئی تھی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر ایک اخبار نے باکس میں

چھاپی تھی کہ پولیس کی دست اندازی اور مزاحمت کے باوجود ایک صحافی نے ان دو لاشوں کی تصویریں حاصل کر لی ہیں جن کو خالد عثمان اور خادم مرزا بنا کے شاہ عالم ہاؤس لے جایا گیا تھا تاکہ پولیس کے اپنے TOUTS یا چمچوں کے سامنے یہ دکھایا جا سکے کہ لاشیں عقبی حصے کے لان کو کھود کر نکالی گئی تھیں۔ اس خبر میں یہ بھی تھا کہ تصاویر کی نقلیں محفوظ ہیں اور پولیس کا مؤقف سامنے آنے کے بعد شائع کر دی جائیں گی۔ میرا دل اس نامعلوم صحافی کے کارنامے پر باغ باغ ہو گیا۔ اب پہلے پولیس تردید کرے یا تسلیم کرے کہ وہ لاشیں خالد عثمان اور خادم مرزا کی تھیں۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر نہ نگلے بنے نہ اگلی جائے۔ یہ کہیں کہ ہاں انہی کی لاشیں تھیں تو پھر کیا شائع ہونے کے بعد تصویروں کو غلط اور جعلی کہیں اور انکار کریں تو کیا وضاحت کریں کہ وہ کس کی لاشیں تھیں وہاں کیوں لائی گئی تھیں اور لانے والے پولیس کے TOUTS نہیں تھے تو پھر کون تھے۔ ان کے خلاف کیا کارروائی ہو رہی ہے۔

رئیس نے اخبار چھین کر پھینک دیے "ابے کیا حفظ کر رہا ہے خبر کو۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون صحافی ہو سکتا ہے۔ شبنم تو لاپتا ہے۔"

"لاپتا کیا مطلب" رئیس بولا "اور کب سے لاپتا ہے؟"

میں نے کہا "ممکن ہے اب پتا چل گیا ہو اس کا۔ گمشدگی کی خبر بھی عام نہیں کی گئی تھی۔ ابوبکر صاحب ہوشیار آدمی ہیں۔"

"چل تیرا کام ہو گیا۔ جس نے بھی کیا تجھے کیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے اور بہت سے ضروری کام ہیں اور کچھ کام تجھے بھی کرنے ہیں مگر پہلے میں نہا لوں اور ناشتا کر لوں۔"

جانی جن اور جیرا بلیڈ پرانے یاروں کی طرح جسمی ڈال کے ملے اور بڑے خوش ہوئے۔ جانی جن کی جوشیلی جپھی خاصی قاتلانہ تھی۔ میں شور نہ کرتا تو میری دو چار پسلیاں ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دیتی۔ مجھے سانس بحال کرنے میں دیر لگی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح دیوزاد ہی تھا لیکن زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ رئیس نے اسے اکھاڑوں سے ہٹا کے ایک مارشل آرٹ کے ماہر کے حوالے کر دیا تھا جو بزعمِ خود بلیک بیلٹ تھا۔ جیرا بلیڈ کچھ بھی نہیں کرتا تھا اور سب کچھ کر سکتا تھا چنانچہ عیش کر رہا تھا۔ وہ سوانگ بھر کے جعلی شخصیت بنانے کے فن میں بھی مہارت حاصل کر چکا تھا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جعلی دستاویزات بنانا سیکھ چکا تھا۔ رئیس ہر بار آڑے آجاتا تھا ورنہ وہ جعلی کرنسی چھاپنے کے چکر میں تھا اور اپنے آرٹ کا ایک نمونہ پیش کرکے شرط بھی جیت چکا تھا۔ جعلی نوٹ پہچاننے کا دعویٰ رکھنے والوں نے اصل نوٹ کو جعلی قرار دے دیا تھا اور جعلی کو اصلی۔ دونوں کے نمبر ایک تھے۔

"سب سے پہلے تو میں بلانا چاہتا ہوں اخبار والوں کو" میں نے کہا۔

رئیس نے سرہلایا "کہاں۔ شاہ عالم ہاؤس میں؟"

"نہیں یار۔ شاہ عالم ہاؤس میں خطرہ ہے۔ اخبار والوں نے بھی خدشہ ظاہر کیا ہے کہ مخالف مجھے قتل کراسکتے ہیں۔ وہاں ٹائم بم یا ریموٹ کنٹرول بم نہ نصب کردیا گیا ہو۔ کل کی کارروائی کے دوران میں پورے شاہ عالم ہاؤس پر ان کا قبضہ تھا۔ جب تک سیکیورٹی والے کلیئرنس نہیں دیتے' میں وہاں قدم رکھنے کا رسک نہیں لوں گا۔"

"پھر تو ہوٹل ہی رہ جاتے ہیں یا پریس کلب ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "آج کل تیرے سر پر کس کا دستِ شفقت ہے۔"

"ابے سیدھی طرح پوچھ کہ میں کس کے لیے کام کررہا ہوں تو پیارے' ایک پرانے ناکام سیاست داں ہیں۔ ملک عمر بخش مندرال۔ ایک بار مجلسِ شوریٰ میں نامزد ہوا تھا۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں بھی جیت گیا تھا مگر ویسے کبھی کامیاب نہیں ہوا۔"

"یعنی سرکاری حمایت کے بغیر؟"

"ہاں۔ سیاست کا چسکا پڑگیا ہے۔ پیسہ بہت ہے اور خاصا اثر رسوخ بھی ہے مگر ٹکٹ اسے کوئی جماعت نہیں دیتی۔ آزاد کھڑا ہوتا ہے پھر دس بیس ہزار ووٹ لے جاتا ہے۔ اس مرتبہ پھر اوپر والوں نے اسے چھ امید دلائی ہے تو بڑے جوش میں ہے لیکن اس کے حلقے میں ایک اور بندہ بڑا بھاری ہے۔ جلسے جلوس میں بھی اچھا ہے اور علاقے میں گھوم پھر کے بڑا سوشل ورک کررہا ہے۔ ڈراما زیادہ کرتا ہے اس لیے کامیاب ہے۔"

"اور یہ عمر بخش مندرال___"

"یہ بڈھا ہے اور جاہل۔ اسے بولنا نہیں آتا اور کارکن بھی نہیں ہیں اس کے پاس۔ مجھ سے بات ہوئی ہے کہ میں جلسوں میں گڑبڑ نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے حریف کے جلسے میں گڑبڑ پھیلانا' ان کے بینر پھاڑنا' پوسٹر اتارنا' ایسے سب ٹھیکے میرے پاس ہیں۔"

میں نے کہا "فرض کرمیں اس کو اپنے ساتھ ملالوں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ اب پی جے ایف کا جھنڈا اور لیبل اتار دینا چاہیے۔ بہت بدنامی ہوگئی ہے اور اتنا وقت نہیں ہے کہ عدالتی فیصلے تک میں کچھ نہ کروں۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ ایک نئی جماعت بنالوں۔ کیا خیال ہے تیرا؟"

رئیس نے کچھ دیر سوچا اور پھر میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "بالکل ٹھیک۔"

"پرانے گند کو چھوڑ کے صاف سلیٹ سے ابتدا کی جائے جو میرے مخلص ساتھی اور وفادار کارکن ہیں' ان کو آسانی ہوگی فیصلہ کرنے میں ورنہ ابھی تو بس کنفیوژن ہی کنفیوژن ہے۔ پرانی پارٹی میں ان کے حوالے کردیتا ہوں جو اس پر قبضے کے لیے لڑرہے ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں بہت شوق ہے چیئرمین بننے کا تو سازشیں مت کرو۔ سنبھالو پارٹی' آج کے اخبارات نے ان کی ساکھ خاصی خراب کی ہے۔ مجھے زبردست سیاسی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے اگر میں اس موقع پر اپنی جماعت الگ کرلوں۔ کوئی گروپ نہیں' میری جماعت منشور سب نیا ہو۔ پرانے ساتھی آنا چاہیں تو خوش آمدید۔"

رئیس نے کہا "تو ملک عمر بخش مندرال کو ساتھ ملا کے جماعت بنائے گا۔"

"ہاں۔ میں اسے چیئرمین بناؤں گا۔ خود صدر بن جاؤں گا۔ اس کے اور میرے ووٹر مل جائیں گے۔ میں اسے لاہور کے کسی حلقے سے پارٹی ٹکٹ دے سکتا ہوں۔ میرا اپنا حلقہ تو محفوظ ہے۔"

"ابے وہ تو بڑا خوش ہوگا۔ اسے تیرے جیسے سہارے کی ضرورت ہے اور تو بڑی آسانی سے اس پر چڑھ ڈال سکتا ہے" رئیس خوش ہوکے بولا۔

"بس تو پھر طے ہوگیا۔ پریس کانفرنس اس کے گھر پر ہوگی اور وہاں میں سارے اعلانات کردوں گا۔ پہلے تو جاکے ذرا ملک صاحب کو سب سمجھادے۔"

رئیس نے کہا "ابے میں کیا سمجھاؤں۔ تو خود چل کے ان سے مل اور ساری بات کر۔ نیک کام میں دیر کیسی؟"

"ٹھیک ہے۔ پہلے ذرا میں فرید عباسی سے بات کرلوں' فون دے مجھے۔"

میرا موبائل فون رخشی مانگ کرلے گئی تھی۔ میں نے اپنا ہی نمبر ڈائل کیا تو رخشی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے کہا "سو رہی ہو ابھی تک' صبح بخیر۔"

اس نے کہا "رات بہت دیر تک جاگتی رہی۔"

"یہی حال میرا بھی تھا" میں نے دردناک لہجہ بنا کے کہا۔

"میں فرید کی ماں سے باتیں کرتی رہی تھی پھر سوئی تو بڑے عرصے بعد سکون کی نیند آئی۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی تک صبح

کے اخبارات ملاحظہ نہیں کیے۔"

"ملاحظہ کرنا بھی نہیں چاہتی ابھی۔ کیا ہوگا ان میں___ وہی۔"

"عباسی اگر سو رہا ہے تو اسے فوراً جگادو یا مجھے اس کا فون نمبر بتادو تاکہ میں اس سے براہِ راست بات کرسکوں" میں نے کہا۔

اس نے نمبر بتایا اور پھر سوگئی۔ چوتھی یا پانچویں گھنٹی پر اس کی ماں نے ریسیور اٹھایا اور عباسی کو بلالیا "میں انتظار کررہا تھا تمہارے فون کا۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"میں اخبارات دیکھ چکا ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ تمہارے کزن کی کوئی لیگل فرم ہے۔ کیا نام ہے اس کا' فیصل کی___ پورا نام نہیں معلوم مجھے۔"

"فیصل ہاشمی!" وہ بولا "اتفاق سے رات کو وہ ادھر آیا ہوا تھا۔ میں نے ذکر کیا تھا تمہارا۔ رخشی تو میری ماں کے پاس بیٹھی تھی اس وقت بھی جب میں دو بجے سونے گیا۔ فیصل کے ساتھ میں باہر لان میں بیٹھا رہا۔"

"کیا ارادہ ہے پھر اس کا؟ میری وکالت کا خطرہ مول لے گا؟ یا ڈرتا ہے تمہاری طرح مرنے سے؟"

وہ ہنسنے لگا "زبان سے کہنے کی بات اور ہے ورنہ مرنے سے کون نہیں ڈرتا۔ یہ سارے حفاظتی انتظامات' آخر کیوں کرتے ہیں لوگ___ تاہم فیصل نے کہا کہ اسے بڑی خوشی ہوگی۔ اس وقت تو کورٹ میں ہوگا۔ شام کو ملاقات رکھ لو۔"

میں نے کہا "دوپہر کے بعد ایک پریس کانفرنس ہے۔ ملک عمر بخش مندرال کے ساتھ۔ اس کی رہائش گاہ پر۔"

"یہ کون ذات شریف ہیں۔ تمہارے کیا لگتے ہیں؟"

"جب وہاں آؤ گے تو سب معلوم ہوجائے گا۔"

"یار' ایک ضروری بات میں بالکل بھول گیا۔ تمہارے لیے دوبار پیغام موصول ہوا۔ تمہارے موبائل فون پر' رخشی نے بتایا___"

"اس کا کہنا ہے کہ بہت عرصے بعد سکون کی نیند آئی ہے۔ میری دخل اندازی بھی اسے پسند نہیں آئی' تمہارا نمبر بتاکے پھر سوگئی۔"

"خیر___ فون اخبار کے دفتر سے آیا تھا۔ ابوبکر آزاد صاحب کا۔ کہہ رہے تھے کہ وہ عالم بالا میں ہوں تو بھی مجھ سے رابطہ کریں فوراً ورنہ مجھے آنا پڑے گا وہاں گویا بقلم خود۔"

"اللہ خیر' کیا چلبلی کی طبیعت پھر ناساز ہے۔ نصیبِ دشمناں۔"

"کون چلبلی!؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "ہے ایک بیماری جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہ ہوگا گویا مگر اس ناچیز کے دستِ شفا

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اُس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں۔

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۲

سٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ہے۔۔۔ میں بات کرنا چاہتا تھا ویسے بھی ان سے۔ ان کا شکریہ ادا کرنا تھا لیکن اس وقت وہ سو رہے ہوں گے اسطیل بچ کے گویا" میں نے گھڑی دیکھی۔

"انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہم خوابِ عدم میں ہوں تب بھی جگانے میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ یہ اپنے شاہ عالم ثانی کہیں دستیاب ہوں۔ بڑی چیز ہے آزاد صاحب بھی یار۔" میں نے کہا "اس شخص کی صورت پر اور حلیے پر اور مسخروں والے اندازِ گفتگو پر مت جانا۔ بڑی کائیاں چیز ہے۔ ایک نظر میں آدمی کا اندر تک ایکس رے کرلیتا ہے اور دماغ بھی اس کا کمپیوٹر ہے۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس نے میری مشکل وقت میں راہنمائی اور مدد کی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ مجھے چلبلی کا مسیحا سمجھتا ہے۔ محض ایک موٹر مکینک جو اس کھٹارا گاڑی کو رواں دواں رکھ سکتا ہے۔ رخشی کا کیا پروگرام ہے آج۔"

میرے اچانک سوال سے وہ گڑبڑا گیا "رخشی کا۔۔ مجھے نہیں معلوم۔ شاید رہے گی ابھی یہاں۔"

"میں طلاق دے رہا ہوں اسے۔"

"اس نے بتایا ہے مجھے' چلو اچھا ہے۔ کیا فائدہ خواہ مخواہ اس تعلق کا بار اٹھانے سے اور خود کو آزمائش میں ڈالے رکھنے سے۔ وہ بھی خوش اور تم بھی آزاد۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اعصاب پر بہت دباؤ تھا۔ کچھ دن اس ماحول سے دور رہے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اور اسے ٹھیک رکھنے کے لیے مجھے فی الحال تم سے بہتر اور موزوں امیدوار کوئی نظر نہیں آتا۔ ملاقات ہوگی ملک کے ڈیرے پر؟"

"ضرور ہوگی۔" وہ بولا "خدا حافظ۔"

ابوبکر آزاد کے پیغام کی URGENCY اور اہمیت میری سمجھ میں نہ آسکی۔ معاملہ چلبلی کا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بات تو میں نے عباسی سے مذاق میں کی تھی۔ شاید وہ شبنم کے بارے میں کچھ پوچھنا یا بتانا چاہتے ہوں گے۔ وہ آفس سے رات تین بجے کے بعد اٹھتے تھے۔ شاید صبح چار بجے سوتے ہوں گے۔ خیر چھ گھنٹے بعد انہیں جگانا جائز ہوگا۔ ان کی عمر کے آدمی کو چھ گھنٹے کی نیند کافی ہوتی ہے۔

وہ جاگ رہے تھے اور میری آواز سنتے ہی شروع ہو گئے۔ "بھئی بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ یعنی تم ہو کہاں گویا۔ سارا زمانہ تلاش کرتا پھر رہا ہے تمہیں لیکن تم ایسے غائب ہو جیسے گھوڑے کے سر سے سینگ۔ ملک الموت کو بھی پتا ٹھکانا نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "اسے بتائیے گا بھی مت۔ وہ مجھے ہی تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ خیر مجھے کس سلسلے میں یاد کیا تھا آپ نے؟"

"بھئی بڑی اچھی اور بُری خبر ہے گویا بیک وقت مگر تم کو فون پر سنانا قطعاً مناسب نہیں۔ تم فوراً آجاؤ بقلم خود۔"

میں نے کہا "اس وقت۔۔۔؟"

"اس وقت کیا ہے۔ تم ماؤنٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہو یا بحرالکاہل کی تہ میں قیام پذیر ہو گویا" وہ خفا ہونے لگے۔

"یہ بات نہیں۔ ایک پریس کانفرنس ہے دو گھنٹے میں۔ ملک عمر بخش مندرال کے گھر پر۔۔۔ آپ جانتے ہیں نا ملک کو؟"

وہ ہنسے "میاں ہم ملک اور چوہدری۔ نواب اور مخدوم قسم کی ہر نسل مخلوق کو جانتے ہیں۔ سات پشتوں کا حال سن لو ہم سے۔ اگلی یا پچھلی ۔۔ مگر تمہارا اس سے کیا رشتہ برخوردار۔ کہیں تم اس کے ساتھ کوئی سیاسی اتحاد وغیرہ تو نہیں کر رہے ہو گویا؟"

میں آزاد صاحب کی معاملہ فہمی پر دم بخود رہ گیا۔ "آپ تو دل کی بات جان لیتے ہیں فون پر بھی۔ صورت دیکھے بغیر۔۔۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"خیال؟ وہ کیا فرمایا ہے کسی نے کہ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ اب یہ خیال ہے تمہارا گویا تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ میاں' جب آدمی کے پیچھے لگے ہوں ایک طرف شکاری کتے اور دوسری طرف ہوں بھیڑیے تو وہ پوچھتا نہیں کسی سے بھی کہ کیا خیال ہے۔ درخت پر چڑھ جاؤں یا کنوئیں میں اتر جاؤں۔ ویسے بھی ہمارے سارے خیالات ایک ہی سمت میں مرتکز ہیں اس وقت اور مرکزِ خیال ہے شبنم گویا۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟ وہ ابھی تک روپوش ہے؟"

"روپوش تو ہے۔۔۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ کہاں اور کیوں روپوش ہے اور یہی ہے وہ مسئلہ گویا' جس سے ہم الجھے رہے رات بھر اور کوشش کرتے رہے کہ تمہارا سراغ ملے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ پریس کانفرنس میں ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ادھر سے اٹھا لو ہمیں بھی گویا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو پک کروں مگر آپ نے مجھے تجسس اور تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔ شبنم کہاں ہے آخر؟"

"بھئی' ہم نے کہا نا کہ عرض کریں گے فی البدیہہ۔۔۔ ہمارا مطلب ہے بالمشافہ۔ غالباً کسی عقل مند نے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر تو اظہارِ عشق بھی بُر نظر ہوتا ہے گویا۔ حالانکہ عقلمند عشق کہاں کرتے ہیں" وہ قہقہہ مار کے ہنسے اور فون بند کردیا۔

"عجیب آدمی ہیں آزاد صاحب بھی" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا۔۔ شبنم کا کچھ پتا چلا؟"

"پتا تو چل گیا ہے لیکن اس نے مجھے کچھ بتایا نہیں کہ وہ کہاں ملی اور اب کہاں ہے۔ معاملہ کچھ پُراسرار لگتا ہے۔ آزاد صاحب بقلم خود شریک ہوں گے پریس کانفرنس میں۔ آخر کیوں' شبنم کو کیا ہوا ہے؟ یار' کام تو بہت تھے مگر آج سب نہیں ہو سکتے۔"

"فکر مت کر پیارے۔ ہم سے جو ہوگا ضرور کریں گے۔"

میں نے کہا "آج اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ کل تو لاکر سے وہ سب نکلوا لے۔ ایک تو فلمیں اور ایک ڈسک جو ان کے کمپیوٹر میں لگی ہوئی ہوگی۔ سب کی دو دو کاپیاں بنوالے کم سے کم۔ اصل واپس لاکر میں پہنچا دے۔ ایک کاپی مجھے چاہیے۔ ایک میں رکھوادوں گا اپنے لاکر میں مگر یار' یہ کام ایسے ہونا چاہیے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اسی پر میری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ۔۔۔"

"گھبرا مت' کچھ نہیں ہوگا۔" رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

"شام کو مجھے وکیل کے پاس جانا ہے۔ اس سے پہلے میں پریس کانفرنس میں مطالبہ کروں گا کہ میرے تحفظ کی ذمے داری مقامی انتظامیہ کو دی جائے۔ وہ شاہ عالم ہاؤس کی سیکیورٹی کلیئرنس دیں۔ اس کے بعد ہی میں وہاں جاؤں گا۔ مجھے وہاں سے رخشی کے ساتھ جاکے اپنا سارا ضروری سامان نکالنا ہوگا۔ پارٹی کا سارا ریکارڈ اب میرے لیے ردی سے زیادہ اہم نہیں رہا۔ وہ مجھے ان کے حوالے کرنا ہے مگر کورٹ آفیشل کی نگرانی میں۔ اس کے بعد میں شاہ عالم ہاؤس کو خالی کرکے فروخت کرنے کے لیے کاغذات اپنے وکیل کے حوالے کردوں گا۔ جو کچھ بھی شاہ عالم کا تھا' وہ میں رخشی کے سپرد کردوں گا۔ اس کے بعد یہ معاملہ تو ختم۔ دوسرا مرحلہ ہوگا میرے اپنے یعنی ناصر عظیم کے اثاثوں کا۔ انہیں کسی طرح پھر اپنی تحویل میں لانے کے لیے مجھے کسی کو پاور آف اٹارنی دینی ہوگی کیونکہ وہاں میں خود سامنے نہیں جانا چاہتا۔ میرے سارے ASSETS فروخت ہو جائیں۔ سارا سرمایہ میرے موجودہ اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے یعنی شاہ عالم کے اکاؤنٹ میں مگر ایسے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ بعد میں بھی کوئی سراغ نہ لگا سکے۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے بیٹا۔"

"مشکل ہے' ناممکن نہیں۔ فرید عباسی اور فیصل ہاشمی خاموشی سے یہ کام کرسکتے ہیں' آہستہ آہستہ۔۔ سال دو سال میں ناصر عظیم کے نام پر کچھ بھی نہ رہے۔ تھرڈ پارٹی ڈیل ہو۔ بالآخر سب مجھے ہی ملے مگر تیسرے نامعلوم شخص کے ذریعے۔ فوری طور پر میں کچھ اکاؤنٹ خود ٹرانسفر کرالوں گا۔ یہ اکاؤنٹ غیر ملکی بینکوں میں ہیں اور منیجر مجھے جانتے ہیں۔ میں رازداری سے حل کرا نہیں بتا سکتا ہوں کہ کچھ مجبوریاں ہیں میری جن کی وجہ سے میں ایسا کر رہا ہوں۔ ان سے افشائے راز کا خطرہ نہیں۔ وہ مجھے ذاتی ضمانت پر سارا کیش فراہم کردیں گے جو ابھی میری ضرورت کے لیے کافی ہوگا۔ باقی بعد میں آتا رہے گا۔ اثاثے بھی فروخت ہو جائیں گے تو میں کہیں انویسٹ کردوں گا۔"

رئیس نے ملک عمر بخش مندرال کا فون نمبر ملایا اور اس سے چند منٹ رسمی باتیں کرنے کے بعد فون مجھے تھما دیا۔

میں نے کہا "السلام علیکم ملک صاحب۔ کیا حال ہیں؟"

"شکر ہے اللہ کا۔ رئیس نے بتایا مجھے کہ آپ ہمیں شرفِ ملاقات بخش رہے ہو" اتنی انکساری برتنے کے باوجود ملک عمر بخش کے لہجے میں نخوت اور رعونت کی گونج صاف سنائی دیتی تھی۔

میں نے کہا "آپ شرمندہ کرتے ہیں ملک صاحب۔ ہم تو آپ کے سامنے بچے ہیں سیاست کے کھیل میں۔ آپ جب مجلس شوریٰ میں تھے' اس وقت ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔"

"فرماؤ پھر کیا حکم ہے ہمارے لیے؟" وہ بولا۔

"حکم کیسا ملک صاحب۔ ایک درخواست ہے اگر آپ قابلِ غور سمجھیں تو میں خود حاضر ہو کے عرض کروں" میں نے خوشامدی شخص کو خوشامد کے ہتھیار سے زیر کرنا بہتر سمجھا۔ "خیال بہت دن سے تھا مگر آپ تو جانتے ہیں' میرے دشمنوں نے کتنا پریشان کیا ہوا تھا۔ ایک ایسی بات تھی جس سے ہم دونوں کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ فارغ ہوں تو میں آجاؤں۔"

"او جی' مہمان کیا پوچھ کے آتے ہیں؟ ماشاءاللہ سے گھر ہے آپ کا اور فائدے کی بات نہ ہو تب بھی آپ سو بار آؤ' جم جم آؤ" وہ بولا۔

"مہربانی ہے آپ کی ملک صاحب۔ میں ابھی آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔"

رئیس خان کے ساتھ جانی جن اور جیرا بلیڈ بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ فائیو اسٹار بے جیرو تھی جو ملک صاحب نے بطور خاص اپنے معاون اور مشیر کو دے رکھی تھی۔ اس کے آگے اور پیچھے پیتل کی گول پلیٹ تھی جس پر ایم پی اے لکھا ہوا تھا۔ آٹھ سال پہلے ملک صاحب صوبائی اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ ہر انتخاب میں بڑی شان سے ہارے تھے لیکن پلیٹ اب بھی موجود تھی اور اس کی آب و تاب راہ چلتے لوگوں سے ٹریفک پولیس کے اہلکاروں تک سب کو خبردار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتی محسوس ہوتی تھی کہ باادب باملاحظہ۔ ویسے تو ہر پے جیرو سیار کڑوا کریلا ہوتا ہے مگر وہ ایم پی اے بھی ہو تو نیم چڑھا بھی ہو جاتا ہے۔

آزاد صاحب متوسط طبقے کی ایک آبادی کے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے اور اکیلے تھے۔ شادی انہوں نے کی نہیں تھی۔ بہن بھائی اگر ہوں گے تو اپنے اپنے گھر میں۔ ان کے ظاہری حلیے سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ذاتی زندگی میں وہ کتنے قاعدے قرینے کے قائل ہیں۔ ان کا گھر بڑے سلیقے سے آراستہ تھا اور ہر چیز صاف ستھری اور اپنی جگہ پر تھی۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ گھر کا سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ گھر کی صفائی' برتن اور کپڑے دھونے سے کھانا پکانے تک وہ کسی کام میں ملازم کے محتاج نہیں تھے۔ گھر کا ایک کمرا ان کی لائبریری کے لیے وقف تھا جہاں وہ پڑھنے لکھنے میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ مجھے وہاں جدید ترین ذرائع مواصلات کو دیکھ کر بھی حیرت ہوئی۔ فون کے ساتھ فیکس مشین تھی۔ کمپیوٹر تھا

میں نے کہا "بڑا سلیقہ اور ڈسپلن ہے آپ کی زندگی میں۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسے "میاں' صاف کہو ناکہ دیکھنے میں تو کباڑی لگتے ہو گویا صحافی سے زیادہ اور نظر بھی آتے ہو انیسویں صدی کی پیداوار لیکن رہتے ہو اکیسویں صدی میں۔ جو شاید دیکھنی ہی نصیب نہ ہو۔"

میں نے کہا "ایسا کیوں سمجھتے ہیں آپ۔ اکیسویں صدی اب کتنی دور ہے۔ سات سال کی بات ہے اور اصل بات یہ ہے آزاد صاحب کہ جب اکیسویں صدی کیلنڈر کے حساب سے شروع ہوگی تب بھی اس ملک کی غالب اکثریت ذہنی طور پر سو دو سو سال پیچھے ہی ہوگی۔ آپ آج بھی اپنی سوچ کے اعتبار سے اکیسویں صدی میں ہیں۔"

"میاں' یہی تو ہے ساری خرابی۔ وہ کون سا تغلق تھا جس نے اپنے وقت سے آگے جانے کی کوشش کی تھی۔ چمڑے کے سکے چلانا چاہتا تھا۔ آج پلاسٹک کرنسی چل رہی ہے مگر تغلق کی بات پر اسے دیوانہ بادشاہ قرار دیا گیا تھا جو سونے چاندی کے سکوں کے برابر سمجھتا تھا چمڑے کے سکوں کو۔ آج ہمارا سو کا نوٹ بھاری ہے دینار پر۔"

میں نے کہا "آپ اکیلے ہی رہتے ہیں۔۔۔ ملازم کوئی نہیں۔"

"بھئی اب کیا ضرورت ہے کسی ملازم کی۔ ہوتا تو ہم ہی اس کی خدمت کرتے نظر آتے گویا۔ خیر یہ عرض کرو کہ چائے پیو گے یا کافی۔ وقت ہوتا تو ہم کھانے کا پوچھتے اور بقلم خود کوئی اسپیشل ڈش ایجاد کرکے کھلاتے۔ خیال ہمارا یہ ہے کہ چائے پیو' کافی بنانے میں کوئی کمال نہیں۔ کھولتا ہوا پانی ڈال کے بیوی بھی بنا سکتی ہے مگر چائے بنانا آرٹ ہے گویا۔ تم یوں کرو کہ مطبخ میں قدم رنجہ فرماکے ہمیں یہ کارنامہ سرانجام دیتے ہوئے دیکھو اور ہم دریں اثنا تمہیں آگاہ کرتے ہیں کچھ رازہائے درون میخانہ سے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں "آپ کی چلبلی کا مزاج کیسا ہے؟"

"چشم بد دور۔ تم نے ملاحظہ کیا کس شان سے باہر کھڑی ہے۔ خوش و خرم اور اپنی خودی بلند کیے۔ واللہ ایک جدید مرسیڈیز بھی اس کے مقابل آئے تو شرمسار ہو۔"

میں نے کہا "چل سکتی ہے نا۔۔۔ میرا مطلب تھا دھکا لگائے بغیر۔ ہم دونوں کو لے جاسکتی ہے ملک صاحب کے گھر تک۔"

"نامعقول۔ تمہی ہوتی اس وقت ہمارے ہاتھ میں تو ایسے اہانت آمیز سوال پر ہم ضرور رسید کرتے تمہیں۔" وہ خفگی سے بولے "چلبلی تمہیں لے جاسکتی ہے عدم آباد تک۔۔۔ ہم تو وصیت کرچکے ہیں کہ ہمارا سفرِ آخرت بھی اسی شریکِ حیات کے شانوں پر ہو۔"

میں نے رئیس سے کہا "تم لوگ جاؤ۔ مجھے یہاں کچھ دیر لگے گی پھر میں انہی کے ساتھ آجاؤں گا۔"

"کیا میں اتنی دیر میں ملک صاحب سے بات کرلوں۔۔۔ کہ تیری تشریف کیوں آرہی ہے" رئیس فوراً اٹھ کھڑا ہوا "یہاں بیٹھنا تو ویسے ہی مشکل تھا۔ پاگل ہے یہ بڈھا جسے تو خبطی کہتا ہے۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آتی اپنے تو۔"

میں نے کہا "ملک صاحب کو قائل کرنا تیرا کام ہے۔"

چھوٹے سے صاف ستھرے کچن میں آزاد صاحب نے میرے لیے ایک خوب صورت اسٹول رکھ دیا تھا "اس پر رکھو اپنی تشریف کو۔" انہوں نے الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگا دیا "یہ عرض کرو کہ تمہارے ساتھ جو حواری ہیں' ان کو کچھ تمیز وغیرہ ہے چائے پینے کی۔ چائے بنانا ہم جانتے ہیں مگر پینے والے میں ہی کچھ سلیقہ اور لطافت ہونی لازمی ہے۔ ماشاء اللہ سب جہلا کے قبیلے سے لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ چلے گئے۔ میں نے رخصت کردیا۔"

وہ بگڑ گئے "رخصت کردیا؟ میاں' یہ گھر تمہارا ہے یا میرا۔ جہلا ہوں یا علما و فضلا' مہمان تو ہمارے تھے گویا۔ خاطر مدارات کیے بغیر رخصت کردیا انہیں تو ہم خود کس درجہ بدتہذیبی کے مرتکب ہوئے۔"

میں نے فوراً معذرت کی "دراصل انہیں جلدی تھی۔ وہ ویسے بھی لسی پیتے ہیں' چائے نہیں پیتے۔ کہتے ہیں جگر جلاتی ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ پھر تو اچھا ہی ہوا کہ چلے گئے" انہوں نے کہا "میاں' جگر کو جلاتا ہے غمِ جاناں یا غمِ دوراں۔ چائے اس کا درماں ہے گویا۔ خیر۔۔۔"

"آزاد صاحب!" میں نے کہا "شبنم کہاں ہے؟"

"شبنم۔۔۔ ہاں خوب یاد دلایا" وہ چائے دانی صاف کرنے لگے "اس کے لیے تو اتنے متفکر ہیں ہم۔ وہ فی زمانہ ایک نفسیاتی علاج گاہ میں ہے۔"

"نفسیاتی علاج گاہ میں۔۔۔ کیا ہوا ہے اسے؟" میں چونکا۔

"بھئی جو وہاں ہوگا اسے ٹائی فائڈ یا کینسر تو ہو نہیں سکتا۔ نفسیاتی عارضہ لاحق ہوگا۔" وہ کچھ افسردہ ہوگئے "اور یہ گویا خود تمہیں سمجھ لینا چاہیے ذاتی عقل و ذہانت سے کہ اس کا عارضہ کیا ہے؟"

"کیا ہے اس کا عارضہ؟"

"تم خود" وہ ایک دم پلٹ کے تیز لہجے میں بولے "سرطان کے خلیے کی طرح تم نے اس کے وجود میں قدم جمائے تھے اور پھیلتے پھیلتے نوبت یہاں تک آگئی کہ بروقت پتا نہ چلتا تو وہ نظر آتی کسی پاگل خانے میں۔۔۔ یا سڑک پر دیوانوں کی طرح۔"

میں نے کہا "دیکھیے' اس کے وہم اور شک کا ذمے دار میں نہیں۔۔۔"

انہوں نے گرج کر میری بات کاٹ دی "پھر کون ہے؟ مراریجی ڈیسائی یا اقوام متحدہ۔ اس حالت کو وہ تمہاری وجہ سے پہنچی۔ تم نے کبھی سنجیدگی سے کوشش کی اسے قائل کرنے کی؟"

میں نے اپنا دفاع کیا "ایک بار نہیں' کئی بار۔ میرا خیال تھا کہ وہ قائل ہوچکی ہے۔ آخری بار اس سے تھانے میں طویل گفتگو ہوئی تھی۔"

"خیر' اس نے مجھے نہیں بتایا" وہ چائے خوب صورت جاپانی کپ میں ڈالنے لگے۔ کپ اندر سے اجلے سفید اور باہر سے گہرے نیلے تھے۔ ان پر سنہرے نقش و نگار تھے۔

"کہاں ملی وہ آپ کو؟"

"تمہارے مزار شریف پر" وہ بولے "اسے آدھی رات کے وقت پولیس نے پکڑا۔ گورکن کی رپورٹ پر۔"

"او مائی گاڈ۔ کیا وہ قبر کھود رہی تھی؟"

انہوں نے کپ اٹھایا اور رکھ دیا "ہاں۔ ہم نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ زمین کھودنے کے آلات خرید رہی تھی۔ کدال اور کھپی وغیرہ۔۔۔ اب ہم اس کے کہنے سے یہ تو مانیں گے نہیں کہ وہ اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں گویا باغ لگانا چاہتی ہے یا اسے کسی مدفون خزانے کا سراغ مل گیا ہے۔ مگر ادھر ہمارا ذہن نہیں گیا تھا۔ ہم کیسے فرض کرسکتے تھے کہ اچھی بھلی عاقل و بالغ اور ماشاء اللہ سمجھ دار لڑکی کا دماغ اس حد تک خراب ہو سکتا ہے گویا۔ جب مسلسل دو دن اور درمیانی شب وہ لاپتا رہی تو تشویش لازمی تھی۔ تاہم اس معاملے میں پولیس سے مدد لینا لاحاصل ہوتا۔ کوئی خود مختار لڑکی دو دن کے لیے کہیں بھی جاسکتی ہے۔ کسی کے ساتھ بھی جاسکتی ہے لیکن ہمیں معلوم تھا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی کیونکہ ایسا کبھی کیا نہیں اس نے۔ اب یہ ہے تو غیر منطقی سی بات کہ قیامت پہلے کبھی نہیں آئی تو اب کیسے آسکتی ہے مگر برخوردار' یہ مسئلہ تھا جذبات کا۔ اس عزیزہ سے ہمیں ایک بزرگانہ شغف ہے اور یہی وجہ تھی کہ ہم نے خود اپنے خیال کے گھوڑے بحرِ ظلمات میں ہر سمت دوڑائے تو ایک گھوڑا پہنچ گیا وہاں' تمہارے مزارِ اقدس پر۔ اس نے دو مزدور پکڑ لیے تھے اچھے معاوضے کے وعدے پر۔ گورکن کو خاموش رہنے کی قیمت ادا کردی تھی اور اب گویا بقلم خود ملاحظہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ شاہ عالم ہی ہے یا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایسا بتایا گیا ہے۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "مہینوں بعد یہ کیسے جان سکتی تھی وہ۔"

"بس میاں' یہ معاملہ عقل کا ہوتا تو وہ ایسی حرکت ہی کیوں کرتی۔ اس کو ہوگا یقین کہ وہ ڈھانچا دیکھ کر بھی شناخت کرلے گی اسے۔ جیسے۔۔۔ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ خیال کا گھوڑا نصف شب کو پہنچا ادھر تو ہم کھڑے ہوگئے قلم رکھ کے گویا۔ اپنے ایک بھروسے کے پولیس افسر سے بات کی اور اس نے کچھ نفری ہمارے ساتھ کردی۔ رات ڈیڑھ بجے ہم پہنچے وہاں تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ کھڑی ہے شہرِ خموشاں کی بدروح کی طرح اور ملاحظہ کررہی ہے ایک ڈھانچے کو۔ یا وحشت تیرا ہی آسرا۔ ہم نے پولیس کو خبردار کیا کہ احتیاط سے کام لیں۔ کمانڈو ایکشن سے انہوں نے اچانک اسے دبوچ لیا۔ دونوں مزدور گرفتار اور گورکن بھی۔ انہیں ہم نے بعد میں چھڑوا دیا۔ مناسب گوشمالی ہوچکی تھی ان کی تب تک اور اسے لے گئے سیدھے ایک نفسیاتی علاج گاہ میں۔"

"اس نے مزاحمت نہیں کی؟"

"نہیں۔ وہ خوش تھی۔ ہنس رہی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے۔"

"پھر تو جذبات کی روشنی میں صحیح نتیجہ اخذ کیا اس نے۔"

وہ چونکے "کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں۔۔۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ مجھے گھورنے لگے "پھر تو تمہیں بھی ہونا چاہیے اسی کے ساتھ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ تمہیں یاد بھی بہت کر رہی ہے وہ۔ کبھی اچانک ہنستی ہے پھر رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے مجھے معاف کردو۔ میں نے شک کیا تھا تم پر۔ اب اس کی صحت اور شفا بھی گویا تمہارے دستِ مسیحائی میں ہے۔۔۔ جیسے اپنی چلبلی کے مسیحا ہو تم۔۔۔ وہ کیا ہے فارسی میں۔۔۔"

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
کشتگانِ عشق را دارو بجز دیدارِ نیست

میں نے کہا "ذرا مطلب بھی سمجھادیں سلیس اردو میں۔"

"مطلب یہ کہ مرضِ عشق کا علاج صرف دیدارِ یار ہے۔ ڈاکٹر کیا کرے گا انجکشن لگا کے یا اینٹی بائیوٹک دے کر" وہ بولے۔

"مطلب خوب نکالا آپ نے۔"

"تم بھی کچھ سمجھے۔ نہیں سمجھے تو پھر ہم نکالتے ہیں اپنی تیلی۔ اتنی ماریں گے حساب رکھے بغیر کہ تم تشریف رکھنے کے قابل نہیں رہو گے گویا۔ اس کی دلداری تمہارا فرضِ اولیں ہے' ہے یا نہیں؟"

میں نے سعادت مندی سے کہا "بالکل ہے۔ میں نے کب انکار کیا؟"

"تو پھر کب جاؤ گے اس سے بہرِ ملاقات۔"

میں نے کہا "دیکھیے' ابھی تو آپ کے ساتھ جانا ہے مجھے۔ پریس کانفرنس ہے ایک بجے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ لنچ لازمی ہے ورنہ صحافی اگر بھوکے جائیں گے تو رپورٹ بھی ایسی ہی لگائیں گے۔ شام کو مجھے ملنا ہے اپنے وکیل سے۔ کچھ نجی معاملات ہیں قانونی نوعیت کے اور اس کے بعد رات کو پھر ایک ایسی تقریب ہے جہاں میرا جانا ناگزیر ہے۔"

"سب ناگزیر ہے گویا۔ بس وہ پاگل لڑکی سب سے کم اہمیت رکھتی ہے" انہوں نے دکھی اور دل شکستہ لہجے میں کہا "تم کیا جانو ہیرے کی قدر برخوردار' کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کیا تم نے گویا۔ ہم نے بڑی عرق ریزی اور جگر سوزی سے اس کو تراش خراش کے ایک گوہرِ نایاب بنایا۔ آج ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ مجھے احساس ہے آپ کے جذبات کا اور میں شبنم کی اتنی ہی قدر کرتا ہوں۔ اس کے لیے سب کچھ کروں گا میں۔ انکار کب کیا ہے میں نے۔ دوپہر کے بعد پریس کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی میں آپ کے ساتھ سیدھا اس کے پاس جاؤں گا۔ اتنا وقت تو ہوگا ہمارے پاس۔"

وہ ایک دم خوش ہوگئے "یہ وقت بڑی عجیب چیز ہے برخوردار' اس میں بڑی لچک پیدا ہوجاتی ہے جب کوئی اسے اہمیت دے۔ ہر کام کے لیے وقت نکل آتا ہے انہی چوبیس گھنٹوں کے معمولات میں۔ ورنہ اس شہر میں اپنا ہمسایہ فوت ہوجائے تو لوگ کہتے ہیں کہ وقت ہی نہیں ملا جنازے میں شریک ہونے کے لیے۔ بزنس میٹنگ ہو تو آدھی رات کو بھی وقت نکل آتا ہے مصروفیت میں۔۔۔ اس کے لیے کچھ وقت نکالنا ہی پڑے گا تمہیں شاہ جی۔"

انہوں نے پہلی بار مجھے شاہ جی کہا تو مجھے عجیب سا لگا "کمال کرتے ہیں آپ۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ اب وہ میری ذمے داری ہے۔ آپ نے بتادیا مجھے تو آپ سبکدوش ہوگئے۔"

ان کی آنکھیں مچلنے لگیں "کیا واقعی! یقین نہیں آتا ہمیں مگر تم نے جھوٹ کبھی نہیں بولا ہم سے اور ہم نے آخر کیوں تمہارے سچ کو خاموشی سے مان لیا تھا؟ محض شبنم کے لیے۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے' اب چلیں؟"

کلمۂ شہادت' آیت الکرسی اور جل تو جلال پڑھتے ہوئے میں آزاد صاحب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کے چابی گھمائی تو چلبلی غرا کے اسٹارٹ ہوگئی۔ "دیکھا تم نے؟ چلبلی کا موڈ کتنا اچھا ہے۔ یہ خفا ہوتی تم سے تو دھکا لگانا پڑتا تمہیں۔ راستے میں کھڑی ہوجاتی کہیں۔ بریک فیل ہوجاتے۔ بڑے نخرے ہیں اس کے میاں لیکن اب تو شرط لگالو ہم سے۔ یہ مرسیڈیز کی طرح جائے گی اور بی ایم ڈبلیو کی طرح آئے گی۔ رات تک دوڑاتے رہو' حرفِ شکایت زباں پر نہیں لائے گی۔"

بلاشبہ ان کی شخصیت کے بہت سے رخ تھے اور ایک رخ سے وہ باقاعدہ خبطی تھے۔ سنکی تھے اور انہیں نہ سمجھنے والا پاگل سمجھ سکتا تھا۔

چلبلی جیسی شاہانہ سواری میں ملک عمر بخش مندرال کے محل جیسے "مندرال ہاؤس" میں داخل ہونا بھی ایک دلچسپ تجربہ ثابت ہوا۔ سب سے پہلے تو دربان دم بخود رہ گیا۔ جب اسے یقین آگیا کہ یہ لڑھکنے کے انداز میں چلنے والی عجیب و غریب مخلوق بھی کار کہلاتی ہے تو اس نے دانت نکالتے ہوئے اندر کی مخلوق کو دیکھا۔ کم از کم آزاد صاحب اپنی جناح کیپ' محدب شیشوں والی ناک پر ٹکی ہوئی پرانی عینک' خستہ حال شیروانی اور اس کے ٹوٹے بٹنوں سے جھانکتی شوخ پرنٹ والی شرٹ میں اسے چلبلی جیسے ہی لگے ہوں گے۔

"کیا بات ہے؟" چوکیدار نے یوں پوچھا جیسے ہم ردی دینے والوں کی طرح ریڑھی لے کر دروازے کے سامنے کھڑے ہوگئے ہیں۔

آزاد صاحب نے اسے ڈانٹا "نامعقول۔ تیمی نکال کے آئیں تجھے کہ بات کیا ہے؟ اب دروازہ کھول شرافت سے۔"

میں نے کہا "ہم ملک صاحب کے مہمان ہیں۔ وہ انتظار کررہے ہیں ہمارا اور تم جتنی دیر کرو گے اتنی ہی شامت آئے گی تمہاری۔"

"اچھا۔" اس نے سوچ کے کہا "یہ چیز باہر چھوڑ دو۔"

"چیز؟ چلبلی کو چیز کہتا ہے خرزاد۔ اس نوع کی دوسری گاڑی ہے کسی کے پاس۔۔۔" آزاد صاحب چراغ پا ہوگئے۔

میں نے کہا "مندرال صاحب نے یہ گاڑی خریدنے کے لیے ہی بلایا ہے۔ یہ برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ اول کی گاڑی ہے۔ پچاس لاکھ میں سودا ہوا ہے۔"

چوکیدار نے فوراً دروازہ کھول دیا اور میں نے گیٹ سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ سرہلا کے کہہ رہا تھا "خدا کا قدرت ہے کیسا لکڑ بگڑ جیسا چلتی ہے۔ پچاس لاکھ۔ وئی وئی" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

ملک عمر بخش مندرال نے رومن طرز کے پورچ اور برآمدے میں ہمارا استقبال کیا۔ وہ پینسٹھ ستر سال کا بھاری بھرکم شخص تھا جس کے چہرے کی رعونت اس کے مہذب انداز کی نفی کرتی تھی۔ موقع محل کی مصلحت دیکھ کر وہ عاجزی اور انکساری کا پیکر بھی بن جاتا ہوگا لیکن انہی کے سامنے جو رتبے میں اس سے سوا ہاتھ اوپر ہوں یا سوا سو گز اونچے نکلتے ہوں۔ اپنے سے نیچے والوں کے سامنے اس کا رویہ کیسا ہوگا' اس کا میں تصور کرسکتا تھا۔

چونکہ وقت کم تھا اس لیے میں نے خاطر مدارات کے تکلفات سے معذرت کی اور سیدھا مطلب کی بات پر آگیا۔ رئیس خان اسے پہلے ہی بریف کرچکے تھے اور غالباً اسے رخصت کردیا گیا تھا کہ اب بات برابر کے لوگوں میں ہوگی تو تمہارا یہاں کیا کام۔ حسبِ توقع ملک نے بڑی خوشی کا اور گرم جوشی کا اظہار کیا۔

"شوجی' ہم تو اب ہوگئے ہیں بڈھے شیر۔" وہ بولا "اور شکار بھی ہوگیا ہے چالاک اس لیے قابو میں نہیں آتا مگر تجربہ تو ہے ہمارے پاس۔ فیلڈ مارشل ایوب خان سے جنرل ضیاء الحق تک سب کا چڑھتا اترتا دریا تیر کر پار کیا ہے۔ ڈوبنے والے ڈوب گئے۔ ملک مندرال میں ابھی بڑا دم ہے مگر بڑوں نے کہا ہے کہ جوانی کی طاقت اور بڑھاپے کا تجربہ اکٹھے ہوجائیں تو پھر سمجھو بیڑا پار ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ایک سے دو بھلے۔ اللہ نے چاہا تو ہم مل کے اپنے حریفوں کا بیڑا غرق کردیں گے۔ اس وقت انتخابات سر پر ہیں۔ ہم ایک نئی سیاسی جماعت بنائیں تو ہمارے دو نڑ مل کر بہت بڑی طاقت بن جائیں گے۔"

"وہ رئیس کہہ رہا تھا کہ آپ مجھے چیئرمین بنانا چاہتے ہو" اس نے شوقِ اضطراب اور خوشی کے جذبات سے مغلوب ہوکے پوچھا۔

"بالکل۔ یہ تو طے ہے۔ میں صدر۔۔۔ باقی عہدے ہم اتفاقِ رائے سے رکھیں گے اور ٹکٹ بھی ہم اپنی مرضی سے دیں گے۔ آپ کا یہ حلقہ پکا۔ میرا حلقہ اپنی جگہ۔۔۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "بس تو پھر بسم اللہ۔ خیر سے نام کیا ہوگا پارٹی کا؟"

میں نے کہا "پہلے ہم اس سیاسی اتحاد کا اعلان کردیں۔ نام اس کے بعد سوچیں گے۔ جو آپ کی صلاح وہ میری۔"

ملک کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اسے اچانک بے پناہ اہمیت حاصل ہورہی تھی اور انتخابات میں کامیابی یقینی نظر آنے لگی تھی۔ اس نے پریس کانفرنس کا انتظام ہنگامی بنیادوں پر کیا اور ٹیلی فون پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کو لنچ کے انتظامات کا آرڈر دے دیا۔

ایک بجے اخباری نمائندے آنے لگے اور ڈیڑھ بجے تک لان میں لگائی گئی سو کرسیاں بھر گئیں۔ میں آخری وقت تک سامنے نہیں آیا اور اندر سے ہی آنے والوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں بہت سے چہرے اب میں پہچاننے لگا تھا لیکن مجھ سے زیادہ ملک عمر بخش ان سے واقف تھا کیونکہ واقعی اس کی سیاسی عمر میری اپنی عمر سے زیادہ تھی۔ وہ سب بہت مضطرب تھے کیونکہ چوبیس گھنٹے سے انہیں میری تلاش تھی مگر میں لاپتا تھا۔ وہ گزشتہ روز کے واقعات پر بہت سے سوالات پوچھنا چاہتے تھے اور کسی زیادہ سنسنی خیز خبر کی جستجو میں تھے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھے کہ میں نے یہ پریس کانفرنس ملک عمر بخش مندرال کے ساتھ اور اس کے گھر پر کیوں بلائی۔

میرے باہر آتے ہی انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کردی مگر میں نے مسکرا کے سب کو ٹال دیا "ابھی کچھ دیر میں آپ کو سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے" میں نے ایک ایک میز پر جا کے سب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

لنچ کے لیے اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کو چار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چار کے گروپ میں میز کے گرد چار کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا اور انہیں دھوپ سے بچانے کے لیے شامیانے تان دیے گئے تھے۔ یہ سارے کام دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں کرا لینا صرف عمر بخش کے لیے ہی ممکن تھا جس نے فون پر یوں احکامات جاری کیے تھے جیسے حکم عدولی کی صورت میں وہ ملزموں کو سولی پر چڑھا دے گا۔ احکامات پر عمل درآمد کے ذمے دار اس کے ذاتی ملازم تھے جو اس فرعونیت کے عادی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جان نہ سہی کوتاہی کی سزا بے عزتی اور ملازمت سے برخاستگی' کچھ بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے ہر میز پر جا کے فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا۔ سوائے چند خواتین کے جن میں آپا صفیہ اور شمی بھی تھیں۔

صرف چھیڑنے کے لیے میں نے شمی سے پوچھا "آج تمہارا وہ دوست نظر نہیں آ رہا ہے' مولانا۔۔۔"

شمی کا رنگ زرد پڑ گیا اور ہونٹ کانپنے لگے۔

آپا صفیہ نے کہا "ہی از ڈیڈ۔ شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ۔۔۔"

میں نے صدمے سے سنبھل کے کہا "مجھے معلوم ہے لیکن یہ مجھے علم نہیں تھا۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری مس شمی۔ مجھے بہت دکھ ہوا یہ جان کے۔ پلیز' میرے دلآزار سوال پر مجھے معاف کر دیجیے۔"

اس نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو صاف کیے اور کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگانے لگی "یہ تو ہونا ہی تھا۔۔۔ بالکل ناگزیر تھا۔"

شمی کے ساتھ نظر آنے والا جنگلی قسم کا داڑھی والا ایڈز کا مریض تھا اور یہ بات مجھے بہت پہلے معلوم ہو چکی تھی۔ شمی پہلے اس سے شادی کرنے والی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح وہ خودکشی کرے گی مگر اس وقت محبت کی دیوانگی غالب تھی۔ اس نے میرے سمجھانے کا بھی برا مانا تھا۔ بعد میں موت کی دہشت نے اسے انتہائی قدم اٹھانے سے روک لیا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ خود شمی کس حد تک محفوظ تھی اور کتنے دن کی مہمان تھی۔ اگر اس نے خون ٹیسٹ کروایا تھا اور وہ HIV پازیٹو تھی تو یہ بات اس نے سب سے چھپا رکھی تھی۔

جیسے زمانہ جاہلیت میں لوگ کوڑھی کے سائے سے بھی بچتے تھے ایسے ہی ایڈز کا نام سن کر آج جاہل لوگ ایڈز کے مریض سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ مرنے والے کے لیے بھی یہ خوف سے زیادہ شرم سے ڈوب مرنے کی بات ہوتی ہے کہ وہ ایڈز کا شکار ہے حالانکہ اس میں سو فیصد لوگ جنسی بے اعتدالی کے باعث مبتلا نہیں ہوتے۔ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس مرض کے پھیلنے کا سبب وہ خون ہے جو مریضوں کو ٹیسٹ کرائے بغیر دے دیا جاتا ہے اور جس میں کسی پیشہ ور خون دینے والے کا ایڈز کے جراثیم والا خون بھی آ جاتا ہے۔ اس کا سبب ناقابل استعمال سرنجوں کے دوبارہ استعمال کرنے کا مذموم کاروبار بھی ہے اور اسپتال کے فضلے' خون آلود روئی اور پٹیاں وغیرہ کو بے احتیاطی سے پھینک دینا بھی۔

ڈیڑھ بجے میں نے اپنا بیان شروع کیا۔ اس کے آغاز میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ میں نے اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا ذکر کیا اور سازش کرنے والوں کو خوب لتاڑا پھر میں نے انتظامیہ کی خبر لی۔ خصوصاً پولیس کے جانبدارانہ رویے پر بہت گرجا برسا اور ان اخبار نویسوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے سیاست میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ناکام سازشی عناصر بالآخر اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے ناکام قاتلانہ حملوں کی ذمے داری اپنے سیاسی حریفوں پر عائد کی مگر نام کسی کا نہیں لیا۔

اہم اعلان مجھے آخر میں کرنا تھا۔ دس منٹ کی تمہید کے بعد میں نے کہا "آپ سب کو اس لیے بھی زحمت دی میں نے کہ مجھے آپ سب کی تائید اور حمایت کے بغیر زندہ رہنا بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ کل جو کچھ ہوا' آپ سب جانتے ہیں لیکن مجھے گزشتہ ایک ہفتے سے مسلسل دھمکی والے فون موصول ہو رہے تھے۔ ایک ہفتے سے میں نے پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کر لی ہیں ورنہ شاید اپنے ہی گھر میں مجھ پر ہر روز قاتلانہ حملے ہوتے۔ شاید میرے گھر کو آگ لگا دی جاتی۔ اس میں بم کا دھماکا ہو جاتا لیکن سخت حفاظتی تدابیر کے باوجود جو کچھ کل ہوا' وہ آپ سب جانتے ہیں۔ کون تھے آخر وہ لوگ جو لاشیں لے کر زبردستی میرے گھر میں گھسے تھے۔ کس کی تھیں وہ لاشیں جن کو وہ خالد عثمان اور خادم مرزا کی لاش بتانا چاہتے تھے اور کیوں۔۔۔ دو آدمی جو زندہ ہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے۔ ان کے قتل کے الزام میں مجھے کیوں ملوث کیا جا رہا ہے۔ ویسے تو اس شہر میں روز ہی دو چار قتل ہوتے ہیں۔ ڈال دیں مجھ پر کوئی بھی قتل اور چڑھا دیں مجھے پھانسی مگر کیا ہم جنگل میں رہتے ہیں؟ یہ اندھیر نگری ہے؟ جہاں نہ قانون ہے اور نہ انصاف۔ بے شک ابھی ایسا نہیں ہے مگر ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔ جنگل کے قانون کی طرف۔ موجودہ حالات نے میری سیاسی ساکھ

ری نقصان نہیں پہنچایا ہے' میرا ذہنی سکون بھی چھین لیا ہے۔ میری نجی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔"

رئیس خان نے بروقت ایک خریدے ہوئے صحافی کو شارہ کیا "سر۔ مداخلت کی معافی چاہتا ہوں مگر کیا یہ سچ ہے کہ پ کے ازدواجی تعلقات کی خرابی میں طلاق کی نوبت آ گئی ہے؟"

بہت سے صحافیوں نے سر گھما کے اس کو دیکھا۔ یہ ایسا وال تھا جو کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس سوال نے سب ر چونکا دیا تھا اور صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ صرف ایک خص کو یہ اطلاع کیسے ملی اور وہ بھی اتنی مصدقہ کہ اس نے یس کانفرنس میں بیان ختم ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور وال داغ دیا۔ اس کے لیے وہ پہلے سے تیار تھا اور اس نے یح وقت پر دھماکا کیا تھا۔

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے سخت شاک لگا ہے اور ہدے نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ دیا ہے۔ میرے حواس ر ماؤف کر دیا ہے اور میری پوزیشن اتنی AWKWARD کر دی ہے کہ میں بغلیں جھانکنے لگا ہوں۔

بالآخر میں نے کہا "یس۔ یو آر ویری رائٹ۔ مجھے نہیں علوم کہ تمہیں کس ذریعے سے یہ اطلاع ملی مگر یہ ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اسے بھی ایک سنسنی خیز سرخی ہی سمجھیں ے مگر یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ سیاسی محاذ آرائی میں ایک ندان کو تباہ کر دیا جائے' جھوٹ کے ہتھیار سے قتل کیسے کیا سکتا ہے؟ میرے والد میاں جی کی موت اس کا ثبوت ہے۔ ن کے سامنے ایک جعلی شاہ عالم کی لاش رکھ دی گئی۔ ہدے سے ہارٹ فیل ہو گیا ان کا۔ میری نابینا ماں پاگل و گئی۔ عدالت نے بہت بعد میں فیصلہ دیا کہ وہ شاہ عالم نہیں ں۔ شاہ عالم میں ہوں۔ کیا یہ قتل نہیں تھا۔ یہ جھوٹ نہ بولا اتا تو میاں جی آج بھی زندہ ہوتے۔ اسی جھوٹ نے میری ی کو شک میں مبتلا کیا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں اس عورت ی ذہنی کیفیت کو جسے یقین نہ ہو کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ جو ص اس کا شوہر بنا ہوا ہے' وہ واقعی اس کا شوہر ہے یا کوئی عساز ہم شکل۔ شک کی اس خلیج نے ہمارے درمیان عدم تماد کی ایسی فضا پیدا کی۔۔۔ جس کے نتیجے میں ہمارا ساتھ رہنا شکل ہو گیا۔ میری تمام تر کوشش کے باوجود یقین کے آئینے ں جو بال آ گیا تھا' وہ باقی رہا۔ اب ہم نے علیحدگی کا فیصلہ کیا ہے۔ میں مجبور ہوں کہ اسے شرعی طور پر طلاق دے کر زاد کر دوں۔ وہ ایک اعصابی مریضہ ہو گئی ہے۔ کون ہے س کا ذمے دار؟"

میں نے ذرا سی دیر کا وقفہ لیا اور پانی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اخباری نمائندوں کے ہونق چہرے دیکھے۔ میرے ڈرامائی اندازِ خطابت نے انہیں متاثر کیا تھا۔ میں نے ان کی ہمدردیاں جیت لی تھیں۔

"ان حالات میں۔۔۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں پی جے ایف کی قیادت سے دستبردار ہو جاؤں۔ میں اس پارٹی کا بانی تھا۔ میں نے اسے دن رات کی جدوجہد سے زندگی دی تھی مگر اب اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا ہے۔ میں اسے اپنی موروثی جاگیر نہیں سمجھتا۔ میں عدالتی فیصلے سے پہلے ہی پارٹی چھوڑ رہا ہوں۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔ "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ہم خیال اور حامی افراد کا گروپ بنا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "میں کوئی گروپ نہیں بنا رہا ہوں اور نہ ایک پارٹی میں دھڑے بندی کا قائل ہوں۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی سے کیچڑ اچھالنے سے' محاذ آرائی اور کردار کشی سے نفرت بڑھے گی۔ نفرت جنم دیتی ہے تشدد کے جذبات کو' میں اس کا قائل نہیں۔"

"تو کیا آپ سیاست سے ریٹائر ہو رہے ہیں؟" کسی نے چلا کے کہا۔

"نہیں۔ اس کا یہ مطلب نکالنا بھی غلط ہو گا۔ میں سیاست کا انداز بدلنا چاہتا ہوں۔ اس میں شرافت اور بردباری لانا چاہتا ہوں۔ جمہوری فکر اور طرزِ عمل کو فروغ دینا چاہتا ہوں اور بھی بہت کچھ ہے میرے ذہن میں جو تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ جس راستے پر ہماری سیاست چل رہی ہے وہ راستہ غلط ہے۔ اس پر چل کے ہم صحیح منزل پر پہنچنے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں۔"

کسی نے کہا۔ "ابے یار یہ کوئی نیا ڈراما ہے۔"

میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سیاست کو بامقصد اور مثبت سمت دینے کے لئے ایک نئی سیاسی جماعت بناؤں۔"

کسی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ایک اور جماعت۔"

"کچھ لوگ ہنس پڑے۔ "نام کیا ہو گا اس کا۔۔۔؟"

"یار نام بہت۔۔۔ آخر بچوں کے نام بھی رکھتے ہیں۔۔۔ لوگ فال نکال کے یا علمِ اعداد کی مدد سے۔" کوئی بولا۔

میں نے کہا۔ "نام کا اعلان منشور کے ساتھ کیا جائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا۔"

"آپ نام رکھ لیں۔ ایک اور پارٹی۔ ایم اے پی"

"بے مقصد پارٹی۔ بی ایم پی۔ بلا منشور پارٹی بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے مسکرا کے ان مشوروں کو نظرانداز کر دیا۔

"اس پارٹی کے لئے میرا اتحاد ملک عمر بخش مندرانی سے ہو گیا ہے۔ کل اس کے چیئرمین ہوں گے اور اس پارٹی کے دروازے تمام محبِ وطن پاکستانیوں کے لئے کھلے ہوں گے۔"

"کتنے دروازے ہوں گے اس کے۔؟" کوئی بولا۔

"آنے کے اور جانے کے الگ الگ ہوں گے۔"

دوسرے نے جواب دیا۔

ایک اور نے سوال کیا۔ "یہ کیسے پتا چلے گا کہ کون محبِ وطن ہے اور کون نہیں۔؟"

"بھائی شاہ صاحب حب الوطنی کی شناخت کے لئے جب الوطنی میٹر لگائیں گے جو خود بتا دے گا کہ کون کتنا حب الوطن ہے۔"

"اور جس کے پاس شناختی کارڈ ہے وہ پاکستانی ہے۔ خواہ وہ جعلی ہو۔"

ایک نئی پارٹی کے قیام کا اعلان ان سب کے لئے کسی لطیفے سے کم نہیں تھا جو پاکستان کی سیاست کے ماضی اور حال کو حقیقت کے آئینے میں دیکھ سکتے تھے چنانچہ مستقبل سے زیادہ پُرامید نہیں تھے۔ انتخابات میں حصہ لینے والی جماعتوں کی تعداد ہی درجنوں میں تھی۔ ایسی سیاسی جماعتوں کا کوئی شمار نہ تھا جن کا وجود کاغذی تھا۔ جن کو ووٹر تو درکنار کھڑا کرنے کے لئے امیدوار نہیں ملتا تھا یا تائید کرنے والا نہیں ملتا تھا۔ ان کے لیڈر محض لیٹر ہیڈ پر لکھے ہوئے بیان چھپوا کے خود کو سیاست داں سمجھتے تھے۔

ظاہر ہے سیاست کے خودرو جنگل میں ایک اور پارٹی کا اُگ آنا کسی کے لئے اہم خبر نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا ملک بخش مندرانی سے اتحاد کچھ لوگوں کے نزدیک دوہارے جواریوں کا وہ معاملہ بھی ہو سکتا تھا جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے ہائے

ملک عمر بخش مندرانی اب انتخاب جیتنے کی نہ صلاحیت رکھتا تھا نہ ساکھ اور میرا حال یہ تھا کہ میں یوسف بے کارواں ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی ہی پارٹی نے بیدخل کر دیا تھا اور ایسے موقع پر جب میرے پاس سیاسی یا قانونی جنگ لڑنے کی مہلت ہی نہ تھی۔

آخری اعلان میں نے یہ کیا کہ پی جے ایف یا اس کے معاملات سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا اور میں پارٹی کے غاصب عہدیداروں شمس قریشی وغیرہ سے عدالت کے باہر پُرامن تصفیے کے لئے تیار ہوں۔

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی شکست تسلیم کر رہے ہیں۔" ایک اخباری نمائندہ بولا۔

"اگر آپ اسے جنگ قرار دیتے ہیں۔ جو کچھ بھی میرے ساتھ ہوا یا ہو رہا ہے۔ تو تب ہی شکست کا لفظ استعمال کرنے میں عار نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ شمس یا قریشی کو اس پارٹی کا چیئرمین تسلیم کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "جب وہ چیئرمین بن جائیں گے تو میرے تسلیم کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا آپ کو ڈر تھا کہ عدالتی فیصلہ آپ کے خلاف جائے گا؟"

"عدالتی فیصلہ پہلے بھی میرے حق میں ہوا تھا۔ جب مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا گیا تھا۔ اب اس کوئی امکان نہیں تھا مگر میں عدالت سے زیادہ عوام کے فیصلے اہمیت دیتا ہوں۔ جو شاہ عالم کو جانتے ہیں اور اس کے ساتھ مخلص ہیں' وہ بہرحال میرا ساتھ دیں گے۔ شمس اور قریشی بہت جلد اندازہ ہو جائے گا اپنی طاقت کا۔ وہ پارٹی کے نام قبضہ کر کے خوش ہو سکتے ہیں۔ پارٹی کے حامی ارکان کی وفاداریاں نہیں خرید سکتے۔"

"آپ کے حامی اتنے زیادہ طاقتور تھے تو انہوں نے اپنی طاقت کا اظہار کیوں نہیں کیا۔؟"

میں نے کہا۔ "اگر اظہار سے آپ کی مراد ہے کہ احتجاج کرنے کے لئے سڑک پر کیوں نہیں آئے۔ انہوں ہنگامہ آرائی۔ مظاہرے اور توڑ پھوڑ سے طاقت کا اظہار کیوں نہیں کیا تو میں واضح کر دوں کہ ہم تشدد کی سیاست یقین ہی نہیں رکھتے۔ کیا ضرورت ہے انہیں اس کی۔ وقت قریب ہے جب وہ آسانی سے اپنی رائے کا اظہار کر گے اور نتائج خود بتا دیں گے کہ عوام کس پر اعتماد کرتے ہیں پارٹی کا نام' اس کا آفس اور ریکارڈ۔ ان سب پر قبضہ کر سے کوئی اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتا جو شاہ عالم برسوں کی سیاسی جدوجہد سے حاصل کیا تھا۔"

ایک نمائندے نے کہا۔ "ان کا کہنا ہے کہ پارٹی

ریکارڈ پر آپ کا قبضہ ہے۔"

"انہوں نے عدالت سے اس ریکارڈ کی واپسی کی استدعا کی ہے۔"

"رائٹ۔ حفاظت کے خیال سے میں نے ریکارڈ منتقل کر دیا تھا۔ میں عدالت کے استعانی کی موجودگی میں سب ریکارڈ ان کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہوں اور پارٹی کے اثاثوں پر اپنے تمام دعوؤں سے دستبردار ہوتا ہوں حالانکہ اس میں میرا بہت کچھ لگا ہوا تھا۔"

"کیا آپ قاتلانہ حملے کے مقدمات بھی واپس لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تک میں نے کسی کے خلاف کوئی مقدمہ درج کرایا ہے شک کی بنیاد پر تو میں یقیناً واپس لے سکتا ہوں۔"

"یعنی آپ کو معلوم نہیں۔"

"قانونی معاملات سے میرے وکیل بیرسٹر سلطان محمود ڈیل کرتے تھے لیکن انہیں بھی دھمکیاں دی گئیں کہ وہ میرے مقدمات کی پیروی چھوڑ دیں ورنہ ان کے خاندان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد خود میں نے ان کی حفاظت کے خیال سے یہ ضروری سمجھا کہ کسی اور کو وکیل کروں۔ وہ میرے پرانے مہرباں۔ مخلص اور قابلِ احترام دوست ہیں لیکن بیوی بچوں والے ہیں۔"

"اور اب جو وکیل کریں گے آپ اس کے لئے شادی شدہ ہونے کی شرط رکھیں گے؟" کوئی بولا۔ بہت سے لوگ ہنسے۔

"آپ کی پارٹی کا آفس کہاں ہو گا؟ شاہ عالم ہاؤس میں یا مندرانی ہاؤس میں؟"

میں نے کہا۔ "مندرانی ہاؤس میں۔ شاہ عالم ہاؤس کو میں فی الحال قطعی غیر محفوظ سمجھتا ہوں۔ جب تک وزارتِ داخلہ اسے محفوظ قرار نہ دے میں وہاں قدم رکھنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر پی جے ایف کا ریکارڈ کو کسی بم دھماکے سے نقصان پہنچتا ہے تو اس کی ذمے دار پولیس ہو گی۔ ہم ڈسپوزل اسکواڈ سے کلیئرنس مل جانے کے بعد میں شاہ عالم ہاؤس چھوڑ دوں گا۔ ویسے بھی وہ میری بیوی رخشندہ کے حق مہر میں لکھا گیا تھا۔ اسے فروخت کرنے کے بعد رقم انہیں ادا کر دی جائے گی۔"

"کیا طلاق کا فیصلہ قطعی ہے۔؟"

میں نے کہا۔ AS A MATTER OF FACT میں طلاق دے چکا ہوں اور وہ اب میرے ساتھ نہیں ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں وہ۔؟"

میں نے کہا۔ "یہ آپ لوگ معلوم کر سکتے ہیں۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

میرے بعد ملک عمر بخش مندرانی اٹھا۔ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی شعلہ بیاں مقرر نہیں تھا اور مجمع پر سحر نہیں پھونک سکتا تھا مگر سیاسی میدان میں سلور جوبلی منانے کے بعد اسے بولنا آ گیا تھا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ اونچی آواز میں اعلان کیا کہ نئی جماعت ان سب کے چھکے چھڑا دے گی جو آج چھکے مار کے خوش ہیں اور آنے والے انتخابات میں کامیابی کے بلند بانگ دعوؤں کے بعد یہ دیکھتے ہوئے کہ صحافی بھوک سے بے حال ہیں لنچ کا اعلان کر دیا۔

لنچ کے دوران میں مختلف میزوں پر سب سے گپ شپ کرتا ہوا اور فضول سوالات کو ہنس کر ٹالتا میں آزاد صاحب کے پاس جا پہنچا۔ یار لوگ ان کی آشفتہ بیانی سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے اور ان سے شبنم کے بارے میں بھی جو پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں غائب ہے۔

"بھئی وہ کچھ محوِ استراحت ہے بوجہ علالت گویا۔"

"آزاد صاحب اردو میں جواب دیتے تو سمجھ آتی بات۔"

"یار بیمار ہے وہ۔ اب بیماری کچھ نہیں ورنہ بنا دیں گے کوئی جمع المفاصل یا جوع البقر اور عرق النسا قسم کی۔"

"عرق النسا۔" کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ "کوئی سمجھ سکتا ہے اس سے کہ یہ خنثیا کو کہتے ہیں۔"

پھر اچانک وہاں شمی آ بیٹھی۔ "آزاد صاحب شبنم نظر نہیں آ رہی۔"

"بخدا یہی ہم کہنے والے تھے۔ ہمیں بھی نظر نہیں آ رہی ہے گویا۔ ہمیں تو شک ہو چلا تھا اپنی بصارت پر کہ غالباً۔ مضمحل ہو گئے قویٰ غالب۔ تم صاف نظر آ رہی ہو البتہ۔"

شمی نے مجھ سے کہا۔ "شاہ عالم صاحب۔ اجازت ہو تو ایک دو سوال پوچھ لوں۔ آف دی ریکارڈ۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کے سوالات کیا ہوں گے۔ "ضرور پوچھو۔ مگر جواب کو بھی آف دی ریکارڈ سمجھنا۔"

"یہ تو ایک اصولی اور اخلاقی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "اف یو ڈونٹ مائنڈ۔ میں تمہارا پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر دیکھ لوں' جو یقیناً تمہارے شولڈر بیگ میں ہو گا۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر بڑی ہوشیاری سے ٹیپ ریکارڈر نکالتے ہوئے اسے آف کرکے میرے حوالے کردیا۔

"یہ اس لئے ضروری تھا خاتون کہ ضرورت پڑنے پر میں انکار نہ کرسکوں کہ ایسا میں نے کبھی نہیں کہا۔ تم کھانا کیوں نہیں کھارہی ہو۔"

اس نے سنہری لائٹر سے سگریٹ جلائی۔ "بس۔۔۔ کھالیا جتنی ضرورت تھی۔۔۔ مجھے افسوس ہوا آپ کی میرج ختم ہونے کا۔"

"تھینکس۔ مجھے بھی افسوس ہوا۔"

اس نے نروس ہوکے بات کاٹ دی۔ "اب کیا سوچا ہے آپ نے' باقی عمر اکیلے گزاریں گے یا پھر کریں گے شادی۔۔۔؟"

"یہ سوال بہت قبل از وقت اور نامناسب ہے۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔"

"گستاخی معاف۔ جب میں شادی کرنے والی تھی تو آپ نے اس حد تک ٹانگ اڑائی تھی کہ اس شادی کو جرم قرار دے دیا تھا۔ سماجی اور قانونی۔ اس کے علاوہ ہر لیڈر کی پرائیویٹ لائف بھی پبلک پراپرٹی ہوتی ہے شاہ جی۔۔۔"

"جب وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ ابھی میں نے سوچنا بھی شروع نہیں کیا شادی کے مسئلے پر۔"

"کیا آپ کی وائف رخشندہ کے ساتھ ازدواجی تعلقات میں خرابی صرف ان حالات سے پیدا ہوئی تھی یا اور کوئی وجہ تھی۔"

"اور کیا وجہ ہوسکتی ہے۔؟" میں نے کہا۔

"ایک وجہ شبنم تھی۔ میرا مطلب ہے وہ افواہیں جو اس سے منسوب تھیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ خود اسے افواہ سمجھتی ہیں تو پھر سوال کرنے کا مقصد؟"

شمی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ "رخشندہ تو نہیں سمجھتی ہوگی۔ شوہر کے معاملے میں ہر بیوی انتہا درجے کی حاسد اور شکی ہوتی ہے۔"

"تم سنی سنائی کہہ رہی ہو۔ یا ذاتی تجربے کی بات ہے یہ!"

میرے وار نے اسے تڑپا دیا لیکن اس نے زیادہ سخت جوابی حملہ کیا۔ "شبنم یہ بات سرعام تسلیم کرتی تھی کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔۔۔ محبت کرتی ہے تم سے۔"

"پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔ محبت کرنا کسی قانون کے تحت جرم نہیں۔ میری طرف سے آپ کو کیا ہر حسین لڑکی کو اجازت ہے کہ مجھ سے محبت کا اعلان کردے۔۔۔ ریڈیو ٹی وی پر یا اخبار میں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ یکطرفہ محبت ہے۔ آپ کو اس کے جذبات کی ذرا بھی پروا نہیں۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

میں نے ضبط سے کام لیا "No Comment"

"کیا محبت میں ون وے ٹریفک ممکن ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ سوال کسی ٹریفک سارجنٹ سے کریں آپ۔ خود آپ کے ذاتی تجربے کا افسوس ناک انجام کیا ظاہر کرتا ہے۔؟"

اس کا چہرہ سرخ پڑگیا۔ "شاہ جی۔۔۔ ایک آخری سوال۔ فرض کریں آج نہ سہی کل خود شبنم یہ چاہے۔"

"میں نے شمی سے کہا "اور پرسوں آپ چاہیں۔۔۔ اس کے بعد کوئی اور۔۔۔ مجھے سب منظور ہیں۔ اسلام نے چار کی اجازت دی ہے آخر۔۔۔"

اس نے آزاد صاحب کی موجودگی کو بالکل نظرانداز کردیا تھا اور وہ بھی بہرے بنے پورے انہماک کے ساتھ کھانے میں مصروف تھے۔

"کل رات شاہ عالم ہاؤس میں کسی نے دو لاشوں کی تصویر بنالی اور پولیس کو غچا دے کر نکل گیا۔" شمی نے کچھ دیر بعد کہا۔

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ "کیا وہ تم تھیں؟"

اس نے میرے سوال کو جیسے سنا ہی نہیں۔ "فرض کرو کوئی وہ تصویریں تمہیں دینا چاہے۔۔۔ بدلے میں تم اسے کیا دو گے؟"

میں نے اس کے سوال پر غور کیا۔ "کیا ثبوت ہوگا کہ تصویر انہی دو لاشوں کی ہوگی۔"

"تصویریں اور بھی ہوں گی ساتھ۔۔۔ پورے بیک گراؤنڈ میں اور ہر تصویر پر وقت کے ساتھ تاریخ کا پرنٹ ہے۔ ابھی تک کسی نے بھی وہ تصویر نہیں دیکھی جن سے لاشوں کی شناخت ممکن ہے۔ ان کی مدد سے ورثا کو تلاش کیا جاسکتا ہے اور معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کون تھے۔" شمی نے کہا۔

"لاشیں کہاں ہیں۔۔۔؟"

"ہوں گی مردہ خانے میں۔۔۔ یا اصل وارثوں کے حوالے کردی گئی ہوں گی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے مگر ثبوت

نہ ہو تو پولیس صاف انکار کرسکتی ہے۔"

"وہ انکار کیسے کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے انہوں نے انکار کردیا ہے کہ شاہ عالم ہاؤس سے پولیس کی وردی میں کچھ لوگ گرفتار کیے گئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "او کے۔۔۔ تمہاری کیا قیمت ہے؟ سکہ رائج الوقت میں۔"

اس نے ذومعنی سوال کا بُرا نہیں مانا۔ "میں بھی۔۔۔ HIV پازیٹو ہوں اب۔۔۔"

"مجھے امید تھی۔۔۔ اور میرا اندازہ ٹھیک تھا۔" میں نے کہا۔

"تم اب بھی سمجھتے ہو کہ میں نے غلطی کی تھی اس سے محبت کرکے۔ اب وہ مرچکا ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"صرف محبت کرنے سے کسی کے ایڈز کے جراثیم دوسرے کے خون میں شامل نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "تمہارا یا مرنے والے کا جرم یہ ہے کہ اس نے معاشرے میں ایک اور خطرناک مریض کا اضافہ کردیا۔ ایڈز کا ہر مریض ایک چلتا پھرتا کیمیائی بم ہے۔ وہ کہیں بھی کسی بھی وقت ان گنت لوگوں میں مرض/موت تقسیم کرسکتا ہے اور یہ چین ری ایکشن ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ کہیں آگ ایک عمارت سے دوسری عمارت تک پھیلتی جارہی ہو تو اسے کیسے ختم کیا جاتا ہے۔۔۔ درمیان کی ایک عمارت کو ڈائنامائٹ سے اڑا کے۔"

"تم بہت سنگدل ہو۔ یہ کہہ رہے ہو کہ مجھے مار دینا چاہیے؟ جیسے زمانۂ جاہلیت میں کوڑھیوں کو شہر سے باہر ایک حصار میں مقید رکھا جاتا تھا ایسے ہی مجھے۔۔۔ جب تک زندگی ہے QUARENTINE میں رکھنا چاہیے۔"

"میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیا تم یہ کنٹرول کرسکتی ہو کہ کسی سے تمہارا جسمانی رابطہ نہ ہو۔ تم خوبصورت اور جوان ہو اور حد سے زیادہ آزاد خیال اور خودمختار۔ میں نے سنا ہے کہ ایک انتقامی ردِ عمل کے طور پر بھی ایڈز کے مریض ایسا کرتے ہیں۔۔۔ وہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "میں باہر جانا چاہتی ہوں۔۔۔ کسی ایسی جگہ جہاں مجھے کوئی بھی نہ جانتا ہو۔ یہاں سب مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔۔۔ جیسے میں چھوت کی مریض ہوں۔۔۔ اچھوت ہوگئی ہوں۔۔۔ ہمدردی نہیں نفرت ہے میرے لئے سب کی آنکھوں میں۔۔۔ HIV پازیٹو ہونے کے باوجود میں کئی سال زندہ رہ سکتی ہوں۔"

مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ "کہاں جانا چاہتی ہو تم۔"

"مجھے میرا اخبار لندن میں اپنا نمائندہ بنا سکتا ہے۔ لیکن وہ مجھے لندن بھیجنے کا خرچ ادا نہیں کریں گے۔ انہیں وہیں لندن میں بہت لوگ مل جائیں گے۔۔۔ یہ کام تم کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "ایک بار پہلے بھی تم نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ بلیک میلنگ نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کا معاہدہ ہے۔"

اس نے افسردگی سے کہا۔ "لاشوں کی تدفین سے پہلے تمہیں تصویریں مل جائیں گی تو تمہارا کام آسان ہوگا۔ بعد میں لاش نکلوا کے شناخت اور پوسٹ مارٹم کے قانونی مسائل پیدا ہوجائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا۔۔۔ لاؤ تصویریں۔۔۔"

اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ "میں تم پر اعتماد کرسکتی ہوں۔"

"میں کسی کے اعتماد کو دھوکا دینا گناہِ عظیم سمجھتا ہوں۔" میں نے لفافہ لے لیا اور تصویروں کو تھوڑا سا باہر نکال کے ایک نظر دیکھا۔

اچانک ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے لفافہ مجھ سے چھین لیا۔۔۔ مرنے والوں کے چہرے میری نظر میں گھوم رہے تھے۔

○☆○

میری نظر میں ایک ہی چہرہ گھوم رہا تھا۔ ہاشمی صاحب کا چہرہ جس پر موت کا سکوت اور سکون تھا۔ گل نواز کی حالت دیکھ کے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ لندن سے ملنے والی خبر کیا ہوسکتی تھی مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے کچھ پوچھ سکوں۔

بالآخر اس نے رومال سے ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔ "ہی از ڈیڈ۔۔۔ ہاشمی صاحب از ڈیڈ۔۔۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" میں نے بے اختیار کہا۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

رئیس نے کہا۔ "کیا شاہ و آرہی ہے۔ میرا مطلب ہے ان کی بیگم۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن لاش لانے کے انتظامات کے لئے مجھے جانا ہوگا۔ تقدیر کے فیصلے یوں ہوتے ہیں۔ تم نے صحیح وقت پر دستخط کردیئے ورنہ یہ معاملہ ختم ہوجاتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ وہ آپ کے دوست تھے اور میرے محسن۔ مجھے بہت افسوس ہوا ان کے انتقال کی خبر سن کے۔"

"ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے ان کی شادی کو۔" رئیس بولا۔ "کہ شادو۔۔۔ شاہدہ پردین بیوہ ہو گئی۔ ہنی مون کے لئے گئے تھے ولایت۔۔۔ آدمی کی موت اسے کہاں لے جاتی ہے۔۔۔ وہیں جہاں۔۔۔"

میں نے رئیس کا پیر دبایا۔ گل نواز خان اسے خون آشام نظروں سے گھور رہا تھا۔ رئیس کی بات غلط نہیں تھی مگر یہ بات کہنے کا وہاں کوئی موقع نہ تھا۔

باہر آکے میں نے کہا۔ "یار کبھی تو سوچ سمجھ کے بولا کر۔"

"ابے رہنے دے۔۔۔ تم۔۔۔ سالے ۔۔۔۔ رسمی باتیں کر رہے تھے۔ جھوٹ بول رہے تھے ایک دوسرے سے۔" رئیس نے خفگی سے کہا۔ "تجھے خاک افسوس ہوگا اس کے مرنے کا جس نے تجھ سے شادو کو چھین لیا تھا بلکہ خرید لیا تھا۔ تیرا بس چلتا تو اسے خود مار دیتا۔ تجھے تو خوشی ہوگی بیٹا کہ اس نے تیرے ساتھ برائی کی تھی۔ قدرت نے تیرا بدلہ لے لیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ وقت گزر گیا رئیس۔ جب شادو نے خود ہی مجھے چھوڑ کے اسے پسند کر لیا اور اس سے شادی کر لی پھر میں ہاشمی صاحب کو کیا کہوں۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ تجھے پسند کر لیتی تو میری دوستی بھول جاتا تو بھی۔"

"گل نواز خان اب پریشان ہوگا کہ شادو اس کے برابر آکے بیٹھ جائے گی۔۔۔ آدھے کی مالک ہو جائے گی۔"

"آدھے کی نہیں پورے کی۔" میں نے کہا۔ "گل نواز خان ورکنگ پارٹنر ہے۔ مطلب یہ کہ جو ہے سب ہاشمی صاحب کا ہے۔ وہ صرف کام سنبھالتا ہے اور منافع میں آدھے کا حقدار ہے۔ شادو اس معاہدے کو ختم کر سکتی ہے۔ اگر چاہے۔"

رئیس ہنسا۔ "بس تو شادو پھر بک۔۔۔ گئی نا۔ اس کا دوسرا خصم ہوگا گل نواز خان۔۔۔ شرط لگا لے تو مجھ سے۔۔۔ میں لکھ کر دے سکتا ہوں۔"

میں نے جھنجلا کے کہا۔ "ایک ہی بات بار بار۔ کل بھی ایک لاکھ کی شرط لگا رہا تھا تو۔۔۔ ایک لاکھ چھوڑ۔۔ ایک ہزار بھی ہیں جیب میں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ ہم وکیل کے آفس سے نکل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ نہ جانے کیوں میں اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ جیسے میں یہ چاہتا تھا۔ رئیس کا سچ اتنا تلخ تھا کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا ورنہ حقیقت یہی تھی کہ گزشتہ روز میں بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ شادو نے مجھے دکھ دیا تھا اور اپنے لئے دولت مندی کا سکھ خریدا تھا۔ قدرت نے انصاف کیا اور اسے چار دن کا سکھ دے کر بیوگی عطا کر دی۔

میرا ذہن کنفوژن کا شکار تھا۔ پہلے بھی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر شادو نے ہاشمی صاحب میں کیا دیکھا کہ اس سے شادی کر لی۔ صرف دولت؟ دولت کیا پہلے اس کے پاس نہیں تھی؟ جب وہ شاہ جی کے ساتھ تھی تو اسے پیسے کی کمی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بے شک ہاشمی صاحب کے پاس اس سے کہیں زیادہ دولت تھی مگر شادو نے شاید اس دولت کے ساتھ ملنے والی عزت اور شہرت کے لئے خود کو ان کے حوالے کر دیا اور میری محبت کو بھلا دیا۔ اعلیٰ سوسائٹی کی زندگی۔۔۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کی تقریبات۔۔۔ لندن اور پیرس کے تصور نے اس کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا اور جذبات پر ہوس کے تقاضے غالب آگئے۔

پھر اب اس کی جذباتی کیفیت کیا ہوگی۔ اسے دکھ زیادہ ہوگا یا پچھتاوا۔۔۔ کیا اسے احساس نہیں ہوگا کہ وہ پھر تنہا ہے اور زندگی کا لمبا سفر باقی ہے۔۔۔ ناصر عظیم اب اس کی دسترس میں نہیں۔۔۔ وہ خریدا نہیں جا سکتا۔ ساری عمر صرف دولت کے سہارے پر کیسے گزرے گی۔۔۔ بے شک اس دولت کی خاطر اس کا ہاتھ تھامنے والے بہت ہوں گے مگر ان میں ناصر جیسا دل والا کون ہوگا۔۔۔ وہ سب غرض مند اور لالچی لوگ ہوں گے۔۔۔ ایک حسین اور دولت مند بیوہ کے پرستاروں میں تو کیا جوان کیا بوڑھے۔۔۔ سب ایک ہی صف میں نظر آئیں گے۔ اگر وہ ہاشمی صاحب جیسے شخص کی زوجیت میں آسکتی ہے تو پھر ساٹھ سال کے کسی بھی مرد کو قبول کر سکتی ہے۔ مرد کا کیا ہے۔۔۔ ساٹھا پاٹھا۔ اور جوان تو خیر جوان ہی ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ ہوگی تو کیا۔۔۔ کچھ نہیں۔

میرا دماغ فضول خیالات کی یلغار سے خراب ہو رہا تھا۔ رئیس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو میں نے اسے جواب ہی نہیں دیا اور پھر سختی سے جھڑک دیا۔ "یار تو مجھے اکیلا چھوڑ دے۔۔۔ جا۔۔۔ میں پریشان ہوں اس وقت۔"

"پھر تو پیارے ہم تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔" اس نے بُرا مانے بغیر کہا۔ پارک میں بیٹھ گئے۔ یہ رہائشی علاقہ تھا یہاں سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک کا شور نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "رئیس۔۔۔ شادو اکیلی ہے۔ اسے کوئی نہیں جانتا وہاں۔"

"ولایت میں اکیلی عورت کو کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ اور گل نواز خان پہنچ جائے گا کل تک۔" رئیس بولا۔ "یار یہ ہارٹ اٹیک ایک دم تو نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔ پرابلم پہلے سے ہوگی۔۔۔ ہائی بلڈ پریشر رہتا ہوگا یا انجائنا کا مسئلہ ہوگا۔"

"لیکن اس نے شادو کو بتایا نہیں ورنہ وہ انکار کر دیتی۔"

"کیا پتا۔ ہو سکتا ہے خود اسے معلوم نہ ہو۔ بہت سے لوگ اس عمر کو پہنچ کے بھی چیک نہیں کراتے۔ بظاہر صحت مند لگتے ہیں۔"

رئیس نے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شادو نے یہ سب معلوم ہو جانے کے بعد شادی کا فیصلہ کیا ہو۔ یہ سوچ کر کہ ایسی حالت میں وہ کتنے دن بچے گا۔"

"یار اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جب وہ واپس آئے گی تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تجھے کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے پیارے۔ اس کے اور تیرے راستے الگ ہو گئے۔ اس نے تجھے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ بات بھول کے اب گیا اس کے سامنے تو پھر دھتکار دے گی وہ تجھے اور کس منہ سے جائے گا تو اس کے سامنے یہ کہنے کے لئے کہ شادو جی۔۔۔ چلو اب قبول کر لو مجھے۔ میں پھر حاضر ہوں اپنی محبت کے ٹوکرے کے ساتھ۔ دیکھ لو خالص اور کھرا مال ہے۔ وہ ہاشمی صاحب والی محبت نہیں ہے۔ وہ نوکروں سے کہے گی کہ اس پاگل کے بچے کو ٹوکرے سمیت باہر پھینک دو۔"

میں نے مشتعل ہو کے رئیس کے ایک مکا مارا۔ وہ پیچھے گر گیا اور ہنسنے لگا۔ "مار۔۔۔ اور مار۔ غصہ نکال دے سارا مجھ پر۔"

میں نے کہا۔ "بھونکنا بند کر کتے۔ میں اتنا ذلیل نہیں ہوں۔ مجھے نہ شادو کی دولت سے سروکار ہے اور نہ اس کے جسم سے۔ میں اس سے محبت کرتا تھا اور کرتا ہوں۔ وہ دکھی ہے تو میں دکھی ہوں۔ جیسے۔۔۔"

"رک کیوں گیا۔ جیسے وہ خوش تھی تو ناصر عظیم بھی خوش تھا۔ کچھ شرم آتی ہے اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہوئے؟ ڈائیلاگ مارتا ہے میرے سامنے۔۔۔؟"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یار۔۔۔ کیا میں اس سے ہمدردی بھی نہ کروں۔۔۔ اسے ضرورت ہوگی کسی مخلص ہمدرد کی۔ جس کے سامنے وہ جی بھر کے رو لے۔۔۔ اپنی غلطی پر یا اپنے عذاب پر آنسو بہا لے۔ کیا پرانی دوستی، شرافت اور انسانیت کا رشتہ نبھانے کے لئے بھی ہم کچھ نہیں کریں گے؟"

"کریں گے کیوں نہیں پیارے۔" وہ طنز آمیز تمسخر سے بولا۔ "ہم تدفین میں شرکت کے بعد سب کے ساتھ دعا کریں گے۔۔۔ اور جناب سوئم، چہلم میں جا کے قرآن خوانی کریں گے، وکیل صاحب کی مغفرت کے لئے۔۔۔ بہت لوگ ہوں گے وہاں۔۔۔ ہم بھی شامل ہو جائیں گے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "یار میں چلتا ہوں۔"

"تو برا مان گیا۔ دیکھ یار۔ اپن دوستی کے سوا کچھ نہیں جانتے اور اسی لئے میں سمجھا رہا ہوں۔ مجھے کہ اب اس کا تیرا کون سا رشتہ باقی رہ گیا ہے؟ اس نے پروا کی تھی تیری کہ تو اس کے لئے اتنا دکھی ہو رہا ہے؟ بھول گیا اس وقت کیا حالت تھی تیری۔۔۔؟ اور بیٹا۔۔۔ پھر اس کے عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے تو تیری مرضی۔۔۔ لیکن ابھی ٹھہر۔۔۔ کچھ دن دیکھ، وہ کیا سوچتی ہے اپنے مستقبل کے بارے میں۔۔۔ اور تیرے بارے میں۔۔۔ ویسے تو اس کا باپ بھی ہے یہاں لیکن کیا پتا اب وہ پرانی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ رکھنا چاہے۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تو کہاں جا رہا ہے میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"یار بھوک لگی ہے۔ چل پیر صاحب کے حجرے میں چلتے ہیں۔ آج جمعرات ہے نا۔ بڑی رونق ہوگی۔" اس نے مجھے بدمعاشی سے آنکھ ماری۔ "قسم بھوک کی ایسی ایسی چیزیں آتی ہیں کہ دل چاہتا ہے سب کی مراد پوری کر دوں۔ چاچا بھی کہہ رہا تھا کہ اور کچھ نہ سہی، ان کو اولاد تو دے ہی سکتے ہیں ہم۔ جن کے شوہر سالے۔۔۔"

میں نے غصے سے کہا۔ "نہ مجھے بھوک ہے اور نہ ہی اس بدمعاشی کے دھندے میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ تو جا۔"

"ابے یار قوالی ہوگی اور تر مال بھی ملے گا کھانے کو۔ تیرا دل بہل جائے گا۔ کچھ مت کر تو بیٹھ کے تماشا دیکھ۔۔۔ گھر جا کے کیا کرے گا۔ ماسی پھر خوب سنائے گی اسے بھی اور تجھے بھی۔ وہ لحاظ کرنے والی نہیں ہے پھر تو لڑ پڑے گا اس سے۔ رات رات بھر خون جلاتا رہے گا اپنا۔ چل آجا۔"

اس نے مجھے ساتھ کھینچ لیا اور ہم ایک رکشے میں بیٹھ گئے۔ باغبانپورہ اور شالامار باغ گزر گئے تو سڑک پر شور و غل کم ہو گیا اور اندھیرا بڑھ گیا۔ یہاں سڑک پر صرف آتی جاتی گاڑیوں کی لائٹ تھی۔ داروغہ والا اور ٹکسال سے آگے آبادی کا علاقہ بھی ختم ہو گیا۔ یہ جگہ ابھی آباد ہو رہی تھی جتنے مکان بن چکے تھے یا بن رہے تھے اس سے زیادہ زمین پر خالی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پلاٹ نظر آ رہے تھے۔

ایک جگہ رئیس نے رکشا روک لیا۔ ہم بائیں ہاتھ والی چھوٹی سی نیم پختہ سڑک پر چلنے لگے۔ میں نے دور ہی سے پیر صاحب کی خانقاہ دیکھ لی۔ قریب جا کے مجھے رونق بھی نظر آئی اور میرے کانوں نے اللہ ہُو کی آواز بھی سنی۔ وہ کوئی کچا سا مکان تھا جس پر سبز جھنڈا لگایا گیا تھا۔ اندر باہر دو سو واٹ کے بلبوں سے رات میں دن کا سماں تھا اور ساٹھ ستر افراد کھلی جگہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے یا جھوم رہے تھے اور اللہ ہُو کا ورد کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "لوگ تو زیادہ نہیں ہیں۔"

رئیس نے کہا "یار نیا نیا بزنس ہے ابھی۔ جمتے جمتے جمے گا اور ابھی تو شو شروع ہوا ہے۔ آ رہے ہیں بے وقوف۔"

"بے وقوف مت کہہ انہیں۔ سب مجبور اور پریشان حال لوگ ہیں۔ سہارے تلاش کرتے ہیں۔"

"ابے گویا خدا کا سہارا کافی نہیں ہے؟ لینے اور دینے والا تو وہی ہے سب کو۔ وہ سب کی دعا سنتا ہے یا کہتا ہے کہ فلاں سے دعا کراؤ تو میں سنوں گا اور تمہارا کام ہو جائے گا؟ یہ تو سالے سرکاری افسروں والی بات ہے جو سفارش سے مانتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "سفارش بھی تو مجبور لوگ ہی کراتے ہیں۔"

میں چاچا چنگ باز کو ایک پیر کے روپ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور اس کے ڈرامے میں ایک کردار بھی ادا کر چکا تھا۔ یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اب اس نے پیری فقیری کو منافع بخش پیشے کے طور پر اپنا لیا تھا۔ اس کے علاوہ چنڈال چوکڑی کے دوسرے معزز ممبر بھی شغل میں مصروف تھے اور انتظامیہ کا کردار ادا کر رہے تھے۔

چاچا چنگ باز ایک مختصر سی اسٹیج جیسی جگہ پر آلتی پالتی مارے اور ہاتھ باندھے سر جھکائے بیٹھا تھا اور آنکھیں بند کیے جھوم رہا تھا۔ جانی جن اس کے بالکل پیچھے بت بنا کھڑا تھا اور جھلمل کرتے کالے کرتے اور لاچے میں سچ مچ کالا دیو نظر آتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ ہی تھا مگر مجھے وہ کچھ زیادہ ہی لمبا لگا۔ رئیس نے بعد میں بتایا کہ وہ تخت کے پیچھے چھ انچ اونچی جگہ پر کھڑا ہوا تھا اور اس کے بالکل پیچھے قنات تھی چنانچہ وہاں کسی کے جانے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے پنکھے تھے جن پر سبز کپڑا تھا اور کناروں پر گوٹا۔ البتہ وہ یوں جھل رہا تھا کہ بیک وقت دایاں ہاتھ بائیں طرف جاتا تھا تو بایاں ہاتھ دائیں طرف حرکت کرتا تھا اور یہ محنت طلب اور مشکل کام وہ مشینی انداز میں کسی روبوٹ کی طرح سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر اللہ ہو کا ورد کرنے والے خاموش ہو گئے۔ بولی اور جیرا بلیڈ سبز کرتے لاچے میں بہت ایکٹیو تھے۔ وہ آنے والوں کو سمجھاتے کہ انہیں پیر صاحب کے حضور اپنی استدعا کیسے پیش کرنی ہوگی۔ جیسے کچہری کے باہر منشی اور ڈی سی آفس کے پاس عرضی نویس یا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ آفس میں فارم بھرنے والے بیٹھے نظر آتے ہیں ایسے ہی شانو ایک چوکی پر مرادیں لکھ رہا تھا۔ اس کا لباس بھی سبز تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے آنکھ ماری اور بولا۔ "حاضری چاہیے۔۔؟"

میں نے کہا۔ "حاضری کیسے ہوتی ہے۔"

شانو بولا۔ "دیکھتا رہ۔ ابھی آجائے گا کوئی مرغا۔ ابے ہٹ ایک مرغی آرہی ہے۔"

میں دور ہٹ گیا۔ جسے شانو نے مرغی کہا تھا' وہ ایک مفلوک الحال اور بیمار نظر آنے والی عورت تھی جس کے شباب کو محرومیوں کے عذاب کا گھن لگ گیا تھا۔ اس نے شانو سے کچھ کہا۔ شانو نے اپنے قریب رکھی ہوئی دیسی چینی کی سفید پلیٹ اٹھائی اور ایک قلم سے کچھ لکھنے لگا۔

"مدینے کا نورانی قلم ہے مائی۔ آب زم زم سے لکھتا ہے۔" شانو نے کہا۔ "دیکھ اس کی کرامت اپنی آنکھوں سے۔"

وہ قلم کو پانی میں ڈبوتا تھا۔ پانی شیشے کی شفاف پیالی میں تھا مگر یہ شانو کے ایکشن کا کمال تھا کہ قلم پانی کو چھوتا تک نہیں تھا۔ صرف دیکھنے والی کی آنکھ یہ دیکھتی تھی کہ اس نے قلم پانی میں ڈبو کے لکھنا شروع کیا تو سفید چینی پر سبز رنگ کی تحریر نظر آنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سبز مارکر سے لکھ رہا ہے مگر مارکر کو بڑی صفائی سے۔۔سوکھی لکڑی کی شاخ جیسا بنا دیا گیا ہے۔ عورت کا اس نورانی قلم سے نفسیاتی طور پر مرعوب ہو جانا فطری بات تھی۔ "حاضری کے وقت پلیٹ سیدھے ہاتھ میں رکھ کر پیش کرنا۔" شانو نے عورت کو تاکید کی۔

عورت اندر چلی گئی تو میں نے پوچھا۔ "کیا لکھا تھا تو نے پلیٹ پر؟"

"وہی جو عورت چاہتی تھی۔" شانو ہنسنے لگا۔

"پیر صاحب کو کیسے پتا چلے گا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔"

شانو نے رازداری سے کہا۔ "عورت کی سب سے پہلی خواہش تو ہوتی ہے اولاد کی۔ اولاد میں بھی اسے لڑکا چاہیے۔ دوسرا مسئلہ ہوتا ہے کسی سوکن کے آنے کا۔ شوہر کسی اور

کے چکر میں پڑ جائے تو اسے لگتا ہے کہ سب کچھ لٹ گیا۔ وہ چاہتی ہے کہ شوہر واپس مل جائے۔ تیسرا مسئلہ سسرال کا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ ساس کا اور چوتھا بیماری کا۔ اب عورت پلیٹ الٹی رکھے اور سیدھے ہاتھ سے پیش کرے تو مسئلہ اولاد کا یا شوہر کا۔۔ چاچا سمجھ جاتا ہے۔ پلیٹ کا ایک کنارہ ذرا سا جھڑا ہوا ہو تو اسے اولاد کے لئے تعویذ چاہیے۔ کنارے بالکل ٹھیک ہوں تو بات شوہر کے التفات کی۔۔ چاچا اولاد کے لئے ایک ہی بات کہتا ہے۔ جا تیرے دل کی مراد پوری ہوئی۔ بیٹا مل جائے گا تجھے۔ اب جس کے لڑکیاں ہی ہوں وہ بھی خوش اور جس کے کچھ بھی نہ ہو وہ بھی مطمئن۔"

میں نے دلچسپی سے کہا۔ "اور پلیٹ کے کنارے ٹھیک ہوں پھر۔"

"پھر وہ عورت کو خوش خبری سنا دیتے ہیں کہ شوہر واپس آجائے گا۔ اگر وہ پلیٹ الٹے ہاتھ پر رکھ کے سامنے جائے تو پھر دو مسئلے۔ پیر صاحب اس کو۔۔۔ سسرال والوں سے نجات کی خوشخبری سنا دیتے ہیں یا پھر بیماری سے شفا کی۔"

"مرد کیا مانگتے ہیں۔۔؟"

وہ بولا۔ "سب سے پہلے روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اولاد کا پھر بیماری کا یا وہی کسی سے شادی کا۔ جوان لڑکے ہوں تو پہلا مسئلہ روزگار کا' پھر امتحان کا یا محبت کا۔ ہر پلیٹ دیکھنے میں ایک جیسی ہی لگتی ہے اور سب دیسی ہیں مگر نام الگ الگ ہیں۔ رائل چائنا۔ ریگل چائنا' کسی کا نام سرخ رنگ سے لکھا ہوتا ہے کسی کا نیلے سے۔ الٹی پلیٹ دیکھ کے پیر صاحب پہلے تو اس پر غور کرتے ہیں کہ سائل نے پلیٹ کس ہاتھ سے پیش کی ہے پھر پلیٹ کون سی ہے اور کیسی ہے۔ جب وہ تحریر پڑھے بغیر مسئلہ بتا دیتا ہے اور اس کا حل بھی تو سب اسے پیر صاحب کی کرامت سمجھتے ہیں کہ ان کی نظر نے الٹی رکھی ہوئی پلیٹ کے نیچے لکھا ہوا پڑھ لیا۔ باقی سبحان اللہ سبحان اللہ کرنے لگتے ہیں۔"

"جسے معلوم نہ ہو اس کے لئے تو ہے حیرانی کی بات۔"

"ابھی تو بزنس شروع کیا ہے۔ ایسے ایسے طریقے ہیں کرامات دکھانے کے جن کو عام آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کچھ ہاتھ کی صفائی ہے کچھ سائنس کے کھیل۔ کچھ عرصے بعد دیکھنا لوگ خود ہی کرامات کو معجزے مشہور کر دیں گے۔ بڑا مال ہے اس دھندے میں یار۔"

میں نے کہا۔ "پکڑے گئے جس دن بیٹا اس دن سارا کھایا پیا نکل جائے گا۔"

"یار ہم کوئی فراڈ کر رہے ہیں۔۔؟"

"اور کیا ہے یہ۔"

"کسی کے لئے دعا کرنا یا کسی کو کامیابی کے لئے وظیفہ بتانا یا کوئی عمل اور تعویذ دینا' ہے کسی میں ہمت کہ اسے فراڈ کہے؟ مراد بر آئے تو کمال ہے پیر صاحب کا۔ مراد پوری نہ ہو تو قصوروار حاضری دینے والا۔ تو دیکھ چکا ہے ایک بار پھر دیکھ اندر بیٹھ کے۔" شانو بولا۔ "ایک مرغا آرہا ہے۔"

میں اندر جا کے عقیدت مندوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہاں بھی وہی ڈراما چل رہا تھا جو سراج دھولی کی بیٹھک میں چل رہا تھا۔ چاچا نے یہاں اپنا نام بدل دیا تھا۔ اب وہ پیر انجن شاہ تھا۔ یہ نام مجھے بھی عجیب لگا مگر بعد میں چاچا نے مجھے بتایا کہ چونکانے والے نام فوراً اپنی پبلسٹی کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

میں دائیں طرف والے کونے میں سب سے آگے بیٹھ گیا۔ میرے سامنے ہی بولی نے اس عورت کو حاضری کے لئے پیش کیا۔ چاچا کے ایک ہاتھ میں لمبی تسبیح تھی اور وہ آنکھیں بند کیے جھوم رہا تھا۔ اس نے یقیناً آنکھیں تھوڑی سی کھول کے پلیٹ دیکھ لی ہوگی۔ عورت نے سیدھے ہاتھ سے پلیٹ الٹی پیش کی اور پیر صاحب کے سامنے الٹی رکھ کے خاموش بیٹھ گئی۔

میں بھی خاموشی سے دیکھتا رہا۔ چاچا نے نہ عورت پر نظر ڈالی تھی اور پلیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بار بار سر کو جھٹک رہا تھا اور ایک ہاتھ سے نہ جانے کیا اشارے کر رہا تھا۔ مؤدب کھڑے ہوئے بولی نے ایک شخص سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا مگر اس کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ احمقانہ حد تک مرعوب اور متاثر نظر آنے لگے۔ انہوں نے عقیدت سے سر ہلاتے ہوئے ساتھ والے کو بتایا۔ چند منٹ میں مجھے پتا چل گیا کہ پیر صاحب کی خدمت میں ایک جن حاضر ہوا ہے اور پیر صاحب سخت برہم تھے کہ اس نے آدھی رات سے پہلے آنے کی گستاخی کیوں کی۔ جنات کا وقت آدھی رات کے بعد تہجد تک تھا۔ یہ وقت خلق خدا کا تھا چنانچہ وہ اس کی بات سننے پر آمادہ نہ تھے اور اسے کہہ رہے تھے وہ دفع ہو جائے مگر جن خوشامد کر رہا تھا کہ اس کی عرضی سن لی جائے۔

جن نہ کسی نے دیکھا نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز بھی صرف پیر صاحب سن رہے تھے۔ باقی سب دم بخود بیٹھے تھے۔ اچانک چاچا نے گرج کے کہا۔ "شامت کے انجن کی سواری چھوڑ دے مردود۔ اس گھر کو چھوڑ دے۔ وہاں ہمارے مرشد کا آستانہ تھا۔"

جن نے غالباً پھر کچھ کہا کیونکہ پیر صاحب سر ہلا رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے فرمایا۔ "تیرا انجن الٹ جائے گا۔ جل کے خاک ہو جائے گا۔" پھر اس نے پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ کو جھٹکا تو چھینٹے فضا میں بکھر گئے۔ لوگوں نے ایک چیخ سنی جو انسانی بالکل نہیں لگتی تھی اور ہوا میں چنگاریاں سی دیکھیں جو فوراً بجھ گئیں۔

بوبی نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جلا کے راکھ کر دیا پیر صاحب نے گستاخ کو۔"

پیر صاحب نے اس پیالے میں پھر ہاتھ ڈالا اور پانی کے چھینٹے لوگوں کی طرف پھینکے۔ ایک چھینٹا مجھ پر بھی گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پگھلی ہوئی برف کا پانی تھا۔ لوگ فرطِ عقیدت سے چیخنے لگے اور سبحان تیری قدرت کا ورد کرنے لگے۔ اس برف جیسے ٹھنڈے پانی نے ان کی نظروں کے سامنے آگ برسا کے ایک گستاخ جن کو جلا دیا تھا۔ ہوا میں چنگاریاں چمکنا تو کسی کیمیکل کا کھیل ہو سکتا تھا جو ہوا میں آگ پکڑ لیتا ہو مگر اس پانی جیسے محلول کا لوگوں پر برفیلی پھوار کی طرح گرنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شیشے کے اس بڑے سے پیالے کو جو پیر صاحب کے سامنے رکھا ہوا تھا شیشے کی پتلی سی دیوار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ دیوار شفاف تھی چنانچہ پانی میں نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے آدھے حصے کے پانی میں ٹھنڈک کا اثر تھا۔ یہ تماشا سڑک پر ہوتا تو لوگ اسے مداری کا کھیل کہتے مگر ایک پیر کے لئے یہ کرامت بن گیا۔ متاثر ہو جانے والے سب لوگ بے وقوف یا جاہل نہیں ہوتے۔ ان میں پڑھے لکھے اور ذہین لوگ بھی ہوتے ہیں مگر مداری کے کرتب کو سمجھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جب وہ عقیدت اور احترام کی عینک لگا کے دیکھتے ہیں تو ان کی عقل پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ بہ آسانی یقین کر لیتے ہیں کہ خلافِ فطرت واقعہ دھوکا نہیں روحانی طاقت کا مظہر ہے۔

پیر صاحب اچانک عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تو کیوں بیٹھی ہے اب تک۔ جا۔ خوش قسمتی کے انجن کو ہم نے آگے کر دیا ہے۔ انجن چل پڑا ہے۔ تیرے حالات کی گاڑی ٹھیک جا رہی ہے۔ اگلے اسٹیشن پر تجھے بیٹا مل جائے گا۔"

عورت کا چہرہ چمک اٹھا۔ "آپ نے کیسے جان لیا۔"

پیر صاحب نے کڑک کے کہا۔ "ہم سے بولتی ہے ایسی بات؟ ہم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ دیکھ لے پلیٹ کے اپنی خواہش کو۔ کیا لکھا ہے؟"

عورت نے پلیٹ کو پلٹ کے دیکھا۔ پلیٹ پر وہی لکھا تھا جو اس نے لکھوایا تھا۔ بوبی نے فوراً پلیٹ اس سے لے لی اور حاضرین کی طرف رخ کر دیا۔ پڑھنے والوں نے با آوازِ بلند پڑھا۔ پیچھے سے جانی جن نے نعرہ لگایا۔ "پیر انجن والا۔" بولے کہ ہاں والا۔"

عورت نے سخت جذباتی ہو کے اپنا سونے کا کنگن اتارا اور آگے بڑھایا۔ پیر صاحب نے غصے میں آتش فشاں ہو کے کہا۔ "ہٹا لے۔ ہٹا لے اس پیتل کو۔ ہماری نظروں کے سامنے سے۔۔۔؟"

"پیر صاحب۔ یہ سونے کا ہے۔۔۔" عورت کا رنگ اڑ گیا۔

"سب سونا پیتل ہے۔ سب پیتل سونا ہے۔" وہ آنکھیں بند کر کے تسبیح کے دانے گھمانے لگا۔ "انجن سونے سے نہیں۔ آگ سے چلتا ہے۔ اندر کی آگ سے۔ روح میں انجن جیسی طاقت چاہیے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ایک ضرورت مند ابھی ابھی آیا ہے۔ اس کی ماں مر جائے گی اگر اس کا آپریشن نہ ہوا۔ اسے ضرورت ہے اس کی۔ کون آیا ہے۔۔۔؟"

بوبی کے اشارے پر مجھے کھڑا ہونا پڑا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "میں آیا ہوں عالیجاہ۔ میری ماں اسپتال میں پڑی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں دوائیاں لاؤ۔ دوا بہت مہنگی ہے۔ دوا کے بغیر آپریشن نہیں ہو سکتا۔"

عورت نے کنگن میری طرف بڑھا دیا۔ "لے بھائی۔ پیر صاحب کا حکم ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہے میرے پاس۔"

"ایک اور شخص کو بھیجا ہے رب نے۔ کھڑا ہو جا۔" پیر صاحب نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔

سراج دھوبی بڑی شان سے کھڑا ہوا۔ "آپ کی دعا سے میری ماں بچ گئی ورنہ ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا تھا۔ خواب میں بشارت ہوئی کہ پیر انجن والا کے پاس حاضری دے۔ ایک ضرورت مند تیرے جیسا پہنچا ہے۔ یہ معتبر نذرانہ لایا تھا میں۔ ایک لاکھ ہیں۔ یہ لو۔" اس نے ایک بنڈل میری طرف بڑھا دیا۔

پیر صاحب مسکرائے۔ "تو گنا ہوں کے انجن پر سوار تھا۔ ہم نے ثواب کا انجن بنا دیا ہے اسے۔ ماں کے قدموں کے نیچے والی جنت کی گاڑی کا انجن۔"

میں حیران تھا کہ لوگوں کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ جو مداری والے شعبدے چاچا پتنگ باز دکھا رہا تھا' وہ انہیں پیر صاحب کی روحانی کرامات سے منسوب کر رہے تھے۔ کوئی

حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے والا نہیں تھا۔ سب عقیدت کے جذبات کی پٹی باندھے بیٹھے تھے اور چنڈال چوکڑی کی دھوکے بازی کا ڈراما بہت کامیاب جا رہا تھا۔

میں نے بھی مجبوراً پیر صاحب کے لئے شکر گزاری کے جذبات کا اظہار بڑی دکھ بھری آواز میں کیا۔ ان کے ہاتھ چومے اور پھر اپنے محسن کے۔ اسی وقت حاضری کا وقت ختم ہو گیا۔ پیر صاحب شاہانہ انداز میں اٹھے۔ ایک ہاتھ اٹھا کے اس نے مجمع سے کہا۔ "یا رب سب کا انجن چلتا رہے۔" اور پھر اندر کی طرف جانے والے راستے سے غائب ہو گئے۔

سراج دھوبی نے کڑکراتے کلف لگے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ حلیے سے خاندانی رئیس نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے قریب آ کے سرگوشی کی۔ "یار پیسے سنبھال کے رکھنا۔ سالے جیب کترے بھی ہیں یہاں۔ دو تجھے بوبی نے دکھائے تھے۔"

میں نے کہا۔ "وہ بھی تو پہچانتے ہوں گے بوبی کو اور جیرے بلیڈ کو۔ آخر تمہاری ہی برادری کے ہیں۔"

"ہم معزز لوگ ہیں یار۔" سراج نے کہا۔ "ایسے گھٹیا کام نہیں کرتے۔ آؤ اندر چل کے کھانا کھاتے ہیں۔ باہر بھی لنگر شروع ہونے والا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا انتظام کس نے کیا ہے۔"

"خانقاہ کی طرف سے ہے۔ یار کچھ خرچہ تو کرنا ہی پڑتا ہے شروع میں۔ ویسے پہلی جمعرات کے حساب سے اچھی بوہنی ہوئی ہے آج۔"

پچھلے کمرے میں چاچا پتنگ باز تک پہنچے۔ نیچے ہمیں گھوم کے جانا پڑا۔ پیر صاحب کے حجرۂ خاص تک عام آدمی کی رسائی نہیں تھی۔ جانی جن نے "ڈور آئی" سے جھانک کے دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ اندر کا نقشہ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا سراج دھوبی کی بیٹھک میں نظر آتا تھا۔ چاچا پتنگ باز اور رئیس آمدنی کا حساب کر رہے تھے۔ دن بھر کی کمائی ان کے درمیان ڈھیر کی صورت میں رکھی ہوئی تھی۔

"آ بھئی شہزادے۔" چاچا نے خوشدلی سے کہا۔ "کیسا لگا تجھے یہ ٹھکانا۔"

میں نے کہا۔ "سچی بات یہ ہے کہ اچھا نہیں لگا۔"

رئیس نے کہا۔ "ابھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے تجھے۔ اب کیا خرابی ہے آخر یہاں۔؟"

میں نے ایک لاکھ اور کنگن اس کی طرف پھینک دیئے۔ "دھوکے اور فراڈ میں اچھائی کون سی ہوتی ہے لیکن اس دھندے میں جذباتی استحصال بھی ہے مجبور اور دکھی لوگوں کا۔"

چاچا نے کہا۔ جو مجبور نہ ہو اور دکھی نہ ہو' اس کا استحصال کون کر سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "چاچا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہاں دل شکستہ اور مایوس لوگ آتے ہیں۔ پریشان حال' بیمار اور غریب آتے ہیں۔ انہیں بے وقوف بنانا۔ جھوٹی امید' دھوکے سے ٹھگنا۔ پُرفریب آسرے دینا اور وہ بھی کشف اور کرامت کے نام پر۔ روحانی مرتبے کا ڈراما کر کے۔"

چاچا نے سر کھجایا۔ "بیٹا ایمانداری کا دنیا میں کون سا کام ہے۔ لوگ تو نماز' روزہ' ایمانداری سے نہیں کرتے حج اور زکوٰۃ میں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری بات اور ہے۔ تم ظاہر کرتے ہو کہ خدا کے مقرب بندے ہو۔ عبادات۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کے باعث تمہارا درجہ بلند ہے۔ تم خدا کے نام پر خلقِ خدا کو بے وقوف بنا رہے ہو۔"

رئیس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ابے پڑھ لکھ گھاس کھودی تو نے۔ نظر نہیں آتا تجھے دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں خود جاہل ہوں ابھی۔ میٹرک پاس بھی نہیں مگر میں سوچ سکتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ چوری کرنا' ڈاکے ڈالنا یا جیب کاٹنا بھی جرم ہیں مگر بہادری کے کام ہیں۔ اس میں خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ پکڑے جانے کا ڈر رہتا ہے۔ جو پکڑا جاتا ہے وہ تھانے میں مار بھی کھاتا ہے اور جیل بھی جاتا ہے۔ اور برائی کرتا ہے تو برا کہلاتا بھی ہے مگر تم تو برائی کر کے اچھے بن رہے ہو۔ شرافت اور نیکی کی نقاب اوڑھ کے مجبور لوگوں کے جذبات سے کھیل رہے ہو اور ان کے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہو۔ یہ بزدلی ہے۔"

چاچا کا موڈ خراب ہو گیا۔ "دیکھ یہ لیکچر بازی مت کر۔ ہمارے سامنے تو کل کا بچہ ہے۔ اتنے ہی برے ہیں ہم اگر تو یہاں آیا کیوں ہے؟"

میں نے کہا۔ "اب نہیں آؤں گا۔۔۔ رئیس لے آیا تھا مجھے زبردستی۔ میں جا رہا ہوں۔"

رئیس میرے پیچھے لپکا۔ "ابے بات سن۔۔۔ کھانا تو کھا لے۔"

میں نے ہاتھ لہرایا اور باہر نکل آیا۔ "بھوک نہیں ہے مجھے۔"

وہ میرے ساتھ باہر آ گیا۔ "دیکھ یار۔۔۔ قوالی بھی شروع ہونے والی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لعنت قوالی اور لنگر کرانے والوں پر۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا بس چلے تو ابھی جا کے سب بتا دوں پولیس کو۔"

رئیس ہنسنے لگا۔ "اس سے کیا ہوگا؟ سالے تو خود مشکل میں پڑے گا۔ تو نے دیکھا نہیں سراج کی بیٹھک میں۔ علاقہ انچارج اور مجسٹریٹ سب اپنے یار ہیں۔ ان کی مرضی نہ ہو تو کوئی دھندا چل سکتا ہے۔ محنت اور حق حلال کی کمائی نہیں کر سکتا کوئی اگر وہ اجازت نہ دیں۔ ریڑھی اور خوانچے والے بھی روز کے روز یا ہفتے وار بھتا دیتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی جوئے اور سٹے کی طرح ناجائز کمائی کا اور لوگوں کو لوٹنے کا ایک طریقہ ہے۔ ویسا ہی اڈا ہے یہ بھی۔"

"قسم اللہ کی۔ بڑے بڑے افسروں کی۔ وزیروں اور جرنیلوں کی گھر والیاں جاتی ہیں ایسے پیروں فقیروں کے پاس۔ یہاں تو صدر اور وزیراعظم تک ان کے مرید ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یار رئیس میں سب کو دھوکے باز نہیں کہہ رہا ہوں مگر چاچا چنگ باز جیسے پیر ہو جائیں تو پھر جانتے بوجھتے ان کا ساتھ دینا..."

رئیس میرا ہاتھ پکڑ کر ایک اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ "تو غصے میں ہے اس وقت اور غصہ ہے شادو کا۔ چل جو کہنا ہے مجھے کہہ۔ میں بولوں گا تو مرچیں لگ جائیں گی تجھے۔"

"شادو پر اب کیسا غصہ۔" میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اور کیا ملے گا اب غصہ کر کے بھی۔ بس میں یہاں نہیں رہ سکتا اور یہ کام نہیں کر سکتا۔"

رئیس نے کہا۔ "ویسے بڑے نیک کام کیے ہیں تو نے سالے۔ اب بھول گیا وہ دن جب ہم مل کے یتیم خانے کے چندے میں غبن کرتے تھے۔ یہ جو تھوڑی بہت دولت اکٹھی کی ہے تو نے' یہ کیا حق حلال کی کمائی تھی؟ سب چکربازی کا پیسہ ہے۔ تو خود جانتا ہے۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں اس کی بیوی کو بے وقوف بنا کے عیش کرتا رہا تو۔ شاہ جی کا خانہ خراب کیا تو نے اور اب بھی تو کیا سوچ رہا ہے۔ اس سالے وسیم کی ایسی تیسی کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے گرم ہو کے کہا۔ "کیا اسے سزا نہیں ملنی چاہیے۔ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میری نظروں میں آج بھی ناصر کی لاش گھوم رہی ہے۔ کیسی بیدردی سے مارا تھا وسیم نے اسے اور میرے پاس ہیں سارے ثبوت کہ اس نے کس طرح ناصر کی ماں کو قتل کیا تھا اور کیسے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔"

"یہ کام تیرا نہیں پولیس کا ہے۔ ثبوت ہے تو پیش کرو عدالت میں۔ پھانسی چڑھوا دے اسے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش اس ملک میں قانون صرف کتابوں میں نہ ہوتا۔ کہیں نظر بھی آتا' یہی تو مشکل ہے کہ یہاں قانون سے کھیلنے والے عیش کر رہے ہیں اور قانون کے پابند شریف شہری عذاب میں ہیں اس ملک میں کسی جعلی پیر کا مرید بن کے برائی کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔"

رئیس نے فخر سے کہا۔ "ہاں... جب تو وزیراعظم بن جائے تو ختم کر دینا ساری برائی کو۔ چوروں' بدمعاشوں کا خاتمہ کر دینا۔ قانون نافذ کر دینا' پھر شریف لوگ سکھ سے رہیں۔"

"کیا ایسا ہونا ممکن ہے...؟"

"ابے چھوڑ' تجھ سے پہلے کتنے صدر اور وزیراعظم گزر گئے یا گزار دیے گئے۔ کیا وہ بے وقوف تھے جاہل تھے؟ انہیں پتا نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے پاکستان میں' کیا ان کے پاس اختیار نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں... وہ چاہتے تو اس نظام کو ٹھیک بھی کر سکتے تھے مگر وہ خود ٹھیک نہیں تھے کیونکہ ان کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ جو ٹھیک تھے ان کو چلتا کر دیا ان سالے اندر کے دشمنوں نے۔ بھارت' اسرائیل بال بیکا نہیں کر سکتے ہمارا اگر ہم خود جو ہیں اپنی جڑیں کھودنے والے۔"

اچانک رئیس نے کہا۔ "ابے تو نے کچھ دیکھا... ابھی وسیم گزرا ہے یہاں سے گاڑی میں... نیلی تھی۔"

میں نے کہا۔ "دھوکا ہوا ہوگا تجھے۔ اس کا یہاں کیا کام؟"

"کیا پتا وہ پیر صاحب کے پاس آیا ہو حاضری کے لئے... یا رہتا ہو یہیں کہیں... چل دیکھتے ہیں۔"

"اگر تو نے دیکھ لیا اسے... تو وسیم نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔ ہیڈلائٹ کی روشنی میں۔" میں نے کہا۔

ہم واپس مڑے اور ہر طرف گھوم پھر کے دیکھا۔ لنگر ختم ہو چکا تھا اور لوگ اب ڈکاریں مارتے خلال کرتے قوالوں کو دیکھ رہے تھے جو اپنا طبلہ' ہارمونیم سیٹ کر رہے تھے۔ قوال پارٹی کے آٹھ دس ارکان میں چار ہم شکل اور بھائی لگتے تھے۔ وہ سب ایک جیسی کالی ٹوپیاں' سنہری کام والی مخمل کی لال کوٹیاں اور طوطے کے رنگ کے سبز ریشمی کرتے پہنے آئے تھے۔ چیف قوال بھاری بدن اور لمبے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا جو مسلسل پان چبا رہا تھا اور بڑے اکھڑ لہجے میں سب کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے پندرہ سولہ سال کے ایک لڑکے کو ایک تھپڑ بھی رسید کیا جو اونگھنے لگا تھا۔

"وہ تو کہیں بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"قسم اللہ کی میں نے اسے دیکھا تھا۔" رئیس بولا۔ "کہاں گیا سالا؟"

میں نے کہا۔ "یار کیا پتا وہ ادھر کہیں رہتا ہو۔ یہاں مکان بنوا لیا ہو۔ یہ نئی بستی ہے۔ زمین سستی ہوگی یہاں۔"

"یار یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اتنی دور آ کے اس نے کرائے پر مکان لے لیا ہو۔ تاکہ اسے کوئی تلاش نہ کر سکے آسانی سے۔"

"ہمارے سوا کون تلاش کر رہا ہے اسے؟" میں نے کہا۔

"اس کا سالا... انسپکٹر بشیر۔ وہ کب تک اپنی بہن کو گھر بٹھا کے رکھے گا آخر۔"

"تیری بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "بڑا اچھا ہوا کہ تو نے دیکھ لیا اسے ورنہ ہم جاتے پرانے پتے پر۔"

"آدمی کے برے دن آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تقدیر ہی ساتھ نہیں دیتی اور تدبیر الٹی ہو جاتی ہے۔ ہم تلاش کریں گے اسے۔"

"یار جب تو نے اسے دیکھا اور پہچان لیا' تو اس نے بھی ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھے تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔"

"ایک بار نہیں' سو بار دیکھے۔" وہ بولا۔

"اس وقت قوالی شروع ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "یار میں چلتا ہوں مجھے کوئی شوق نہیں قوالی سننے کا' ماسی ہیر بھی پریشان ہوگی اگر میں گھر نہ گیا۔"

واپسی پر میرا ذہن پھر شادو کی طرف ہو گیا۔ اس وقت وہ کیا کر رہی ہوگی؟ وہ ہاشمی صاحب کی لاش اسپتال سے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ وہاں وہ کسی ہوٹل میں ٹھہری ہوگی۔ اسپتال والے لاش کو رکھ دیں گے کسی کولڈ اسٹوریج میں۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں اکیلی بیٹھی واپسی کے انتظامات کر رہی ہوگی۔ گل نواز خان نے کہا تھا کہ وہ میت لے کے لندن جا رہا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا واپسی کا سفر شادو کے لئے۔ وہ مسز ہاشمی بن کے نئی نویلی دلہن کے روپ میں ولایت جانے والے جہاز پر سوار ہوئی ہوگی تو اس کے جذبات کی سرخوشی میں شاید کوئی چٹختا دانہ بھی ہوگا مگر اس نے ناصر کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا ہوگا۔ کچھ دن روئے گا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن سب خراب ہو گیا تھا۔ رونا اس کے نصیب میں تھا' اس کی واپسی ایک تابوت کے ساتھ ہوگی۔ نئی نویلی دلہن کے ارمان ابھی نکلے بھی نہ تھے کہ سہاگ اجڑ گیا۔ لوٹ کے اسے پھر اپنی اس پرانی زندگی کی طرف آنا پڑا جس میں اب صرف دولت مندی کا احساس تھا۔ خوش کوئی نہیں تھا۔ مگر خوشی کا کیا ہے۔ جب وہ میرے ساتھ آئی تھی تب بھی خوش تھی۔ ہاشمی صاحب سے شادی کر کے بھی وہ خوش ہوگی۔ اس کے مرنے سے بھی شاید خوش ہو۔ خوشی اس کی غلام ہے۔ ناصر عظیم اور ہاشمی صاحب جیسے الو کے پٹھے اس کو خوشی دینے والے بہت ہیں۔"

میں واپس گھر پہنچا تو حسب توقع ہیر بڑی پریشانی سے میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میری صورت دیکھ کے وہ زیادہ پریشان ہو گئی۔ "ہائے بتاتا نہیں کیا ہوا ہے؟"

میں نے چلا کے کہا۔ "ایک بار کہہ دیا نا کہ کچھ نہیں ہوا۔ اب خدا کے لئے جاؤ۔ میری جان چھوڑو۔ اکیلا چھوڑ دو مجھے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا۔ "برخوردار... تمہاری ذہنی کیفیت تمہارے الفاظ کی نفی کرتی ہے۔"

ہیر نے دکھی لہجے میں کہا۔ "اپنی ماں سے بھی چھپاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ماسی... اس حرامزادی فاحشہ شادو کا بوڑھا خصم مر گیا ہے۔ ہارٹ فیل ہو گیا ہے مردود کا۔ وہ آ رہی ہے اس کی لاش یہاں گاڑنے۔ جاؤں گا میں اس پر مٹی ڈالنے۔"

کسی نے دروازہ بجایا اور پھر سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ ڈاکٹر رانجھا دروازے تک گیا اور لوٹ آیا۔ "بھئی تار ہے تمہارے نام... جاؤ خود ہی وصول کر لو۔"

میں نے دستخط کر کے تار لے لیا۔ یہ تار لندن سے شادو نے بھیجا تھا۔

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

چڑیلوں کی ملکہ اور خونی راکھشس کی خونی ٹکر۔
ایک بہادر انسان جو دونوں کو قید کرنے کا گُر جانتا تھا۔
ایک شخص کی داستان جسے انسانی خون چاہیے ہوتا تھا۔
کیا راگا بن ملیان اپنے بلیدانی جسم کو بچا سکا؟

قیمت 200 روپے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماسی ہیر نے گھبرا کے کہا "پتر خیر ہے نا' کس کا تار ہے؟"

میں نے کہا "اسی شادو کا۔"

اس کی صورت پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ "دشتی نا ہو تو۔ ہمیں کیا ضرورت تھی اطلاع دینے کی۔ ہمارا کون سا سگا تھا وہ۔"

میں نے غصے سے کہا "میری طرف سے جہنم میں جائے وہ اور جہنم میں ہی ہوگا اس کا ٹھکانا۔ شادو بھی مر گئی تھی میرے لیے اسی دن۔"

"حکیم بقراط کا قول ہے کہ غصہ دماغی خلیوں کے لیے آگ ہے پھر تجھے اپنا خون جلانے کی کیا ضرورت ہے پتر جی۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔"

"تا کوئی مجھے بھی تو بتاؤ کہ ایسی کیا بات ہے تار میں۔ میں پڑھ نہیں سکتی اس لیے مجبور ہوں" ہیر نے چلا کے کہا۔

"اس نے ناصر کو لندن بلایا ہے" ڈاکٹر رانجھا نے کہا۔

"لندن بلایا ہے' کیوں؟ ادھر کوئی نہیں ملا اسے جنازہ اٹھانے والا۔ کھا گئی دو مہینے میں خصم کو" ماسی ہیر غصے میں بولنے لگی "میں تو کہتی ہوں رب نے بچا لیا میرے ناصر کو اس آدم خور سے۔"

میں نے تار کا مضمون پھر دیکھا۔ اس سے کچھ واضح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر تم لندن آنا چاہو تو اس کا انتظام ہو جائے گا۔ فوراً مجھے اس پتے پر جواب دو۔

یہ بڑی مبہم سی بات تھی۔ آخر میں لندن کیوں جانا چاہوں گا۔ اگر وہ چاہتی تھی کہ اس مشکل وقت میں لندن پہنچ کر میں اس کی مدد کروں تو یہ بات اسے صاف لکھنی چاہیے تھی۔ اس کا انتظام مجھے یہاں کرنا تھا۔ شادو بھلا لندن میں بیٹھ کے کیا کر سکتی تھی۔ مجھے اس کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت تھی اور شناختی کارڈ کے بعد پاسپورٹ بنوانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لندن جانے کے لیے ہوائی جہاز پر سیٹ حاصل کرنے کے لیے رقم کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ ہو سکتا تھا ویزا حاصل کرنے کا۔ شاید انتظام سے اس کی یہی مراد تھی۔ وہ وہاں کسی سے کہے گی کہ میں اکیلی ہوں اور کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانا چاہتی ہوں لیکن یہ بات بھی ناقابل فہم تھی۔ میت کو تابوت میں ڈال کے ہوائی جہاز سے روانہ کرنے میں اس کی مدد خود اسپتال والے کر سکتے تھے یا ہوائی کمپنی کے نمائندے۔ وہاں پاکستانی بھی کم نہ تھے اور ایسے موقع پر تو دشمن بھی کام آجاتے ہیں۔

میں نے تار کو پھر غور سے دیکھا تو بات میری سمجھ میں آگئی۔ تار پر ایک ہفتے پہلے کی تاریخ تھی۔ یہ ہمارے ڈاک اور تار کے محکمے کی کارکردگی کا کمال تھا کہ لندن سے چند منٹ میں پاکستان پہنچ جانے والا پیغام مجھ تک ایک ہفتے میں پہنچا تھا۔ یہ تار شادو نے ہاشمی صاحب کو ہارٹ اٹیک ہونے سے پہلے بھیجا تھا۔

انتظام کا مطلب میری سمجھ میں آنے لگا تو ذلت کا احساس میرے وجود میں غصے کی آگ بن کر پھیلنے لگا۔ شادو کے کہنے پر ہاشمی صاحب نے وہاں میرے لیے رہائش اور ملازمت کا کوئی انتظام کیا ہوگا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ پاکستان میں ادھر ادھر دھکے کھانے والے لاوارث نوجوان کو ملک سے باہر قسمت آزمانے کا موقع فراہم کرکے اس پر احسان کیا جائے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اور دبئی شارجہ اور سعودی عرب سے برطانیہ اور امریکا تک ہر جگہ جانے کے لیے پاکستان کے نوجوان اتنے بے تاب تھے کہ اس کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کر رہے تھے۔ وہ جعلی پاسپورٹ اور ویزوں کی مدد سے سرحدیں عبور کر رہے تھے جو پکڑے گئے تھے وہ جیلوں میں پڑے تھے۔ جو حکام کی نظروں سے بچ نکلے تھے وہ مفرور مجرم کی طرح روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بیرونِ ملک بھجوانے والے دھوکے باز ایجنٹ ان سے لاکھوں وصول کر رہے تھے۔ وطن چھوڑ کے جلاوطن ہو جانے والے نوجوان یہ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے سارے خزانے ان کے انتظار میں ہیں۔ ہر جگہ ہُن برس رہا ہے اور زندگی کے ہر خواب کی تعبیر دینے والے ریال' ڈالر یا پاؤنڈ وہ بوری بھر بھر لائیں گے تو آنے والی سات نسلوں کے دن پھر جائیں گے۔ یہ سراب تھا جس کی حقیقت کو سمجھے بغیر میرے وطن کے نوجوان آنکھیں بند کیے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے لیکن ان میں ناصر عظیم شامل نہیں تھا۔

"آخر کیا سمجھتی ہے وہ فاحشہ خود کو" میں نے غصے میں تار کو پھاڑ کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ "کیا میں محتاج ہوں کسی کا؟"

ہیر نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا "ہائے اللہ نہ کرے۔"

"میں اس کا احسان لے کر لندن جاؤں گا۔ وہاں دو دو ٹکے کے ذلیل کام کروں گا؟" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "ہوٹلوں میں برتن دھونے کے اور بیرا گیری کرنے کے۔"

"یہ لکھا ہے اس نے؟" ہیر آگ بگولا ہو گئی۔

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "بھئی لکھا تو نہیں ہے مگر مطلب ایسا ہی ہے کہ تم آجاؤ یہاں' آگے تمہاری قسمت۔ خود اسے تو وہاں رہنا نہیں تھا۔ اس نے بندوبست کرا دیا ہوگا کسی چھوٹی موٹی نوکری کا۔ اس کا شوہر اتنا بڑا وکیل تھا۔ وہاں بھی جان پہچان ہوگی اس کی۔"

میں نے کہا "وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میرے عزائم کیا ہیں۔ میں کچھ بننا چاہتا ہوں۔ اپنی محنت سے اور صلاحیت سے۔ مجھ میں ہمت ہے سب کچھ کرنے کی اور میں کسی کی محتاجی قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں اپنا پاکستان چھوڑ کے کہیں جانے کی۔ میری تقدیر اسی ملک سے وابستہ ہے اور مجھے یہاں کوئی کمی نہیں مواقع کی۔ ابھی میٹرک بھی نہیں کیا تھا میں نے۔ باہر کون پوچھے گا مجھے۔ میرے پاس کوئی غیر معمولی ہنر بھی نہیں۔ کیوں جاؤں میں ولایت محنت مزدوری اور معمولی حیثیت کے گھٹیا کام کرنے کے لیے۔ جو خود نہیں کر سکتے' وہ ہم کالے ایشیائی لوگوں سے کراتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں سو الگ۔ کالا کتا کہہ کے بولتے ہیں اور آج بھی غلاموں جیسا سلوک کرتے ہیں۔"

"سچ کہا تم نے پتر جی۔ جو سکھ اپنے چوبارے' وہ بلخ نہ بخارے" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "بے گھر اور بے وطن آدمی خود اپنی نظر میں ذلیل ہو جاتا ہے۔"

"وہ ہوئی نا ذلیل!" ہیر نے موقع سے فائدہ اٹھایا "ادھر اپنا گھر بساتی' سکھ چین سے رہتی۔ اس بڈھے کے ساتھ گئی تھی ولایت' بڑی شان سے۔ اب آرہی ہے کھجل خوار ہو کے۔ کیا ملا اسے جوانی میں بیوہ ہو کے۔ پیسہ تو کنجری کے پاس بھی ہوتا ہے' توبہ توبہ۔ یہ سب لالچ کی سزا ہے۔"

میں نے تلخی سے کہا "جسے تم سزا سمجھ رہی ہو ماسی' وہ اس کے لیے تقدیر کی لاٹری ہے۔ آج وہ لاکھوں کی مالک ہے۔ میرے ساتھ رہ کے اسے کیا ملتا۔"

"ہائے پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے کیا؟"

"ہاں۔ آج کل سب کچھ ہوتا ہے۔ ماں' باپ' ایمان خدا۔ سب پیسہ ہے ماسی۔ ایسی ہی ہو گئی ہے یہ دنیا" میں نے کہا "اور وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ مجھے اس کے لچھن دیر سے پتا چلے۔"

"چل رب نے بچایا تجھے اس منحوس بلا سے نہیں تو تجھے بھی کھا جاتی۔ دفع کر اس کے خیال کو بھی اور جا سو جا آرام سے۔"

"پہلے اس سے پوچھ لے کہ کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ کہہ رہی ہے خالی پیٹ سو جا۔" ڈاکٹر رانجھا بولے "حکیم سقراط نے فرمایا ہے کہ معدہ خالی ہو تو شیطانی خیالات معدے میں اتر آتے ہیں دماغ سے اور معدے کی گیس اوپر دماغ میں چڑھ جاتی ہے۔ اس سے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

میرے انکار کو ماسی ہیر نے بڑی آسانی سے بلڈوز کر دیا اور ایک پورا گلاس گرم دودھ کا زبردستی میرے حلق سے اتار دیا۔

ڈاکٹر رانجھا ہنگامی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور اہالیانِ محلہ کی ضرورت کے لیے ایک محدود شفاخانہ اپنے گھر میں بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک سکون آور طلسماتی گولی کھلانے کی کوشش کی۔ "عزیزم! یہ بایو کیمک اور ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کے ملاپ سے پیدا ہونے والی ایجاد بندہ ہے۔"

"چل رہنے دے اپنی ایجاد بندہ کو۔ آج آگئی تھی وہ پچھلی گلی میں رہنے والی مجھ سے لڑنے' کہتی تھی تیری دوائی سے مرغی مر گئی۔"

"بھئی حد ہو گئی۔ کیا اس میں دوا کا قصور تھا۔ تم ہی فیصلہ کرو پتر جی۔ غلطی اس نے کی' جو دوا اپنے شوہر کو دیتی تھی وہ مرغی کو کھلا دی اور مرغی والی دوائی دے دی شوہر کو" ڈاکٹر رانجھا نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

"دیکھو نا ناصر! مرغی مر گئی خیر ہے مگر اس کا شوہر۔"

میں نے کہا "کیا وہ بانگ دینے لگا ہے؟"

"وہ ہو گیا تھا تقریباً پاگل۔ مرغی کا دانہ مانگ رہا تھا کھانے کو۔ اس کی گھر والی نے خود دیکھا بعد میں کہ دڑبے کے باہر بیٹھا ہے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "کیا کسی مرغی پر لٹو ہو گیا تھا۔ ..... ڈاکٹر صاحب' آپ نے جانوروں کا علاج کب سے شروع کر دیا؟"

"بھئی برخوردار۔ تم خیر سے پڑھے لکھے ہو۔ اس جاہل عورت ذات کو بھی سمجھاؤ کہ ساری دوائیاں پہلے جانوروں پر آزماتے ہیں۔ ان کے تمام' اعضا اور نظامِ ہضم' نظامِ تنفس' دورانِ خون وغیرہ انسانوں جیسے ہوتے ہیں۔ ہوتے ہیں یا نہیں؟"

میں نے کہا "یہ بات تو ٹھیک ہے۔ تجربات پہلے کیے جاتے ہیں خرگوشوں پر اور گنی پگ پر۔"

"گنی پگ کیا ہوتا ہے' یہ بھی بتا دو اسے" ڈاکٹر رانجھا نے خوش ہو کے کہا۔

"گنی ایک ملک بھی ہے اور پہلے ایک سکہ تھا برطانیہ کا۔ پگ کہتے ہیں سور کو۔" میں نے جانتے بوجھتے غلط تشریح کی۔ "انگریزی میں۔"

"ہائے میں مر گئی۔" ہیر نے سینے پر ہاتھ مارا "پہلے نجس سور کو دوا دیتے ہیں۔۔۔ پھر وہی انسانوں کو کھلاتے ہیں؟"

"اوئے ابوجہل کی بچی۔ گنی پگ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔"

"پھر ہوتا تو سور ہے۔ توبہ توبہ" ماسی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ وہ چوہے جیسا ہوتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جو ہے جیسا ہو یا بلی جیسا' خنزیر تو خنزیر ہے۔ بیڑا غرق ہو ان انگریزوں کا۔ ہمارا ایمان عاقبت خراب کرتے ہیں۔ میں تو اب ہاتھ نہیں لگاؤں گی ان ولایتی دواؤں کو۔" ماسی ہیر نے سخت خفگی سے کہا۔

"پھر کیا کرے گی؟ اس حکیم کی دوا کھائے گی۔ جو تیرے آدھے خاندان کو مار چکا ہے" ڈاکٹر رانجھا نے کہا "تیرے ابا کی جان بھی اس نے اور پھر ماما کی۔ ہاضمہ خراب ہوا تھا اس کی معجون کھا کے بیٹھ ہو گیا۔"

"تو بدنام کرتا ہے انہیں۔"

"لو پتری۔ اس کا ماما پہلے مرا کسی کے چہلم میں۔ وہاں سے ایک شادی میں۔ دونوں جگہ کھایا اس نے چار بندوں جتنا۔ اللہ نے بڑی گنجائش رکھی تھی اس کے پیٹ میں مگر اس دن پیٹ بھی ہار مان گیا۔ حکیم نے پیٹ خالی کرنے کے لیے دے دیا جمال گوٹا۔ کھایا پیا تو نکلا' ساتھ ہی جان بھی نکل گئی۔ سات سال جیل بھی کاٹ آیا ہے مگر اب پھر وہی کر رہا ہے۔ انگریزی دوائیاں گلاب جامن میں ملا کے دیتا ہے اور کہتا ہے جوارش' معجون اور پتا نہیں کیا۔"

"تا۔ تو کیا کرتا ہے؟" ماسی نے آستینیں چڑھالیں۔

میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے "یہ آدھی رات کو طے کرنے والا مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی محلے والے آجائیں گے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے جاتے جاتے کہا "ویسے برخوردار۔ میں نے بہت سی کتابیں لے لی ہیں۔ اب اسپتال چلانا ہے تو علم میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں ساری دوائیوں کا حال ہے۔"

"کون سی دوائیاں۔"

"ساری۔ انگریزی دوائیاں الگ ہیں۔ جیسے ڈکشنری میں نام ہوتے ہیں۔ اے بی سی کے حساب سے۔ ایسے ہی دوائیوں کے نام اور خواص درج ہیں۔ خوراک لکھی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "دوائیں بنانے والی فارسیوٹیکل کمپنیاں اپنے اپنے کیٹلاگ شائع کرتی ہیں۔ آپ انہی کی بات کر رہے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ ہومیو پیتھی تو بہت ہی آسان ہے۔ ایک کتاب کافی ہے۔ اپنے ہنومان جی کی۔"

"ہنومان؟ وہ تو بندروں کے دیوتا ہیں۔۔۔ اور بندر ہیں۔"

"او نہیں پتر۔ ہنومان جرمنی کا بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ اس نے ہومیو پیتھی ایجاد کی۔ بابائے ہومیو پیتھی کہتے ہیں اسے۔"

"اوہ۔ آپ ہنیمن کی بات کر رہے ہیں۔"

رانجھا نے اپنی خفت مٹائی "اب یہ کتابیں رٹنے کے بعد میری قابلیت کیا کسی ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے کم ہوگی؟"

میں نے کہا "مگر بیماری کی علامات اور تشخیص۔"

وہ ہنسنے لگا "ہے تو اپنا بزنس سیکرٹ پتر جی مگر اب تم سے کیا پردہ۔ میں نے ایک ڈائری بنالی ہے۔ اس میں ہر صفحے پر ایک مرض کی علامات لکھی ہیں۔ اس کے نیچے ساری دوائیاں۔ پہلے بیماری دیکھ لی پھر دوا کے بارے میں پڑھ لیا اور بس۔ علاج غلط کیسے ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ اپنی پریکٹس خوب چلے گی بلکہ دوڑے گی' یہ جو لیبارٹری کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔ یہ میں پہلے ہی پڑھ لیتا تھا۔ ہر رپورٹ میں لکھا ہوتا ہے کہ نارمل کیا ہوتا ہے۔ ایک بچہ بھی دیکھ سکتا ہے کمی بیشی کو۔"

میں ڈاکٹر رانجھا سے کیا کہتا۔ پہلے تو وہ بے ضرر شربت اور مختلف قسم کے بیج اور جڑی بوٹیاں ہی کھلا پلا رہے تھے' اب ان کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ بڑا اسپتال بنانے سے پہلے وہ بڑے ڈاکٹر بھی بننا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا۔ پانچ سال میں ایم بی بی ایس کرنے والے آخری سال میں دواؤں کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ انہوں نے چار سال کاٹ دیے تھے اور آخری سال کا کورس بھی خلاصہ بنا کے پاس ہونا چاہتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ چند برسوں میں وہ مکمل ڈاکٹر کہلائیں گے۔ بہت سے کیمسٹ۔ دوا ساز کمپنیوں کے REPS یعنی سیلز مین اور کمپاؤنڈر سے ہی ڈاکٹر بن جاتے ہیں یا عطائی کو ڈاکٹر بنا دیتے ہیں پھر جب اسپتال چل جاتا ہے تو وہ نوکری کی تلاش میں پھرنے والے نوجوان ڈاکٹروں کو دو تین ہزار روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیتے ہیں اور قانونی طور پر بھی محفوظ ہو جاتے ہیں۔

میرا ڈاکٹر رانجھا کو سمجھانا لاحاصل تھا کہ وہ لوگوں کی جانوں سے نہ کھیلیں۔ ان کے دماغ میں پہلے ہی خناس تھا کہ وہ ڈاکٹر ہیں اور خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا لکھی ہے۔ اب کڑوا کریلا نیم چڑھنے لگا تھا۔ انہیں کون قائل کر سکتا تھا کہ یہ غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہی نہیں خطرناک کام بھی ہے۔ میرے لیے پولیس کو رپورٹ کرنا بھی ناممکن تھا۔ ملک میں ایسے ہزاروں ڈاکٹر تھے اور انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ فرض اور محبت کی جنگ میں فرض کی جیت پر قلم بن جاتی ہے مگر عملی زندگی میں آج تک کسی بیٹے نے باپ کے خلاف گواہی دی کہ وہ رشوت لیتا ہے یا کسی بھائی نے بھائی کی رپورٹ کی کہ وہ جعلی دوائیں بناتا ہے۔ کسی نے اپنے دوست کو پکڑوایا کہ وہ دو نمبر کا مال سپلائی کرتا ہے پھر میں کیا کرتا۔ میں بھی اسی کمزور معاشرے کا ایک بے وقعت پرزہ تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں ان رشتوں کا خون کر سکوں جن کی

بیماری میں نے اپنے جذبات سے کی تھی۔

ڈاکٹر رانجھا کو پیسے کی ہوس نہیں تھی۔ وہ دھوکے باز بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کے مطابق نیک نیتی سے علاج کرتا تھا اور اس کا مقصد شفا دینا ہوتا تھا۔ خود وزارت صحت کے حکام یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گاؤں دیہات اور کم ترقی یافتہ غریب آبادی میں یہ عطائی' نیم حکیم اور ہومیو پیتھ بہرحال وہ کام کر رہے ہیں جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر کرنے پر تیار نہیں۔ باقاعدہ ڈاکٹر' باقاعدہ کلینک اور ڈسپنسری مانگتا ہے اور ہر قسم کی دوائیں مانگتا ہے جو اس ملک میں صرف دو فیصد صحت کے بجٹ سے فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر بجلی' پانی اور بنیادی سہولتوں سے محروم گاؤں میں نہیں جاتے اور دور افتادہ علاقوں میں نہیں جاتے۔ آبادی کی اکثریت کا تھوڑا بہت سہارا اور بیشتر صورتوں میں انہیں سستا علاج فراہم کرنے والے ڈاکٹر رانجھا جیسے بھی ہیں' انہیں مریض بھی ایسے سادہ لوح ملے ہیں کہ شفا ہو تو ڈاکٹر کو دعا دیتے ہیں اور قضا لے جائے تو دعائے مغفرت پڑھ کے کہتے ہیں کہ جو اللہ کی مرضی۔ ڈاکٹر موت کے وقت کو کیسے ٹال سکتا ہے۔

صبح میری ذہنی اور جسمانی حالت بہت بہتر تھی۔ شاید میں نے غلط سوچا اور غلط سمجھا۔ شاذو مجھے ذلیل کرنا نہیں چاہتی ہوگی۔ اس کے ذہن میں ایک احساس گناہ و جرم ہوگا جسے مٹانے کے لیے وہ کچھ کرنے کا سوچتی ہوگی۔ میری بھلائی کے لیے ہی اس نے یہ کہا کہ میں جس مکان میں کرائے دار تھا مجھے اس کا مالک بنا دیا پھر اس نے میرے مستقبل کے بارے میں سوچا۔ یہاں میرے دشمن بہت تھے۔ مددگار کم تھے۔ اس نے سوچا کہ برطانیہ میرے لیے محفوظ جگہ ہوگی اور وہاں میں ترقی بھی کروں گا۔ شاید غیر شعوری طور پر اس نے مجھے دور بھیجنے کے خیال سے ایسا کیا۔ وہ نہیں چاہتی ہوگی کہ اسی شہر میں اس کا اور میرا آمنا سامنا ہو تو ہر بار میری نظر اسے ملعون کرے۔ وہ میرے خیال سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتی ہوگی۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ شاذو کو میرا خیال تھا۔ وہ میرے بارے میں سوچتی تھی۔

لیکن اب اس سے فائدہ؟ آج کی شاذو وہ نہیں تھی جس کے لیے میں نے کاسۂ گدائی اٹھالیا تھا۔ عزت نفس کو مار دیا تھا۔ اپنے آپ کو بھلا دیا تھا۔ کسی دولت مند مشہور وکیل ہاشمی صاحب کی بیوہ سے کوئی جذباتی رشتہ استوار کرنا میرے بس کی بات ہی نہ تھی۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ میں نے جو خوابوں کا شیش محل تراشا تھا' اس کو شاذو نے خود غرضانہ بے رحمی کے پتھر سے چکنا چور کر دیا تھا۔ اب ان ٹکڑوں کو جوڑ کے پھر وہ شیش محل کون شیشہ گر بنا سکتا تھا۔ ان ٹکڑوں نے میری روح کو لہولہان کر دیا تھا۔ میرے دل کو کاٹ دیا تھا اور میرے وجود کو زخموں سے بھر دیا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا مستقبل کی تعمیر نو کے منصوبے میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ علم طب میں مطالعے کو وسعت دینے کے ساتھ ہی وہ نئے کلینک کو اسپتال کا درجہ دینے کی جزئیات پر غور فرماتے رہتے تھے جو ان کے نزدیک بڑی دماغ سوزی کا کام تھا چنانچہ ماسی ہیر سے مشورے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ماسی ہیر نصف بہتر ہونے کے ناتے ڈاکٹر رانجھا کے پیشہ ورانہ معاملات میں ٹانگ نہ اڑائے۔

صبح ان کی جھک جھک جاری تھی کہ رئیس آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں رات بھر سو نہیں سکوں گا۔ مجھے ہنسی مذاق میں مصروف دیکھ کے وہ خوش ہوا۔ میں کبھی ہیر اور کبھی رانجھے کی طرف داری کرتے ہوئے انہیں ایسے ہی لڑا کے لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے رئیس مرغے لڑاتا تھا۔ بالآخر ماسی ہیر میری بدمعاشی سمجھ گئی۔

"رانجھے' اس حرامی کی باتوں میں مت آ۔ یہ مزے لے رہا ہے۔ کبھی تیری حمایت کرتا ہے کبھی میری" ماسی نے کہا۔

ڈاکٹر رانجھا نے سر کھجایا "مجھے معلوم ہے۔ میں بھی تو مزے لے رہا تھا۔"

ڈاکٹر رانجھا کے گھر سے نکلتے ہی کسی نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ماسی ہیر بوکھلائی ہوئی نمودار ہوئی۔

"باہر تو پولیس کھڑی ہے ناصر اور بھی دو بندے ہیں۔"

"کس کو پوچھ رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تجھے۔ کیا بات ہے ناصر۔" ماسی پر گھبراہٹ سوار تھی "ایسی ویسی کوئی بات ہے تو مجھے بتا دے۔ پولیس کیوں پکڑنے آئی ہے تجھے؟"

میں نے کہا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟"

رئیس نے کہا "ہاں ماسی۔ ہم نے کچھ کیا ہی نہیں تو پولیس ہمیں کیوں پکڑے گی۔"

میں نے کہا "رئیس۔ تو ٹھہر' وہ صرف مجھے ہی پوچھ رہے ہیں۔"

رئیس تجربہ کار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس کسی جھوٹی سچی رپورٹ پر ایک کو پکڑنے آئے تو جتنے ہاتھ آجائیں شبے میں سب کو لے جاتی ہے اور پھر غیر ضروری لوگوں کو بھی حسب توفیق نذر نذرانے لے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اگر پولیس واقعی میرے خلاف کسی کی رپورٹ پر آئی تھی تو رئیس کا باہر رہنا ضروری تھا تاکہ وہ میری رہائی کے لیے دوڑ بھاگ کر سکے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے شاہ جی کی وجہ سے پولیس کے ہر تھانے میں رئیس کی جان پہچان تھی مگر وہ سلسلہ اب ختم ہو گیا تھا۔ اگر اتنے عرصے بعد پھر خود شاہ جی نے مجھ پر کوئی الزام عائد کروایا تھا تو رئیس کے پرانے مراسم بے کار تھے لیکن وہ پیرانجن شاہ کا اثر رسوخ بہرحال استعمال کر سکتا تھا۔

پولیس میں اتنی برداشت کہاں کہ وہ کسی کے دروازے پر کھڑے رہ کر تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے باہر آنے کا انتظار کرے۔ مجھے دو منٹ کی دیر ہوئی تو وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔

"کیا بات ہے مائی! بات سمجھ میں نہیں آئی تھی یا سازش ہو رہی ہے کہ بندہ نکل جائے" ایک جنگلی قسم کے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

میں نے کہا "بھاگنے کا کوئی راستہ نظر آ رہا ہے تمہیں اور بھاگتا ہے وہ جو مجرم ہو۔ تم اندر کیسے گھس آئے؟"

"سب بتائیں گے تجھے تھانے جا کے" اس نے غرا کے کہا "تو ہے ناصر عظیم یا یہ؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم میں ہوں۔"

"وسیم کو جانتا ہے تو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں۔ وہ پہلے اسی مکان میں رہتا تھا۔ اب چلا گیا ہے یہاں سے۔ یہ مکان میں نے خرید لیا ہے۔"

"پھر تجھے اس کا پتا ضرور معلوم ہوگا۔ چل آجا ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "کچھ بتاؤ' آخر بات کیا ہے؟"

"بتائیں گے تجھے چوہدری صاحب!" اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور پیچھے سے دھکا دیا۔ ایک سپاہی نے پیچھے سے مجھے لات ماری۔

ماسی ہیر چلانے لگی۔ "ہائے کیوں مارتے ہو شودے کو۔ کچھ بتاؤ تو سہی اس نے کیا جرم کیا ہے؟"

رئیس نے اسے روک لیا "فکر مت کرو ماسی۔ بشیر چوہدری صاحب اچھے آدمی ہیں۔ ناصر پر بہت مہربان ہیں۔"

رئیس کی بات ہیڈ کانسٹیبل نے بھی سنی اور اس کا اچھا اثر ہوا۔ اس نے صرف چوہدری صاحب کہا تھا۔ رئیس نے بشیر چوہدری کے بارے میں دو تعریفی جملے بول کے ہیڈ کانسٹیبل کے جارحانہ عزائم کو بریک لگا دی۔ وہ سب ایک جیپ میں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے درمیان میں بٹھایا مگر باقی راستے کوئی غلط بات کرنے سے گریز کیا۔

میرا یہ شک دور ہو گیا تھا کہ شاہ جی نے پھر مجھ پر کوئی الزام لگا کے دشمنی کی پیاس بجھانے کی کوشش کی ہوگی۔ ہاشمی صاحب کی وجہ سے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا اور جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا تو وہ تقریباً پاگل ہو چکا تھا۔ ہاشمی صاحب پہلے ملک سے چلے گئے تھے اور اب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تب ایسے میں شاہ جی پر پاگل پن اور عناد کا دورہ پڑنا بعید از امکان نہ تھا مگر وسیم کا نام سن کے مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

انسپکٹر بن جانے کے بعد بشیر چوہدری تھانہ انچارج بھی ہو گیا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ آج کل کہاں ہے۔ میں جانتا تھا کہ وسیم اس کا بہنوئی ہے اور ایک دو ٹکے کی طوائف کے چکر میں وسیم نے بشیر چوہدری کی بہن کو بھائی کے گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ ایس ایچ او ہونے کے باوجود بشیر چوہدری بہن کی وجہ سے مجبور تھا اور وسیم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی بہن کو طلاق نہ ہو جائے اور الزام اس پر نہ آجائے کہ بہن کا گھر اس نے اجاڑا۔ مرد کا کیا ہے' تین بار طلاق کہے اور عورت کے ماتھے پر مطلقہ کا داغ لگا کے اسے دنیا میں خوار ہونے کے لیے چھوڑ جائے۔ خود بشیر چوہدری کی بہن یہ نہیں چاہتی تھی کہ واپسی کے راستے بند ہو جائیں۔ اسے معلوم تھا کہ ساری عمر وہ کسی بھائی کے گھر میں نہیں رہ سکتی اور وہ جیسا بھی ہو مگر اس کے بچوں کو ایک باپ کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی اسے ایک شوہر کی۔

بشیر چوہدری افسرانہ شان کے ساتھ اپنے کمرے میں ڈیوٹی افسر سے رات بھر کی کارگزاری کی رپورٹ لے رہا تھا اور روزنامچہ ملاحظہ کر رہا تھا۔ جب اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا تو میں نے اس ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا جو مجھے گرفتار کر کے لایا تھا اور منتظر تھا کہ انچارج صاحب کے سامنے اپنی کارکردگی کی رپورٹ فخر کے ساتھ پیش کر سکے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے کھسک جانا بہتر سمجھا۔ شاید میرے ساتھ مہمانوں جیسے سلوک نے ہیڈ کانسٹیبل کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کر دیے تھے۔ اس نے میرے ساتھ کوئی شریفانہ سلوک نہیں کیا تھا مگر اس کا گلہ کرنا اتنا ہی عبث تھا جتنا گیٹ پر بندھے ہوئے کتے کے بھونکنے کی اس کے مالک سے شکایت کرنا۔

بشیر چوہدری نے فارغ ہوتے ہی کہا "ہاں بھئی' کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "آپ کی دعا سے جی رہے ہیں جناب!"

اس نے رسماً پوچھا "چائے پیو گے؟" مگر میرے جواب دینے سے پہلے ہی ایک کانسٹیبل چائے کا ایک کپ لے آیا تو اس نے دوسرا کپ بھی منگوا لیا۔

میں نے کہا "آج صبح صبح آپ نے کیسے یاد کیا سر!"

اس نے چہرے سے کسی قسم کے جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے "تمہیں کچھ پتا ہے وہ۔۔۔ وسیم آج کل کہاں ہوتا ہے؟"

وسیم کے نام کے ساتھ فٹ ہونے والی گالی سے بشیر چوہدری کے جذبات کی صحیح عکاسی ہوتی تھی۔ میں نے کہا "دو تین بار نظر آیا تھا۔"

"کہاں نظر آیا تھا؟" وہ مجھ پر نظر جما کے بولا۔

"ایک بار سینما کے باہر۔ بلیک سے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہی طوائف تھی" میں نے کہا "دوسری بار بس میں مل گیا تھا۔"

"جس مکان میں تم رہتے ہو' وہ اسی کا تھا۔"

میں نے کہا "اس کے بڑے بھائی کا۔ بھائی مر گیا۔"

"پھانسی ہوئی تھی اسے۔"

"ہاں۔ بعد میں اس کی بیوی۔۔۔ وسیم کی بھابی غائب ہو گئی تھی۔ بڑے پُراسرار حالات میں اور بھتیجا مر گیا تھا ایک حادثے میں تو اس نے مکان پر قبضہ کر لیا تھا۔"

"وہ سب معلوم ہے مجھے۔ اس کے بھتیجے کا نام بھی ناصر عظیم تھا۔ تمہیں شک تھا کہ اسے بھی قتل کیا گیا ہے اور اس کی ماں کو بھی۔ تم بدلہ لینے کے چکر میں تھے۔"

میں نے فخریہ لہجے میں کہا "وہ مکان اب میں نے خرید لیا ہے۔"

"تم نے خرید لیا ہے؟" وہ حیران ہوا "بڑا پیسہ آ گیا ہے جنی؟"

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا "دراصل۔۔۔ ایک بہت بڑے وکیل ہیں ہاشمی صاحب' مکان انہوں نے خریدا تھا پھر میرے نام کر دیا۔"

"تمہارے نام کیوں کر دیا؟"

"بس جی ان کی سخاوت ہے۔ لاکھوں' کروڑوں کے مالک ہیں وہ۔ ہم جیسے غریبوں کے لیے زکوٰۃ کے نام پر ہی سر چھپانے کا آسرا کر دیتے ہیں۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی "وہ۔۔۔ آج کل روپوش ہے کہیں۔ ایک مہینہ ہو گیا اس کا کوئی پتا نہیں۔ میں نے سوچا شاید ابھی تک تم اس کے پیچھے لگے ہو گے تو کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

وسیم کو میں نے گزشتہ رات ہی دیکھا تھا مگر اس کے بارے میں کچھ نہ بتا کے میں نے عقلمندی کی تھی۔ اس کا احساس مجھے بشیر چوہدری کی پریشانی دیکھ کر ہوا "خیر تو ہے چوہدری صاحب!"

"او یار خیر کیسی۔۔۔ بہن کو مصیبت بھی نہیں کہہ سکتا۔ بڑا بھائی ہوں مگر مصیبت تو ڈالی ہوئی ہے اس۔۔۔ نے۔" وہ گالی کے بغیر وسیم کا نام ہی نہیں لیتا تھا "نہ وہ چھوڑتا ہے اس ڈر سے کہ پھر میں اس کا حشر نشر کر دوں گا۔ ابھی میرا ہاتھ صرف بہن کی وجہ سے رکا ہوا ہے۔ نہ بہن اسے چھوڑنا چاہتی ہے۔ کوئی تکلیف نہیں میرے گھر میں۔ میری بیوی بھی ویسی نہیں جیسی بھابیاں ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود روتی رہتی ہے۔ اسے یاد کرتی رہتی ہے۔ واپس جانا چاہتی ہے اس کے گھر میں ذلیل ہونے اور جوتے کھانے کے لیے" اس نے افسوس سے سر ہلایا "عورتیں کیسے کیسے شوہروں کے ساتھ گزارا کر لیتی ہیں۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ آخر آپ جیسے تھانے داروں کی بیویاں بھی تو ہیں۔ داد ان کی ہمت کی بھی دینی چاہیے مگر وہ خود ہی بولا "اب ہم ہیں ادھر تھانے دار مگر گھر میں تھانے داری چلتی ہے گھر والی کی۔ اس کے ناز نخرے اٹھاتے ہیں۔ ہر بات سنتے ہیں' ہاتھ جوڑ کے مناتے ہیں وہ ناراض ہو جائے تو۔ جانتے ہیں ناکہ گھر اسی کے دم سے چلتا ہے۔ دو دن میں سب چوپٹ ہو جائے اگر وہ نہ ہو۔ اس حرامی وسیم کو پروا ہی نہیں۔ کل اس پاگل کی بچی نے نیند کی گولیاں کھا کے مرنے کی کوشش کی تھی۔ اللہ نے بچا لیا اسے ورنہ اور مشکل ہو جاتی میرے لیے۔ دنیا یہی کہتی کہ کیسا بھائی تھا۔ تھانے دار ہو کے بھی بہن کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اوئے تھانے دار کیا' ڈی آئی جی صاحب بھی کیا کر سکتے ہیں اگر معاملہ بہن کا ہو یا بیٹی کا ہو۔"

ابنِ حسن عثمان آبادی کا ایک شاہکار ناول

تحیر، تجسس اور رومان سے بھرپور

ایک چونکا دینے والا ناول

چیل کوٹھی

راستوں کے اندھیرے دور کرتے والے اُن بدنصیب چراغوں کی داستان جن کے پاس اپنے لیے صرف اور صرف اندھیرے تھے کیونکہ صدیوں سے ایک بددعا اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔

اُن نوابوں کی کہانی جن کی قسمت میں جوان ہونے کے بعد راتوں میں جاگنا اور رونا لکھا تھا۔

ایڈونچر سے بھرپور ناول

قیمت -/100 روپے

ڈاک خرچ -/20 روپے

علی میاں پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون 7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا جی آپ نے۔"

اسے شاید احساس ہوا کہ میرے سامنے وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا "اچھا یار' تم بتاؤ۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"آپ کی نصیحت پر عمل کر رہا ہوں سر۔ میٹرک کا امتحان دیا ہے۔"

اس نے سرہلایا "فضول لوگوں سے اور فضول چکروں سے دور رہو گے تو ترقی کرو گے۔"

میں نے اسے سلام کیا "اگر مجھے پتا چلا وسیم کے بارے میں تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

ایک گھنٹے بعد میں واپس پہنچا تو رئیس حیران رہ گیا۔ تھانے جا کے اتنی جلدی کون واپس آتا ہے۔ ماسی ہیر کے چہرے کی اُداسی اور پریشانی دور ہو گئی۔

"تو ایسے ہی فکر کر رہی تھی۔ بشیر چوہدری صاحب تھانے دار ہیں اور اپنے یار ہیں۔ میں نے کہا تھا نا" میں نے ماسی ہیر کو تسلی دی "ایک کام تھا مجھ سے اس لیے بلایا تھا۔"

"کیا کام تھا؟" رئیس بول پڑا پھر کچھ شرمندہ ہوا۔

میں نے کہا "کشیدہ کاری کا کام نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ کے ہوتی ہے۔ باہر چل بتاتا ہوں۔ اور ماسی' تم بالکل پریشان ہونا چھوڑ دو۔"

"تو دیر کرتا ہے تو میرے دل میں ہول اٹھتے ہیں پتر" وہ بولی "جلدی واپس گھر آجایا کر۔ مجھے پتا بھی نہیں ہوتا کہ تو کہاں ہے۔"

میں نے کہا "نئے گھر میں فون بھی لگوا دوں گا پھر دیر ہوگی تو بتا دیا کروں گا۔"

میں نے رئیس کو بشیر چوہدری سے ملاقات کا سارا حال ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے سنایا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔

"پیارے' ہے نا عجیب بات۔ ہم نے کل رات ہی اسے دیکھا اور آج چوہدری صاحب کو اس کی ضرورت پڑ گئی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ لیکن میں نے یہ بات اسے نہیں بتائی۔"

"کیوں نہیں بتائی۔ ایک موقع ملا تھا اس پر احسان کرنے کا۔ علاقے کا پتا چل جاتا تو سالا تھانے دار ضرور تلاش کر لیتا اپنے بہنوئی صاحب کو۔"

میں نے کہا "ابے کچھ سمجھا کر۔ احسان بھی کریں گے ہم مگر آدھا ادھورا نہیں۔ پورے سے بھی زیادہ۔ سوا بشیر چوہدری پر بلکہ ڈیڑھ۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"رئیس خان۔ بڑا فرق ہے آدھی نیکی' پوری نیکی اور ڈیڑھ نیکی میں۔ کبھی بھوکے کے ہاتھ میں چار آنے رکھ دو کہ جا کہیں سے روٹی لے کر کھا لے تو یہ ہوئی آدھی نیکی میرے نزدیک۔ اس کو روٹی سالن دے دیا تو یہ ہوئی پوری نیکی اور اسے عزت سے گھر میں بٹھا کے پیٹ بھر کھانا کھلایا پھر میٹھا' چائے پلا کے رخصت کیا تو یہ ہو گئی ڈیڑھ نیکی۔ اب تو دیکھتا جا میں ایک تیر سے تین شکار کیسے کرتا ہوں۔ دو تو سب ہی کر لیتے ہیں۔"

"بھوکے کو کھانا کھلا دے بابا۔" ایک فقیر نے قریب آ کے ہاتھ پھیلا دیا "اللہ رئیس اور امیر کی پوری نیکی قبول کرے۔"

رئیس نے اسے غور سے دیکھا اور پہچان لیا "ابے تو سن رہا تھا ہماری باتیں؟"

وہ ایک ہٹا کٹا داڑھی والا فقیر تھا جس کی صورت مجھے شاہ جی کے ڈیرے پر دیکھی ہوئی لگی۔ اس نے ڈیوٹی والے کپڑے پہن رکھے تھے یعنی میلے کچیلے' پھٹے ہوئے اور بدبودار۔ آج بھی جب میں فقیروں کے ڈیرے کا تصور کرتا تھا تو میرے ذہن میں بدبو آتی تھی۔ ان کے غلیظ جسموں کی بدبو' گندے کپڑوں کی بدبو' ان کے ذہن کی غلاظت سے بھری باتوں کی بدبو۔ چرس والے سگریٹوں کے دھوئیں کی بدبو۔ یہ ساری بدبوئیں مل کے اس ہال کے منحوس اور آسیب زدہ نیم تاریک ماحول میں رچ بس گئی تھیں۔

فقیر دانت نکالتا ہوا میرے سامنے اور رئیس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ میرے ساتھ نہیں بیٹھا تھا مگر اس سے میری مشکل آسان نہیں ہوئی۔ رئیس کے پیچھے دیوار تھی اور اس پر ٹیبل فین ایسے نصب تھا کہ گھومتے ہوئے اس کی ساری ہوا نیچے کی طرف پھیلے۔ ایسے پنکھے لوور فین کہلاتے ہیں اور دیواروں پر ہی نصب کیے جاتے ہیں۔ ہر بار پنکھا گھومتا ہوا اس فقیر کے سر پر سے گزرتا تھا تو چند سیکنڈ بعد بدبودار ہوا کا جھونکا سیدھا میری ناک پر یلغار کرتا تھا۔

مجھ سے فقیر کا بہت کم تعلق رہا تھا مگر رئیس سے اس کے پرانے اور خاصے دوستانہ مراسم ہوں گے جبھی وہ ہنس ہنس کے بے تکلفی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

"یار' کہاں ہے آج کل۔ بڑے ٹھاٹ باٹ نظر آ رہے ہیں۔"

رئیس نے کہا "بس یار ے۔ اپن پہلے بھی عیش کرتے تھے اور اوپر والے کی مہربانی سے اب بھی عیش میں ہیں۔ ایک پیر صاحب کا مرید ہو گیا ہوں۔"

"اچھا! یہ بات ہے۔ یار درگاہوں پر تو بڑی عیش ہوتی ہے۔" اس نے رئیس کے دھپ مارا "مال ہی مال تے نال' حلوے اور جلوے۔"

میں رئیس کی وجہ سے خاموش تھا مگر اس فقیر کی صحبت سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ میرا لباس تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا تھا۔ آج کل رئیس بھی ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگا تھا۔ ہم حلیے سے شریف اور معزز نظر آتے تھے۔ ایک فقیر کے ساتھ گپ شپ سے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ہم بھی فقیر ہیں مگر اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔

رئیس نے کہا "اور سنا۔۔۔ اپنے شاہ جی کا کیا حال ہے؟"

فقیر نے حیرانی اور افسوس سے کہا "تجھے نہیں معلوم؟"

"نہیں۔۔۔ بہت پہلے دیکھا تھا۔ سالا نشے میں ٹُن تھا۔ ڈیرے پر تو خیر پیتا تھا مگر باہر نہیں نکلتا تھا ایسی حالت میں۔"

فقیر نے سرہلایا "شاہ جی فوت ہو گیا۔"

رئیس کے ذہن کو شاید صدمے کا جھٹکا لگا "فوت ہو گیا' نہیں یار؟"

"اوئے ہاں یار۔ آج چوتھا دن ہے۔ پرسوں سوئم تھا اس کا اور کمال دیکھ کہ شاہ جی کے سوئم والے دن ملا تھیکے دار مر گیا۔"

"وہ بھی مر گیا؟" رئیس بولا "بڑی جلدی مر گیا۔ ڈاکٹر تو کہتے تھے کہ سال بھر اور گزارے گا۔"

"تجھے معلوم تھا کہ اسے کینسر ہے؟"

"ہاں۔ اس نے شاہ جی کو بلایا تھا۔ اپنا سارا دھندا اسے سونپ دیا تھا۔"

فقیر اور حیران ہوا "وہ تو دشمن تھے ایک دوسرے کے۔"

"تھے جب تھے' ملا کو پتا چلا کہ وہ مرنے والا ہے تو اس نے شاہ جی کو بلا کے دشمنی ختم کر دی۔ شاہ جی نے اس کی بیوی کو اپنی بہن بنا لیا تھا۔ ملا سے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے ان کی مگر پیارے' قدرت کے کھیل ہی نیارے ہیں۔ شاہ جی پہلے مر گیا۔" رئیس بولا "اب ان دونوں کا دھندا کون چلائے گا۔"

"پتا نہیں۔ کوئی قبضہ کرے گا جس میں اتنا دم ہو گا ورنہ سب ادھر ادھر ہو جائیں گے۔" فقیر بولا۔

"ملا کی ایک بیٹی تھی۔ حرامی نیکا اس سے شادی کر لیتا تو آج سارے کا مالک ہوتا۔ اس کی بیٹی میں تو تیز نہیں ہے۔"

"ابے یار تیز تھا شاہ جی کی لونڈیا میں مگر وہ نکل گئی عشق کے چکر میں اپنے یار کے ساتھ۔ تھا وہ بھی کوئی فقیر ہی۔۔۔ مجھے یاد نہیں پڑتا۔"

غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رئیس نے میز کے نیچے سے میرا پاؤں دبا کے مجھے خاموش رہنے کے لیے کہا لیکن میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس فقیر کا رئیس کے ساتھ بیٹھ کے بے تکلفی سے بات کرنا ہی سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رئیس اپنا نہیں تو میری پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے بات ختم کرے اور اٹھ جائے۔

"شادو کا صدمہ ہی لے کے بیٹھ گیا شاہ جی کو۔" فقیر اپنی دھن میں کہتا جا رہا تھا "شراب پی پی کے مار ڈالا اس نے خود کو۔۔۔ پتا نہیں وہ کہاں ہو گی۔ تھا بڑا ہیرو جو اسے نکال لے گیا شادی کا لارا دے کر۔ عمر میں کم تھا۔ شادی کہاں کرنی تھی اس نے۔"

رئیس اب سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا "نہیں۔۔۔ وہ تو شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"سنا ہے تیرا یار تھا۔ تجھے معلوم ہو گا۔ شادی کی اس نے؟"

رئیس نے میری طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "نہیں۔"

فقیر نے قہقہہ مارا "ہمیں معلوم تھا۔ ابے اس نے چار دن عیش کر کے چھوکری دے دی ہو گی کسی کو اور پانچ دس ہزار جیب میں ڈالے ہوں گے۔"

میں نے پانی کا جگ اٹھا کے اس کے سر پر مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اسٹیل کا جگ لگنے سے وہ چکرا گیا۔ سارا پانی اس کے منہ پر پڑا اور آس پاس بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں پر بھی گرا۔ میں نے اسے ایک سے بڑھ کر ایک گالی دی۔ ریسٹورنٹ میں ہڑبونگ مچ گئی۔ گاہک اٹھ کھڑے ہوئے اور چلا چلا کے مالک کو بلانے لگے۔ ایک پہلوان ٹائپ شخص گالیاں بکتا ہوا مجھے مارنے بھی دوڑا مگر کسی نے اسے روک لیا پھر مالک آ گیا اور اس نے ہم سب کو زیادہ شاندار گالیوں سے نوازا۔ اس کے حکم پر ویٹرز کی فوج نے ہمیں دھکے دے کر ہوٹل سے باہر فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

اس فقیر کے لیے بے عزتی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کے واویلا کرتا رہا "اوئے خدا کا کچھ خوف کرو۔ فقیر کا سر پھاڑ دیا اس نے۔ اسے کچھ نہیں کہتا کوئی۔ ظالمو اسٹیل کا جگ رکھتے ہو میز پر۔"

کسی نے قہقہہ لگایا "پاگل دا پتر۔ تیرے لیے فرانس کا بنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا شیشے کا جگ رکھیں۔"

"تیرا سر کیوں نہیں ٹوٹے ٹوٹے ہوئے شیشے کے جگ کی طرح۔"

مالک نے دہاڑ کے کہا "اوئے خبردار جو پھر کسی فقیر کو اندر گھسنے دیا۔ جس کی ٹیبل پر ہوگا اس کی ـــ پر لات مار کے باہر نکال دوں گا۔"

یہ آخری کلمات ویٹرز سے مخاطب ہو کے کہے گئے تھے۔

میں رئیس کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ "تیری وجہ سے اتنی بے عزتی ہوئی میری۔ میں تو جان سے ماردیتا اس حرام زادے کو۔ کتے کی طرح بھونکتا چلا جارہا تھا۔ اچھا ہوا ریوالور نہیں تھا میرے پاس۔"

رئیس نے مجھ سے معافی مانگنا جاری رکھا "ابے یار' مجھے کیا معلوم تھا وہ سالا ایسی گھٹیا بات کرے گا۔"

"گھٹیا آدمی سے اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی تجھے اس کو منہ لگانے کی" میں نے گرم ہو کے کہا "لیکن تو ابھی تک اندر سے وہی فقیر ہے۔ تیرے دوست وہی ہاتھ پھیلانے والے ہیں۔۔۔"

"یار' اب وہ آگیا تھا تو میں کیا کرتا؟"

"کیا کرتا؟ اس کے ہاتھ پر رکھتا ایک چونی اور کہتا جاؤ" میں نے کہا "یہ بات تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ ایسے فقیر خیرات کے نہیں ایک لات کے مستحق ہیں۔ تو نے یار سمجھ کے بٹھالیا اپنے پاس۔ چھیڑ دیے پرانے قصے۔"

"اچھا پیارے' آئندہ بات بھی نہیں کروں گا کسی سے۔"

"ہاں۔ میرا دوست بن کے رہنا ہے تو بھول جا اس وقت کو۔ جن کے مقدر میں ذلت لکھی ہے وہ آج بھی ذلیل ہو رہے ہیں مگر ہم عزت اور ترقی کے راستے پر آگے بڑھ چکے ہیں" میں نے کہا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "تجھے افسوس نہیں ہوا شاہ جی کے مرنے کا سن کے۔"

"افسوس کیسا۔۔۔ خس کم جہاں پاک۔ اس دنیا کے سارے شاہ جی مرجائیں تو بڑی اچھی جگہ ہو جائے دنیا بھی" میں نے کہا "وہ میرا دشمن تھا اور ایک ذلیل شیطان تھا۔ کون سی کسر چھوڑی تھی اس نے مجھے مارنے میں کہ میں اس کے مرنے کا افسوس کروں۔"

"افسوس تو خیر مجھے بھی نہیں ہے برائی کا بُرا انجام لیکن یار' کیسا اتفاق ہے کہ شاہ جی چار دن پہلے مرگیا۔ ورنہ اسے بھی معلوم ہو جاتا کہ داماد صاحب کو اللہ میاں نے پہلے بلالیا۔

بیٹی آگئی ہے ولایت سے واپس۔"

"بڑے دعوے سے کہا تھا کہ اس نے کہ میری بیٹی تیرے جیسے کنگلے سے شادی کرے گی؟ ناممکن ۔۔۔ میں جانتا ہوں اپنی بیٹی کو" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اسے شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شادو نے تجھ سے نہیں' ہاشمی صاحب سے شادی کرلی ہے" رئیس بولا "ورنہ وہ تیرے سامنے آکے ڈھول بجاتا۔ صدمہ اسے یہی تھا کہ اس نے تیرے جیسے کو پسند کرلیا تھا۔ ہاشمی صاحب جیسے معزز آدمی کا سسر بننے کے بعد تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔"

"شادو نے اس سے تعلق ہی نہیں رکھا بعد میں۔ یا خود ہاشمی صاحب نے اسے روک دیا ہوگا کسی کو کچھ بتانے سے۔"

"مگر یار۔ یہ کیس عدالت میں گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ شادو کس کی بیٹی تھی۔" رئیس بولا "اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ہاشمی صاحب نے اس سے شادی کرلی تھی۔ شاہ جی کو زمانے کی خبر رہتی تھی۔ کیا یہ بات اسے معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔ اسے پتا چل گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "شاید اس کو صدمہ ہوا اسی بات کا۔ ہاشمی صاحب نے اسے دھتکار دیا ہوگا کہ خبردار جو پھر ادھر کا رخ کیا اور شادو نے بھی ملنے سے انکار کردیا ہوگا۔ خیر ہمیں کیا' ہمارا ایک دشمن تھا وہ نہیں رہا۔"

شام تک ہم خانقاہ کے آس پاس کی آبادی میں پھرتے رہے اور وسیم کے بارے میں لوگوں سے پوچھتے رہے مگر یا تو اسے وہاں منتقل ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے یا ادھر سے اس کا گزرنا اتفاقیہ تھا کہ لوگ اسے نام سے جانتے تھے اور نہ حلیے سے۔ نام کا یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے کرائے پر مکان حاصل کرتے ہوئے اپنا نام کچھ اور بتایا ہو۔

اچانک وسیم کا ملنا بے حد ضروری ہو گیا تھا کیونکہ میرے ذہن میں ایک پلان تھا جو میں نے ابھی تک رئیس کو بھی نہیں بتایا تھا۔ چاچا پتنگ باز جو اب پیر انجن شاہ بنا ہوا تھا۔ اچھی منصوبہ بندی میں لگا ہوا تھا اور چنڈال چوکڑی کے سب معزز اراکین پوری طرح اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان سب کے عزائم بہت بلند تھے۔ مستقبل میں یہ درگاہ بہت بڑی آمدنی کی ضامن ہو سکتی تھی اور ہر قسم کے خفیہ کاروبار کا بہترین اڈا بن سکتی تھی۔ ایسے بہت سے ڈبا پیروں کی درگاہیں انتظامیہ کی سرپرستی میں چل رہی تھیں اور کچھ پیروں کا اثر رسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ مقامی پولیس بھی وہاں چھاپا مارنے کی جرات نہیں کرسکتی تھی۔

دوپہر کے بعد میں نے اور رئیس نے پھر وسیم کی تلاش کے فیصلے پر غور کیا۔ رئیس کو یقین تھا کہ وہ اسی علاقے میں رہتا ہے۔ اس کا نظر آنا کوئی اتفاق نہیں تھا "مگر اسے تلاش کیسے کریں۔ گھر گھر جا کے تو پوچھنے سے رہے۔" میں نے کہا "اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اسی راستے پر بیٹھے اس کی راہ دیکھتے رہیں۔"

رئیس نے مجھ سے اتفاق کیا "راستے تو بہت ہیں وہ نہ جانے کدھر سے نکل جائے۔"

"یہ بھی تو معلوم نہیں کہ وہ کام کیا کرتا تھا۔"

"آخری بار تو اس سے ملنے گیا تھا۔ اس وقت المونیم کے برتنوں کی دکان تھی اس کی" رئیس بولا۔

"وہ دکان بیچ دی تھی اس نے۔"

شام تک ہم ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے پھر میں نے رئیس کو وہیں چھوڑا کیونکہ میں شام کو حاضری کے کھیل میں فریق نہیں بننا چاہتا تھا۔ آج دوپہر پیش آنے والے ناخوش گوار واقعے نے میری طبیعت مکدر کردی تھی۔ اس فقیر کو پتا نہیں تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو شادو سے محبت کرتا تھا۔ بے شک آج مجھے وہ محبت نہیں اپنی حماقت لگتی تھی۔ شادو نے میرا جذباتی استحصال کیا تھا اور مجھے استعمال کیا تھا لیکن جہاں تک میرے جذبات کا تعلق ہے' میں اپنی محبت میں دیوانگی کی حد تک مخلص اور سنجیدہ تھا۔ اس فقیر نے محبت کی نہیں' میری توہین کی تھی۔ میں نے محبت کے تقدس کی اپنے ایمان کی طرح حفاظت کی تھی۔ اگر میں چاہتا تو عشق میں ہوس کی سرحدیں عبور کرجاتا۔ نہ مجھے مواقع کی کمی تھی اور نہ بہانوں کی لیکن خود اپنی امانت میں خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہونے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ اس فقیر نے مجھے وہ گالی دی تھی جو ناقابل برداشت تھی مگر یہ اس کی اپنی سوچ تھی۔ شاید میری جگہ وہ ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ وہ شادو کو بیچ دیتا۔

میں نے ایسا نہیں کیا تو کیا ہوا۔۔۔ میری شکست خوردہ انا نے اندر سے مجھے کچوکا دیا۔ شادو نے خود اپنے آپ کو بیچ دیا۔ یہ بیچنا اور خریدنا ہی تو تھا۔ ہاشمی صاحب کے پاس اتنی ڈھیروں دولت نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ شادو جیسی کوئی لڑکی انہیں قبول کرتی۔ شادو کو ان سے نہیں ان کی دولت سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ ساٹھ سال کے کسی مفلس بوڑھے پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔

اس وقت شادو سے نفرت کے جذبات نے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیا۔ میں نے طے کیا کہ میں اس سے ملنے جاؤں گا۔ اس کی کوٹھی میں شاید مجھے گھسنے نہ دیا جائے مگر میں ائرپورٹ پر اس سے مل سکتا ہوں۔

ہاشمی صاحب کے آفس کا اور گھر کا ٹیلی فون نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ میں نے ایک ٹیلی فون کال آفس سے ان کے دفتر فون کیا۔

"مجھے گل نواز خان سے بات کرنی تھی۔" میں نے ریسیور اٹھانے والے سے کہا۔

"وہ تو لندن چلے گئے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ ہاشمی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے لندن میں۔"

"جی' گل نواز خان ان کی میت لے کر آئیں گے۔"

"آئی ایم سوری۔ میت کب پہنچے گی پاکستان؟"

"پرسوں شام چھ بجے والی فلائٹ سے۔ تدفین اگلے روز ہوگی" اس نے کہا "آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیا پھر میں بہت دیر تک سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا۔ میرے ذہن میں ایک خلا سا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ وہی ہونے کے باوجود دنیا میں کچھ کمی ہے۔ ہر چیز ویسی ہی ہے مگر پھر بھی بدلی بدلی لگتی ہے۔ یہ احساس کی خلش تھی۔ ایک لاحاصل پچھتاوا تھا۔ آخر کیا ملا شادو کو مجھے ٹھکرا کے؟ صرف دولت؟ وہ دولت کو اتنی اہمیت کب دیتی تھی۔ مجھ سے تو اس نے یہی کہا تھا کہ میں اس ماحول سے نجات چاہتی ہوں۔ وہ محبت کی اور خوشی کی متلاشی تھی۔ کیا وہ جھوٹ بولتی تھی مجھ سے؟

تھک ہار کے میں گھر لوٹ گیا۔ ماسی حسب خلاف معمول میرے جلدی آجانے سے خوش ہوئی مگر میری صورت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گئی "خیر تو ہے نا پتر۔ تیرا جی ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہوں میں۔ بس ذرا تھک گیا ہوں۔"

"چل تو لیٹ جا آرام سے۔ میں چائے بناتی ہوں تیرے لیے" ماسی نے کہا۔

میں نے کہا "ماسی۔ ایک بات بتاؤ دل پر ہاتھ رکھ کے۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"شادو نے ایسا کیوں کیا تھا میرے ساتھ؟ کیا تمہیں وہ ایسی لڑکی لگتی تھی؟"

ماسی چپ ہو گئی "سچ کہوں۔۔۔ یقین مجھے بھی نہیں آتا کہ اس نے بس دولت دیکھ کے اس بڈھے سے بیاہ رچالیا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔"

"اس نے پھر کیا سوچ کے میری محبت کو ٹھکرا دیا تھا؟"

"شاید وہ۔۔۔ تیرا بھلا چاہتی تھی" ماسی بے خیالی میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولی۔

میں اٹھ بیٹھا "یہ کیا فضول بات ہے۔"

"ہاں۔۔۔ تجھے فضول ہی لگے گی میری بات مگر یہ میرا خیال ہے۔ ابھی تیری عمر نہیں تھی شادی کی۔ وہ بڑی تھی تجھ سے اور۔۔۔"

"اور کیا۔۔؟"

"اور تیرے لائق بھی نہیں تھی۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی اس میں کہ اپنی زندگی خراب کرلے تو۔ اس جیسی ہزاروں تجھ پر قربان۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایک ماں کی طرح بات مت کرو۔"

"ایک عورت کی طرح بتاؤں؟ اس نے تیری بھلائی اسی میں دیکھی کہ تیرا راستہ خالی چھوڑ دے۔ وہ محبت کرتی تھی تجھ سے۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ تو ابھی سے شادی کے چکر میں پڑکے بھول جائے۔۔ کہ تجھے ترقی کرنی ہے۔ بہت آگے جانا ہے" ماسی نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"تم ایسا سمجھتی ہو؟ یہ قربانی تھی اس کی؟"

"ہاں۔ اگر مجھے رانجھے سے محبت ہوگی تو میں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے اس کا راستہ کھوٹا ہو۔ جو وہ چاہتا ہے وہ حاصل نہ کرسکے۔ میں اپنی محبت' اپنی خوشی اور اپنی زندگی بھی قربان کردوں گی اس کے لیے" ماسی اسی طرح بولتی گئی۔

میں چائے پینے کے بعد خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ ماسی ہیر جاہل تھی مگر ایک عورت تھی۔ ہیر رانجھے کی محبت' مجنوں لیلیٰ کی چاہت یا ناصر کے لیے شادو کا پیار' کیا فرق ہے ان میں؟ کوئی فرق نہیں پھر کیا ماسی ہیر کی رائے کو فضول سمجھا جاسکتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کیونکہ ایسا سوچنا شادو کے لیے بھی ناممکن نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میرے عزائم کی وسعت پرواز کے لیے سرحدِ افلاک بھی کم ہے۔ وہ مانتی تھی کہ میں ناصر ہوں یعنی فتح کرنے والا اور عظیم ہوں بہت بڑا۔ وہ مجھے سمجھتی تھی اور اسے یقین تھا کہ میرے لیے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ کیا اس لیے اس نے مجھے آزاد چھوڑدیا کہ میری پرواز میں کوتاہی نہ آئے؟ اگر وہ مجھ سے کہتی کہ محبت کو بھول جاؤ' اس مقصد کو یاد رکھو جو عظیم تر ہے۔ تو کیا میں اس کی مانتا؟ کبھی نہیں۔ میں اس کے بھانپڑ رسید کرتا کہ پاگل کی بچی۔ محبت سے عظیم تر بھی کوئی مقصد ہوسکتا ہے میرے لیے اور شادو سے بڑھ کر کوئی منزل ہوسکتی ہے۔

چنانچہ اس نے وہ کام کیا جس نے از خود ایک ردِ عمل کے طور پر محبت کے امرت کو نفرت کے زہر میں بدل دیا۔

کیا واقعی اس نے میری اور صرف میری کامیابی کے لیے اپنی محبت میں ناکامی قبول کی۔ جانتے بوجھتے زہر کا پیالہ پی لیا کہ موت ہی عشق کی زندگی ہے۔ دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیا جانے۔

ڈاکٹر رانجھا کی زبردست السلام علیکم حضرات اور خواتین نے میرے خیالات کا تانا بانا بکھیر دیا۔ "لوجی آج تے خیر کمال ہوگئی" اس نے ٹوپی اتار کے الماری کے اوپر رکھی اور میرے پاس بیٹھ گیا "بندہ ایک سمجھ لو کہ فوت ہی ہوگیا تھا۔"

"تیری دوائی سے اور کیا ہوتا تھا" ہیر نے کچن سے تبصرہ کیا۔

"ہے نا بے وقوف۔ او جھلی' جب اس کو میرے پاس لائے تو سمجھ لو کہ آخری سانس رہ گئی تھی۔ بڑا نام ہے ایک ڈاکٹر کا۔ اس نے تو کہہ دیا کہ اب میرے پاس کیوں لائے ہو۔ قبرستان لے جاؤ۔ مایوس لواحقین کو کسی نے ایک حکیم کا بتایا۔ اپنے آپ کو حکیم لقمان سمجھتا ہے۔ اس نے بھی بتادیا کہ مریض کو ملک الموت صاف نظر آرہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ لو۔ بس جی میں نے کہا کہ یا ربّا' اپنی عزت تیرے ہاتھ ہے اور اس بندے کی زندگی بھی۔ بسم اللہ شریف پڑھ کے دوائی دی۔"

"اور وہ کھڑا ہوگیا پیروں پر۔ ڈانس کرنے لگا۔ اوئے رانجھے اتنی گپ بازی گھر میں کرتا ہے۔ باہر والے جتنے ہوں گے" ہیر نے کہا۔

"بس یہی خرابی ہے پترجی۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ کوئی بیوی اپنے شوہر کی قدر نہیں کرتی۔ زمانہ بے شک اسے نوبل پرائز دے مگر رہے گا وہ ٹکے کا ٹکا۔" رانجھا نے خفگی سے کہا۔ "خیر چھوڑو۔ اچھا ہوا تم آج جلدی آگئے۔ ایک مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟"

"وہ حرامی شاہین حمام گرم والا۔ کل مان گیا تھا شرافت سے۔ آج پھر مکر گیا۔ کہتا ہے نوٹس دو۔ ایسے جگہ خالی نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "اس کا تو باپ بھی جگہ خالی کرے گا۔ آپ فکر مت کرو۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ایسے تھانے کچہری میں تو بڑا ٹائم ضائع ہوجائے گا۔ اس کی نیت مجھے ٹھیک نہیں لگتی پترجی۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ مجھے

جلدی ہے کلینک بنانے کی۔ مجھ سے کچھ وصول کرنا چاہتا ہے' چور دا پتر۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے آپ کو کچھ دے گا۔ یہ دنیا شرافت کی نہیں رہی ڈاکٹر صاحب!"

"نا۔۔۔ تو بدمعاشی کرے گا تو۔۔۔ مار پیٹ کرے گا؟" ہیر بولی "کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ خواہ مخواہ جان خطرے میں ڈالنے کی۔"

ماسی ہیر کی بات پر میں نے خاموش ہوجانا ہی بہتر سمجھا مگر دوسرے دن مسئلہ چنڈال چوکڑی کے سامنے پیش ہوا۔ سب سے پہلے جیرے بلیڈ نے پولیس کی وردی زیب تن کی اور شاہین حمام گرم پہنچ گیا۔ واپسی پر اس نے یہ رپورٹ دی۔

پروپرائٹر شاہین حمام گرم نے تھانے دار کا پُرجوش استقبال کیا "آؤجی' تھانے دار صاحب۔ حکم کرو' شیو کہ حجامت؟"

جیرے نے کہا "حجامت ہی ہونی ہے مگر میری نہیں تیری اور ادھر نہیں تھانے میں۔"

اس کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا فرمارہے ہو مائی باپ۔ ہمارا قصور؟"

"قصور تو تیرے باپ کا ہے جس نے تجھے پیدا کیا لیکن شکایت ملی ہے کہ تو ادھر دوسرا کام بھی کرتا ہے" جیرے نے میز پر بید بجاکے کہا۔

"دوسرا کام۔۔۔؟ ہاں جی' ختنے بھی کرتا ہوں۔"

"اوئے ختنے دے پتر۔ کچھ چرس وغیرہ بھی رکھی ہے ادھر تو نے اور اپنے گاہکوں کو لڑکیاں وغیرہ بھی سپلائی کرتا ہے۔"

وہ تھر تھر کانپنے لگا "قسم رب دی سرکار۔ جس نے بھی کہا ہے وہ میرا دشمن ہوگا۔"

"پھر تو سارے ہی دشمن ہیں تیرے۔ ادھر ایک ڈاکٹر صاحب ہیں۔ میں جانتا ہوں بڑے شریف آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی بدمعاشی کرتا ہے تو۔"

اس نے اپنے کان پکڑلیے۔ "توبہ جناب عالی' اپنا تو باپ دادا کے زمانے سے یہی کام ہے۔ سب کی خدمت کرنا۔ بدمعاشی کا نام لینا بھی گناہ۔"

جیرے نے خالص تھانے داروں والی زبان میں گرج کے کہا "سب معلوم ہے مجھے اور جو نہیں معلوم وہ تھانے جاکے معلوم ہوجائے گا۔ بہت شوق ہے نا تجھے تھانے جانے کا؟ ڈاکٹر صاحب کو بدمعاشی سے ڈراتا ہے۔"

وہ کچھ سمجھ گیا "ایسی بات نہیں مائی باپ۔۔۔ لیکن ان کی بھی بڑی زیادتی ہے جی۔"

جیرے نے اس کی گردن دبوچ لی "چل زیادتی کی رپورٹ لکھوادے' میرے ساتھ چل۔ ان کے بڑے تعلقات ہیں۔ ایس پی صاحب کی بیگم کا بھی علاج کرتے ہیں۔ تو انہیں دھمکیاں دیتا ہے۔"

اس نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے اور سو کا نوٹ نذر کرکے گلوخلاصی کرائی اور اگلے دن ڈاکٹر رانجھا سے شکوہ کیا کہ انہوں نے ایس پی سے شکایت لگادی اور تھانے والے اس کے پیچھے پڑگئے ہیں۔ ڈاکٹر رانجھا نے بڑے گول مول طریقے پر کچھ ہاں اور کچھ نہیں کہتے ہوئے اس پر واضح کیا کہ معاملات کو تھانے کچہری میں طے کرنے کی بات خود اس نے کی تھی پھر اب تھانے جاتے ہوئے ڈرتا کیوں ہے؟

اس سے اگلے روز جانی جن نے خلیفہ کا تعاقب کیا اور اسے گھر کے دروازے پر جالیا۔ وہ اندھیرے سے ایک دم نکلا اور اس کے سامنے ایسے آیا کہ خلیفہ ایک لمحے کے لیے گھبرا کے وظیفہ پڑھنے لگا۔ جانی جن نے اس سے کہا کہ وہ بال کٹوانے آیا ہے۔ ظاہر ہے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوا خلیفہ خالی ہاتھوں سے بال نہیں کاٹ سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ بال کٹوانے ہیں تو دکان پر بال لے کر آنا۔ جانی جن کا سر منڈا ہوا تھا اور وہ ایک دن چھوڑ کے سر پر استرا پھرواتا تھا اور تیل کی مالش کراتا تھا چنانچہ اس کا سر تربوز کی طرح چمکتا رہتا تھا جس پر پالش کی گئی ہو۔ خلیفہ کی بات پر جانی جن نے اسے یوں دبوچ لیا جیسے عقاب اپنے پنجوں میں دو دن کے چوزے کو پکڑے۔ خلیفہ بہت پھڑپھڑایا مگر جانی جن نے کہا کہ ہمیں انکار کرتا ہے؟ بال ہوں یا نہ ہوں۔ تجھے ابھی بنانے پڑیں گے۔ خلیفہ کا سانس تک رک گیا تھا۔ وہ حلق سے آواز بھی نہ نکال سکا پھر جانی جن نے کہا کہ وہ خلیفہ کو واپس دکان پر لے جائے گا کیونکہ آج رات اس کے ساتھی جنات کو بھی اپنے اپنے سر منڈوانے ہیں۔ انہیں شاہ جنات نے ایک معمولی سی غلطی پر یہ سزا دی ہے اور کہا ہے کہ شاہین گرم حمام جاؤ اور سر پر استرا پھرواکے صبح اپنے اپنے سر معائنے کے لیے پیش کرو۔ اسے صبح تک ایک سو ایک سر صاف کرنے ہوں گے ورنہ ایک سو ایک جن اس کی دکان میں گھس گئے تو انہیں نکالنے کے لیے ایک سو ایک عامل درکار ہوں گے جو ایک سو ایک دن جلالی عمل کرنا جانتے ہوں۔

خلیفہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کی نیم پاگل بیوی کے بارے میں پہلے ہی کسی نے کہہ دیا تھا کہ اس پر جن آتے ہیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی وجہ یہ ہے کہ گھر میں آسیب ہے۔ گھر کے بعد دکان میں جنات کا آنا اس کی روح فنا کرنے والی اطلاع تھی۔ معلوم نہیں اس نے کسی سے کیا کہا۔ مجھے تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے خود ہی ڈاکٹر رانجھا کی دکان خالی کردی اور مکان چھوڑ کے کہیں چلا گیا۔

میں اس دن شام کے وقت ائرپورٹ پر تھا۔ رئیس کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود میں اس راستے پر کھڑا ہوگیا تھا جہاں سے شادو کا گزرنا یقینی تھا۔

میں مقررہ وقت سے بہت پہلے پہنچ گیا تھا۔ ہاشمی صاحب کے ساتھی وکیل اور دوست احباب بعد میں آنے لگے۔ ان میں آفس کے لوگ بھی تھے جن کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ سب ان لوگوں کے مقابلے میں کچھ خاموش اور افسردہ تھے جو اپنے وطن لوٹنے والے کسی عزیز کا استقبال کرنے کے لیے آئے تھے۔ چند لوگوں کو میں بھی پہچانتا تھا جو ہاشمی صاحب کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ کسی نے زبان سے کچھ بھی نہیں کہا مگر ان کی نظریں مجھ پر عجیب انداز میں پڑتی محسوس ہوتی تھیں۔ یوں جیسے وہ پوچھ رہے ہوں کہ تمہارا یہاں کیا کام؟ یا کہہ رہے ہوں کہ ہم خوب جانتے ہیں تم یہاں کیوں آئے ہو؟

کراچی سے آنے والی فلائٹ لینڈ کرگئی تو سب کی نگاہیں اندر سے آنے والے راستے پر جم گئیں۔ بڑے بڑے شفاف شیشوں والے لاؤنج کے اندر لائٹس جل رہی تھیں پھر بھی دور سے کچھ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ جب مسافر آنے شروع ہوئے تو لوگوں کی بے چینی بڑھ گئی۔ کبھی کوئی اچانک انگلی اٹھا کے چلانے لگتا تھا۔ وہ۔۔۔ وہ آگئے۔۔۔" اور انتظار کرنے والوں میں سے کچھ لوگ کم ہوجاتے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی اور میں عجیب سی گھبراہٹ اور کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں اور وہاں سے چلا جاؤں۔ ایک سوال کی بازگشت تھی جو صرف مجھے وہاں موجود لوگوں کی باتوں کے شور سے الگ صاف سنائی دیتی تھی۔ "آخر تم یہاں کیوں آئے ہو؟ شادو سے اظہارِ ہمدردی کے لیے؟ نہیں پھر کیا اس کو شرمندہ کرنے آئے ہو؟ نہیں' اس پر طنز کرنے اور اس کا مذاق اڑانا چاہتے ہو؟ نہیں' اس پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ تمہیں اس سے کوئی شکایت نہیں۔ اس نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی' تم نے اسے فراموش کردیا۔ تم آج بھی اس کو چاہتے ہو۔ اس کو احساس دلانا چاہتے ہو کہ تمہارے دل کے دروازے اس کے لیے بند نہیں ہوئے؟"

انکار بھی لاحاصل تھا اور اقرار بھی بے معنی تھا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں وہاں کیوں موجود ہوں۔ آنے کا فیصلہ بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا آخری وقت میں چلے جانے کا۔ میں سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کے قابل ہی نہ تھا چنانچہ میں وہاں کھڑا رہا۔

گل نواز خان کو میں نے پہلے دیکھا۔ شادو اس کے پیچھے ایک عورت کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اتنی بدل گئی تھی کہ پہلی نظر میں اسے پہچاننا بھی میرے لیے مشکل ہوگیا تھا۔ اس کا لباس ہی نہیں چال بھی بدل گئی تھی۔ وہ اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے ہوئے تھی جو اس نے پہلے کبھی استعمال نہیں کی تھی۔ اس کے بال بھی کٹے ہوئے تھے اور اس کے شانوں تک چہرے کے گرد سنہرا ہالہ بنائے روشنی میں جھلملا رہے تھے اور جھول رہے تھے۔ پھسل رہے تھے اور پھیل کے سمٹ رہے تھے۔ اس کا رنگ بھی پہلے سے کہیں زیادہ صاف اور اجلا ہوگیا تھا۔ یہ میک اپ کا کمال تھا یا پھر لندن کی آب و ہوا کا۔

اس نے ایک بیگ اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا اور دوسرا نسبتاً چھوٹا بیگ جو لیڈیز پرس جیسا تھا اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ہائے حسین بیوہ" میرے پیچھے سے کسی نے سرگوشی کی۔

"اس کے لیے تو میں اب بھی مرنے کو تیار ہوں۔"

"یار' شرم کرو" کسی نے جواب میں کہا "بے چاری کتنی دکھی ہے۔"

"خاک دکھی ہے۔ یہ کمبو اداکاری کررہی ہے۔"

"اس کا شوہر تھا مرنے والا۔"

"شوہر! یار اپنے ایمان سے کہو۔ بڈھا مرنے کے قریب نہ ہوتا تو یہ اس سے شادی کرتی؟"

"جب۔۔۔ اسے کیا معلوم تھا؟"

"بالکل معلوم ہوگا۔ اللہ نے مجھے ایسی حسین لڑکی بنایا ہوتا تو میں بھی یہی کرتا یار۔ نہ پرائز بانڈ نکلتا ہے اپنا نہ کوئی دولت مند حسینہ پھنستی ہے۔"

ایسی باتیں کرنے والے ہاشمی صاحب کے آفس میں کام کرنے والے نچلے درجے کے ملازم تھے۔ کلرک' ٹائپسٹ اور چپراسی۔ ہاشمی صاحب کو ان کی پروا نہ ہو اور شادو بھی سب کو جوتی کی نوک پر رکھے مگر زبان خلق کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ جن حالات میں یہ شادی ہوئی تھی۔۔۔ دیکھتے ہوئے عام لوگ ایسی ہی باتیں سوچ سکتے تھے۔

شادو اندر ہی رک گئی اور وہ تینوں ہاتھ باندھے خاموش کھڑے اندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے دائیں جانب

گل نواز خان تھا۔ بائیں ہاتھ پر کھڑی عورت کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ گل نواز خان کی بیوی تھی۔ وہ اکیلا لندن نہیں گیا تھا۔ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ یہ اس کی دوستی اور شرافت کی وضع داری تھی مگر نہ جانے کیوں میرے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ مجھے رئیس خان کی بات یاد آگئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہاشمی صاحب کے بعد شادو کا شکار ہوگا گل نواز خان۔ وہ مجھ سے ایک لاکھ کی شرط لگانے اور یہ لکھ کر دینے کو تیار تھا' الو کا پٹھا۔

اندر سے چار افراد ہاشمی صاحب کا تابوت کندھوں پر اٹھائے نمودار ہوئے۔ باتیں کرنے والے بھی خاموش ہوگئے۔ تابوت ان تینوں کے سامنے سے گزرا پھر لاؤنج کے باہر صف بستہ لوگوں کے درمیان آیا تو دوسرے لوگ کندھا دینے کے لیے آگے آگئے۔ معلوم نہیں کیوں تابوت کو ادھر سے لانے کی اجازت دے دی گئی تھی جدھر سے مسافر آنے تھے۔ ورنہ تابوت کو ایمبولینس میں دوسری طرف سے باہر پہنچا دیا جاتا ہے۔ شاید یہ ہاشمی صاحب کے اثر رسوخ کا کرشمہ تھا۔

سب لوگ تابوت کے پیچھے چل پڑے تھے۔ تابوت میرے سامنے آیا تو مجھے بہت عجیب لگا۔ میں لکڑی کے خوب صورت پالش والے منقش تابوت میں لیٹے ہوئے ہاشمی صاحب کا تصور کرسکتا تھا۔ ابھی تک وہ ویسے ہی تھے جیسے اپنی زندگی میں نظر آتے تھے لیکن سوٹ کی جگہ ان کے جسم پر سفید کفن تھا اور وہ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹے ہوئے تھے۔

خاموشی کی ایک مہیب آواز نے کہا' لو بھئی اب میدان تمہارے لیے خالی ہے۔ اگلی بازی میں ہم نے تمہیں واک اوور دیا۔

میں شادو سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ حقیقت ہے کہ آخری وقت میں جب وہ میرے سامنے آئی تو مجھے بہت شرم آئی کہ میں وہاں موجود ہوں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف اور بے یقینی کا آسیب سا اتر آیا۔ جیسے وہاں سوگواروں کی صف میں کھڑا ہوا میں قہقہے لگا رہا ہوں۔ خوشی سے ناچ رہا ہوں اور اس کے سامنے مضحکہ خیز رسوا کن اور فحش حرکات میں مصروف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے لبوں پر مسکراہٹ بھی نہ تھی مگر آس چور کا میں کیا کرتا جو شادو کے دل میں چھپا بیٹھا تھا اور چلا رہا تھا' دیکھو' دیکھو۔۔۔ اس ناکام و نامراد عاشق زار کو دیکھو۔ یہ تم پر ہنس رہا ہے۔ تمہارا مذاق اڑا رہا ہے۔ تمہیں ذلیل کرنے آیا ہے اور اس کے باوجود ہمدرد بنا سوگوار چہرہ بنائے کھڑا ہے۔ کمینہ۔۔۔ دھوکے باز۔۔۔ لالچی۔

شادو کے قدم نہیں رکے۔ اسے بس ایک جھٹکا سا لگا پھر اس کی آنکھوں میں نظر آنے والا سوال روشن ہوگیا لیکن یہ روشنی نہیں آگ تھی اور اس آگ کو بھڑکانے والی نفرت تھی۔ صرف نفرت۔ اس اک نگاہ نے جو بظاہر نگاہ سے کم تھی۔ مجھ سے کہہ دیا کہ ناصر' تم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔

پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ ایک ایک کرکے پرانے لوگ چلے گئے۔ مجمع میں نئے لوگ شامل ہوگئے۔ اگلی فلائٹ سے آنے والوں کا انتظار کرنے والے۔ ایک عقابی نظر رکھنے والے سیکیورٹی کے آدمی نے مجھے تاڑ لیا۔

"تم بہت دیر سے کھڑے ہو یہاں' کس کا انتظار ہے تمہیں؟"

میں چونکا "ہاں۔۔۔ وہ وکیل صاحب۔۔۔ ہاشمی صاحب!"

"ان کے لیے آنے والے تو چلے گئے۔"

میں نے سر ہلایا "میں بھی جاتا ہوں۔"

اس کی نظر مجھے شک سے دیکھتی رہی مگر میں بے خیالی میں چلتا ہوا باہر آگیا۔ مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس پریشان کررہا تھا۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی کیا ضرورت تھی مجھے شادو کے سامنے جانے کی۔ اگر بعد میں وہ تجدید تعلق کی ضرورت محسوس کرتی تو خود مجھ سے رابطہ کرسکتی تھی۔ مجھے بُلوا سکتی تھی یا میرے پاس آسکتی تھی۔ ہم غیر یا دشمن تو نہیں تھے۔ شاید اب ایسا نہ ہو۔

رئیس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کردیا تھا۔ شام کے وقت وہ پیر انجن شاہ کی خدمت میں مستعد رہتا تھا۔ اسے یہ کام منافع بخش اور محفوظ ہی نہیں دلچسپ بھی لگتا تھا۔ میں نے ماسی ہیر کو نہیں بتایا تھا کہ میں شادو کے لیے ائرپورٹ جاؤں گا۔ اسے دیکھنے کے لیے یا ریسیو کرنے کے لیے یا اظہارِ افسوس کرنے کے لیے یا اسے ملامت کرنے کے لیے۔ ہر صورت میں وہ مجھے منع کرتی۔

میں ائرپورٹ سے نکل آیا۔ ایک کے بعد دوسری بس بدل کے میں شالامار باغ پہنچا اور پیدل چلنے لگا۔ سڑک کے کنارے چلتے ہوئے میرا دھیان ٹریفک کی طرف نہیں تھا۔ وہ محض اتفاق تھا کہ میں نے وسیم کو دیکھ لیا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور سب کچھ دیکھ رہی تھیں مگر وسیم کا عکس آنکھ کے پردے پر بنا تو میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا اسی سمت میں جارہا تھا۔ پہلے میں نے اس کا سائڈ پوز دیکھا پھر اس نے سر گھمایا تو پورا چہرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سامنے آگیا مگر وسیم کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ موٹر سائیکل چلانے والے سے باتیں کر رہا تھا۔

میرے حواس ایک دم بیدار ہو گئے اور میرا ماؤف دماغ اچانک اتنا مستعد ہو گیا کہ میں نے فوٹو موٹر سائیکل کا نمبر دیکھا۔ سیاہ پلاسٹک کی چٹ پر سفید حروف بہت واضح تھے۔ وہ نمبر میرے ذہن میں نقش ہو گیا۔ یہ سب ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے لمحے کو موٹر سائیکل دور چلی گئی اور وسیم میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

آدمی کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے میں محو ہو یا خیالوں کے پرستان میں گھوم رہا ہو' اس کا رشتہ زندگی سے اور اس کے حقائق سے منقطع نہیں ہوتا۔ دماغ کا خود کار نظام اسے پلک جھپکنے سے پہلے ہوشیار کر دیتا ہے۔ وہ ایک دم بریک لگا کے کسی کو گاڑی کے نیچے آنے سے بچا لیتا ہے یا خود چھلانگ مار کے بچ جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ وسیم کے خیال کا میرے ذہن میں کہیں دور تک گزر نہ تھا مگر اس کا چہرہ دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا اور مجھے صرف نمبر نوٹ کرنا یاد رہا۔

وسیم نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس جگہ سے ایک کلو میٹر کے فاصلے پر وہ سڑک تھی جو بائیں طرف نکلتی تھی۔ اس پر پیر انجن شاہ کے فراڈ کی گاڑی چل رہی تھی اور اسی سڑک پر رئیس نے وسیم کو ٹیکسی میں گزرتے دیکھا تھا' اب شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ یقیناً اسی علاقے میں رہائش پذیر تھا مگر اب اس کی تلاش کچھ آسان ہو گئی تھی۔

پیر انجن شاہ کے چیلے چانٹے خانقاہ کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے محنت بھی کر رہے تھے اور پیسہ بھی خرچ کر رہے تھے۔ رئیس مجھے بتا چکا تھا کہ جگہ پر انہوں قبضہ کیا تھا۔ روایت کے مطابق انہوں نے راتوں رات مسجد بنا دی تھی اور اس کے گرد احاطہ تعمیر کر دیا تھا۔ کسی کو خبر ہونے تک وہاں لاؤڈ اسپیکر سے اذان نشر ہو گئی اور نماز باجماعت کھڑی کرنے کے انتظامات بھی ہو گئے۔ مسجد' ملحق حجرہ' احاطے کے گرد مینار اور جھنڈے دوسری رات لگ گئے۔ پیر انجن شاہ کے نزول اجلال تک وہاں ایک مکمل خانقاہ کا پورا سیٹ لگایا جا چکا تھا اور وہ روحانی ماحول پیدا کر دیا گیا تھا جو عقیدت مندوں کو کھینچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ سب ذہانت اور کاروباری صلاحیت کا کھیل تھا۔ فاسٹ فوڈ اور فاسٹ میوزک کے دور میں چاچا پتنگ باز اگر جوگی بن کے بیٹھتا' کسی قبر پر ریاضت کرتا اور اپنے مقدس پُرنور حلیے سے لوگوں کو متوجہ کرتا تو اسے پیر کا درجہ حاصل کرنے میں مہینوں یا برسوں لگ سکتے تھے۔ اس نے ٹھیکے داری جیسا کام کیا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ کی طرح چٹ پیری پٹ کمائی۔ اس کی ٹیم بڑی تھی اور وہ سب چلتے پُرزے تھے۔ چاچا نے ایک باکمال ہدایت کار کی طرح کام کیا اور سارے بدارج چٹکی بجاتے میں طے ہو گئے۔ کسی کو حیران ہونے کا موقع بھی نہ ملا اور خانقاہ میں حاضری' لنگر' قوالی سب شروع ہو گئے۔ جو حیران ہوتا ہے ہوتا رہے۔ جو اسے فراڈ کہتا ہے کہتا رہے۔ جب تک بے وقوف زندہ ہیں' عقلمند بھوکے نہیں مر سکتے۔

چھوٹی دکان دیر میں گاہک کھینچتی ہے۔ خانقاہ دھوم دھام اور شان و شوکت سے شروع ہونے والی بڑی دکان تھی۔ اس کا افتتاح ہوتے ہی رش پڑ گیا تھا۔ چاچا پتنگ باز سارے جہان میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ اس نے پبلسٹی کے جدید طریقے آزمائے۔ اخبار والوں کو بلا لیا اور ان کے ذریعے اپنی کرامات کی کہانیاں شائع کرا دیں۔ لنگر کی تصویریں اور قوالی کی تصویریں الگ شائع ہوئیں۔ اس نے بڑی احتیاط برتی تھی اور کسی بڑے اخبار کے نمائندے کو نہیں بلایا تھا جو بال کی کھال نکالنے پر تل جائے۔ وہ سب بوگس صحافی تھے یا ایسے اخباری نمائندے جن کے اخبار میں ایڈیٹر اور رپورٹر سے فوٹو گرافر تک سب خیر سے اپنے ہی گھر کے اٹھائی بندے ہوتے تھے اور اسے پڑھنے والے بھی وہی اٹھائی قارئین۔ چاچا نے انہیں معقول معاوضہ دیا اور ان کی اچھی خاطر تواضع کی پھر ان سے کہا کہ وہ ہر جمعرات کی رات ہونے والی قوالی اور لنگر کی رپورٹ اور تصویریں جمعے کی صبح چھاپ دیا کریں اور اس دن سب اپنے اخبار کی اشاعت بڑھا دیں۔ دو ہزار سے دس ہزار تک سارا خرچہ پیر انجن شاہ کے ذمے۔ یہ اخبار نماز جمعہ سے قبل ہاکرز کو دے دیا جاتا تھا جو اسے جمعے کی نماز پڑھ کر نکلنے والوں کو مفت تھما دیتے تھے اور اس کام کے سو سو روپے لیتے تھے۔

چند ہفتوں میں پیر انجن شاہ کی خانقاہ کی شہرت اس نئی بستی سے نکل کے دس دس کوس تک پھیل گئی۔ بے شک اکثریت نے اس اخبار کو' خبر کو اور تصویر کو ڈھونگ قرار دے کر مسترد کر دیا مگر متاثر ہونے والی اقلیت بھی کم نہ تھی۔ اس طرح شہر کے ہر علاقے میں پیر انجن شاہ کے معتقد' مرید اور گن گانے والے پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد نکتہ چیں اور عیب جو یا پردہ چاک کرنے والے صحافی جو چاہیں اپنے بڑے اخبار میں لکھیں۔ عقیدت کا تعلق کبھی عقل سے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں۔ پیراں نمی پرند مریداں پرانند۔ یعنی پیر نہیں اڑ سکتے مگر مرید انہیں اڑا سکتے ہیں۔ اڑتا دیکھ بھی سکتے

ہیں اور حلفیہ کہہ بھی سکتے ہیں کہ پیر صاحب اڑتے ہیں۔

جب میں وہاں پہنچا تو قوالی جاری تھی۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو رئیس میرے ساتھ بیٹھا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تو کب آیا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ابھی۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے۔"

"رو کیوں رہا ہے؟" رئیس نے کہا۔

میں نے اپنے آنسو صاف کر لیے "بس ایسے ہی۔ قوالی کے بول اتنے پُرسوز تھے۔"

"جھوٹ مت بول مجھ سے۔ میں نے کہا تھا کہ مت جا وہاں۔ اس لیے کہا تھا الو کے پٹھے" رئیس بولا "دفع کر۔ لعنت بھیج اس کے خیال پر بھی۔ سمجھ لے کہ ہاشمی صاحب نہیں مرے' وہ مر گئی خود۔ کیا اپنی جان دے گا اس کے لیے۔"

میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ میں کہتا بھی تو اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ قوال اب بھی ایک ہی تال پر سر دھن رہے تھے۔ جاں سوز کی حالت کو جاں سوز ہی سمجھے گا۔ میں مجمع سے کہتا ہوں محفل سے نہیں کہتا۔ یہ عشق عشق ہے عشق عشق۔

قوالی سنتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آج جمعرات نہیں ہے۔ رئیس نے بتایا کہ اس کا اہتمام کسی عورت نے کیا تھا۔ دشمنوں نے اس کے بیٹے کو جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیا تھا۔ وہ چھوٹ کے گھر آگیا ہے۔ دو دن پہلے ہی پیر انجن شاہ نے فرمایا تھا کہ تیرے دشمنوں کا انجن الٹا چلنے والا ہے۔ تیرا بیٹا سیدھا انجن پر بیٹھ کے آئے گا۔

قوالی ختم ہوئی تو رئیس نے مجھے کھانے کے لیے کہا۔ میں نے کہا "اول تو بھوک نہیں ہے مجھے اور پھر یہ نذر نیاز کی خیرات تو میں ہرگز نہیں کھاؤں گا۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑا "چل پھر ادھر نیو شالامار لنک روڈ پر چکن تکا کھلاتا ہوں تجھے۔ پیدل چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے وسیم کو دیکھا میں نے۔"

وہ رک گیا "پھر یہاں دیکھا؟"

میں نے کہا "میں پیدل ہی آرہا تھا۔ یہاں سے ایک کلو میٹر کے فاصلے پر تھا کہ وہ میرے پاس سے موٹر سائیکل پر گزر گیا۔ میں نے موٹر سائیکل کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہے۔"

"ابے واہ' قسم اللہ کی اب نہیں بچے گا وہ۔" رئیس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا "صبح پتا کریں گے کہ موٹر سائیکل کس کی تھی۔"

میں نے کہا "صبح تدفین ہے ہاشمی صاحب کی۔"

"وہاں بھی جائے گا تو؟" رئیس بگڑ کے بولا۔

"ہم دونوں جائیں گے۔ وہ شادو کے شوہر ہونے کے علاوہ بھی کچھ تھا یار۔ ہمیں اس نے شاہ جی سے بچا لیا۔ ہماری ضمانت کی نوبت تک نہیں آنے دی اور۔۔۔ مرنے سے پہلے ایک گھر چھوڑ گیا جو میرے کام چاہے نہ آئے مگر ایک بہانہ بن گیا ہیر رانجھے کے لیے۔ قدرت کے آسرے کا۔ ان کی زندگی بدل گئی اور اسی مکان کی وجہ سے وسیم قابو میں آئے گا۔ وہ قابو میں آئے گا تو پھر بہت سے الٹے کام سیدھے ہو جائیں گے۔ آدمی کی برائی کے ساتھ اس کی اچھائی کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔"

رئیس نے تائید میں سر ہلایا "اور پیارے۔۔۔ اپن تو صاف بات کریں گے چاہے تجھے بُری لگے۔ اس عمر میں آدمی کی ٹھرک کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔ دوسری تیسری شادی جوانی میں کوئی نہیں کرتا۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔"

"ہاشمی صاحب بھی اِدھر اُدھر منہ مارتا ہو گا۔ اللہ معاف کرے میں مرنے والے کی غیبت کر رہا ہوں مگر ہر آدمی کی بات ہے یہ۔ سارے دولت مند سالے عیاش ہوتے ہیں۔ عورت ہی سب سے بڑی کمزوری بن جاتی ہے ان کی۔ ہاشمی صاحب بھی فرشتہ نہیں تھا۔ دل آگیا اس کا شادو پر۔ شادو سے پہلے دن میں نہ جانے کتنی بار دل راہ چلتے ہی آجاتا ہو گا کسی پر مگر شادو لفٹ نہ کراتی اسے تو دل آتا اور چلا جاتا۔ قصور سارا اس عورت کا ہے جو مرد کے اشارے کا جواب اشارے سے دے کر ہمت بڑھاتی ہے اس کی۔ جس دن شادو سے ایسی کوئی بات کی تھی ہاشمی صاحب نے' وہ مار تی اس کے منہ پر جوتی اور تھوک کے آجاتی اس کی دولت جائداد پر تو کچھ نہ ہوتا مگر اس کی اپنی رال ٹپکی۔"

"یار' ابھی کیا معلوم کیا ہوا۔ بلاوجہ اسے الزام مت دے۔"

"ابے اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔ فرض کر ہاشمی صاحب نے اسے بلیک میل کیا کہ یا تو شادی کر لو مجھ سے ورنہ میں ناصر کو شاہ جی کے حوالے کرتا ہوں۔۔۔ وہ مارا جائے گا نیکے کی طرح۔ یا پھر۔"

"ہاں بول۔۔۔ اور کیا ہو سکتا ہے؟" رئیس نے غور سے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے میری بھلائی کی خاطر اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کو قربان کردیا ہو۔" میں نے اسے ماسی ہیر کے نظریے سے آگاہ کیا مگر وہ نہیں مانا۔

"سب دل کی تسلی کی باتیں ہیں پیارے اور نہیں یقین تو آگے جا کے سب سمجھ آجائے گا۔"

"ابے رہنے دے نجومی کی اولاد۔ تیری ایک بات تو غلط ہوگئی۔ گل نواز خان شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی ساتھ گئی تھی۔ تو لکھ کے دے رہا تھا اور لاکھ روپے کی شرط لگا رہا تھا مجھ سے۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ہم نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔ کیا وہ دوسری شادی نہیں کرسکتا اور دوسری ایسی ہی ہوتی ہیں پیارے۔ پہلی تو ہوتی ہے خاندانی۔ دوسری باہر آدمی کی عقل پر سوار ہوجاتی ہے اور اسے گدھا بنا کے گھاس ڈال دیتی ہے تو وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتا ہے۔ سیکریٹری قسم کی لڑکیاں یہ چکر ضرور چلاتی ہیں کہ باس کی بیوی بن کے مالکن ہوجائیں اور وہ ہوتی ہیں بڑی چناخ پناخ۔ ہائی سوسائٹی میں ساتھ رکھنے کے قابل۔"

میں نے کہا "ایک ہاتھ ماروں گا تو ساری بکواس دھری رہ جائے گی۔ گل نواز خان کی پہلی بیوی ایسی ہی ہے۔ چناخ پناخ اور ہے بھی سرخ سفید پٹھانی۔ اول تو گل نواز نہیں قابو آنے والا کسی کے اور چاہے بھی تو اس کی وہ پٹھان بیوی گولی نہیں مار دے گی دونوں کو۔"

کسی فلسفی کی طرح رئیس خان نے متانت سے فرمایا "یار، عورت صرف عورت ہوتی ہے۔"

"جیسے ٹماٹر صرف ٹماٹر ہوتا ہے" میں نے اس کے ہاتھ مارنے کی کوشش کی مگر وہ بچ گیا۔

اگلی صبح ہاشمی صاحب کے جنازے میں سیکڑوں لوگ تھے۔ ہمیں کون پوچھتا۔ کوٹھی کے اندر باہر ہجوم تھا اور گاڑیوں کی قطاریں تھیں۔ اس آدمی کی واقعی شہر میں بڑی عزت تھی۔ مگر کیا اتنی ہی عزت شادو کو بھی ملی؟ میں نے سوچا۔ اور مل گئی تھی تو کیا باقی رہے گی؟ نہیں۔ یہ عزت تھی ہاشمی صاحب کی نسبت سے۔ ان کی بیوی کوئی بھی عورت ہوتی اسے مل جاتی۔ کوٹھی کے اندر نہ جانے کتنی عورتیں اسے تعزیت کے رسمی الفاظ کہتے ہوئے "مسز ہاشمی!" کہہ رہی ہوں گی، ان میں بہت سی شاید حقیقتِ حال سے بھی آگاہ ہوں گی۔ ان کی پہلی بیوی سے بھی واقف ہوں گی۔ پیٹھ پیچھے وہ کتنی باتیں کریں گی۔ خود میں نے ائرپورٹ پر مردوں کی زبان سے بہت کچھ سن لیا تھا۔ عورتوں کی زبان سے تو اللہ کی پناہ۔ غلط نہیں کہتے لوگ کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ اس کا گھر اجاڑتی ہے پھر روتی ہے اور باتیں بناتی ہے۔

کسی مرد کے شادو کے پاس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شرعی طور پر وہ عدت کے چار ماہ دس دن گھر میں گزارنے کی پابند تھی۔ میں قبرستان تک گیا اور لوٹ آیا۔ مجھے یقین نہیں کہ سب کے ساتھ ہاتھ اٹھائے ہوئے میں نے واقعی ہاشمی صاحب کے لیے مغفرت کی دعا بھی مانگی تھی۔

قبرستان سے لوٹتے وقت مجھے سچ مچ ایسا لگا جیسے میں اپنی محبت کو دفن کرکے آیا ہوں۔ ہاشمی صاحب کے لیے میرے جذبات صفر تھے۔ ان کی اچھائی برائی سب ان کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔ میری محبت کے قاتل وہ تھے مگر نہ جانے کیوں وہ مجھے اس خنجر یا ریوالور کی طرح لگتے تھے جن سے حالات نے یہ خون کرادیا تھا۔ نفرت میں حالات سے کرسکتا تھا۔ خنجر یا ریوالور کی گولی کے خلاف کیسے جذبات۔ حالات خود میرے پیدا کردہ تھے پھر میں نے ہی شادو کو وہاں رہنے دیا اور جب حالات پر قابو پانے کے لیے میں کچھ کرسکتا تھا تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

شادو میری دسترس اور میرے خیالوں سے دور چلی گئی تھی۔ آج بھی صورتِ حال وہی تھی۔ وہ میری پہنچ سے بہت دور تھی۔ اس کے اور میرے درمیان اجنبیت کی دراڑ اب ایک خلیج بن چکی تھی جسے پاٹنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کا پھر میری طرف ملتفت ہونا بھی اتنا ہی بعید از قیاس تھا جتنا میرا اس کے لیے پھر جذبات کی وہی طلسماتی کشش محسوس کرنا جو مرچکی تھی اور دل محض ایک مدفن بن گیا تھا جس کی لوحِ مزار پر لکھا ہوا تھا "یہاں شادو رہتی تھی۔"

ایک بوجھل دوپہر ہم نے بے مقصد گھومتے گزاری۔ اس دن رئیس میرے ساتھ ہی رہا اور رات کو بھی میں گھر گیا تو اس نے کہا کہ "یار، آج میں بھی ماسی ہیر سے مل لوں۔ کہتی ہوگی کیسا خون سفید ہے اس کا۔ گیا تو پھر لوٹ کے ہی نہیں آیا۔"

ماسی ہیر سے ملنے کا بس بہانہ تھا۔ وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اکیلا پن مجھے ڈپریشن میں مبتلا کردے گا اور میں بے وقوفی میں نہ جانے کیا حرکت کر بیٹھوں گا۔ کچھ بھی نہ کیا تو رات بھر شاید روتا رہوں گا۔ یہ اس کا میرے لیے خلوص تھا جو اسے پریشان کررہا تھا اور اسے بے بنیاد اندیشوں میں مبتلا کررہا تھا۔

ماسی ہیر رئیس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے مصنوعی غصے کا اظہار اسے گالیاں دے کے کیا۔ وہ ہنس ہنس کے سنتا رہا اور اسے چڑا کے غصہ دلانے والی باتیں کرتا رہا۔

"سنا ہے تمہارے ڈاکٹر رانجھا نے انسان کی دوا مرغے کو دے دی اور مرغے کی دوا بندے کو۔"

"ہاں تو غلطی ہوجاتی ہے بندے سے۔"

"مگر سنا ہے مرغے کے چیک لگ گئی ہے اور سرگنجا ہوگیا ہے رانجھے کی طرح اور وہ بندہ انڈے دینے لگا ہے۔ ماسی تم علاج کراؤ اس کا۔"

"کس کا۔ مرغے کا یا انڈے دینے والے کا" ماسی ہنسنے لگی۔

"ارے رانجھے کا۔ تھوڑا پاگل تو تھا پہلے ہی۔ ورنہ تم سے شادی کیوں کرتا، اب خطرناک پاگل ہوگیا ہے۔ چار نمبر بس جاتی تھی پہلے پاگل خانے۔"

ماسی نے اسے چپٹا مارا "تا تجھے نہ داخل کرادوں وہاں شکل بری ہے تو بات اچھی نکال منہ سے۔"

"شکل اس سبزی منڈی سے تو اچھی ہے" رئیس ہنستا رہا۔

"کون سبزی منڈی۔۔۔؟"

"وہی۔۔۔ جس کا سر ہے آلو جیسا۔ منہ گوبھی جیسا۔ پیٹ ہے کدو کی طرح اور ککڑی جیسی ٹانگیں۔ ناک جیسے لہسن اور آنکھیں ہیں کہ ٹماٹر۔"

ماسی اسے چپٹے سے مارتی بھی رہی اور ہنستی بھی رہی "آج آنے دے اسے۔ بتاؤں گی تو کیا کہتا ہے اسے۔"

ڈاکٹر رانجھا لوٹ کے آئے تو انہوں نے گزشتہ شب تیرے بلیڈ اور شاہین حمام گرم کے مالک کے درمیان ہونے والی گفتگو کا احوال سنایا اور یہ بھی بتایا کہ آج گرم حمام ٹھنڈا پڑگیا ہے۔ "یہ جانی جن کون ذاتِ شریف ہیں؟"

میں نے کہا "ایک جن ہے ہمارے قبضے میں۔ آج وہ خلیفہ کو جلوہ دکھائے گا۔ کل اللہ نے چاہا تو آپ کی دکان چھوڑ جائے گا وہ۔"

اگلے دن ہم نے وسیم کو تلاش کرنے کے لیے اس دفتر کا رخ کیا جہاں گاڑیوں کی رجسٹریشن ہوتی ہے۔ موٹر سائیکل کے نمبر سے مالک کا پتا چلانا آسان نہیں تھا مگر ہر مشکل کا حل ہماری جیب میں تھا۔ سو کا نوٹ پکڑ کے ایک ایجنٹ نے کہا۔ "ایک بندہ آجاؤ میرے ساتھ۔"

میں اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اندر ایک کلرک بادشاہ سے نیاز حاصل کیے اور معلوم نہیں اسے سو میں سے کیا ملا مگر مجھے چند منٹ میں شناختی کارڈ نمبر اور پتا دونوں معلوم ہوگئے۔ میں رئیس کے ساتھ پتا تلاش کرتا ہوا سنت نگر کے ایک مکان تک پہنچا تو اندر سے ایک عورت نے کہا کہ "شام کو آنا۔ ابھی تو وہ دفتر گئے ہوئے ہیں" ظاہر ہے وہ اس کے شوہر کا حوالہ تھا۔ شریف بیویاں اپنے شوہروں کا نام کہاں لیتی ہیں۔

شام تک انتظار کرنے کے بجائے میں نے دروازے کی جھری سے جھانکنے والی خاتون سے کہا "باجی۔ ان کے آفس کا پتا بتادو، ہم بڑی دور سے آئے ہیں۔"

اس نے بلا تردد بتادیا کہ وہ نسر کے چکلے میں ہیں۔ نسر کے چکلے کے دفاتر دھرمپورے میں نسر کے کنارے ہی تھے یعنی تقریباً اسی جگہ جہاں ہم رہتے تھے۔ انہی دفاتر کے پیچھے ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کا بلکہ میرا وہ مکان تھا جو مرحوم ہاشمی صاحب نے میرے نام کردیا تھا۔ اگلا مرحلہ اسے فروخت کرنے کا تھا۔ سارے جہاں میں خوار ہو کے ہم لوٹ کر وہیں آئے جہاں سے چلے تھے۔

وہ تو ہمیں مل گئے مگر وسیم کا نام سن کے وہ سوچ میں پڑ گیا "کل میں ایک بندے کے ساتھ گیا تھا ادھر لیکن اس کا نام تو کچھ اور ہے۔ اس نے میرا مکان کرائے پر لیا تھا۔ کرایہ نامہ دستخط کرانا باقی تھا مگر اس کا نام تو گلزار احمد ہے۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے یہی نام ہو۔ بھائی نے پرچی پر دو نام لکھ کر دیے تھے۔ ایک کو گیارہ سو پہنچانے تھے اور ایک کو نو سو۔ اسی میں گڑبڑ ہوگئی۔"

وہ مطمئن ہوگیا اور اس نے مجھے تفصیل سے پتا سمجھادیا پھر بولا "تم آدھا گھنٹا رک جاؤ تو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ تم رکشا پکڑ لینا۔ میں موٹر سائیکل پر چلوں گا۔ دراصل اس نے آدھا کرایہ دیا ہے۔ باقی آدھا ابھی وصول کروں گا۔ کتنے دو گے تم اسے نو سو کہ گیارہ سو؟"

رئیس نے میری طرف دیکھا۔ ہمارا جھوٹ مہنگا پڑ رہا تھا "ہم تو ابھی نہیں کل جائیں گے جی بس سے" میں نے کہا۔

باہر نکلتے ہی میں نے رئیس سے ہاتھ ملایا "کیوں استاد، کیسی رہی؟"

"وہ سالا اب گلزار احمد ہوگیا ہے" رئیس بولا "اس کی تو۔۔۔"

وسیم کا گھر ہم نے کسی دشواری کے بغیر تلاش کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے ہم.... کئی بار اس گھر کے سامنے سے گزر چکے تھے اور آس پڑوس کے لوگوں سے بھی پوچھ چکے تھے مگر یہاں آئے اسے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے اور وہ اپنے اصل نام سے نہیں آیا تھا۔

گھر کے بیرونی دروازے پر تالا دیکھ کے ہمیں کوفت ہوئی۔ "اب اس کا انتظار کرنا پڑے گا نہ جانے کب تک۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "چل وہ گانا گاتے ہیں۔ ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔"

ہم بلاوجہ دروازے کے سامنے کھڑے رہتے تب بھی مشکوک ہو جاتے اور گلی میں ٹہلتے پھر بھی لوگ شک کرتے۔ خدائی فوجدار قسم کے اور طبیعتاً شکی مزاج جو اپنی ولدیت پر بھی شک کرتے ہوں' ہم سے سوال جواب کرتے۔ گلی میں وسیم کے آنے کا راستہ وہی ہو سکتا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ ادھر ایک نسبتاً چوڑی گلی تھی جس کے مقدر میں باری آنے پر سڑک کہلانا لکھا تھا۔ دوسری طرف جا کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ گلی دائیں بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ بالکل سامنے ایک برساتی نالہ سا تھا۔

اس جغرافیائی صورتِ حال نے ہمارا مسئلہ کچھ آسان کر دیا۔ ہم گلی کے اس موڑ کی طرف چلے گئے جہاں مستقبل بعید کی سڑک موجود تھی۔ صرف وسیم ہی نہیں گلی کے دوسرے لوگ بھی اسی طرف سے آ جا رہے تھے۔ وہاں ایک بھٹے والا پہلے سے کھڑا تھا۔ ہم اس کے قریب ہی سڑک کی منڈیر پر بیٹھ گئے مگر وہ کسی پلاٹ کی حد بندی ثابت ہوئی۔ گرم گرم بھٹے کھانے کا لطف اس لیے نہیں آیا کہ ہمارا اصل مقصد وقت گزاری تھا۔ ہم بڑے اہتمام سے ایک ایک دانہ چن چن کر نوش فرماتے رہے۔ رئیس نے آخری دانہ منہ میں ڈالنے سے پہلے آہ بھر کے پوچھا کہ "وسیم تو ابھی تک نہیں آیا' اب ہم کیا کریں گے۔"

میں نے اسے ایک مدبرانہ جواب دیا "ہم دوسرا بھٹا کھائیں گے۔ اس کے بعد تیسرا۔"

"اور اس کے بعد۔" رئیس نے فوراً دوسرے بھٹے کا آرڈر دیا۔

"یہ بھٹے والا ریڑھی لے کر اپنے گھر چلا جائے گا' ہم اپنے گھر۔ کل پھر آئیں گے بھٹے کھانے" میں نے کہا۔

لیکن قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ ہم دوسرے بھٹے کا آرڈر کینسل کرنا چاہتے تھے کیونکہ وسیم ہمارے سامنے سے گزر کے گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ بھٹے والے نے سودے کی منسوخی کو غیر اخلاقی فعل قرار دیا تو ہم چند منٹ بعد دوسرا بھٹا کھاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ہماری نظر وسیم پر تھی۔ وہ تالا کھول کے گھر میں ایسے داخل ہوا تھا جیسے وہ گھر کسی اور کا ہے۔

اس نے دستک پر جیسے ہی دروازہ کھولا' میں نے کہا "السلام علیکم!" اور اندر داخل ہو گیا۔

اس نے ہمارا راستہ روکنے کی واجبی سی ناکام کوشش کی۔

"کیا بات ہے؟"

رئیس نے اسے بھٹا پیش کیا "لو۔۔۔ گرم ہے۔"

"کیوں آئے ہو تم لوگ یہاں" پریشانی اس کی صورت پر پھیل گئی۔

"اچھا ہوا جو تم نے یہ نہیں پوچھا کہ کون ہو تم" میں نے کہا "تم ضرور پہچان گئے ہو گے کہ میں ڈیرا غازی خان کا غازی خان ہوں۔"

"اور میں ڈیرا اسماعیل خان کا اسمٰعیل خان" رئیس بولا "ہم بھائی ہیں۔"

"یہ شہر ہم نے ہی آباد کیے تھے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے نام۔"

"شش" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھی "آہستہ بولو اور دروازہ بند کر دو۔ یہاں لوگ تمہارا نام بھی نہیں جانتے کہ تم گلزار احمد نہیں وسیم احمد ہو۔ ہم بھی نام بدل سکتے ہیں۔"

رئیس نے کہا "اس کے علاوہ جو باتیں ہم کہنا چاہتے ہیں' وہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ تم بھی نہیں چاہو گے کہ کسی کو معلوم ہو۔"

میں نے کہا "ہم نے محکمۂ نہر میں کام کرنے والے تمہارے مالک مکان کو بھی کچھ نہیں بتایا جس نے ہمیں تمہارا پتا سمجھایا تھا۔"

وہ مختصر سے صحن میں ہمارے سامنے کھڑا ہمیں یوں گھور رہا تھا جیسے ہمیں ہپناٹائز کر رہا ہو "تم لوگ مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟"

"ہاں۔ ایک بار پہلے بھی آئے تھے۔ تمہارے پرانے گھر میں مگر تم نے ہمیں سالے تھانے دار کے سپرد کر دیا تھا۔ بہت مار پڑی تھی ہمیں" میں اطمینان سے بھٹا کھاتا رہا۔

"اب سالا تھانے دار خود تمہاری تلاش میں ہے۔" رئیس بولا۔

"اس کے علاوہ۔۔۔ میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے" میں نے اسے دکھا کے ریوالور پھر جیب میں ڈال لیا "یہ اصلی ہے۔ نقلی کے دھوکے میں کوئی بے وقوفی مت کرنا۔"

رئیس نے کہا "نام کے ساتھ تم حلیہ بدلنے کی کوشش بھی کر رہے ہو' کتنے دن سے شیو نہیں بنوائی پیارے؟"

میں نے کہا "پندرہ دن میں خشخشی ہو گئی ہے داڑھی۔ ایک مہینے میں صوفی کہلانے کے قابل ہو جائے گی۔ ابھی لعنت برس رہی ہے' پھر نور برسے گا چہرے پر۔"

اس کا حوصلہ جواب دے گیا "دیکھو' یہ ڈرامے بازی بند کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے"

"کیا ہم اطمینان سے بیٹھ کے بات کریں" میں نے کہا۔

وہ ہمیں اندر لے گیا۔ دو کمروں والے چھوٹے سے گھر میں میرا سا سامان ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ ابھی اس نے سیٹنگ شروع نہیں کی تھی۔ ہم بید کی بنی ہوئی دو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کیا شروع کی کہانی دہرانے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "کہ تمہارے بھائی کو پھانسی ہو گئی تھی پھر تم نے اپنی خوب صورت اور تم سے زیادہ دولت مند بھابی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔۔۔ پھر بقول تمہارے وہ آوارہ عورت گھر سے بھاگ گئی مگر سچ یہ ہے کہ تم نے اسے مڈل ایسٹ کے ایک خبیث بردہ فروش کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے بردہ فروش کو سوتیج پا کے قتل کر دیا اور تمہیں بھی قتل کرنے کی کوشش کی مگر قسمت خراب تھی اس کی۔ وہ خود تمہارے ہاتھوں ماری گئی۔ تم نے اس کی لاش کو اسی کے گھر کا صحن کھود کے گاڑ دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ سب جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ کسی حد تک اخبارات کی خبروں اور قیاس آرائیوں میں بھی ملتا ہے۔ وہ رپورٹیں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ایک فوٹو کاپی تمہیں بھی دی تھی۔ بعد میں کیا ہوا' یہ میں جانتا ہوں۔ تمہارا ایک بھتیجا تھا ناصر عظیم' میرا ہم نام۔ تم اسے یتیم خانے میں چھوڑ گئے تھے۔ وہاں اس نے مجھے سب بتا دیا تھا اور میری شہ پر وہ تم سے اپنا حق مانگنے پہنچ گیا تھا۔"

"کوئی ثبوت نہیں کسی کے پاس۔"

میں نے بھٹے کا خالی سٹا کھینچ کر اس کے منہ پر مارا "مجھے جھوٹا کہہ کے اشتعال مت دلاؤ ورنہ یہ سٹا۔۔۔ (ناقابلِ اشاعت)۔۔۔ میں نے پھر سٹا اٹھا لیا۔"

رئیس نے اسے دوسرا سٹہ دکھایا "یہ بھی خالی ہونے والا ہے۔"

"تم نے حادثہ بنا کے ناصر کو قتل کرا دیا۔ اس کے مکان پر قبضہ کر لیا اور اس کی ماں کے کچھ نقد اور زیور پر بھی۔ یہ کارنامہ تم نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کے سرانجام دیا تھا۔ ناقص العقل عورت ذات نے ۔۔۔۔۔۔ تمہارا ساتھ دیا تھا کہ وہ ایک سوکن قبول کرنے سے بہتر یہ سمجھتی تھی کہ اس کا کام تمام کرنے کے جرم میں شریک ہو جائے۔ لالچ الگ غالب تھا اس پر۔ سارا زیور اسے ہی ملا۔ تقریباً ستر ہزار مالیت تھی اس کی۔ بھائی کی دکان بھی تمہاری ہو گئی جو بعد میں تم نے بیچ دی۔ مکان بھی بیچ دیا مگر اس کے صحن میں وہ لاش ابھی تک محفوظ ہو گی۔ میرا مطلب ہے اس کا ڈھانچا۔"

"تمہاری بات کوئی نہیں مانے گا۔ یہ الزام ہے' جھوٹ ہے" وہ چلایا۔

میں نے کہا "آہستہ۔۔۔ آہستہ بولو' نیا محلہ ہے۔ لوگ تمہارے پرانے کرتوت سے واقف ہو گئے تو پولیس کو بلا لیں گے۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ یہ پولیس کیس بنے۔"

میں نے رئیس کی تائید میں سر ہلایا "آپس کے معاملات ایسے ہی طے کیے جا سکتے ہیں۔"

اس نے اب اپنی گھبراہٹ پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ "تم پہلے ہی ایک بار کوشش کر چکے ہو پھر جاؤ اور میرے خلاف ایف آئی آر لکھوا دو۔ تمہاری بکواس کوئی نہیں سنے گا۔ نہ میں نے کسی کو قتل کیا اور نہ کہیں دفن کیا۔ اتنا آسان نہیں ہوتا کسی پر الزام لگانا۔ ایسے تو میں کسی کا بھی نام لے کر کہہ دوں کہ اس نے اپنے صحن میں لاش گاڑی ہے۔ تو کیا میرے کہنے پر پولیس گھر میں گھس کے صحن کھودنا شروع کر دے گی؟ وہ مکان مجھ سے ایک بہت بڑے وکیل نے خریدا تھا۔ ہاشمی صاحب نے۔"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "یار' چائے کا بڑا موڈ ہے۔"

"میزبان سے کہہ' یہ میرا گھر نہیں ہے" رئیس بولا۔ "میں بھی مہمان ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ تم دونوں یہاں سے۔"

میں نے رئیس سے کہا "دیکھ یار۔ یہاں کوئی تھرمس یا کیتلی ہو تو گلی کے نکڑ تک چلا جا۔ کہیں چائے ضرور مل جائے گی۔"

رئیس اٹھ کھڑا ہوا "میں دیکھتا ہوں استاد!"

وسیم بھی کھڑا ہو گیا "لگتا ہے تم لوگ شرافت سے نہیں جاؤ گے۔"

میں نے اسے دھکا دیا اور وہ کرسی پر گرا تو کرسی الٹ گئی۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا "شرافت کا نام بھی مت لینا دوبارہ۔ ہم تو گولی مار کے بھاگ جائیں گے۔ محلے والوں کے آنے سے پہلے اور تم گلزار احمد۔۔۔ لاوارث سمجھ کے کہیں گاڑ دیے جاؤ گے' چندے کے کفن سے۔"

وہ سیدھا بیٹھ گیا "آخر کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "تم نے جس وکیل کا نام لیا تھا' چار پانچ دن پہلے اس کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ دل کا دورہ پڑنے سے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے آج ہی میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ کل خبر دیکھ لینا اخبار میں۔ اس نے مرنے سے پہلے وہ مکان مجھے فروخت کردیا تھا جو اس نے تم سے خریدا تھا۔ اس میں کوئی رہنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مکان آسیب زدہ مشہور ہوگیا تھا ایک عورت کی وجہ سے۔ وہ عورت تمہارے پڑوس کے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا۔ تم اور تمہاری بیوی مل کے ایک لاش کو دفنا رہے تھے۔ صحن کھودنے کی آواز نے اسے متوجہ کیا تھا اور وہ خاموشی سے سب دیکھتی رہی تھی۔ اس نے لاش کو بھی پہچان لیا تھا۔ مرنے والی عورت ــــ بلکہ قتل کی جانے والی عورت نے قتل سے کچھ دن پہلے اسے ایک خط لکھا تھا۔"

وہ بُری طرح چونکا "تم ــــ جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے اسی اطمینان سے اپنی بات جاری رکھی "وہ خط بھی دکھادیا جائے گا تمہیں۔ مقتولہ نے اس میں سب بڑی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے اور یہ بھی کہ اسے کس بات کا ڈر ہے۔"

"اگر ایسا تھا ــــ تو اس نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی۔"

میں نے کہا "ایک تو وہ عورت تھی' اکیلی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی تھانے جانے کی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آج کل مرد بھی بزدل' خودغرض اور کمینے ہوگئے ہیں۔ قتل اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھ لیں تب بھی منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں اور خاموشی میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ..... اس عورت کی دوسری مجبوری تھی اس کا بیٹا جو ایک حادثے کے بعد سے کوما میں پڑا تھا۔ مفلوج اور بے ہوش۔ اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ وہ عورت کون تھی۔ اس کا بیٹا مہینوں اسی حالت میں پڑا رہا اور بالآخر مرگیا۔ محلے کا ایک ڈاکٹر اس کا جو علاج کرسکتا تھا کرتا رہا۔ عورت صدمے سے پاگل ہوگئی تھی اور لوگوں کو قتل کی اس واردات کے بارے میں بتاتی پھرتی تھی۔ ظاہر ہے پاگل سمجھ کے اس کی بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرتا تھا مگر اچانک ایک دن اس نے وہ خط میرے حوالے کردیا۔"

"کون سا خط ــــ" وسیم کی آواز بڑی مشکل سے نکلی۔

"وہی خط جو تمہاری مقتولہ بھابی نے لکھا تھا۔ دراصل میں نے پہلے وہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ انسانی آوازوں نے اسے متوجہ کیا۔ اس وقت بڑھیا کا بیٹا زندہ تھا۔ وہ کچھ دن بعد مرا۔ اس نے مجھے دیکھا اور معلوم نہیں کیسے ذکر نکل آیا ناصر کا اس کے باپ کا اور ماں کا۔ اس نے مجھ سے بھی کہا کہ گھر پر آسیب ہے۔ گھر کے مالک کو پھانسی ہوگئی۔ اس کی بیوی غائب ہوگئی اور لڑکا حادثے کا شکار ہوگیا مگر مجھے معلوم ہے کہ اس لڑکے کی ماں کو بھی قتل کیا گیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے جو دیکھا تھا سب بتادیا اور وہ خط بھی دے دیا۔ بعد میں اس کا لڑکا مرگیا اور وہ اس کے سوئم سے پہلے ہی غائب ہوگئی۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا نہیں لیکن وہ خط میرے پاس محفوظ ہے۔ اب تم ساری صورتِ حال پر غور کرو۔ مکان کا مالک میں ہوں۔ مجھے اپنے گھر کا فرش کھودنے سے کون روک سکتا ہے۔ میرے پاس آدھی کہانی اخباری تراشوں کی صورت میں موجود ہے۔ ایک خط میں لکھی ہوئی ہے جو مقتولہ کے ہاتھ کی تحریر ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ تمہاری شریکِ جرم' چشم دید گواہ' تمہاری شریکِ حیات زندہ ہے اور اپنے بھائی کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

رئیس کہیں سے پائے لے آیا تھا۔ اس نے کچن میں چولہا جلاکے اسے پھر گرم کیا اور ہمیں ایسے پیش کیے جیسے وہی صاحبِ خانہ ہے۔ میں اور وسیم مہمان ہیں۔ وسیم پر جیسے آسمانی بجلی گرگئی تھی۔ یادِ ماضی کے حوالے سے اب اس کا واحد مسئلہ اس کی بیوی رہ گئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ سالا تھانے دار تھا۔ اگر وہ عام آدمی ہوتا تو وسیم اسے کب کا طلاق دے کر فارغ کرچکا ہوتا اور بالکل آزاد ہوتا۔ بھائی' بھاوج' بھتیجا اور بیوی۔ سب کا مسئلہ ختم۔ اس کے بعد رام رام جپنا پرایا مال اپنا۔ ہم تو اس کے دماغ کے کسی دور افتادہ گوشے کا خیال بھی نہ تھے۔ وہ ہمیں بھول چکا تھا اور یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ہم نظر نہ آنے والے سائے کی طرح مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں۔

وسیم کے سامنے فرار کے راستے مسدود ہوجانے کے بعد دو ہی راستے کھلے رہ گئے تھے۔ ایک راستہ سیدھا تختۂ دار تک جاتا تھا اور دوسرا ہماری شرائط تسلیم کرنے کی مجبوری کی طرف۔ ظاہر ہے پھانسی چڑھنے کا یقین ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ وہ دوسرا راستہ اختیار نہ کرتا تو کیا کرتا۔

بالآخر اس نے کہا "دیکھو..... میں..... میں ـــ" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"میں میں کیا ــــ" میں نے کہا "یہاں ہم ہی ہم ہیں' آگے بولو۔"

"تم بڑے حرامی ہو۔ میری باتیں ٹیپ کرلوگے۔" وہ بولا۔

"پہلے رئیس کی تلاشی لے کر اپنا اطمینان کرلو' پھر میری تلاشی لے لینا۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی خاص

بات کہنا چاہتا ہے۔ اس کا خوف دور کرنا ضروری تھا۔

"میں مانتا ہوں کہ میں نے یہ سب کیا" اس نے بالآخر اپنی شکست کا اعتراف کرلیا "لیکن ــ؟"

"تمہاری زبان کیوں رک جاتی ہے بار بار ــــ لیکن ــــ؟"

"لیکن میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"سب دوسروں کو مارنا چاہتے ہیں۔ خود مرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ مرنا سب کو ہے ایک دن" میں نے کہا۔

"مجھے پھانسی ہوجائے گی" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"انشاء اللہ" میں نے کہا "تمہیں بھی اور تمہاری منکوحہ کو بھی۔ اس جہاں کی شریکِ حیات جہنم میں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

"مجھ سے صاف بات کرو۔ ایک بار بتادو کہ تم کیا چاہتے ہو اور پھر میری جان چھوڑدو۔"

"میں اتنا آسان حل پیش کررہا ہوں تمہاری مشکلات کا ــ کہ تم سنوگے تو دم بخود رہ جاؤگے۔"

رئیس بولا "یہ اس وقت بھی دم بخود ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاؤ" میں نے کہا۔

"ایں؟" اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی "کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا کہ اپنی پرانی زندگی کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کردو جہاں سے ختم ہوا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی اپنے گھر میں رہو۔ کھاؤ پیو' موج کرو۔"

"پوتوں نہاؤ دودھوں پھلو" رئیس بولا۔

"جب بولے گا الٹا بولے گا' ابوجہل" میں نے کہا "خیر اپنے وسیم احمد عرف گلزار احمد صاحب۔ یہ ویسے تو مشکل بلکہ ناممکن لگتا ہوگا تمہیں مگر ہے بہت آسان۔ اب پوچھو کیسے؟"

اس نے مجبوراً کہا "کیسے؟"

"وہ ایسے کہ تم میرا مکان مجھ سے خریدلو۔ جو درحقیقت تمہارا ہی تھا یا ہوگیا تھا۔ اس کے لیے تم مجھے ادا کردو پانچ لاکھ۔"

"پانچ لاکھ" اس کے حلق سے کراہ نکلی۔

"ہاں۔ میں تمہیں بلیک میل نہیں کرنا چاہتا ورنہ کہتا دس لاکھ۔ آدمی کی حیثیت دیکھ کے بات کرنی چاہیے۔"

"بہت جائز مطالبہ ہے" رئیس خان نے کہا۔

"مگر پانچ لاکھ میں کہاں سے لاؤں گا؟" اس نے فریاد کی۔

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "اس کے سوال کا جواب دو۔"

رئیس نے سوچ کے کہا "بینک سے لاؤ۔ اگر گھر میں نہیں ہیں۔ بینک میں بھی نہیں ہیں تو ادھار لو کسی سے۔ سود خور پٹھان ضرور دے سکتے ہیں۔ بعد میں جو ہوگا اس کی ابھی سے فکر مت کرو۔ ورنہ چوری کرو' ڈاکے ڈالو ــــ کوٹھے پر بیٹھ جاؤ۔"

میں نے اسے ڈانٹا "بے وقوف ..... یہ مرد ہے۔"

"تو پھر اس کی بیوی بیٹھ جائے" رئیس بولا۔

"اس کا بھائی تھانے دار ہے۔ اس کی تو عزت ہے" میں نے کہا "یار گلزار۔ ہم مہلت دیں گے تمہیں ہفتے دس دن کی۔"

اس نے صورتِ حال کی سنگینی کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا۔ "ابھی فرض کرو میں پانچ لاکھ میں وہ گھر تم سے لے لوں۔"

"ہاں۔ یہ ہوئی نا بات" میں نے کہا "اس کے بعد تم جاؤ اپنی سسرال اور اپنی بیوی بچوں کو واپس لے آؤ۔ بیوی تمہاری [illegible] وفادار ہے اور شوہر پرست ورنہ اب تک تمہیں لٹکوا کے عدت سے بھی فارغ ہوجاتی اور نکاحِ ثانی کرچکی ہوتی۔"

"یہ ناممکن ہے" وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"سب ممکن ہے جو ہم فرمارہے ہیں" میں نے کہا "وہ شریکِ حیات ہونے کے ساتھ شریکِ جرم بھی ہے۔ تم دونوں کے درمیان پھوٹ نہیں پڑنا چاہیے پھر اس کا بھائی ہے تھانے دار۔ کسی وجہ کے بغیر بھی تم کو پھانسی چڑھانے کا اختیار رکھتا ہے مگر صرف اپنی بہن کے خیال سے کچھ نہیں کرتا۔ جب تک وہ تمہارے ساتھ ہے سمجھو کہ تمہاری لائف انشورنس پالیسی ہاتھ میں ہے۔ تم اس گھر میں رہ کے اپنی بھابی مرحومہ کے مزار شریف پر روز قرآن خوانی کرو۔ پھول چڑھاؤ' کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ سالا تھانے دار ہو تو کس کی مجال کہ گڑے مردے اکھاڑے۔ تمہارا صحن کھود کے۔ دیکھا کیسی زبردست اسکیم ہے۔ میاں بیوی راضی۔"

"تو کیا کرے گا قاضی" رئیس بولا۔

"پھر بے تکی بات۔ قاضی کا اب کیا کام" میں نے کہا۔ "بچے راضی۔ سالا تھانے دار راضی' ہم راضی' ہمارا خدا راضی لیکن یہ سب راضی نامہ ہوسکتا ہے صرف ایک ہی صورت میں کہ تم پانچ لاکھ میں خود اپنا مکان خریدلو۔"

وہ خلا میں گھورتا رہا "اس کے بعد بھی کچھ حرامی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرور ہوگا۔"

"قسم اللہ کی اس کے بعد معاملہ ختم۔ ہم ساری عمر تمہاری منحوس شکل نہیں دیکھیں گے" رئیس بولا۔

"وہ بات یہ ہے کہ ویسے تو ہم پیسے کو کچھ نہیں سمجھتے ہیں" میں نے کہا "مگر تمہیں وہ مکان مفت تحفے میں بھی نہیں دے سکتے۔ تم سمجھ لو کہ سزائے موت نہیں ہوئی۔ بس پانچ لاکھ جرمانہ ہوا۔ ایک معاہدہ ہوگیا ہے ہمارا جس کی رو سے ہم پابند ہیں کہ تمہاری سابق ازدواجی زندگی پھر شروع ہوجائے۔ اسی طرح جیسے پہلے تھی۔ اس بیوی سے چھٹکارا پانے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ کلمۂ شہادت پڑھو اور سولی چڑھ جاؤ۔"

وہ بہت دیر خاموش بیٹھا اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ غیب سے مسئلے کا کوئی تیسرا حل نازل ہوجائے مگر جو ناممکن تھا وہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر پانچ لاکھ اس کے پاس نہ ہوتے تو وہ چیختا چلاتا اور کوشش کرتا کہ ہم یہ رقم کچھ کم کردیں۔ لاکھ دو لاکھ لے لیں۔ جتنا اس کے پاس ہے سب لے لیں لیکن اس کا ذہن خوف اور صدمے سے ماؤف ہوگیا تھا اور وہ شدید مایوسی کا شکار تھا۔ اس کے فرار ہونے اور روپوش ہوجانے کی اسکیم بھی فیل ہوگئی تھی۔ میرے نزدیک یہ احمقانہ کوشش تھی اور اس کو جلد یا بدیر ناکام ہی ہونا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس شہر سے کیا ملک سے ہی نکل جاتا مگر نہ جانے کیوں اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

"مجھے کچھ سوچنے دو۔ تھوڑا ٹائم دو" وہ بالآخر بولا۔

"سوچنے کے لیے یا بھاگنے کے لیے؟" رئیس نے کہا۔

"یہ ثابت ہوگیا ہے کہ تم بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے پھر کوشش کروگے تو پھر نتیجہ یہی نکلے گا۔ ہم بھوت کی طرح تمہارے پیچھے رہیں گے۔ بھاگو کہاں بھاگتے ہو۔" میں نے کہا "ہم نے بڑی مشکل سے تمہیں دوبارہ تلاش کیا ہے۔ اب ہم تمہیں گم کرنے کا کوئی رسک نہیں لیں گے۔ ہم میں سے ایک ہر وقت ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوگا۔ تمہیں نظر آئے یا نہ آئے اور ہمارے علاوہ پولیس بھی تمہاری تلاش میں ہے۔ بشیر چوہدری نے سب کو تمہارے نام اور حلیے سے آگاہ کردیا ہے۔"

"اس کی تھانے داری مجھ پر نہیں چلے گی۔"

میں نے کہا "دیکھو وسیم۔ عقل سے کام لو۔ کب سے تم اپنے ہی اعمال کے جہنم میں عذاب کاٹ رہے ہو۔ کوئی انتہا ہے تمہارے عذاب کی؟ اپنے آپ سے بھلا کون بھاگ سکتا ہے۔ تمہارے ماضی کا آسیب قبر تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ تم احساس کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے رہوگے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری بیوی ان تمام شیطانی صفات اور فطری خرابیوں کے باوجود جن کا تم مظاہرہ کرچکے ہو' تمہیں اپنا سہاگ اور سر کا تاج وغیرہ سمجھتی ہے۔ وہ کمزور اور بے بس ہے یا بے وقوف ہے۔ کچھ بھی سمجھ لو' وہ دوسری قسم کی عورت ہوتی تو اپنے چنگیز خان بھائی سے کہتی کہ اٹھا لاؤ اسے تھانے میں اور میرے سامنے ننگا کرکے اتنا مارو کہ اس کی چمڑی گوشت سے اور گوشت ہڈیوں سے الگ ہوجائے۔ شاید وہ خود تمہیں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کردیتی۔ اس نے زندگی بھر تمہارا ساتھ دیا۔ دکھ سکھ میں ہی نہیں' مجرمانہ عزائم میں بھی وہ شریک رہی۔ اس کا کیا صلہ دیا تم نے اسے۔ ایک طوائف کے چکر میں پڑکے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ آج بھی تم کو معاف کرنے پر تیار ہے بلکہ الٹا تم سے معافی مانگے گی اگر تم کہوگے۔ وہ انتہا درجے کی شوہر پرست عورت ہے۔ اس نے بھائی کو روک رکھا ہے' وہ طلاق بھی نہیں چاہتی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ' ان کے باپ کے ساتھ تمہاری بیوی بن کے رہنا چاہتی ہے۔ سب کچھ بھول جانا چاہتی ہے جو ہوا۔ آگے مت جاؤ' یہیں سے واپس لوٹ جاؤ اسی زندگی کی طرف۔ اسی گھر کی طرف۔ تمہیں سب کچھ پھر مل سکتا ہے۔ وہ سکون' آرام اور خوشی جو کبھی تمہیں حاصل تھی۔ تم نے یہ موقع گنوادیا تو پھر ممکن ہے وہ عورت بیوگی کا عذاب قبول کرنے پر بھی تیار ہوجائے۔"

اس کا رنگ آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری بات کا خاطر خواہ اثر ہونے لگا ہے۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "وسیم عرف گلزار۔ اس خوش فہمی یا غلط فہمی کو دل سے نکال دو کہ ہم تمہیں کوئی رعایت دے رہے ہیں یا صرف ذاتی فائدے کے لیے بلیک میل کررہے ہیں۔ ہم نے یہ ضمانت تمہاری بیوی سے اور بشیر چوہدری سے حاصل کی ہے اور انہیں یہ ضمانت دی ہے کہ ہم تمہیں واپس لے آئیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ ایک مجبور عورت کو بیوہ ہونے سے اور بچوں کو یتیم ہونے سے بچانے کے لیے ہم نے کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر سمجھوتا کرلیا ہے۔ پانچ لاکھ میں ہم تمہیں وہ مکان دے رہے ہیں جو گویا جائے واردات ہے اور جہاں سارے ثبوت موجود ہیں لیکن ہم بہت کچھ اپنے ہاتھوں میں بھی رکھیں گے۔ تم کو اس گھر کا فرش کھود کے لاش کا ڈھانچا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکال پھینکنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جس دن تم ایسا کرو گے اسی دن پولیس تمہیں رنگے ہاتھوں گرفتار کرلے گی۔ رائٹ؟ پھر وہ خط ہمارے پاس رہے گا جس کو ایک دستاویزی ثبوت کی حیثیت حاصل ہے۔ تم اپنی بیوی کو عینی شاہد سمجھ کے قتل نہیں کرو گے۔ جیسا کہ قاتل کرتے ہیں۔ وہ تمہیں صرف شوہر سمجھتی ہے تو تم بھی اسے صرف بیوی ہی سمجھو گے۔ اس کے ساتھ کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرو گے اور اسے کوئی دھمکی نہیں دو گے۔ تمہارے بچوں کو کچھ معلوم نہ ہو تو یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ شرافت سے رہو جیسے پہلے رہتے تھے اور بس۔ پھر تمہیں کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا "بڑے عجیب آدمی ہو تم۔"

"ہر آدمی کسی نہ کسی زاویے سے عجیب ہوتا ہے" میں نے کہا۔

"تمہاری عمر زیادہ نہیں ہے مگر تم عقل اور تجربے کی بات ایسے کرتے ہو جیسے سب کچھ دیکھ چکے ہو' بھگت چکے ہو۔"

"عقل کا تعلق کبھی عمر سے نہیں رہا اور تجربہ صرف اپنا نہیں' دوسروں کا بھی کام آتا ہے" میں نے کہا "کیا فیصلہ ہے پھر تمہارا؟"

"مجھے منظور ہے۔ میں خود آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ آزادی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ اب مجھے کسی سے خطرہ نہیں۔ میں خوش رہ سکتا ہوں' جیسے پہلے تھا۔ میں نے جو گنوادیا تھا کیا سب پھر مل سکتا ہے؟" وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگا۔

"ہاں۔ اس دنیا کی زندگی کی حد تک" میں نے کہا "آخرت کا حساب الگ ہے۔ وہاں جس کا تم پر دعویٰ ہوگا داور محشر کی عدالت میں خود پیش کرے گا۔ میں بھی یہاں ظالم کی نہیں مظلوم کی مدد کررہا ہوں۔ اس کیس میں مظلوم ہے تمہاری بیوی' مظلوم ہیں تمہارے بچے۔"

"صرف انہی بچوں کی وجہ سے میں یہاں رکا ہوا تھا۔ ورنہ میں باہر نکل جاتا" وہ بولا "ابھی وہ چھوٹے ہیں۔ بڑے ہوجانے کے بعد وہ ماں سے میرے بارے میں ضرور پوچھتے۔"

"کیا بتاتی وہ انہیں اس کے سوا کہ تمہارا باپ مرگیا۔ اصل حالات کا علم ہوجاتا انہیں تو خود سوچو کہ ان کی شخصیت کتنی مجروح ہوتی۔ یتیم نہ ہونے پر بھی وہ خود کو یتیم سمجھتے۔ خود اپنی نظر میں ان کی عزت گرجاتی کہ ایسا تھا ان کا باپ" میں نے کہا "خیر ابھی وقت ہے۔ تم اپنے ماضی کے داغ چھپا سکتے ہو۔"

"آج کل تم کرتے کیا ہو؟" رئیس نے پوچھا۔

"میں۔۔۔ امپورٹ ایکسپورٹ" وہ بولا۔

رئیس ہنس پڑا "یعنی اسمگلر ہو۔"

اس نے خفت سے کہا "اسمگلر بہت بڑا ہوتا ہے۔ میں مہینے میں دوبار کچھ سامان لے جاتا ہوں۔ ہانگ کانگ' سنگاپور یا بنکاک اور واپسی میں وہاں سے جو لاتا ہوں وہ یہاں سپلائی کردیتا ہوں۔"

"یہاں سے کیا لے جاتے ہو اور وہاں سے کیا لاتے ہو؟"

اس نے کہا "یہاں سے زیادہ تر دو نمبر کی چیزیں' ہینڈی کرافٹ اور چمڑے کی مصنوعات۔ وہاں سے لاتا ہوں سلے سلائے کپڑے' چشموں کے فریم' گھڑیوں کے سیل۔ میرا اپنا اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ یہاں سے مال مل جاتا ہے۔ باہر لگے بندھے ٹھکانے ہیں۔ وہ ادائیگی کردیتے ہیں۔ جو میں لاتا ہوں وہ بھی مخصوص دکانداروں کو فراہم کردیتا ہوں۔ لین دین کا کوئی جھگڑا نہیں۔ سودے بازی نہیں۔ ہر بار مجھے دس سے پندرہ ہزار بچ جاتے ہیں۔ ایک بار پکڑا بھی گیا تھا۔"

میں نے کہا "ایسے دھندے کرنے والے لائن کلیئر رکھتے ہیں۔"

"لائن کلیئر ہی رہتی ہے لیکن کسٹم والے کارکردگی دکھانے کے لیے کبھی کبھی چھاپے مارنے کا ڈراما بھی کرتے ہیں۔ وہ تھوڑا تھوڑا سب لے لے کر جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کی ضبطی دکھادیتے ہیں۔ اخبار والوں کو بلا کے چھاپا مارنے والوں' پکڑے جانے والوں اور برآمد کیے جانے والے مال کی تصویر شائع کرادی جاتی ہے۔ بعد میں چھڑانے والے سب کو چھڑا کے لے جاتے ہیں۔"

"یہ ڈراما ایف آئی اے والے نہیں کرتے" رئیس بولا۔

"ان کا شکار ہم جیسے خوردہ فروش نہیں ہوتے۔ وہ بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ جن کی لانچیں چلتی ہیں دبئی اور کراچی کے درمیان یا جو سونا اور کرنسی وغیرہ ادھر سے اُدھر کرتے ہیں۔ ہم تو کھیپی ہیں۔۔۔ ہزاروں کا دھندا کرنے والے۔ لاکھوں کے پھیرے ہوں تو بندہ اسمگلر کہلاتا ہے اور بڑی آسامی ہوجاتا ہے۔"

"یعنی زیادہ معزز۔ جیسے چور ترقی کرکے ڈاکو بنتا ہے تو

پولیس والوں کے نزدیک وی آئی پی ہوجاتا ہے۔" میں نے کہا۔

رئیس بولا "پھر تو بہت مال بنالیا ہوگا تم نے۔"

وہ کچھ نہیں بولا "اتفاق سے ایک آدمی مل گیا جس نے اس راستے پر لگادیا ورنہ میں کیا کرتا۔ آج تمہارا مطالبہ کیسے پورا کرسکتا تھا۔"

"اسی لیے تم کسی کے ہاتھ نہیں آئے کہ تمہارا آنا جانا لگا رہتا ہے" رئیس بولا۔

"ہاں۔ مہینے میں پندرہ دن تو باہر ہی گزارتا تھا۔"

"خیر اب یہ کام چھوڑ دو" رئیس نے اسے مشورہ دیا "ورنہ کسی دن ایسے پکڑے جاؤ گے کہ اندر ہوجاؤ گے۔"

میں نے کہا "بے وقوف آدمی۔ جس کا سالا تھانے دار ہو اسے کون اندر کرسکتا ہے؟"

رئیس نے کہا "پاسپورٹ کہاں ہے تمہارا؟"

اس نے تذبذب کے ساتھ کہا "پاسپورٹ۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"پاسپورٹ ہمارے پاس رہے گا۔ سارے معاملات طے ہونے تک۔۔۔ تمہارا کیا اعتبار۔ تم کل پھر بھاگ جاؤ۔"

میں نے کہا "رئیس خان۔ یہ تم نے پہلی عقل کی بات کی۔"

"پیارے' اب میں دوسری بات کرتا ہوں۔ اس سے پاسپورٹ تو لے لو۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ میں نے تمہاری بات سمجھ لی ہے" وہ بولا۔

"پاسپورٹ نکالو" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

اس نے بادلِ ناخواستہ پاسپورٹ میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے سرسری طور پر دیکھا۔ اس میں وسیم احمد کا اصل نام تھا۔ تصویر بھی اس کی اپنی تھی مگر رئیس نے اسے پلٹ کے دیکھا اور اپنے پاس رکھ لیا "دوسرا بھی اتنی ہی شرافت سے دے دو پیارے۔"

"دوسرا!" وہ چوری پکڑے جانے پر چونکا "اور کوئی نہیں ہے۔"

"قسم اللہ کی دولتی مار کے بتیسی جھاڑ دوں گا" رئیس نے کہا "اس میں تمہارے نام پر آخری ویزا دبئی کا ہے۔ چار مہینے پہلے کی تاریخ ہے۔ چار مہینے سے تم جو ہانگ کانگ سنگاپور اور بنکاک گئے تھے گلزار احمد کا پاسپورٹ ہوگا بیٹے۔ ہوسکتا ہے تین پاسپورٹ بھی ہوں تمہارے پاس۔ میں ویزا کی تاریخ دیکھ لوں پہلے پھر پتا چلے گا۔"

وسیم کا رنگ اڑگیا تھا۔ رئیس نے بڑی آسانی سے اس کا جھوٹ پکڑلیا تھا۔ رئیس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا "یہ تو ریکارڈ ہوگیا۔ ایک ساتھ دو عقلمندی کی باتیں۔ ایک کے بعد دوسری' پہلی اور آخری بار۔"

وسیم نے مردہ لہجے میں کہا "دوسرا پاسپورٹ میرے سوٹ کیس میں ہے۔"

"ہم نکال لیں گے۔ تم اس کی چابیاں دے دو" رئیس نے کہا۔

"میرے پاس نہیں ہے وہ سوٹ کیس" وسیم نے کہا۔

"پھر کہاں ہے" رئیس نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان پر نظر ڈالی "اس میں دو ٹین کے صندوق تھے اور دو سوٹ کیس۔ دونوں سوٹ کیس نئے تھے اور سیمسونائٹ کے بنے ہوئے۔"

"وہ میں اپنے پاس نہیں رکھتا" وسیم نے پریشانی سے کہا "پکڑے جانے کے ڈر سے۔ جن کا سامان لاتا' لے جاتا ہوں' انہی کے پاس رہتا ہے۔"

میں نے اس کی صورت کو غور سے دیکھا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا اور اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اس کا جھوٹ چلنے والا نہیں ہے۔ "اگر اس میں تمہارا اور قیمتی سامان ہے تو فکر مت کرو۔ ہم اسے ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔"

"نہیں' یہ بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے۔ کیا تمہیں ڈر ہے کہ ہم تمہارے بوگس پاسپورٹ ضبط کرلیں گے اور تمہیں بلیک میل کریں گے بعد میں" میں نے کہا۔

"تم سب کچھ کرسکتے ہو۔"

"ہاں۔ ہم سب کچھ کرسکتے ہیں لیکن اب نہیں کریں گے کیونکہ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔" میں نے کہا "میں تمہیں معاف کرنے والا نہیں تھا۔ اگر میں اپنے ارادے پر قائم رہتا تو تمہیں تباہ کردیتا۔ تم قانون کی گرفت میں آنے سے بچ گئے تھے لیکن میں تمہیں نہ چھوڑتا۔ میں تمہیں دھکیل کر موت کی طرف لے جاتا اور ایسے حالات پیدا کردیتا کہ تمہارے لیے جینا مشکل اور مرنا آسان ہوجاتا۔ تم خود موت میں نجات تلاش کرتے لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی کہ مجھے تمہارے بیوی بچوں پر رحم آگیا۔ ان کی بے کسی اور مجبوری دیکھ کے میں الٹا تمہیں اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جانے کا موقع فراہم کررہا ہوں۔"

رئیس نے کہا "چابی کے بغیر بھی ہم یہ سوٹ کیس کھول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیں گے بیٹا' توڑ دیں گے تالے۔"

میں نے ریوالور نکال کے یوں اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا جیسے میں اس کے استعمال کا عادی ہوں "اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ' ہاتھ اوپر۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا "میں۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

میں نے کہا "رئیس۔ تلاشی لے اس کی۔ چابی جیب میں ہی ہو گی۔"

رئیس نے پیچھے سے اس کو کالر سے پکڑا اور کھینچ کے دیوار سے لگا دیا۔ وسیم نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ رئیس نے اس کی پتلون کی جیب میں سے ایک چابی نکال لی۔ وسیم پلٹ کے سیدھا کھڑا ہو گیا "میں۔۔۔ میں نکال دیتا ہوں۔ پاسپورٹ ہی چاہیے نا۔ چابی مجھے دو۔"

رئیس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "یہ کام تم پہلے شرافت سے بھی کر سکتے تھے۔ اب تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ تالا کھولنا آتا ہے مجھے۔"

اس نے گھبراہٹ اور جھنجلاہٹ میں کہا "لیکن بیچ والا تالا نمبر ملانے سے کھلتا ہے۔"

میں نے کہا "اس کے نمبر بتاؤ۔"

"نمبر۔۔۔ ایک منٹ ٹھہرو" وہ ہکلا کے بولا "میں یاد کرتا ہوں۔ دراصل۔۔۔ میں نمبر بدلتا رہتا ہوں۔۔۔ تاکہ COMBINATION غلطی سے بھی کوئی نہ دیکھے۔"

رئیس نے پہلے اوپر والے سوٹ کیس میں چابی لگانے کی کوشش کی۔ وہ نیچے والے امپورٹڈ اور بالکل نئے سوٹ کیس کی چابی تھی۔

اچانک وسیم چلایا "تم ہٹ جاؤ' میں کھولتا ہوں۔"

میں نے اسے روک دیا "کھڑے رہو اپنی جگہ۔ رئیس تجوریوں کے تالے کھول سکتا ہے۔ یہ سوٹ کیس کیا چیز ہے؟"

"نمبر نہیں بتاؤ گے تو میں اسے توڑ دوں گا" رئیس بولا۔

وسیم کے حلق سے ایک کراہ سی نکلی "ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں۔"

رئیس نے نمبر ملائے اور سوٹ کیس کھولا۔ اب میرا تجسس بھی بڑھ گیا تھا کہ آخر سوٹ کیس میں ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جو وسیم ہم سے چھپانا چاہتا تھا۔ اسے جعلی اور بوگس نام والے پاسپورٹ ہمارے ہاتھ لگ جانے کا ڈر نہیں تھا۔ اس کے خوف کا سبب کچھ اور تھا۔ شاید سوٹ کیس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سونا تھا یا غیر ملکی کرنسی تھی۔۔۔ یا پھر ہیروئن۔۔۔ شاید اس نے ہمیں ٹالنے کے لیے ایک جھوٹ بولا تھا کہ وہ باہر سے چھوٹی موٹی چیزیں لاتا ہے۔

سوٹ کیس میں ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ رئیس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا "یار ناصر۔ مال تو ہے اس میں مگر زیادہ نہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کے دیکھا۔ سوٹ کیس میں تھوڑے سے ڈالر تھے۔ کچھ کپڑے اور سفری ضرورت کا سامان تھا لیکن یہ سب ایک خالی گوشے میں سمٹا ہوا تھا۔ سوٹ کیس کا زیادہ حصہ چھوٹے بریف کیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ چھ بالکل نئے بریف کیس اس میں بڑی احتیاط سے رکھے گئے تھے۔ تین آگے تین پیچھے۔ ہر پیچھے والے بریف کیس کے اوپر دو بریف کیس تھے۔ ان سب کو الگ الگ شفاف پولی تھین بیگ میں پیک کرنے کے بعد درمیان کی خالی جگہ میں پیکنگ میٹریل ایسے بھر دیا گیا تھا کہ انہیں معمولی سی خراش بھی نہ آئے۔

"اس میں کوئی نازک چیز ہے۔ شیشے کی طرح ٹوٹنے والی" رئیس نے کہا۔

اس کے جواب میں وسیم نے ایک جست لگائی۔ مجھے ایک لمحے پہلے اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میں ایک دم پلٹا اور پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

"ہٹ جاؤ۔ دور ہٹ جاؤ۔ ہاتھ مت لگانا کسی چیز کو" وسیم چلایا اور اس نے رئیس کو گھسیٹ کر سوٹ کیس سے دور کر دیا۔

میں نے ریوالور کا رخ وسیم کی طرف رکھا "کیا ہے اس میں؟"

وسیم گہرے لمبے سانس لیتا رہا "بہت خطرناک چیز ہے۔۔۔ مارے جاؤ گے تم اگر اسے ہاتھ لگایا۔"

میں نے کہا "اس چیز کا کوئی نام بھی ہو گا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

ایک خوفناک انکشاف کے خیال سے میرا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا "کیا۔۔۔ ٹائم بم ہیں ان میں۔۔۔ یہ بریف کیس۔"

رئیس اٹھ کے دوڑا "ٹائم بم۔۔۔ ابے مروا دیا۔"

میں نے کہا "گھبراؤ مت۔ یہ خود پھٹنے والے نہیں ہیں۔ ان کو کار آمد بنایا جاتا ہے۔ کچھ پرزے جوڑ کے اور فیوز لگا کے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ خدا کی قسم مجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ وحشت زدہ نظروں سے باری باری رئیس کی اور میری صورت دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "اچھا۔ آرام سے یہاں بیٹھ کے بتاؤ۔"

اس نے کھلے ہوئے سوٹ کیس کو دیکھا اور نیچے جھک کر اس میں سے ڈالر نکال لئے "لو۔ یہ تم لے لو' سب رکھ لو۔"

رئیس نے وہ نوٹ ضبط کرنے کے انداز میں چھین لیے۔

"یہ۔۔۔ اٹھائیس ہزار ڈالر ہیں۔۔۔" وہ بولا "تم نے پانچ لاکھ روپے کی بات کی تھی نا۔۔۔ یہ اس سے زیادہ ہی ہیں۔ ساڑھے پانچ لاکھ سمجھ لو" وہ سخت نروس اور بدحواس تھا۔

میں نے حساب لگایا۔ ڈالر تقریباً سولہ روپے کا تھا۔ وسیم نے صحیح رقم بتائی تھی مگر اب صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ وسیم کی گھبراہٹ اور پریشانی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں مکان کی قیمت نہیں' رشوت دے رہا ہے۔ اس کا مالک' خطرناک راز' اتفاق یا اس کی شامت اعمال کے باعث فاش ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہم اس سے اور کچھ نہ پوچھیں لیکن یہ ناممکن تھا۔

میں نے کہا "رئیس' رقم واپس وہیں رکھ دے' شاید اسے چھونا بھی غلط ہو۔ پہلے معلوم ہو کہ یہ سلسلہ کیا ہے؟"

رئیس نے ایک مٹھی میں آجانے والے نوٹوں کی گڈی وہیں رکھ دی جہاں سے وسیم نے اٹھائی تھی۔ دہشت سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور نظر بریف کیسوں پر جم کے رہ گئی تھی۔

میں نے جیمز بونڈ کی طرح ریوالور ہلا کے اشارہ دیا "تم ادھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ اور پھر مجھے سچ سچ بتاؤ۔"

وسیم نے کرسی پر گر کے ایک گہری لمبی سانس لی "میں نے کہا نا۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں؟ بتاتے ہوئے ڈرتے ہو یا اپنی اسی بات پر قائم ہو کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں" میں نے کہا۔

"دونوں ہی باتیں ہیں" وہ بے خیالی میں بولا۔

"اگر تم کسی سے ڈرتے ہو" میں نے کہا "تو ذہن میں یہ رکھو کہ خدا کے بعد اس وقت تمہیں سب سے زیادہ ہم سے ڈرنا چاہیے کیونکہ یہاں اور کوئی نہیں اور نہ آسکتا ہے۔ دوسری بات میں ماننے کو تیار نہیں کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ چلو تم جتنا جانتے ہو اتنا بتا دو۔"

وہ زور زور سے سر ہلانے لگا "دیکھو اس چکر میں مت پڑو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

"ایک معمولی سی غلطی نے تمہارا کام بگاڑ دیا۔ اگر تم وہ پاسپورٹ دکھا دیتے جس پر تمہارا نام گلزار احمد لکھا ہوا ہے تو رئیس تم سے دوسرا پاسپورٹ طلب نہ کرتا" میں نے کہا۔

"ابے چھوڑ۔ میں دوسرا ضرور مانگتا۔ میں جانتا ہوں ایسے لوگ صرف ایک پاسپورٹ کافی نہیں سمجھتے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یہ تباہی پھیلانے والا سامان تم کس کو بیچو گے؟"

"اس سالے سے پوچھ کہ لایا کہاں سے ہے؟" رئیس بولا۔

وسیم نے کہا "جو میں کہوں گا' تم نہیں مانو گے۔"

"ایسی بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تکلیف اٹھائے بغیر سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے" میں نے کسی تفتیشی افسر کی طرح کہا۔

"سچ میں بتاؤں گا مگر تم کہو گے کہ جھوٹی کہانی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ابے کچھ بول تو سہی۔۔۔" رئیس نے اسے ایک گالی دی۔

"نہ یہ سوٹ کیس میرا ہے۔۔۔ نہ سامان" وہ بولا۔

میں نے اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں سر کی چوٹ سے وہ بے ہوش نہ ہو گیا ہو۔ رئیس نے میرے اشارے پر اسے اٹھا کے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بہت دیر تک ہانپتا اور کانپتا رہا۔

"کراچی ایئرپورٹ پر میرا سوٹ کیس بدل گیا تھا۔ کسی نے جان بوجھ کے بدلا ہو گا" اس نے چند منٹ کے بعد کہا۔

"دونوں ایک جیسے تھے۔"

"تمہیں وزن کے فرق کا بھی پتا نہیں چلا۔"

"نہیں۔"

میں نے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے سر کو فٹ بال کی طرح کک مار کے تمہارے کندھوں پر سے اڑا دوں۔ یہ تمہارا سوٹ کیس نہیں تھا تو اس میں تمہارے سوٹ کیس کی چابی کیسے لگی۔ تالے کیسے کھولے تم نے۔"

رئیس نے پُرتشنج لہجے میں کہا "ابے بالکل ہی عقل سے پیدل ہے تو۔ یار جو اتنا بڑا سوٹ کیس بدل سکتے ہیں' ان کے لیے اتنی سی چابی غائب کرنا کیا مشکل تھا۔ میں شرط لگاتا ہوں وہ سالے جیب کترے بھی تھے۔ پہلے ہی پاکٹ مارنے کا کام کرتے ہوں گے۔"

"مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے ہوا۔ میں نے چابی لگائی اور تالے کھل گئے۔ تم خود بھی سوچ سکتے ہو کہ ایسا کس طرح ممکن ہے۔ کیا پتا انہوں نے سوٹ کیس نہ بدلا ہو۔ اس کے اندر کا سامان بدل دیا ہو۔ یا دونوں کے تالے ایک جیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام تھا۔"

میں نے کہا "میں امکانات پر ریسرچ نہیں کر سکتا۔ جو بات ہے وہ بتاؤ۔"

"اصل بات یہی ہے کہ میں نے تالے کھولے اور اندر دیکھا تو سامان میرا نہیں تھا۔ میری ہر چیز غائب تھی۔"

"تم کیا لائے تھے؟"

"میں۔۔۔ دو سو فریم تھے چشموں کے۔ الیکٹرونکس سیل تھے۔ فلاپی ڈسک کے ڈبے تھے۔ ایک فیکس مشین تھی۔" اس نے یاد کر کے کہا۔

"کتنی مالیت کا سامان تھا؟"

"دس ہزار ڈالر کا" وہ بولا "مجھے گیارہ ہزار ملتے۔"

"پھر تو فائدے میں رہے تم" میں نے طنز سے کہا "یہ اٹھائیس ہزار ڈالر ہیں۔ سترہ ہزار کا منافع۔۔۔ وسیم، مجھے پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا تمہیں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ چلانے لگا "ایسی غلطی ہرگز مت کرنا۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "یہ فرض ہے میرا۔ غلطی کے بچے۔"

"دیکھو جلد بازی مت کرو" وہ گھگیانے لگا "میں نہیں جانتا وہ کون لوگ ہیں مگر وہ خطرناک ہیں۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟" میں نے کہا۔

"جب میں نے سوٹ کیس کھول کے دیکھا۔"

"ایک منٹ۔ سوٹ کیس صرف چابی گھمانے سے کھل گیا؟ اس کے نمبروں کا مسئلہ کیسے حل کیا تم نے؟"

"نمبر سب زیرو پر تھے۔ سوٹ کیس نمبرز کی COMBINATION سے لاک نہیں کیا گیا تھا۔" وہ بولا "اس میں اوپر ہی ایک کاغذ رکھا ہوا تھا، ٹائپ کیا ہوا۔ اس پر میرے لیے ایک پیغام تھا" وہ بولا۔

رئیس نے میری طرف اور میں نے رئیس کی طرف دیکھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کیا وسیم کی کہانی اس حد تک قابلِ یقین ہے کہ پوری سنی جائے۔

وسیم نے سر ہلایا "یہ سچ ہے۔ میں نے وہ پیغام پڑھا۔"

"کہاں ہے وہ کاغذ؟" میں نے کہا۔

اس نے جیب میں سے پرس نکالا اور پرس میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ "یہ لو، خود پڑھ لو۔"

عبارت کسی تمہید کے بغیر شروع ہوئی تھی اور ایسے ہی اچانک ختم ہو گئی تھی۔ "زیادہ حیران اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سوٹ کیس خاموشی سے گھر لے جاؤ۔ اس میں جتنی نقد رقم ہے وہ تمہارے نقصان کی مالیت سے دگنی ہے۔ یہ تم رکھ سکتے ہو۔ کسی چیز کو چھیڑنا تمہارے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوگا۔ سوٹ کیس کو رازداری اور احتیاط کے ساتھ رکھو۔ ہمارا آدمی خود تم سے وصول کر لے گا۔"

"میں نے خود کو اس احمق کی طرح محسوس کیا جو کسی اور کے لیے کھودے جانے والے دشمن کا گڑھا برابر کرتے ہوئے کسی کنوئیں میں گر جائے۔ کسی کی مدد کے لیے ڈنڈا لے کر چور بھگانے جائے اور ڈاکوؤں کی گولی کا نشانہ بن جائے۔ نیک لوگوں کے لیے کہتے ہیں کہ ٹھگ لینے کو جائیں پیسہری مل جائے۔ یہ معاملہ اس کا الٹ تھا۔"

میں نے اخبار جیسے کاغذ پر صاف مگر غلط انگریزی میں لکھے ہوئے پیغام کو بار بار پڑھا یہاں تک کہ رئیس سے مزید سسپنس برداشت نہ ہو سکا "ابے کیا اس میں لکھا ہے کہ زبانی یاد کرو ورنہ گنجے ہو جاؤ گے۔"

میں نے اسے مضمون کا ترجمہ سنا دیا۔

رئیس نے اس پر غور فرما کے کہا "یہ ثابت کرنا پڑے گا تمہیں پیارے کہ یہ خود تم نے نہیں ٹائپ کیا ہے۔"

"میں بہت اچھا ٹائپسٹ تھا۔" وہ بولا "جس نے یہ لکھا ہے وہ ٹائپ کرنا نہیں جانتا۔ ایک ایک حرف دیکھ کے انگلی ماری ہے۔ اس کے علاوہ یہ الیکٹرونک ٹائپ رائٹر ہے۔ اس جیسے حروف میں نے پہلے نہیں دیکھے۔"

"تم تو شرلاک ہومز بھی ہو" میں نے کہا "یقیناً تم نے اپنی عقل کے گھوڑے ہر سمت دوڑائے ہوں گے۔"

"کوئی گھوڑا ائرپورٹ کی طرف بھی گیا ہوگا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ سامان کس سے بدلا گیا؟"

وہ بولا "میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ مجھے خاموشی اور رازداری کی ہدایت کی گئی تھی۔"

میں نے کہا "یہ کب کی بات ہے؟"

"پرسوں رات ہی میں سنگاپور سے لوٹا تھا" وہ بولا۔

"تم ٹیکسی میں گھر آئے تھے؟" رئیس نے کہا "ہم نے تمہیں گزرتے دیکھ لیا تھا۔ خیر، گیا اس کے بعد کسی نے تم سے رابطہ کیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "معلوم نہیں وہ مجھے کیسے تلاش کریں گے، میرا پتا بدل گیا ہے۔"

"تمہارا پاسپورٹ پر الگ ہے؟" میں نے کہا۔

"نام بھی الگ ہے" رئیس بولا۔

"وہ بے وقوف لوگ نہیں ہوں گے۔ مل جائیں گے کسی دن ائرپورٹ پر" میں نے کہا "لیکن ہم انتظار نہیں کر سکتے۔"

"کیوں۔۔۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" وسیم پریشان ہو گیا۔

"ہم آسان کام کریں گے۔۔۔ یہ سب کچھ تمہارے سالے تھانے دار کے سپرد کر دیں گے۔ تم اسے ساری اسٹوری سنا دینا۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے۔ تمہیں۔۔۔ سب کو۔"

"لیکن یہ تخریب کاری کا سامان ہے" میں نے کہا "کیا تم اٹھائیس ہزار ڈالر کے لیے وطن دشمنوں کے آلۂ کار بنو گے؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں آخر۔ اپنی مرضی سے میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں مجبور ہوں" وہ دروازے کی طرف دیکھ کے بولا "وہ کسی وقت بھی آ سکتے ہیں یہ سوٹ کیس لاک کر دو۔ ایسا نہ ہو انہیں شک ہو جائے کہ میں نے سب کچھ تمہیں بتا دیا ہے۔ وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے کچھ دیر سوچ کے کہا "اس کے برعکس۔۔۔ تم نے خوف سے ان کی بات مان لی، تو وہ تمہیں پھر استعمال کریں گے۔"

"اور تمہیں استعمال ہونا پڑے گا پھر انکار کرنا تمہارے بس میں نہیں ہوگا پیارے۔ لالچی بھی ہو تم" رئیس نے کہا۔

"میں کل اور آج ائرپورٹ پر بھی رہا۔ کہ کوئی مجھے دیکھ لے۔۔۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ان کا مال اور پیسہ لے کر بھاگ گیا۔"

میں نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ کوئی تمہارے پیچھے یہاں تک نہیں آیا؟"

"آتا تو اپنا سامان نہ لے جاتا؟"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس کے بعد میں نے کہا "یہ صورتِ حال تو بہت گمبھیر ہو گئی۔"

"اور ڈینجرناک بھی" رئیس بولا "اب کیا کرنا ہے استاد؟"

میں نے کہا "ہم غور فرما رہے ہیں اور ابھی تک ہماری عقلِ سلیم میں یہی آیا ہے کہ اپنی اور وسیم کی جان چھڑانے کی ایک ہی صورت ہے۔"

"وہ کس کی صورت ہے پیارے؟"

میں نے کہا "رقم بچی سرکار ضبط کر لے۔ سوٹ کیس بند کر کے اس پر سے اپنی اور میری انگلیوں کے نشانات مٹا دے۔"

"اتنی ہمت نہیں ہے اپن میں پیارے۔ کہیں خود اپنے نشانات نہ مٹ جائیں غلطی سے" اس نے رقم نکال کے چھپالی۔

"مسٹر وسیم احمد عرف گلزار احمد۔"

"عرف سردار احمد۔ تیرے پاسپورٹ پر یہی لکھا ہے" رئیس بولا "چوتھا شاید اس پتے پر نئے نام سے بنوایا جائے گا۔ داڑھی والی تصویر کے ساتھ۔"

"تم خود کو زیرِ حراست سمجھو" میں نے کہا۔

"کیا؟" وسیم کی حالت غیر ہو گئی۔

"ہم چوبیس گھنٹے تم پر نظر رکھیں گے۔ تم سے دور رہ کے ہمیں فنا دے کر غائب ہونے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ تم سے پہلے ہم یہاں پہنچ کر یہ سوٹ کیس اٹھا لیں گے اور بھاگ جائیں گے پھر تم کیا بتاؤ گے انہیں مال کہاں گیا؟ وہ تو اس وقت تک مارتے اور پوچھتے رہیں گے جب تک۔۔۔"

رئیس نے کہا "ظاہر انصاری نفسِ روح سے پرواز نہیں کر جاتا۔"

مجھے ہنسی آ گئی "ظاہر انصاری نہیں ابوجہل۔ نفس عنصری، طائرِ روح۔"

"ابے ہاں وہی" رئیس جھینپ کر بولا "نفسِ روح تو صحیح تھا۔"

"آج کل میں وہ ضرور تم سے رابطہ کریں گے۔ تم مال ان کے حوالے کرو اور غائب ہو جاؤ۔ واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔ اپنی پرانی زندگی کی طرف تاکہ وہ پھر تمہیں تلاش نہ کر پائیں۔"

"ابے یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ اگر یہ باہر آتا جاتا رہے گا تو پھر کسی دن سوٹ کیس بدل جائے گا۔ لالچ بری بلا ہے اور وہ لالچ بھی معمولی نہیں دیتے۔ ایک کام کے ساڑھے پانچ لاکھ روپے بن گئے۔ تو شرط لگا لے مجھ سے کہ یہ کرے گا۔"

میں اصل خیال کو گول کر گیا "ابے بعد کے ذمے دار ہم نہیں ہیں۔ ہمارا کام تھا سمجھانا۔ آگے اس کا جو دل چاہے کرے۔ عیاشی کرے گا تو کسی دن مارا بھی جائے گا۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو الگ بات ہے۔ لوگ دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی بن جاتے ہیں اور پکڑے بھی نہیں جاتے۔"

"یار پکڑے گا کون، کس میں ہمت ہے کہ فرض شناسی کے جوہر دکھائے یا حب الوطنی کا پنگا لے۔" رئیس بولا۔

وسیم بولا "تم لوگ میری نگرانی کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"ہم ایک بار ضرور تمہیں واپس لے جائیں گے اور تمہاری بیوی کے حوالے کر دیں گے۔"

"کہ لو۔۔۔ چاند سی بیوی اب تیرے حوالے" رئیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا۔

"نہیں۔ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ آگے تمہاری ذمے داری۔ ہم اس کے باپ نہیں ہیں کہ اس کے اخلاق اور کردار پر نظر رکھیں" میں نے کہا۔

یہ سب کتنا آسان تھا مگر ہوگا کیسے؟ اس پہلو پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ وسیم نے بحالتِ مجبوری خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سنائی ہوئی کہانی بظاہر سچی ہی لگتی تھی مگر رئیس کا یہ خیال بھی غلط نہ تھا کہ لالچ میں وہ کسی گروہ کا آلۂ کار بننا قبول کر سکتا ہے۔ ابھی باہر کے پھیروں میں اسے جتنا منافع ہو رہا تھا' وہ کئی گنا بڑھ سکتا تھا۔ اگر وہ منشیات یا اسلحہ وغیرہ لانے والوں کے چکر میں پڑ جاتا تو لاکھوں کمانے کا لالچ اس پر غالب آ سکتا تھا۔ ذہنی طور پر وہ جرائم پیشہ تھا۔ اس کا ثبوت وہ بہت پہلے دے چکا تھا اور ہم اس کے کارناموں سے واقف تھے۔

مجھے ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ وہ مسلح ہوگا۔ باہر سے ملک میں آنے والے اسلحے کی افراط نے غیر ملکی خصوصاً روسی ساخت کے ریوالور کی دستیابی بہت آسان کر دی تھی اور کوئی بھی شخص جو ارادہ اور پیسہ رکھتا ہو درّے یا کوئٹہ افغان سرحد سے ہر قسم کا اسلحہ لا سکتا تھا۔

میں نے اس کا ذکر وسیم کے سالے سے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اسے اشارے سے پہلے باہر بلایا۔ وسیم ہماری نظر کے سامنے تھا لیکن ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔

"یار' یہ کیا ذمے داری قبول کر لی تو نے" رئیس بولا "ہم اس پر دن رات کیسے نظر رکھیں گے؟"

میں نے کہا "یار' ایک دو دن کی بات ہے۔ باری باری سوئیں گے اور جاگ کر نگرانی کریں گے۔"

"اور کیا یہ گھر میں بیٹھا رہے گا؟"

"میرے خیال میں یہی بہتر ہے۔ جن کا مال ہے وہ گدھے نہیں ہو سکتے کہ کسی کو اتنی آسانی سے نکل جانے دیں اور گم کر دیں۔ ان کی نظر ہوگی وسیم کی نقل و حرکت پر۔ پہلی بار ہے اس لیے وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ بندہ کیا کرتا ہے۔ اگر وہ پہنچ جاتا پولیس اسٹیشن تو انہیں معلوم ہو جاتا پھر وہ دوسری طرح اس سے نمٹتے۔ اب انہیں اطمینان ہو گیا ہوگا کہ مرغا ان کے جال میں پھنس گیا ہے۔ وہ اگلے پھیرے کے لیے اسے نیا کام دیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی اسے مل کے باضابطہ دعوت دے کہ مستقل کام کرو ہمارے لیے۔ یہ ایک کام اچھا کیا تم نے۔ اوپر والے خوش ہیں تم سے۔ اسے مزید پانچ دس ہزار ڈالر انعام میں دیں تو وسیم ان کے قدموں میں لیٹ جائے گا' آج سے آپ مائی باپ' بس حکم کرو۔"

"اور وہ انکار کر دے تو؟"

"تو کچھ نہیں۔ وہ زبردستی نہیں کریں گے۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ بے روزگاروں کی بڑی تعداد کھیپ بن گئی ہے۔ نہ جانے کتنے ان کے لیے کام کر رہے ہوں گے پہلے سے۔"

"یار' فرض کر کوئی ابھی آ گیا۔ ہم کیا کریں گے" رئیس پر گھبراہٹ سوار تھی "ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ابے عقل ہے' یہ ریوالور ہے۔"

"اوئے پاگل خانے ___ ہم عقل پر سوار ہو کے پیچھا کریں گے یا ریوالور پر بیٹھ کے" رئیس بولا "وہ وسیم کو گاڑی میں بٹھا کے ساتھ لے گیا یا اس نے کہا کہ باہر چلو۔ گلی کے موڑ پر کار کھڑی ہے۔ تو ہم رہ جائیں گے منہ دیکھتے۔ ہمارے لیے کون سی ٹیکسی تیار ہوگی۔"

میں نے سوچ کے کہا "تجھ میں عقلمندی اور دور اندیشی کے جراثیم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اچھا ابھی تو جا۔ میں یہاں ہوں۔ ہمیں تیرے بلیڈ کے تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ میرا مطلب ہے تھانے دار محمد نذیر کی۔"

"وہ بڑی خوشی سے آئے گا۔ ایسے کام میں بڑا مزہ آتا ہے اسے۔" رئیس نے کہا۔

"وہ کوئی ٹیکسی بھی پکڑ سکتا ہے۔ یومیہ بنیاد پر اس کو ادائیگی کی بات کرے۔ دو تین سو روپے روز پر کوئی بھی تیار ہو جائے گا۔ وہ ٹیکسی کے ساتھ آس پاس موجود رہے۔"

"دن رات؟"

"ضرورت کسی بھی وقت پڑ سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ رات کو آئیں گے۔ اندھیرے میں... بندے کی شناخت نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

"وہ کیا کرے ___ ٹیکسی میں بیٹھا رہے اور ٹیکسی گلی کے آخر میں کھڑی رہے۔ شک نہیں ہوگا لوگوں کو؟"

میں نے کہا "لوگوں کو چھوڑ۔ ڈرائیور اگر بونٹ کھول کے کھڑا ہوا تو آتے جاتے کو ایسا لگے گا کہ گاڑی خراب ہے۔ تیرا ہوشیار آدمی ہے' خود سنبھال لے گا معاملے کو۔"

"ٹھیک ہے' کیا میں اسے سب بتا دوں؟"

"بتا دینا۔ کیا حرج ہے" میں نے کہا "دوسرا کام یہ کرنا کہ ماسی ہیر کو بھی اطلاع کر دینا۔ تسلی دینا کہ ایک دو دن کے لیے ناصر کراچی گیا ہے' فکر نہ کریں۔ جب تو آ جائے گا تو میں جاؤں گا تھوڑی دیر کے لیے۔"

"ابے میں اس سے کیسے نمٹوں گا۔ اگر اس نے حرامی

پن کیا۔"

میں نے کہا "یار تو پ دے کر جاؤں گا تجھے۔ داغ دینا سالے پر ویسے مجھے ایک خطرہ اور بھی ہے۔"

"یا میرے مولا ___ خطرے پہ خطرہ۔"

"اس کے پاس اسلحہ نہ ہو۔ ہمیں پہلے اس کی تلاشی لینی چاہیے۔ مجھے دوسرا سوٹ کیس بھی ایسا ہی لگتا ہے" میں نے کہا۔

"یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا۔"

وسیم کی نظر بار بار ہماری طرف اٹھتی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم کیا کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ ہم جو بات کرنے آئے تھے' وہ کچھ اور تھی اور وسیم نے بلا شک و تذبذب مان لی تھی مگر اس کے بعد معاملہ خراب ہو گیا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ ہم اپنی بات کہہ کے چلے جائیں گے مگر بات سے بات نکلی تو وہ راز فاش ہو گیا جس کو چھپانا اسے مشکل نہیں لگتا تھا۔ سب کچھ اچانک ہو گیا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کا منافع اچانک نقصان میں بدل گیا اور ہماری دخل اندازی سے وہ غیر محفوظ بھی ہو گیا۔ اس کا مال ہم پہلے ہی ضبط کر چکے تھے۔ اب اسے جان کی فکر لاحق تھی۔

وہ اٹھ کے باہر آ گیا "آخر تم لوگ چپکے چپکے کیا طے کر رہے ہو۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔"

میں نے کہا "رئیس کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے تم۔ ابھی تم بچے ہو" وہ برہمی سے بولا۔

"بچہ ہی آدمی کا باپ ہوتا ہے" میں نے کہا "ہم صرف پیسے کی رشوت لے کر ٹلنے والے نہیں ہیں۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ملک میں الیکشن کے زمانے میں تخریب کاری کا یہ سامان کس نے منگوایا ہے۔ اٹھائیس ہزار کیا اٹھائیس لاکھ ڈالر بھی ہوتے تو ہم آنکھیں بند نہ کرتے اور خاموش تماشائی بن کے نہ بیٹھتے۔"

"آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"تم خاموشی سے دیکھو۔ تمہیں اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نکال لیں گے ہم" میں نے کہا۔

رئیس نے کہا "تم اگر ہمارا ساتھ دینے سے ڈرتے ہو تو بس چپ چاپ بیٹھو۔ مقابلہ کیا تو مارے جاؤ گے بیٹا۔ ہم ابھی تک تمہیں قصوروار نہیں سمجھتے۔ تم انجانے میں پھنس گئے ہو لیکن خدانخواستہ تم نے لالچ میں کچھ اور طے کیا ہے تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں۔"

"میں ___ میں نے کچھ بھی طے نہیں کیا۔ تم جو چاہو کرو۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی وہی زندگی مجھے واپس مل جائے ___ مگر ___"

میں نے کہا "وسیم۔ تم جھوٹے آدمی ہو۔ اگر تم نے ایسا چاہا ہوتا تو کون تھا تمہیں روکنے والا؟ بیوی بچے تمہاری جان کو رو رہے ہیں۔ سالا تھانے دار تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں بھی یہی چاہتا تھا پھر روپوش کیوں تھے تم؟ کیا تم... اپنے گھر اور سسرال کا راستہ بھول گئے تھے۔ آج تم قابو آئے ہو تو ہاں میں ہاں ملا رہے ہو۔"

رئیس چلا گیا تو میں نے وسیم کے گھر اور سامان کی تلاشی لی۔ جب تک میں سامان کو الٹ پلٹ کے دیکھتا رہا اور سوٹ کیس کھول کے جھانکتا رہا وہ ناگوار بے نیازی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ میں کن انکھیوں سے اس کی صورت کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا۔ پریشانی کے آثار اس کے چہرے پر تب نمودار ہوئے جب میں نے کچن کا رخ کیا۔

"تم ___ وقت ضائع کر رہے ہو اپنا" وہ بولا "میں نے کہا ہے نا کہ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں۔"

"میرے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں ضائع کرنے کے لیے پھر میں تم پر اعتبار کرنے کا رسک کیوں لوں؟" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کے میرے قریب آ گیا "اسلحہ کیا کچن میں ہوتا ہے؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "نہیں ہوتا تو پریشانی کس بات کی ہے؟ ویسے ایک ذاتی تجربے کی بات بتاؤں' میں نے اسلحہ پانی کے ٹینک میں چھپایا تھا۔ چھت کے اوپر والے ٹینک میں ڈال دیا تھا۔ پلاسٹک میں لپیٹ کے۔ وہاں کئی مہینے پڑا رہا۔ اب مجھے بتاؤ کیا اسلحہ کوئی ایسی جگہ رکھتا ہے مگر اسلحہ ایسی جگہ ہی رکھا جاتا ہے۔ اسلحہ بھی اور زیور بھی۔ جہاں کسی کو اس کی موجودگی کا شک بھی نہ ہو۔ ایک فلم میں دیکھا تھا یا کسی ناول میں پڑھا تھا۔ اسلحہ فلش ٹینک میں چھپایا گیا تھا۔"

میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں باتوں میں مصروف ہوں اور اس کی طرف سے غافل ہوں۔ وہ شاید میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ میں مرچ مسالے کے ڈبے کھول کے بھی دیکھوں گا مگر شک ہو جانے کے بعد میں تو آٹے کو بھی چھلنی سے چھان کر دیکھتا کہ کہیں اس میں ریوالور تو نہیں ہے۔ چینی' چاول' گھی اور آٹے جیسی چیزوں کے اوپر والوں کے ڈبے بڑے تھے۔ ریوالور انہی میں رکھا جا سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے ایک دم کوئی چیز اٹھائی اور مجھ پر حملہ کیا۔ اگر میرا دھیان اس کی طرف نہ ہوتا تو وہ میرا سر پھاڑ دیتا۔ وہ مسالا پیسنے والی کونڈی کا ڈنڈا' جسے گھوٹنا کہتے ہیں۔ میرے سر پر مارتا مگر میں صحیح وقت پر بیٹھ گیا۔ جگہ کم ہونے کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا۔ ڈنڈا ایک شیلف پر لگا اور بہت سے چینی کانچ کے برتن شہید ہو گئے۔ وہ شیلف سے ٹکرا کے لڑکھڑایا۔ میں نے نیچے بیٹھ کے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور ایک جھٹکا دیا تو وہ بھد سے فرش پر گرا۔ میں نے ایکشن فلموں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ جسمانی طور پر بھی میں اس سے زیادہ توانا تھا۔ میں نے شیلف پر رکھا ہوا اچار کا مرتبان اٹھا کے اس کے سر پر مارا۔ مرتبان مضبوط تھا اور کافی بھاری تھا۔ اس نے حلق سے آہ اور ہائے جیسی آواز نکالی اور ادھر ادھر ڈولنے لگا۔ میں نے دوبارہ مرتبان اس کے سر پر مارا تو وہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اس کی بیرونی سطح تیل سے چکنی ہو رہی تھی۔ سارا اچار فرش پر پھیل گیا اور وسیم اس کے اوپر لیٹ گیا۔

یہ یقین آجانے کے بعد کہ وسیم ناک آؤٹ ہو گیا ہے مجھے اپنے اناڑی پن پر افسوس ہوا۔ نہ جانے کتنی فلموں میں ہیرو نے کسی ولن یا دشمن کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کے اسے آسانی سے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ ریوالور میرے پاس بھی تھا لیکن میں نے کتنا مشکل طریقہ اختیار کیا۔ شاید یہی فرق ہوتا ہے حقیقی زندگی اور فلم میں۔ ہیرو وہی کرتا ہے جو اسکرپٹ میں لکھا ہوتا ہے۔ میں نے وہ کیا جو مجھے سوجھا۔

میرا ہاتھ اس وقت گھی کے ایک ڈبے کی طرف بڑھ رہا تھا جب وسیم نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس میں چاول تھے اور چاولوں کے اندر سے مجھے ریوالور مل گیا۔ یہ یک نہ شد دو شد والی بات ہو گئی۔ اس دوسرے ریوالور کو میں نے جیب میں رکھ لیا۔ کسی ویسٹرن فلم کے کاؤبوائے کی طرح میرے لیے دونوں ہاتھوں میں دو ریوالور تھام کے دنادن گولیاں چلانا ناممکن بھی تھا اور زندگی میں ایسی صورتِ حال پیش آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ یہ ایک تحفہ تھا جو میں اپنے پیارے دوست رئیس کو پیش کر سکتا تھا۔ وہ بزدل اور ڈرپوک آدمی تھا۔ اسے ریوالور بہادر بنا سکتا تھا۔

رات ہو گئی تھی۔ میں نے لائٹس جلالیں اور کرسی پر بیٹھ کے سوچنے لگا کہ رئیس کی واپسی میں کتنا وقت لگے گا۔ آدھا گھنٹا جانے کا' آدھا گھنٹا آنے کا۔ آدھا گھنٹا جیرے بلیڈ کو اپنی بات سمجھانے کا اور ماسی ہیرے جھوٹ بولنے کا تاکہ وہ میرے لیے فکر مند نہ ہو۔۔۔دو گھنٹے گویا' میں نے طے کیا۔ ابھی صرف آدھا گھنٹا گزرا تھا لیکن یہ آدھا گھنٹا ضائع نہیں ہوا تھا۔ یہ کار آمد اور فل آف ایکشن آدھا گھنٹا تھا۔

فارغ بیٹھ کے مجھے اندیشے ستانے لگے۔ کہیں وسیم مر نہ گیا ہو۔ میں نے کچن میں جا کے اس کا طبی معائنہ کیا۔ اس کی نبض اور سانس چل رہی تھی۔ میں نے اسے وہیں اچار میں پڑا... چھوڑ دیا تھا مگر پھر مجھے ایک اور خیال پریشان کرنے لگا۔ اگر وہ ہوش میں نہ آیا تو کیا ہو گا؟ سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ مہینوں بے ہوش پڑے رہتے ہیں۔ یہ تو بڑا مشکل ہو گا کہ ہم اسے چھوڑ کے بھاگ جائیں۔ ڈاکٹرز کو بلانا یا اسے اسپتال لے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ رئیس کہے گا' یہ کیا کر دیا ہیرو۔ سارے مشن کا بیڑا غرق ہو گیا۔ جیرا بلیڈ تھانے دار کی وردی پہنے ٹیکسی میں بیٹھا ہے۔ اگر۔ لوگ آ گئے تو سارا معاملہ خراب ہو جائے گا۔ اسے اچار کا مرتبان اٹھا کے دوبار مارنے کی کیا ضرورت تھی آخر؟

میں وسیم کو گھسیٹ کر باہر لایا۔ پہلے تو اس کا چہرہ اور پھر ہاتھ پیر صاف کیے اور اس پر پانی کے چھینٹے مارے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میری پریشانی بڑھ گئی لیکن اسی وقت وسیم نے ایک چھینک ماری۔ میں نے چہرہ صاف کیا تھا تو اچار کا مسالا اس کی ناک میں چلا گیا تھا۔

میں آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا "بس بیٹے۔ بہت ہو گیا بے ہوشی کا ڈراما۔ ریوالور مل گیا ہے مجھے اور اب میں ایک ساتھ دو گولیاں مار سکتا ہوں تمہیں یا دائیں بائیں کھڑے دو دشمنوں کو ایک سیکنڈ میں لٹا سکتا ہوں۔"

اس نے آنکھیں کھول کے فریادی نظروں سے آسمان کو دیکھا اور آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر کے اوپر ہاتھ سے اس نے جائے مضروب کو محسوس کیا اور کراہا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہاں دو گومڑ ہوں گے۔ اس نے مجھ سے نہا کے کپڑے بدلنے کی اجازت مانگی۔

میں نے کہا "کوئی حرامی پن مت کرنا ورنہ یہ تمہارا آخری غسل ہو گا۔"

"تمہارا کے کفن نہ پہن لوں" وہ جل کے بولا "مرنا تو اب ہے۔"

مزید آدھے گھنٹے کے بعد وسیم نے پھر مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں اٹھائیس ہزار ڈالر کافی سمجھتے ہوئے اس معاملے میں دخل اندازی سے باز رہوں کیونکہ اس میں سب کی جان جا سکتی ہے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔

میں نے کہا "تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے جانتے ہو انہیں۔"

"وہ۔۔۔در اصل ۔۔۔ شریف لوگ تو نہیں کرتے ایسے کام۔ خطرناک ضرور ہوں گے" وہ بولا "میں وعدہ کرتا ہوں۔ قسم کھا سکتا ہوں تمہیں یقین دلانے کے لیے کہ دوبارہ تعلق کی بات ہوئی تو میں صاف انکار کر دوں گا۔ میں خود جا کے اپنی بیوی کو لے آؤں گا اور اسی گھر میں۔"

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اچھل پڑا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ رئیس اتنی جلدی واپس نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کیا کوئی اپنا مال اٹھانے آ گیا؟ ان کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا "میں دیکھتا ہوں۔"

"اگر یہ وہی ہوئے" وسیم کے حلق میں آواز پھنس گئی۔

میں نے اوپر دیکھا "اللہ مالک ہے۔ میں ان سے نمٹنے کے لیے بھی تیار رہوں۔"

میں نے دروازہ کھولا تو مالک مکان اپنی موٹر سائیکل میں چین ڈال کے لاک کر رہا تھا "آپ۔۔۔ کو آسانی سے مل گیا مکان؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "بہت آسانی سے۔ لیکن بڑی مشکل پڑ گئی ہے یہاں آ کے۔"

وہ اندر آ کے حیران ہوا "کیا مشکل پڑ گئی ہے؟"

میں نے کہا "ابھی گھر سیٹ نہیں ہے۔ سب بکھرا پڑا ہے۔ بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں۔ آپ کی کیا خاطر تواضع کریں۔ آپ باقی آدھا کرایہ لینے آئے ہوں گے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ اچار کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔" اس نے ناک سکیڑ کے سوں سوں کی۔

"کتنے پیسے ہیں آپ کے" میں نے کہا۔

"چار سو۔ میٹر کی ریڈنگ بھی دیکھنی تھی۔ پرانا بل میں بھر دوں گا۔" اس نے جیب سے بال پوائنٹ نکال کے ایک نوٹ بک میں ریڈنگ لکھی۔ اس کے بعد وہ منتظر رہا کہ ہم اسے تشریف رکھنے کے لیے کہیں لیکن ہم خاموش کھڑے رہے۔

میں نے کہا "گلزار احمد۔ مالک مکان کو چار سو روپے۔"

"میرے پاس نہیں ہیں اس وقت" وہ بولا۔

مالک مکان نے میری طرف دیکھا "تم انہیں کتنی رقم دینے آئے تھے؟ نو سو کہا تھا تم نے یا گیارہ سو۔۔۔؟"

"گیارہ سو۔۔۔ لیکن میرا وہ دوست کسی کام سے پیچھے رہ گیا۔ بس آتا ہی ہو گا" میں نے گھڑی دیکھی "رقم اس کے پاس تھی۔"

"اچھا۔ میں انتظار کر لیتا ہوں" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

میں نے جیب میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا "آپ مجھ سے لے جائیں۔ ہم آپس میں حساب کر لیں گے۔"

اس نے اپنی جیب دیکھی "میں سو کا کھلا لے کر آتا ہوں۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ سو روپے بعد میں آ جائیں گے۔"

جب وہ رخصت ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ نہ جانے کیوں یہ خیال میرے اعصاب پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا تھا کہ آج رات وہ اپنا مال اٹھانے ضرور آئیں گے جنہوں نے وسیم کا سوٹ کیس بدلا تھا۔ مجھے بے چینی سے رئیس کی واپسی کا انتظار تھا کیونکہ اکیلا ہونے کی صورت میں میرے لیے کوئی حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور بہادری اور مردانگی کا مظاہرہ کرنا بھی ناممکن تھا اور جاسوسی کرنا بھی۔ دونوں صورتوں میں میرا شہادت کے منصب پر فائز ہونا یا کم سے کم اگلے تین ماہ کسی اسپتال میں ہڈیوں کے وارڈ میں گزارنا لازمی تھا۔

اگر سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا تو میں رئیس کو یہاں چھوڑوں گا۔ اسے ایک ریوالور تحفے میں پیش کرنے کے بعد۔ سوٹ کیس لینے کے لیے ایک آدمی آئے گا یا دو؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اندر ایک آئے' دوسرا باہر گاڑی میں انتظار کرے۔ ممکن ہے وہ رئیس کے سامنے بات ہی نہ کریں۔ وسیم کہہ سکتا ہے کہ یہ دوست ہے یا نوکر ہے۔ اگر رئیس گونگا بہرا بن جائے تو؟ ویری گڈ۔ پھر وہ اسے بے ضرر سمجھتے ہوئے بے خوفی سے بات کریں گے اور رئیس سب سنے گا۔ ان پر نظریں بھی رکھے گا۔ اس بات کو بھی بعید از امکان نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ رئیس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہیں۔ کسی سے ملوانے کے لیے یا باہر کسی محفوظ جگہ پر مذاکرات کے لیے۔

اس وقت جیرا بلیڈ تو ہو گا ٹیکسی میں۔ ٹیکسی کھڑی ہو گی گلی کے نکڑ پر اور میں؟۔۔۔ میں کیا گلی میں پہرا دوں گا؟ یا ان کے آتے ہی جیرے بلیڈ کو سگنل دوں گا کہ ایکشن شروع۔۔۔ ٹیکسی لے کر دروازے پر آ جاؤ پھر ہم سب ایک ساتھ یلغار کریں گے اور انہیں ہینڈز اپ کرا لیں گے۔

نہیں۔ یہ صورتِ حال وسیم کے لیے مشکلات پیدا کر دے گی۔ ہم ان کو سوٹ کیس کے ساتھ جانے دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیکسی میں ان کا تعاقب کریں اور دیکھیں' وہ کہاں جاتے ہیں۔ جہاں گاڑی رکے وہیں اتر کے ہم انہیں روک لیں۔ ظاہر یہ ہو کہ ہم نے ڈکیتی کی واردات کی ہے۔ جیسی کہ عام طور پر ہوتی رہتی ہیں اور بعض اوقات ڈاکو پولیس کی وردی میں بھی ہوتے ہیں۔ ایسی خبریں بھی آئی ہیں کہ خود پولیس والے ڈاکو تھے جنہوں نے ائرپورٹ کی طرف سے آنے والے مسافروں کو چیکنگ کے بہانے روکا اور لوٹ لیا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تو ہم دوبارہ اچھل پڑے پھر میں نے مسکرا کے کہا "رئیس آگیا۔" اور اپنی گھڑی دیکھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو ایک شخص بالکل ویسا ہی سوٹ کیس اٹھائے کھڑا تھا جیسا وسیم کا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بھی کوئی ہے یا نہیں مگر اس نے مجھے موقع ہی نہیں دیا اور آگے بڑھ آیا۔ وہ صورت شکل سے جاہل' اجڈ اور اپنے حلیے اور لباس سے بھی غریب' محنت مزدوری کرنے والا نظر آتا تھا۔ یہاں تک وہ سوٹ کیس کو کیسے لایا تھا' اس کا جواب مجھے گلی میں کھڑی ہوئی سبزی کی ریڑھی سے ہو گیا۔

اس نے پہلے مجھے اور پھر میرے پیچھے کھڑے ہوئے وسیم کو دیکھا "گل جار کون ہے جی؟۔۔۔ آپ۔؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ درمیان کا آدمی ہے جو کسی کو بھی نہیں پہچانتا۔ "فرض کرو کہ میں ہوں' کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟"

"او جی پھر کیا کرنا ہے۔ بات گل جار کی ہے تو گل جار سے ہی ہووے گی۔ تم یہ بکس رکھ لو اور ایسا ہی دوسرا ہے نا تمہارے پاس۔ وہ ہم کو دے دو۔"

"تم سے کس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسا ہی دوسرا ہو گا؟"

"اجی کسی نے تو کہا ہے نا۔ ہمیں خواب تو آیا نہیں تھا اور نہ کوئی فرشتہ آکے بول گیا کہ اس گھر کا دروا جا بجاؤ اور اندر جا کے ایسا کہو۔ جس نے ہمیں یہ بکس دیا ہے اسی نے بولا تھا۔"

میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "وہ تو میں سمجھ گیا بھائی لیکن میں بھی اپنا اطمینان چاہتا ہوں' آخر کون تھا وہ؟"

"آپ کھود چل کے بات کر لو جی اس سے اگر ہم پر اعتبار نہیں ہے۔ وہ کھڑا ہے اُدھر گلی کے موڑ پر۔ ہم تو سبزی ترکاری بیچ کے گھر جا رہے تھے اس نے کہا کہ ایک کام کر دو ہمارا۔ سو روپے دوں گا۔ اس نے بتایا کہ یہ گھر ہے' دور سے ہی بتا کے لوٹ گیا۔ ادھر ایک بندہ ہے گل جار نام کا۔ اس کو یہ دے دو۔ وہ ایسا ہی بکس تمہیں دے گا' وہ اٹھا کے یہاں لے

آؤ۔"

میں نے کہا "تم نے پوچھا نہیں کہ تم دروازے تک آکے واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"اس نے کھود ہی بتا دیا جی' کہنے لگا گل جار سالا ہے میرا اور میری سسرال سے کچھ گڑبڑ ہے۔ میں وہاں جاتا نہیں۔ تم کو سو روپے لینے ہیں تو کھاموشی سے یہ کام کر دو ورنہ جاؤ۔ ہم کسی اور سے کرا لیں گے۔"

"اس کے بعد تم خاموش ہو گئے۔ خیر' میرا ہی نام ہے گلزار اور ایسا ایک سوٹ کیس ہے میرے پاس" میں نے کہا "اندر آکے اٹھا لو۔"

وہ کچھ نروس تھا۔ اسے اندازہ ضرور ہو گا کہ معاملہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے مگر سو روپے کا لالچ اس پر غالب آگیا تھا۔

میں نے کہا "وہ آدمی اکیلا ہے؟"

"اکیلا ہی لگتا ہے۔" اس نے سوٹ کیس اندر رکھا اور دوسرا اٹھانے لگا۔

میں نے کہا "گاڑی میں ہے۔ گاڑی کیسی ہے۔ کس رنگ کی؟"

وہ رک گیا "دیکھا نہیں جی میں نے۔"

"اچھا ایک آخری بات۔ اس کا حلیہ تو دیکھا ہو گا۔ دراصل میں بھی اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔ کہیں غلط آدمی سوٹ کیس نہ لے جائے" میں نے جیب میں دیکھا تو سو کا ایک نوٹ تھا "یہ میری طرف سے" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور کچھ سوچ کے پیچھے کر لیا۔

"یہ کیا معاملہ ہے جی۔ ہم گریب آدمی ہیں' کسی مشکل میں تو نا پڑ جائیں گے۔"

"ارے نہیں بھائی!" میں نے نوٹ زبردستی اسے تھما دیا۔

وہ بولا "آدمی ہے چھوٹا سا۔ ہم سے اتنا چھوٹا ہو گا" اس نے ایک بالشت کی لمبائی واضح کی "داڑھی ہے اور مونچھیں ہیں بڑی بڑی۔ منہ نظر ہی نہیں آتا بالوں میں۔"

گل زار نے نفی میں اشارہ کر کے واضح کیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس نے سوٹ کیس کے اصل مالک کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں مسلسل دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا' رئیس کو جلدی سے بھیج دے۔ اب تو دو گھنٹے پورے ہو گئے بعض اوقات قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے اور آدمی کوئی فضول سی چیز مانگ بیٹھتا ہے۔ اگر مجھے بھی پتا چل جاتا' جو ناممکن ہے کہ اس وقت میں جو دعا مانگوں گا وہ قبول ہو جائے گی تو میں بہت سوچ سمجھ کے کچھ مانگتا مگر میں نے دل سے جو

چاہا تھا وہ مل گیا۔ مجھے اپنے پیچھے گلی میں ایک سے لے کے رئیس خان کا چہرہ دکھائی دیا۔ پھر شاید اس نے گھر میں ایک اجنبی کو دیکھ لیا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

سبزی فروش نے سوٹ کیس اپنی ریڑھی پر رکھا اور ریڑھی کو ریورس گیئر میں دھکیلتا ہوا لے گیا۔ میں نے گلی میں جھانک کے دیکھا۔ مجھ پر گھبراہٹ سوار تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو سکتا تھا۔

○☆○

ذرا سی بے احتیاطی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو سکتا تھا۔ میں مشتعل ہو جاتا یا دخل در معقولات کرنے والے کے ہاتھ مار دیتا تو سب میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ اخبار والوں کو ایک اور دلچسپ خبر بنانے کا موقع مل جاتا۔

مجھ سے پہلے شمی نے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

لفافہ اچک لینے والا ہاتھ اسی کے ہم پیشہ کسی صحافی کا تھا جس کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا مگر میں اس کے نام سے ناواقف تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے پکڑ لیا "یہ سراسر بدتمیزی ہے مسٹر!"

اس نے خفیف ہو کے لفافہ چھوڑ دیا "اجی سر' ایسی بھی کیا بات ہے۔ ہم تو جانتے ہیں کہ لفافے میں کیا ہو گا۔"

میں نے لفافہ اٹھا لیا "جانتے ہو تو پھر دیکھنے کے لیے اتنے بے تاب کیوں تھے؟"

وہ ڈھیٹ آدمی تھا "بس تصدیق کرنے کے لیے۔"

شمی نے تیز ہو کے کہا "تم بغیر تصدیق کئے سب کو بتا دو' جاؤ۔"

"کیوں' یہاں کوئی خاص بات ہو رہی ہے کہ میں نہیں بیٹھ سکتا؟"

میں نے کہا "لو آر ویری رائٹ۔ ہم ایک خاص بات کر رہے ہیں۔ آپ چند منٹ بعد تشریف لائیں پلیز۔"

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا تو شمی نے اسے ایک مردانہ گالی دی۔

میں نے کہا "کیا واقعی اسے معلوم ہو گا؟"

"بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ تصویر اتار کے میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پانچ چھ اخباری نمائندے تھے اور وہ سب مرد تھے۔ پولیس نے انہیں گھیر لیا تھا۔ میں اکیلی عورت تھی اس لیے بچ گئی اور جان بچا کے نکل آئی تھی۔"

میں نے لفافے میں سے تصویر نکال کے دیکھی۔ تجسس کے ساتھ خوف نے مجھے نروس کر دیا تھا۔ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا جو بہت پہلے صادر ہو گیا تھا مگر ابھی تک میرے علم میں نہ تھا۔ میرے دل کے دوسری بار دھڑکنے سے پہلے میری دنیا اِدھر سے اُدھر ہو سکتی تھی۔ اگر وہ چہرے خادم کرنا اور خالد عثمان کے ہوتے تو میری ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی۔

تصویر دیکھ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ ان لاشوں کے اجنبی چہرے' ان سے ذرا بھی شباہت نہیں رکھتے تھے جن کے قتل کے الزام میں پولیس مجھے زبردستی ملوث کرنا چاہتی تھی۔

شمی میری صورت پر طمانیت کی مسکراہٹ دیکھ رہی تھی "اب کیا خیال ہے؟"

"یو آر گریٹ۔ تم نے واقعی ایک کارنامہ سرانجام دیا۔"

وہ خوش ہوئی "اس کا نیگیٹو میرے پاس ہے۔"

میں نے کہا "اسے حفاظت سے رکھو۔ میں تمہیں اس کی وہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں' جو تم چاہتی ہو۔"

"تھینک یو۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ویسے بھی انکار نہیں کرو گے۔ تم میں ایک غیر معمولی تبدیلی آئی ہے۔ یو نو؟"

"اچھا!" میں نے لفافہ جیب میں رکھ لیا "مجھے بھی بتاؤ اس تبدیلی کے بارے میں۔"

اس نے کہا "پہلے تم منافق تھے۔ بہت میٹھا بولتے تھے لیکن تمہارے دل میں بڑی کڑواہٹ ہوتی تھی۔ اب تم اکھڑ اور معاف کرنا' احمقانہ حد تک صاف گو ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارا لندن جانا طے ہے۔ تمہارے اخبار کی انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"انہیں میرے جواب کا انتظار ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ ایسے صرف مرنے کے لیے وہاں جانے کا کیا فائدہ ہے۔ بس یہ فائدہ ہے کہ میں پُرمنافقت دعاؤں سے بچ جاؤں گی۔ جو دل ہی دل میں مجھ سے نفرت کرنے والے اور میرے لیے حقارت رکھنے والے میری مغفرت کے لیے مانگیں گے۔"

"تم اتنی مایوس کیوں ہو آخر؟ لوگ کئی سال سے HIV پازیٹو ہیں اور زندہ ہیں" میں نے کہا۔

"تم سمجھتے ہو۔۔۔ وہاں علاج ممکن ہے؟"

"بے وقوف عورت" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ مجھ سے زیادہ یہ بات جانتی ہو گی کہ ایڈز لاعلاج ہے اور اس کے جراثیم خون میں سرایت کر جائیں تو کوئی دوا ان کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ بات صرف وقت کی ہے۔ کس کو کتنی مہلت زندگی کی ملتی ہے۔ یہ مشیت ایزدی ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے ایک جھوٹ پر مبنی حرف تسلی سننا چاہتی تھی۔

وہ اور کتنے دن جئے گی؟ یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ چند مہینے یا چند سال مگر ایسا دلآزار سچ بولنے سے مجھے کیا حاصل ہوتا۔ میں نے اس کو ایک پُرامید جھوٹ سے مطمئن کر دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں میڈیکل سائنس سو فیصد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناکام نہیں ہے۔ کامیابی کا اوسط بہت کم ہے مگر اس میں بھی بہت سے دیگر ایسے FACTORS ہیں جو اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ معاملے کو بالکل ابتدائی مرحلے میں ہی روک دیا جائے۔"

"یہ میں نے بھی سنا ہے۔ مجھے تو فوراً معلوم ہوگیا تھا۔"

"پھر تمہارا چانس زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ اہم ہے قوتِ ارادی۔ زندہ رہنے کی خواہش اور بیماری سے لڑنے کی اور اس پر غلبہ پانے کی نفسیاتی قوت۔ جو ہر مرض میں دوا کو اور علاج کو کارگر کرتی ہے۔ اس کی تم میں کمی نہیں اس لیے میرا خیال ہے کہ تمہارا لندن جاکے مستقل مزاجی سے علاج کرانا یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگا۔"

یقیناً کا لفظ میں نے کسی یقین کے بغیر استعمال کیا تھا مگر اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ شمی کا چہرا امید سے روشن ہوا "پھر... میں چلی جاؤں... لیکن میں نے سنا ہے کہ علاج بہت مہنگا ہوتا ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو تھپکا "ڈونٹ یو وری۔ مجھے خدا نے اتنی استطاعت دی ہے کہ کم سے کم ایک بیمار کا خرچہ برداشت کرسکوں۔ تم جاؤ۔ اپنے سفر کے انتظامات کرو، میں تمہیں ٹریولر چیک بنوا دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی تھی مگر اس نے سب کے سامنے رونے سے احتراز کیا۔ غیروں میں کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔ جب وہ میری ٹیبل پر سے اٹھ کے چلی گئی، آزاد صاحب نے کھانے کا شغل روک دیا "بھئی کیا خبر ہے گویا؟"

میں نے کہا "خبر اچھی ہے" اور لفافے میں سے ان کو تصویر کی ایک جھلک دکھا کے لفافہ پھر جیب میں رکھ لیا "آپ تو پہچانتے ہوں گے۔"

انہوں نے سر ہلایا "کیوں نہیں۔ بڑے بدمعاش ہیں دونوں۔"

میں نے کہا "آپ نے تصویر دیکھ کے پہچان لیا، کیا نام ہیں ان کے؟"

"اوفوہ ہرایرے غیرے کو ہم کیا جانیں۔ بھئی ہم ان کی بات کررہے تھے۔ وہ کیا نام ہیں ان کے گویا، مرزا عثمان اور خادم خالد۔"

"خادم مرزا اور خالد عثمان۔"

"ہاں ہاں۔ یہ وہ نہیں ہیں ہرگز۔" انہوں نے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ کیا خیال ہے، اب یہ تصویر سب کو دکھادی جائے۔ شمی کو مجھ سے اس کی قیمت وصول کرنی تھی سو اس نے کرلی۔ آپ کل اسے شائع کردیں۔ رات تک شاید پتا چل جائے کہ یہ مرحومین آخر کون بدبخت تھے" میں نے کہا۔

کھانا ختم ہوتے ہی صحافی حضرات کی دلچسپی بھی تقریباً ختم ہوگئی تھی مگر ان کو رخصت کرنے سے قبل ہی میں نے ایک دھماکا اور کردیا۔

میں نے کہا "آج صبح کے اخبارات میں ایک غیر مصدقہ اطلاع تھی کہ آپ حضرات میں سے کسی نے گزشتہ شب ان لاشوں کی تصویر اتارلی جن کو پولیس خادم مرزا اور خالد عثمان مقتولین بناکے برآمد کرنا چاہتی تھی۔ شاہ عالم ہاؤس کے عقبی حصے سے۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس... ہے کہ وہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ایک خاتون تھیں۔"

جس شخص نے مجھ سے لفافہ چھین کر تصویر دیکھنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ وہ زور سے بولا "معلوم ہے ہمیں۔ عورت ہونے کے بڑے فائدے ہیں بھائی!"

کسی نے اسے مشورہ دیا "پھر جنس کی تبدیلی کا آپریشن کرالو بھائی۔"

کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے تصویر کو ہاتھ میں لہرایا "دیکھیے یہ ہیں وہ تصویریں۔"

ایک دم بہت سے لوگ میری طرف لپکے۔ کل چھ تصویریں تھیں اور ہر تصویر میں ایک ہی واردات کے مختلف مناظر کی عکس بندی اس تسلسل میں تھی کہ دیکھنے والا خود سمجھ جائے۔ اسے اندازہ ہوجائے کہ کون سی تصویر پہلی ہے، کون سی دوسری اور کون سی آخری۔ انہیں جعلی قرار دینا ناممکن تھا۔

میں نے ایک ایک تصویر پیش کی اور دوسری اس وقت تک آگے نہیں بڑھائی جب تک کہ پہلی تصویر گھوم پھر کے واپس میرے ہاتھ میں نہیں آگئی۔ صحافی حضرات اب ان تصویروں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوگئے۔ ان میں سے ہر ایک تمام تصاویر مانگتا تھا اور ان کا "بہت معقول" معاوضہ ادا کرنے کے لیے تیار تھا تاہم اخبارات کے مالکان کی مرضی کے بغیر وہ کوئی قیمت لگانے سے قاصر تھے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ایک ایک تصویر سب کو دے دی جائے۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ یہ شمی کی ملکیت ہیں اور اس نے جملہ حقوق مجھے فروخت کردیے ہیں۔"

شمی کے اسی حریف نے کہا "تو آپ کیا انہیں فریم کراکے رکھیں گے؟"

"یہ شمی کو اس سال کے بہترین فوٹوگرافر کا ایوارڈ دلوائیں گے، اے پی این ایس سے۔"

میں نے کہا "یہ تصویریں کل آزاد صاحب کے اخبار میں شائع ہوں گی۔"

کسی نے کہا "شبنم نے پہلے ہی فرمادیا ہے گویا۔"

دوسرے نے بھی آزاد صاحب کی نقل اتاری "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔"

میں نے کہا "یہ حق بھی انہی کا ہے۔ گزشتہ دو دن میں انہوں نے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ بھی کم اہم نہیں۔"

"وہ خود کم اہم ہیں کیا؟" کسی نے طنز سے کہا۔

"مگر وہ ہیں کہاں جن کے لیے فرمایا ہے شاعر نے کہ۔ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔"

آزاد صاحب شفقت سے مسکرائے۔ "آپ کا ذکرِ خیر کس محفل میں ہوتا ہے گویا، ہم جانتے ہیں عزیزی اور بھئی شاعر نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ۔۔۔ پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا۔ اللہ میری توبہ۔ گایا بھی خوب ہے اور رقص تو قیامت ہے گویا!"

مذاق ہی مذاق میں آزاد صاحب نے سب پر واضح کردیا تھا کہ زیادہ بولنے والے انہیں بولنے پر مجبور نہ کریں ورنہ وہ سب کے بارے میں جانتے ہیں کہ کون صحافت کے نام پر کیا کچھ کرتا ہے۔

صحافی رخصت ہوگئے تو میں نے ملک عمر بخش مندرال سے بھی اجازت لی۔

ملازمین اور سیکیورٹی گارڈز کی ایک فوج نے عالی شان کاروں کی قطار میں کھڑی چلبلی کو حیرت ناک اور عبرت ناک نظروں سے دیکھا مگر ملک صاحب کو مجسم عقیدت سے رخصت کے لیے کھڑا دیکھا تو وہ بھی سراپا احترام بن گئے۔ آزاد صاحب کے ساتھ میں بڑی شان سے گاڑی میں بیٹھا جیسے سچ مچ وہ ملکہ وکٹوریہ کے ذاتی استعمال کی گاڑی اب ایک تاریخی چیز ہے اور انمول ہے۔

جیسا کہ مجھے ڈر تھا۔ عین وقت پر چلبلی نے بس ایک خفیف سی چھینک ماری اور بند ہوگئی۔ آزاد صاحب نے پھر کوشش کی تو اسے کھانسی آئی مگر انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ کیا اب میں چلبلی کا کمنیک ہونے کا ثبوت دوں گا۔ ملک صاحب کے ملازموں کی گاڑیاں بھی اس سے لاکھ درجے بہتر تھیں۔

آزاد صاحب نے بلا تردد کہا "میاں زکام کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے غالباً۔"

میں نے جل کے کہا "اسے ڈبل نمونیا کیوں نہیں ہوجاتا۔"

وہ ہنسے "نصیب دشمناں، نصیبِ حاسداں، شفا پھر بھی تمہارے ہی ہاتھوں ملے گی گویا۔"

ملک نے سر جھکا کے کہا "میرا شوفر آپ کو چھوڑ آئے گا" اس نے ایک چمکتی دمکتی لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بھی پہنچادے گا بعد میں۔"

آزاد صاحب ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئے "بھئی اپنے ملک صاحب! فارسی میں ہے ایک شعر، پہلے سن لیں پھر مطلب بھی بتادیں گے گویا۔"

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

ملک نے مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا۔ "آپ کیا سمجھے شاہ صاحب؟"

آزاد صاحب نے کہا "یہ خاک سمجھیں گے، اردو بھی ڈھنگ سے نہیں آتی جن کو گویا۔ مطلب کچھ یوں ہوا کہ اپنے پیروں پر چل کے آدمی جنت میں نہ جاسکے اور ہمسائے کے پیروں سے چل کر جائے تو بہتر ہے کہ جہنم میں چلا جائے۔"

"اچھا اچھا جی، آپ کی مرضی" ملک خفیف ہوکے بولا۔

میں نے عاجزانہ درخواست کی "کیوں نہ ہم ان سے درخواست کریں کہ وہ دھکا لگائیں۔ شاید اسٹارٹ ہوجائے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں" وہ بولے "کرو درخواست بقلم خود۔"

چار چھ ملازمین چلبلی کو دوڑاتے دھکیلتے، ہانپتے گیٹ تک لے گئے۔ اس دوران میں آزاد صاحب نے دوبار کلچ چھوڑ کے اسے اسٹارٹ کرنا چاہا مگر ناکام رہے۔ تیسری اور آخری بار جب گاڑی دربان کے سامنے سے گزری تو گویا معجزہ رونما ہوا اور چلبلی کا انجن غرانے لگا۔ میں نے اور آزاد صاحب نے ہاتھ ہلایا پھر میں نے پلٹ کے دیکھا تو دربان دم بخود کھڑا تھا اور ملکہ وکٹوریہ کی گاڑی کو دھکا لگانے والے تھکے ہارے یوں واپس جارہے تھے جیسے انگریز ہندوستان سے گئے تھے۔

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ میں آگ لگادوں گا کسی دن اسے۔"

"کسے آگ لگادوگے؟" وہ چونکے۔

"چلبلی کو اور کسے؟"

"میاں صاحب زادے۔ تمہاری والدہ کی عمر کی بزرگ ہے چلبلی گویا۔ ایسی ناخلفی کا کلمہ کم نہیں دشنام سے۔ آگ ہندو لگاتے ہیں ماں مرجائے تو۔"

میں سخت شرمندہ ہوا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ تو ہم کرتے ہیں۔" وہ بولے "یہ جو بزرگ ہوتے ہیں نا برخوردار۔ پرانی مشین کی طرح۔ انجر پنجر ڈھیلے، گراریاں گھسی ہوئی۔ پرزے ٹوٹے پھوٹے۔ لاٹھی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہارے چلیں یا وہیل چیئر پر۔ ان کی دیکھ بھال کہلاتی ہے خدمت گزاری اور سعادت مندی گویا۔ چلانا پڑتا ہے انہیں جب تک چلیں' کیا سمجھے؟ معاملہ ہوتا ہے جذبات کا۔ ورنہ آدمی انہیں اسکریپ میں ڈال دے اور نئے ماڈل کے والدین لے آئے۔ وہ تو ایسا ہی کچھ سلسلہ ہے گویا ہمارا بھی۔ ایک جذباتی رشتہ ہے گویا۔ شریکِ حیات کی طرح زندگی اور موت کا ساتھ ہے۔ دیکھنا یہ رہ گیا ہے کہ کون پہلے ساتھ چھوڑتا ہے۔"

میں شرم سے پانی پانی ہوگیا "میں معافی چاہتا ہوں۔"

وہ ہنسے "ہمیں نہیں' چلبلی کے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ یہ بہت حساس اور زود رنج ہوگئی ہے گویا۔ خیر ابھی تو ہم چل رہے ہیں نفسیاتی علاج گاہ۔ کیا حرج ہے اگر تمہارے دماغ کے اندر عقل' بھوسے اور گوبر کے تناسب کا بھی اندازہ ہوجائے۔"

میں نے کہا "بچپن میں میرا آئی کیو ایک سوتیس تھا۔"

"میاں' سوال بچپن کا نہیں' پچپن کا ہے۔ ہمیں اگر شک گزرتا ہے گویا کہ اب تمہارا آئی کیو بھی بچپن ہی ہوگا تمہاری ذہنی عمر کی طرح۔ بے شک تم جسمانی طور پر جوان نظر آتے ہو۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ میری بات پر ابھی تک خفا تھے۔

میں نے خاموشی میں عافیت جانی اور جب چلبلی "جمال کلینک آف ہیومن بی ہیویئر" میں جاکے بریک لگانے سے رک گئی تو میں نے سکون کا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ چند فٹ کے فاصلے پر پورچ کا آرائشی قسم کا ستون تھا جس پر سیاہ گلیز ٹائل چمک رہا تھا۔ شاید اس کے گرنے سے پورچ کی چھت ہم پر آگرتی۔

کلینک آف HUMAN BEHAVIOR بڑا اچھا نام تھا۔ انسانی رویوں کو سمجھنے اور ان کو بہتر اور نارمل بنانے کے اور بھی نام ہوسکتے ہیں مثلاً اسے نفسیاتی علاج گاہ یعنی سائیکاٹرسٹ کلینک بھی کہا جاسکتا تھا اور جاہلانہ طریقے پر پاگل خانہ یا مینٹل اسپتال بھی۔ ان سب میں نظر نہ آنے والا فرق بہت نمایاں ہے۔ کچھ لوگوں کا رویہ غلط ہوتا ہے۔ اسے سدھارا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ نفسیاتی عوامل کے دباؤ سے ابنارمل ہوجاتے ہیں۔ ان کا علاج آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ پاگل پن ایک ذہنی عارضہ ہے چنانچہ جس کا رویہ غلط لگے اسے پاگل کہنا جہالت کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جینئس اور سائنس داں پاگل کہلاتے ہیں۔

وہ غالباً چار کنال کی کوٹھی تھی جس میں دو کنال پر باغ پھیلا ہوا تھا اور کسی تجربہ کار باغباں کی ہنرمندی ہر گوشۂ چمن سے خود بولتی محسوس ہوتی تھی۔ سرسبز درختوں کے ٹھنڈے سائے میں قالین کی طرح بچھے ہوئے ہرے بھرے لان پر رنگین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر چار افراد بڑے سکون سے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ سب معزز اور شریف لوگ لگتے تھے۔

ڈاکٹر جمال اور ان کی بیوی عائشہ جمال عمر رسیدہ لوگ تھے اور دونوں مل کے اس علاج گاہ کو چلا رہے تھے۔ ان کا ساتھ میڈیکل کالج کا تھا۔ ایک ساتھ ڈاکٹر بننے کے بعد انہوں نے اپنی مرضی سے شادی کی اور پھر ایک ہی فیلڈ کو اسپیشلائز کرنے کے لیے منتخب کیا۔ نیورو فزیشن اور سائیکاٹرسٹ بننے کے لیے میاں بیوی نے آئرلینڈ جاکے ڈبلن سے ایم آر سی پی اور اس کے بعد ایف آر سی پی کیا۔ ان کی زندگی کا زیادہ وقت لندن میں گزرا۔ جب بچے بڑے ہوگئے اور ان کی شادیاں بھی ہوگئیں تو وہ لوٹ کر پاکستان آگئے اور یہاں اپنی رہائش گاہ میں ہی یہ نفسیاتی علاج گاہ قائم کی۔ دو منزلہ عمارت کا ایک چوتھائی حصہ ان کو رہنے کے لیے کافی تھا۔ بہت جلد ان کی کنڈولی پھیل گئی اور وہ پوری دلچسپی کے ساتھ اپنے کام میں مگن ہوگئے۔

ان میاں بیوی کی زندگی میرے لیے قابلِ رشک تھی۔ اس عمر میں بھی وہ صحت مند' چاق و چوبند اور بے حد مطمئن تھے۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور وہ اپنی زندگی ایک مشن کے لیے وقف کرچکے تھے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ ان کی تمام عمر مثالی ڈسپلن کے تحت ایک مقصدِ حیات کو سامنے رکھ کے گزری تھی اور آج بھی جب کہ وہ ساٹھ سال کے ہوچکے تھے یا ہونے والے تھے ان کی زندگی میں دلچسپی برقرار تھی اور وہ کام کو کام نہیں' شوق سمجھ کے دلچسپی کے ساتھ کررہے تھے۔ میاں بیوی انتہائی خلیق اور خوش مزاج تھے۔ ہم تنہائی یا بوریت کا شکار کیسے ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر جمال نے مجھے بتایا' جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ یہاں ایک خاندان کے فرد کی طرح رہتے ہیں اور یہ تعلق باقی رہتا ہے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو ڈاکٹر جمال نے مسکراتے ہوئے کہا "تعارف کی ضرورت کہاں ہے آپ کو۔ بڑی دلچسپ خبریں مسلسل شائع ہوتی ہیں آپ کے بارے میں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ویسے کیا یہ سب سچ ہوتا ہے؟ مجھے تو بالکل کسی فلمی اسٹوری کی طرح لگتی ہے تمہاری کہانی۔"

میں نے کہا "فلمی کہانیاں بھی تو زندگی کے موضوعات پر ہی لکھی جاتی ہیں۔ جتنا مبالغہ ان میں ہوتا ہے اتنا ہی اخبار والے زیبِ داستان کے لیے میری اسٹوری میں ڈال دیتے ہیں' شبنم کا کیا حال ہے؟"

"شبنم از فائن۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ آزاد صاحب اس کو یہاں کیوں لائے؟" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

"SHE IS SUCH A GOOD GIRL"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "تم اس کے ساتھ بہت زیادتی کررہے ہو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میں زیادتی کررہا ہوں؟"

"آف کورس اور مسئلہ کیا ہے اس کا؟" ڈاکٹر عائشہ نے خفگی سے کہا "تم اس کو IGNORE کرتے ہو۔ اگر تم اسے تھوڑی سی توجہ دو۔ اس میں دلچسپی لو تو تمہارا کیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر جمال نے کہا "بے شک تمہاری کچھ معاشرتی مجبوریاں ہیں۔ تم شادی شدہ ہو اور اسکینڈل افورڈ نہیں کرسکتے۔"

"BUT SHE IS MAD AFTER YOU"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "اور کوئی مسئلہ نہیں ہے اس کا۔ اب یہاں لڑکیوں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ محبت کرتی ہیں تو صرف شادی کے لیے۔ صرف محبت کے لیے نہیں۔"

میں نے کہا "کیا آپ اپنی جنس کے لیے جانبداری سے ہمدردانہ جذبات رکھتی ہیں؟"

"او نو۔ یہ لڑکوں کی سوچ نہیں ہے۔ وہ وقت گزارتے ہیں۔ دل لگی کرتے ہیں۔ اتنا SERIOUSLY نہیں لیتے محبت کو اور شادی نہ ہو تو بڑے میٹر آف فیکٹ طریقے پر اسے تسلیم کرلیتے ہیں۔ دوسری عورت کے ساتھ آسانی سے ADJUST بھی ہوجاتے ہیں فوراً۔"

ڈاکٹر جمال نے کہا "سو فیصد کیسوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ لڑکے بھی سیریس ہوتے ہیں جیسے میں تھا۔"

ڈاکٹر عائشہ نے فوراً تردید کی "YOU LIER۔ میرے سامنے بیٹھ کے تو ایسا مت کہو۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ بیک وقت تم کس کس کو چکر دیتے رہے تھے۔ وہ تو میں ذرا فراخ دل تھی کہ میں نے بُرا نہیں مانا۔"

"اور مستقل مزاجی سے میرے پیچھے لگی رہیں۔ چنانچہ کامیاب رہیں" ڈاکٹر جمال نے مسکراتے ہوئے کہا "بات یہ ہے مسٹر شاہ عالم کہ یہ محبت کوئی جسمانی روگ تو ہے نہیں کہ اینٹی بایوٹک کا ایک کورس اسے ختم کردے۔ عشق کے وائرس کی طاقت بھی UNLIMITED ہے۔ میں کیا کرسکتا تھا اگر لندن میں یا مجھ سے شادی کرنے کے بعد عائشہ کو کسی سے عشق ہوجاتا۔ اس میں کیوں کا کیا سوال اور کسی LOGIC یا عقل کی REASONING کا کیا سوال۔"

"تم مجھے بات کرنے دو" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "اب یہ لڑکی شبنم۔ شی از سو سویٹ اینڈ چارمنگ۔ اتنے اچھے MANNERS ہیں اس کے۔ اتنی INTELLIGENT ہے وہ۔"

میں نے مسکرا کے کہا "میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسی ہے؟"

"وہ سمجھتی ہے تمہاری پرابلم کو۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ لڑکی۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی ہے اور اس کی ایک پبلک لائف ہے۔ اس نے وہی کہا جو کہہ سکتی تھی کہ پھر میں کیا کروں۔ یہاں تو سیاست داں' اونچے درجے کے بیوروکریٹ اور فیوڈل لارڈز سب ضرورت کے تحت ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں اور اسے معیوب کوئی نہیں سمجھتا۔ لیاقت علی خان سے بھٹو صاحب تک اس نے مجھے ایک سو ایک نام گنادیے جو بے حد مقبول سیاسی لیڈر تھے اور اپنا ایک CHARISMA رکھتے تھے۔ اس میں کوئی بدنامی یا اسکینڈل والی بات ہی نہیں۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ مذہب نے چار کی اجازت دے رکھی ہے مردوں کو مگر دو تو عام بات بے لوز نیشن ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں ایک قانونی مسئلہ بھی ہے۔ اگر اس کی بیوی اجازت نہ دے تو وہ دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ وہ ہنسنے لگی۔ ایک بات کہی اس نے مجھ سے جو غلط نہیں ہوگی مگر میں تصدیق چاہتی ہوں تم سے۔ اس نے کہا کہ تم اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بالکل خوش نہیں ہو اور زبردستی یہ رشتہ نبھارہے ہو' از دیٹ سو؟"

"شی از وری رائٹ" میں نے کہا۔

"مجھے پتا تھا وہ جھوٹ بولنے والی لڑکی نہیں ہے" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

"اس نے کہا کہ آخر وہ اپنے آپ پر بھی تو ظلم کررہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں تو بیوی کب خوش ہوگی اس سے۔ ہم سب ناخوش ہیں اور بہت آسان اور اچھا حل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔ DIVORCE کردے۔ اس میں کون سی پرابلم ہے۔ وہ کیوں اپنی میری اور۔ کیا نام ہے تمہاری وائف کا۔ رخشی۔ ہاں' رخشی کی زندگی تباہ کررہی ہے۔"

"میں شبنم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں" میں نے کہا۔

ڈاکٹر جمال اور عائشہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "یعنی تم ایسا ہی کرنے کے لیے تیار ہو پھر کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

"تم ڈرتے ہو۔ MORALE COURAGE نہیں ہے تم میں یا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ۔ بے شک میں نے ایسا دیر سے کیا لیکن میں رخشی کو چھوڑ چکا ہوں۔ آج ہی میں نے اس کو DIVORCE دینے کا اعلان بھی کیا ہے۔"

"REALLY" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "کیا شبنم جانتی ہے؟"

"ابھی نہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ڈاکٹر عائشہ کہ ایسا میں نے شبنم سے شادی کرنے کے لیے کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی میں نے اس کے بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا۔ بے شک وہ اچھی لڑکی ہے اور بہت سی اعلیٰ صفات ہیں اس میں۔ میں بھی اس کو بہت پسند کرتا ہوں مگر LIKE کرنے اور LOVE کرنے میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اسے جذبات کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ عقل کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ پہلی بار کی بات مختلف ہے جب آدمی IMMATURE ہوتا ہے۔"

"میں متفق ہوں تم سے۔ کوئی جلدی نہیں۔"

"TAKE YOUR OWN TIME" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ہو سکتا ہے کہ بالآخر تمہارا فیصلہ بھی اس کے حق میں ہو۔ میں سفارش نہیں کر سکتی۔ تم اس کے برعکس بھی کر سکتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم ایک بیوی میں کیا دیکھنا چاہتے ہو۔ کیا EXPECT کرتے ہو اس سے۔ ہو سکتا ہے اس مردوں کے معاشرے میں تمہارے بھی دہرے معیار ہوں یعنی وائف اور محبوبہ کے لیے QUALIFY کرنے والی لڑکی کے STANDARDS ایک نہ ہوں۔"

"میں اپنے لیے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔"

"ایک ذاتی سوال ہے بہت اہم۔ تمہیں کسی سے محبت ہے۔ میرا مطلب ہے ویسی ہی جیسی شبنم کو تم سے ہے۔ INCURABLE قسم کی۔"

"UNFORTUNELY-یس۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر عائشہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یعنی وہی ظالمانہ مثلث۔ اے کو بی سے محبت ہے۔ بی کو سی سے پیار ہے۔ سی کے بارے میں کیا ہے؟ وہ بھی اتنا ہی چاہتی ہے بی کو؟"

میں نے سوچ کے کہا "غالباً۔ کچھ عرصہ پہلے میں کہہ سکتا تھا کہ یقیناً مگر اب میں اتنا SURE نہیں ہوں۔"

"کیوں؟ کیا سی کو ڈی سے عشق ہو گیا ہے؟" ڈاکٹر جمال بولے۔

"کیا اس کی وجہ شبنم ہو سکتی ہے؟" ڈاکٹر عائشہ نے پوچھا۔

"NONE OF THE TWO REASONS" میں نے کہا۔

"اچھا۔ تم اتنا تو کر سکتے ہو۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک نفسیاتی مسئلے سے دوچار ہے کہ اس کے ساتھ HOSTILE نہ رہو۔ اس کی مدد کے لیے۔"

میں نے کہا "HOSTILE میں کبھی نہیں ہو سکتا، نہ تھا۔"

"اپنے INDIFERANCE کو تھوڑا سا بدل لو۔ ایک حوصلہ افزا اور پُرامید دوستانہ رویہ اختیار کر لو" ڈاکٹر جمال نے کہا۔

"ورنہ WARN YOU! وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔" ڈاکٹر عائشہ لندن میں رہ کے انگریزی کے الفاظ زیادہ بولنے لگی تھیں۔

میں نے کہا "اس کی مدد کے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اسے بچانے کے لیے کسی بھی EXTREME تک جا سکتا ہوں۔"

"ونڈر فل بوائے۔" ڈاکٹر عائشہ نے میرے کندھے پر تھپکی دی "جاؤ اوپر ہو گی وہ۔ رائٹ سائڈ پر دوسرا دروازہ۔"

میں بتائے ہوئے راستے پر اوپر گیا تو متضاد جذبات کی کشمکش کا شکار تھا۔ میں شبنم کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور مجھے خود بھی اس کی مدد کی اشد ضرورت تھی مگر اس کے لیے شبنم کو کسی جذباتی دھوکے میں مبتلا رکھنا مجھے مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کی وجہ واضح تھی۔ میں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا کہ میں چندا سے محبت نہیں کرتا۔ دل لگی کے لیے دل لگانے اور فیشن کے طور پر فلرٹ کرنے کا میں قائل نہیں تھا مگر دوسری طرف سوال تھا ایک زندگی کا۔ اس کے لیے جھوٹ بولنا اور محبت کا ذرا سا کرنا کسی طرح بھی گناہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک طرح سے یہ کارِ خیر تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایسا ہی جھوٹ شمی سے بولا تھا کہ لندن جا کے وہ ٹھیک ہو جائے گی پھر کیا میں اس کے ذہنی علاج کی ضرورت سمجھتے ہوئے شبنم سے نہیں کہہ سکتا کہ آئی لو یو۔ صرف تین لفظ۔ بلاشبہ مذہب بھی جان بچانے کی شرط پر حرام کو حلال سمجھنے کی اجازت دیتا ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ کسی کی جان بچانے کے لیے کوئی اپنے ایمان سے پھر جائے۔ اگر کوئی نعوذباللہ یہ کہے کہ یار تم کیسے مسلمان ہو اللہ نیت کا حال جانتا ہے۔ کیا ہے اگر ایک آدمی کی جان بچانے کے لیے تم پتھر کے بت کو سجدہ کر دو۔

میں نے دروازے پر انگلی سے دستک دی اور "یس" سن کے اسے چھیڑ دھکیلا۔ شبنم دروازے کے بائیں جانب بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے کھڑا ہو گیا "گڈ ایوننگ!"

وہ کتاب بند کر کے ایک دم اٹھی "تم!"

میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا "یس۔ تم اتنی حیران کیوں ہو؟"

"کس نے بتایا تمہیں کہ میں یہاں ہوں؟"

میں نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے "میرے دل نے۔ کہو کیسا لگا یہ ڈائیلاگ؟" میں نے ہنس کے کہا "بہت اچھی لگ رہی ہو تم۔ آج۔"

اس نے مجھے خالی نظروں سے دیکھا۔ "آج۔؟ کیا خاص بات ہے آج؟"

میں نے کہا "اس لباس میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں۔"

اس کی آنکھوں میں حیرانی جھلکی "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بھئی یہ شلوار قمیص۔ اور یہ دوپٹا۔"

"عالی۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو آخر۔ مجھے تنگ کرنے کے لیے۔" وہ بولی "ہزار بار تو دیکھا ہو گا۔"

میں نے فوراً بات سنبھالی "میرا مطلب تھا۔ یہ انداز آج نیا لگتا ہے۔ یہ بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بیٹھ گئی "کیا ہوا ہے مجھے؟ تمہیں معلوم ہے۔؟"

میں نے کہا "ہاں۔ آزاد صاحب نے سب بتا دیا ہے مجھے۔ وہی لائے ہیں مجھے یہاں۔"

وہ کچھ دیر مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ریلا یوں آیا جیسے کسی بند کا حفاظتی پشتہ ٹوٹ جانے کے بعد سیلابی پانی کا ریلا۔ وہ ایک دم میرے کندھے پر سر رکھ کے ہچکیاں لینے لگی اور زار و قطار رونے لگی "عالی۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو، میں نے شک کیا تم پر۔"

میں نے اسے شانوں کے گرد ہاتھ لپیٹ کر اپنے قریب کر لیا "اٹ از اوکے جانی۔ وہ حالات ہی ایسے تھے۔ سارا زمانہ شک کر رہا تھا۔"

"سارے زمانے میں اور۔ مجھ میں۔ کوئی فرق نہیں۔ مجھے تو سب سے پہلے گواہی دینی چاہیے تھی۔ مجھے سب کو بتانا چاہیے تھا کہ تم عالی ہو۔ شاہ عالم، میں نے بڑی غلطی کی، بڑا گناہ کیا، پلیز معاف کر دو مجھے۔ میں نے تمہیں بہت دکھ پہنچایا، بہت پریشان کیا۔"

میں نے اسے سنبھالنے کی پوری کوشش کی "شبنم۔ پلیز ہوش میں آؤ۔ دیکھو، وہ بات ختم ہو گئی۔"

لیکن وہ پاگل پن کے دورے میں مجھ سے بُری طرح چمٹ گئی تھی۔ "نہیں، میں بہت بری ہوں۔ تمہاری گناہ گار ہوں۔ اس قابل نہیں کہ تم مجھے معاف کرو۔ مجھے مار ڈالو اپنے ہاتھوں سے۔ گلا گھونٹ دو میرا۔"

اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ دیے۔ اس کا ہسٹریا میرے لیے آؤٹ آف کنٹرول ہوتا جا رہا تھا۔ "دبا دو میرا گلا۔"

میں نے اسے زبردستی الگ کیا اور اچھی طرح جھنجوڑا۔ "شبنم، واٹ از دس۔" مگر وہ روتے روتے بے سدھ ہو گئی اور میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹا دیا اور ایمرجنسی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

ڈاکٹر عائشہ جیسے دروازے سے لگی کھڑی تھیں "اٹ از آل رائٹ۔ یہ بالکل EXPECTED تھا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

وہ انجکشن بھر کے ساتھ لائی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ کے اسے انجکشن لگاتے دیکھتا رہا۔ "میں اس REACTION کو کنٹرول نہیں کر سکا۔ میں نے کوشش کی تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی میں نے۔"

"چلو پریشر ککر کو پھٹنا تھا، پھٹ گیا۔ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اب یہ اٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہو گی۔"

"یہ کتنی دیر سوتی رہے گی؟"

"چار سے چھ گھنٹے۔" وہ بولی۔

"مگر میں۔ اتنی دیر نہیں رک سکتا" میں نے کہا۔

"مسٹر ابوبکر تو چلے گئے۔ انہوں نے کہا کہ تم نہ سو گے اور تمہیں ٹھہرنا بھی چاہیے۔" ڈاکٹر عائشہ نے مجھے ڈانٹا "یہ کس قسم کا COOPERATION ہے آخر۔ تمہیں وقت کی فکر ہے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر۔ میں پھر آجاؤں گا۔ بہت ضروری کام ہے مجھے جو ٹالا نہیں جا سکتا۔"

"کیا ہو گا اگر تم نہیں جاؤ گے؟ لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا؟ تم الیکشن سیٹ ہار جاؤ گے، آسمان گر پڑے گا۔"

"دیکھیے، یہ بات نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے جاگنے سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔" میں نے کہا "میری بہن کی شادی ہے آج۔ رخصتی ہے۔ وہاں میرا موجود ہونا کتنا ضروری ہے، آپ کو سمجھنا چاہیے۔"

"اوہ۔ پھر تم جاؤ" اس نے ایک گہری سانس لی "لیکن دیکھو، جب یہ جاگے گی۔ تو تمہیں پوچھے گی۔ اور تم نظر نہ آئے تو یہ سمجھے گی کہ اس نے خواب دیکھا تھا۔ اس کا اثر خراب ہو سکتا ہے۔"

"میں آجاؤں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"ہو سکتا ہے رات تمہیں یہاں رہنا پڑے اور۔ اگر شبنم ایسا چاہے تو اس کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ سب سے اچھا ہو گا۔"

"ساتھ لے جاؤں۔ کہاں؟"

"اپنے گھر۔ تم نے ابھی کہا کہ بیوی کو تم نے چھوڑ دیا پھر اب کس کا ڈر ہے تمہیں؟" وہ بولی۔

اچانک دروازہ کھول کے دو افراد کمرے میں گھس آئے۔

"خبردار۔ اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے" ان میں سے ایک نے کہا۔

ان دونوں کو میں پہچانتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم کیا سمجھتے تھے کہ ہمیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔" قدرے فربہ اندام اور بے بال شخص نے اپنی آواز کو بارعب اور دہشت ناک بنانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک زنانہ یا بچکانا تھی۔

"ہم سائے کی طرح تمہارا پیچھا کر رہے تھے" دبلے پتلے شخص کی آواز میں مغلِ اعظم جیسی گھن گرج تھی جو پستول اس کے ہاتھ میں تھا' وہ نقلی تھا۔

"مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو' خود اپنی غلطی سے پکڑا جاتا ہے' کیا خیال ہے ڈاکٹر واٹسن!"

"یو آر رائٹ شرلاک ہومز۔ اس مجرم نے کیا غلطی کی تھی؟"

"ڈونٹ بی اے فول۔ ابھی یہ جرم کرے گا پھر غلطی۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور ہوشیار رہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ابھی یہ مجرم نہیں ہے" ڈاکٹر واٹسن کو کچھ مایوسی ہوئی "پھر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"ہم مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے مسکراتے ہوئے ان کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا اور دروازہ کھول کے کھڑی ہو گئیں۔ "چلیں باہر آپ دونوں...... یہ بہت بُری بات ہے۔"

شرلاک ہومز متاثر نہیں ہوا "مگر ڈاکٹر صاحب' ہم ڈراما کر رہے تھے۔"

ڈاکٹر واٹسن کا کردار کرنے والے نے سر جھکایا "میں نے کہا تھا تم سے کہ ڈاکٹر صاحب خفا ہوں گی۔"

"میں خفا نہیں ہوں' مصروف ہوں" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔ "میں ایک مریض کو ATTEND کر رہی ہوں۔"

"یہ مریض نہیں' مریضہ ہے" شرلاک ہومز نے اعتراض کیا "کیوں ڈاکٹر واٹسن؟ عورت لیٹی ہوئی ہے؟"

ڈاکٹر واٹسن سوچ میں پڑ گیا "کیا مریض یہ شخص نہیں ہو سکتا...... جو کھڑا ہوا ہے؟"

شرلاک ہومز نے ایک سائنسی نکتہ اٹھایا "واٹسن...... جو لیٹا ہوا ہے کیا وہ تمہیں HORIZONTALLY کھڑا ہوا نہیں نظر آئے گا؟ اور جو کھڑا ہے کیا وہ اسی طرح VERTICALLY لیٹا ہوا نہیں لگے گا۔ فرض کرو تم ایک کیمرے ہو۔"

"آپ نے سنا نہیں میں نے کیا کہا" ڈاکٹر عائشہ نے سختی سے کہا "باہر جا کے کریں اپنا ڈراما۔ ایسے دستک دیے بغیر کسی کے کمرے میں گھس جانا بڑی بری بات ہے۔ بدتمیزی ہے۔"

"تم کو اپنی کیٹس فراموش نہیں کرنی چاہئیں ڈاکٹر واٹسن!" شرلاک ہومز نے متانت سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کے سر جھکا لیا "آئی ایم سوری سر!"

اس کے دوست ڈاکٹر واٹسن نے بھی ایسا ہی کیا پھر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر عائشہ نے دروازہ بند کر دیا۔

"یہ کیا کیریکٹر تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں ایسے ہی کریکٹر ملیں گے تمہیں" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "دونوں اچھے پڑھے لکھے اور RESPECTABLE لوگ ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں انہیں۔ ایک وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ دوسرا کامیاب بزنس مین تھا۔ ان کے اچھے خاصے گھر ہیں۔ بیوی بچے ہیں' بچوں کی شادیاں کر چکے ہیں اور وہ بھی بہت سیٹ ہیں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ ہے ان کی عمر کے لوگوں کا اکیلا پن۔ یہ پہلے جتنے مصروف تھے اب اتنے ہی بے مصرف ہو گئے ہیں۔ لڑکیاں اپنے گھر کی ہو گئیں۔ ایک کے لڑکے باہر سیٹل ہو گئے۔ وہ نہ بیٹی داماد کے ساتھ رہنے کو اچھا سمجھتا ہے اور نہ باہر جا کے مرنا چاہتا ہے۔ بیٹوں نے بہت مجبور کیا تو ایک بار چلا گیا تھا ان کے ساتھ رہنے مگر دو چار مہینے میں گھبرا کے بھاگ آیا۔ وہاں کسی کو بڑے میاں سے بات کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ پوتے تک ان سے دور بھاگتے تھے۔ یہاں اس کوٹھی میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے جو ریٹائرمنٹ کے بعد اس خیال سے بنوائی تھی کہ بیٹے اور بہوئیں پوتا پوتی سب ساتھ ہوں گے تو جگہ کی کمی نہیں ہو گی۔ اب اتنی بڑی کوٹھی بھائیں بھائیں کرتی ہے۔ چالیس سال پرانی بیوی ہے۔ وہ بھی بیمار رہتی تھی۔ علاج کے لیے امریکا چلی گئی۔ پنشن کے علاوہ بھی بہت آمدنی ہے۔ گھر نوکروں پر چل رہا ہے۔ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں سب مصروف اور الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔"

"یار' یہ کوٹھی بیچ کے کسی چھوٹے گھر میں منتقل کیوں نہیں ہو جاتے۔ کسی چھوٹے لوگوں کی بستی میں جہاں میل ملاپ زیادہ ہوتا ہے۔ پڑوسی اور محلے دار ایک دوسرے کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ساری عمر کی عادتیں اب فطرت کا حصہ بن گئی ہیں پھر اسے ایک جھوٹی آس ہے کہ بچے لوٹ کر آئیں گے تو انہیں رہنے کے لیے اچھی جگہ چاہیے۔ اول تو وہ آنے والے نہیں اور آئے تو ان بڈھوں کے ساتھ کون رہے گا۔ وہ نئی کوٹھیاں بنائیں گے اپنی اپنی۔ دوسرے کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اس کے بچے ملک سے باہر تو نہیں ہیں مگر یہاں

الگ رہتے ہیں۔ بھول گئے ہیں ماں باپ کو۔ ساری عمر محنت اور مسلسل قربانیوں سے بچوں کی پرورش کرنے والے اور بڑھاپے میں سکھ آرام کا خواب دیکھنے والے تنہا رہ گئے ہیں۔ یہی ہے ان کا مسئلہ۔ اگر آج ان کے بچے واپس مل جائیں انہیں تو وہ پھر نارمل ہو جائیں گے۔"

میں نے سر ہلایا "غالباً بہت جلد ہمارا معاشرہ بھی بوڑھے لوگوں کا ٹھکانا اولڈ پیپلز ہوم کو سمجھنے لگے گا۔"

"سمجھنے لگے گا...؟ سمجھنے لگا ہے شاہ جی!" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "آخری عمر کے اکیلے پن نے انہیں نفسیاتی مریض بنا دیا ہے ورنہ وہ بالکل ٹھیک ہیں کارآمد ہیں اور مصروف رہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا کریں۔ اس سوسائٹی کے نزدیک تو وہ ناکارہ پرزے ہیں جن کی اس تیز رفتار مشینی زندگی میں کسی کو ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "کیا یہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے؟"

"نہیں۔ ان کی ملاقات یہاں ہوئی۔ چھ مہینے میں دوست بن گئے۔ ہماری ایک لائبریری بھی ہے۔ وہاں انہوں نے شرلاک ہومز کی کہانیاں پڑھیں۔ دونوں کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ ایک شرلاک ہومز بن گیا' دوسرے نے ڈاکٹر واٹسن کا کردار قبول کر لیا۔ یہاں سب ایسے ہی کسی معمولی سے ذہنی خبط میں مبتلا ہیں۔ ان کا عام رویہ بالکل ٹھیک ہے۔ نہ وہ بے وقوف ہیں اور نہ پاگل۔ بس الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں کبھی کبھی یا خواب و خیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور حقیقت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ اتنی ہمت نہیں ہے ان میں کہ آج کے سنگین حقائق کو تسلیم کریں۔ یہ فرار میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔"

میں نے کہا "ان سے کوئی ملنے نہیں آتا ہے۔"

"آ جائے کبھی کوئی غلطی سے تو یہ ملنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ملاقات کبھی خوشگوار نہیں ہوتی' زیادہ تلخی پیدا کرتی ہے۔"

"تو کیا اب یہ ہمیشہ یہیں رہیں گے؟"

"نہیں۔ مہینے دو مہینے یا سال چھ مہینے میں ان کو گھر یاد آنے لگتا ہے۔ ہمارے علاج سے ان کی ذہنی کیفیت نارمل ہو جاتی ہے پھر یہ چلے جاتے ہیں۔ دوسرے آ جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔"

"کبھی کوئی لوٹ کے آیا؟"

"ہاں۔ یہ بھی ہوتا ہے" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "مگر بہت کم۔"

"یہ لوگ خود آتے ہیں یا کوئی انہیں چھوڑ جاتا ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ایک کو بیوی چھوڑ گئی تھی۔ امریکا جانے سے پہلے کیونکہ شوہر امریکا جانے پر کسی صورت راضی نہیں تھا۔ دوسرے کو بیٹا چھوڑ گیا تھا۔ کچھ دن ہم نے زبردستی روکا پھر انہیں اپنے جیسے ہم خیال بوڑھے مل گئے تو ان کا دل لگ گیا۔ یہ خیال ضرور رکھنا پڑتا ہے کہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ یہاں رہنا ان کی مجبوری ہے۔"

میں نے کہا "ان کے اخراجات کون ادا کرتا ہے؟"

"جیسے...... عزیز و اقارب' یا وہ خود" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔

"کیا اس صورتِ حال کے ذمے دار یہ خود نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے اقرار میں سر ہلایا "بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ یہ لوگ ایڈجسٹ کرنا نہیں جانتے۔ ان کے رویے RIGID ہیں۔ لچک نہیں ہے ان کی سوچ میں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ خود غرض اور خود پرست ہیں۔ یہی عمر ہماری ہے۔ بچے ہمارے بھی نہیں ہیں مگر ہم فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔ خوشی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بیٹے پوتوں کی خدمت گزاری اور جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔ آپ چاہیں تو ساری دنیا کو اپنا سمجھ سکتے ہیں۔ ان کو اپنے اصول' اپنا اختیار' اپنی دولت اور جائداد زیادہ عزیز ہے۔ چلو اولاد نہ سہی' بہن بھائی ہوں۔ بھانجے بھتیجے ہوں۔ نہ جانے کتنے قریبی عزیز ہوں گے جن کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں ہو گا۔ آپ انہیں ساتھ رکھیں۔ کوئی بھی نہیں تو بے گھر اور سہارے کے محتاج بہت ہیں۔ آپ کوٹھی میں اسکول چلائیں' اسپتال بنائیں' سوشل ورک کریں۔ لائبریری جائیں' کلب جوائن کریں۔ گھومیں پھریں' دنیا دیکھیں۔ خود کو مصروف رکھنے اور کارآمد بنانے کے ہزار وسیلے ہیں۔ کارِ خیر کے لیے وقت بھی ہے اور پیسہ بھی۔ خدمتِ خلق کر کے آپ کو ثواب کتنا ملتا ہے اور خوشی کتنی ملتی ہے۔"

"کیا آپ کو دیکھ کر خود کوئی یہ بات نہیں سمجھتا؟ اور آپ یہ سب انہیں سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟" میں نے کہا۔

"شاہ جی۔ ہم بھی کرتے ہیں۔ بہت مغز کھپاتے ہیں' یہ بات سمجھاتے ہیں کہ وہ اپنا لائف اسٹائل اور اپنی سوچ بدلیں لیکن اس عمر میں سوچ بھی ایک خشک ٹہنی کی طرح ہو جاتی ہے۔ موڑنے کی کوشش سے ٹوٹ سکتی ہے' مڑ نہیں سکتی۔ صرف ایک آدمی نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ اب لینا نہیں' دینا سیکھ لینا چاہیے کیونکہ جان دینے کا وقت بھی قریب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آرہا ہے۔ دنیا سے توقعات رکھنا لاحاصل ہے۔ خود کو دنیا کی توقعات پر پورا اترنے کے قابل بنانا چاہیے۔ وہ اب دن رات اسپتالوں میں پھرتا ہے۔ نادار مریضوں کی مدد کرتا ہے۔ جن سے کوئی ملنے نہیں آتا' ان سے باتیں کرتا ہے' انہیں رسالے کتابیں پھل اور دوائیں پہنچاتا ہے۔ کوئی اس کا نام تک نہیں جانتا۔ روز اپنی گاڑی میں سامان بھر کے لے جاتا ہے اور گاڑی خالی ہو تو کبھی مریض کو لے جا رہا ہے تو کبھی تیمار داروں کو۔ رات تک اتنا تھک جاتا ہے کہ گھوڑے بیچ کے سکون سے سوتا ہے۔ اس کی صحت بھی بہت اچھی ہوگئی ہے اور وہ خوش بھی بہت ہے۔ ہاں ایک اور ہے' اس نے خود کو دین کے لیے وقف کردیا ہے۔ وہ بھی بہت پرسکون اور مطمئن ہے۔ ساری انسانیت سے رشتہ جوڑ لینے کے بعد آپ کو خون کے محدود رشتوں سے محرومی کا خیال تک نہیں آسکتا۔"

"یو آر ویری رائٹ!" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا "ایسا وقت مجھ پر آیا تو میں بھی یہی کروں گا۔ آپ نے قبل از وقت ہی سب سمجھا دیا ہے مجھے۔"

ڈاکٹر عائشہ نے میرے کندھے پر تھپکی دی "تم پر نہیں آئے گا ایسا وقت۔ مجھے معلوم ہے' تمہاری ٹائپ یہ نہیں ہے۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا "یہ تو سو رہی ہے۔"

"تم جانا چاہتے ہو نا' جاؤ۔ لیکن تم نے وعدہ کیا تھا' واپس آؤ گے۔"

میں نے کہا "میں پوری کوشش کروں گا کہ رات کو اس کے جاگنے سے پہلے ہی لوٹ آؤں۔ آپ کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ اس میں کافی وقت گزر گیا۔"

ڈاکٹر عائشہ میرے ساتھ چلنے لگیں "کس سے ہو رہی ہے تمہاری بہن کی شادی؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "وہ میرا سب سے عزیز دوست تھا۔ ڈاکٹر فاروقی۔"

"تھا کیا مطلب۔ ہنوز ہو گیا تو دوست نہیں رہے گا؟"

میں نے کہا "یہی مطلب تھا میرا۔ رشتے کی نوعیت بدل گئی ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ تمہیں بہت دکھ ہے بہن سے جدا ہونے کا۔ حالانکہ یہ خوشی کا موقع ہے۔ لڑکیاں رخصت ہو کے غیروں کے گھر جاتی ہیں۔ باہر دوسرے شہروں یا ملکوں میں ہوں تو ان کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں تو زیادہ خوش ہونا چاہیے۔"

میں ڈاکٹر عائشہ کو کیا بتاتا کہ میرا اصل دکھ کیا ہے

"خوش یقیناً بہت ہوں میں۔"

نیچے لاؤنج میں ایک عینک والا پروفیسر ٹائپ شخص اور ابوبکر آزاد فضول قسم کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ پروفیسر اپنے دلائل سے ثابت کرچکا تھا کہ مرغی نہیں پہلے انڈا پیدا ہوا تھا۔ آزاد صاحب کا مؤقف اس کے برعکس تھا۔

آزاد صاحب نے کہا "کب سے دیکھ رہے ہیں؟ بھئی جب سے ہوش سنبھالا ہے' تب سے دیکھ رہے ہیں!"

پروفیسر نے یقین سے کہا "یعنی تم اور کچھ نہیں کرتے؟ بس یہی دیکھتے رہتے ہو ہر وقت۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" آزاد صاحب جز بز ہو کے بولے "ہمارا مطلب یہ تھا گویا کہ بات ہے مشاہدے اور تجربے کی۔ آپ خود بھی کسی مرغی خانے میں بقلم خود جا کے دیکھ سکتے ہیں کہ انڈے کسی مشین سے نہیں بنتے۔"

"ہم جائیں مرغی کے مرغی خانے؟ اسے کیوں نہ بلالیں اپنے غریب خانے پر۔" پروفیسر سوچ کے بولا "معلوم ہو جائے گی حقیقت۔"

آزاد صاحب نے سر پکڑ لیا "بالکل معلوم ہو جائے گا۔ مرغی ہی انڈے دیتی ہے اور مرغی ہی انڈوں پر وہ رکھتی ہے گویا۔۔۔ تشریف۔۔۔ تو انڈوں میں سے مزید مرغیاں اور مرغے برآمد ہوتے ہیں۔"

"اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا۔"

"ثابت یہ ہوتا ہے کہ انڈا ہے پروڈکٹ اور مرغی ہے پروڈیوسر۔ جیسے اپنی فلم کا پروڈیوسر ہوتا ہے' وہ نہ ہو تو فلم کیسے بن سکتی ہے؟"

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا "بات آج کی نہیں ہو رہی ہے جناب' سوال یہ ہے کہ دستِ قدرت نے پہلے کسے تخلیق کیا تھا؟ مرغی کو یا انڈے کو۔ یہ آپ مانتے ہیں کہ تخلیقِ کائنات کے عمل میں منطقی جواز ہے۔"

"بالکل ہے۔ نظامِ کائنات ایک سائنسی کرشمہ ہے' جس کی توضیح عقل سے کی جاسکتی ہے۔ ریاضی کے فارمولے کی طرح۔"

پروفیسر نے خوش ہو کے کہا "اللہ آپ کا بھلا کرے۔ یہی میں بھی سمجھانا چاہتا تھا' آپ ذرا انڈے کی ساخت پر غور کریں۔ انڈا دیکھا ہے آپ نے؟"

"کمال کرتے ہیں آپ۔۔۔ انڈا بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے گویا۔"

پروفیسر نے اپنی بات جاری رکھی "انڈا مشتمل ہے

صرف تین اجزا پر۔ زردی' سفیدی اور بیرونی خول۔ اس کے برعکس مرغی کے ڈیزائن پر غور فرمایئے۔ اس کے پنجوں سے چونچ تک کتنے اعضا ہیں؟ اس کے جسم میں کتنی ہڈیاں ہیں اور جوڑ ہیں۔ اس کے پروں کو شمار کیجئے۔ اس کے اعضائے رئیسہ و پوشیدہ کو دیکھئے۔ دل گردے اور نظامِ ہضم کے علاوہ مرغی کے اندر ایک مشین بھی نصب ہے انتہائی پیچیدہ۔"

"مشین؟" آزاد صاحب نے کہا۔

"جی۔۔۔ انڈے بنانے کی مشین۔" پروفیسر بولا "اب آپ بتایئے کہ منطقی اعتبار سے دستِ قدرت کے لیے کیا آسان تھا؟ انڈا بنانا یا مرغی بنانا؟"

"دستِ قدرت کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔" آزاد صاحب نے گویا اپنے عقیدے کا اعلان کیا۔

"مگر مرغی کے مقابلے میں انڈا آسان تھا۔"

"جب قدرت انسان کو تخلیق کرسکتی ہے۔ جو اشرف المخلوقات ہے گویا۔۔۔ تو مرغی کیا چیز ہے؟" آزاد صاحب نے اس دلیل کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا۔

"مرغی آپ سے زیادہ پیچیدہ اور عظیم ہے۔۔۔ مرغی انڈے دے سکتی ہے' آپ دے سکتے ہیں؟"

آزاد صاحب نے میز پر مکا مارا "ایسے تو۔۔۔ ایسے تو مرغی بھی بہت کچھ نہیں کرسکتی۔۔۔ مثلاً وہ اخبار کی ایڈیٹر نہیں ہوسکتی گویا۔۔۔ ہماری طرح۔"

اس مرحلے پر میں نے دخل در معقولات کیا "آپ دونوں جاہل ہیں۔ یہ بحث نتیجہ ہے لاعلمی کا۔ حقیقت کچھ اور ہے۔"

پروفیسر نے چونک کے مجھے دیکھا "اچھا؟ وہ کیا حقیقت ہے؟"

میں نے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ مرغی اور انڈا ایک ساتھ بیک وقت پیدا ہوئے تھے۔"

"یہ۔۔۔ آپ کیسے جانتے ہیں؟" پروفیسر نے کہا۔

میں نے کہا "خدا کے حکم سے کیا نہیں ہوسکتا۔ جو اس میں شک کرے وہ کافر۔ کیوں آزاد صاحب!"

آزاد نے سر ہلایا "ان اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر۔"

"بس اچانک مرغی نے آنکھیں کھول کے اپنے قریب پڑے ہوئے انڈے کو دیکھا اور خدا کے حکم سے اس پر بیٹھ گئی" میں نے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" پروفیسر نے کہا۔

میں نے کہا "اس لیے کہ انڈا نہ مرغی کو دیکھ سکتا تھا اور نہ اس پر بیٹھ سکتا تھا۔ آئی بات سمجھ میں؟"

پروفیسر کے چہرے پر تجسس سے حاصل ہونے والے علم کا نور پھیل گیا۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا "تم نے مسئلہ حل کردیا بھائی صاحب۔"

اس کے جاتے ہی میں نے آزاد صاحب کو اٹھنے کا اشارہ کیا "آپ بھی حد کرتے ہیں۔ یہاں بیٹھے' اس فضول شخص سے فضول بحث میں وقت ضائع کرتے رہے۔ اوپر آ کے شبنم کو نہیں دیکھا۔"

وہ خاموشی سے سر جھکائے باہر آگئے اور چپلی کی بائیں ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجبوراً مجھے پھر ڈرائیونگ کی ناخوشگوار ذمے داری سنبھالنا پڑی۔ چپلی کسی دھکم پیل اور زور زبردستی کے بغیر اسٹارٹ ہوگئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

آزاد صاحب نے کہا "ہم نے سوچا کہ جب تم بقلم خود ملاحظہ فرما رہے ہو شبنم کو' تو ہمارا اس کو دیکھنا کیا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ ڈرتے ہیں اس کا سامنا کرتے ہوئے۔"

"ڈر کیسا برخوردار۔ ہم اسے بچپن سے دیکھ رہے ہیں اور بچپن کے ہو گئے گویا۔ اس وقت تمہارا ملنا ہی بہتر تھا۔ بقول قلمی شاعر۔۔۔ تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا۔۔۔ لیکن یہ بھی سچ ہے گویا۔۔۔ کہ ہم اسے دکھی دیکھتے تو مزید دکھی ہوتے خود بھی۔۔۔ کیونکہ کسی حد تک ہم اپنے آپ کو بھی قصوروار سمجھتے ہیں گویا۔۔۔ اگر ہم نے بقلم خود یہ فرض نہ کیا ہوتا کہ وہ بڑی ہوگئی ہے تو عاقل و بالغ اور خود مختار بھی ہوگئی ہے گویا اور خود ذمے دار ہے اپنے معاملات کی۔ اگر ہم حسبِ سابق کچھ خبر رکھتے اس کے مسائل کی۔ تو نوبت یہاں تک نہ آتی شاید لیکن مصلحت کے تقاضے اپنی مجبوری بن گئے تھے گویا۔ تمہاری عمر کے نوجوان بڑے الرجک ہوجاتے ہیں بزرگوں سے بھی۔ کوئی سمجھائے کہ میاں آگے کنواں ہے تو جواب ملتا ہے کہ ہماری مرضی' ہم گرنا چاہتے ہیں کنوئیں میں۔ زندگی ہماری ہے یا آپ کی۔ خاموش رہیں اور انہیں گرنے دیں کنوئیں میں تو خود اپنی نظر میں قصوروار گویا۔ بخدا ہم نئی نسل کو برا نہیں کہہ رہے ہیں' یہ سلسلہ تو ایسے ہی چلتا ہے۔ والد بزرگوار' اللہ انہیں جنت میں سکون عطا کرے۔ سخت نالاں رہے ہماری ناخلفی سے گویا اور جدِ امجد نے تو کئی بار عاق فرمایا ہمارے والد ماجد کو۔ شیطان لعین کی مشکوک اولاد قرار دیتے تھے انہیں۔ بڑا اچھا سا نام ہے انگریزی میں اس کا۔ یہ جو مسئلہ ہے گویا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جنریشن گیپ۔۔۔" میں نے کہا۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔" وہ خوش ہو کے بولے "ہماری نظر کا فتور ہے یا دماغ میں خرابی ہے کہ ہمیں نئی نسل میں کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی۔ عاق کیے جانے کے قابل لگتے ہیں ہمارے جیسے بزرگ۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہیے' آج بھی شبنم کو اتنی ہی ضرورت ہے آپ کی جتنی آپ کو شبنم کی ہے۔"

"نہیں عزیزِ من' ہم جانتے ہیں کہ اسے کس کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ اب وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اس نے شاہ عالم کے وجود کو تسلیم کرلیا ہے۔ پورے یقین کے ساتھ۔"

آزاد صاحب نے سرہلایا "اس کے مسائل صرف جذباتی تھے۔ شاہ عالم مل گیا اسے تو گویا۔ اسباب ہی ختم ہوگئے ذہنی انتشار کے گویا۔"

میں نے کہا "حضرت۔ یہ کہنا قبل از وقت بلکہ غلط ہے کہ اسے شاہ عالم مل گیا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ اب اس کے ذہن میں کوئی کنفیوژن نہیں رہا۔ اس نے شاہ عالم کو شناخت کرلیا ہے۔"

انہوں نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا "یعنی شاہ عالم کو ابھی دیر لگے گی گویا۔ شبنم کو شناخت کرنے میں۔۔۔ خیر۔ دیر آید درست آید۔۔۔ سوائے اخبار کے اور پہلے بچے کے۔ وہ جلدی آنا چاہیے۔"

میں نے چلبلی کو آزاد صاحب کے دفتر کے سامنے روکنے کی کوشش کی مگر وہ سیدھی چلتی گئی۔

میں نے گھبرا کے کہا "آزاد صاحب۔ اس کے تو بریک فیل ہوگئے ہیں۔"

وہ اطمینان سے باہر دیکھتے رہے "کوئی بات نہیں' تم گاڑی روکو۔"

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ گاڑی کیسے روکوں؟"

"بھئی جیسے ہم روکتے ہیں۔"

میں نے گاڑی کو فرسٹ گیئر میں ڈالا تو اس نے ایک جھٹکا لیا اور رفتار بہت کم ہوگئی۔ ایک ریڑھی والے' ایک فقیر اور ایک کھمبے کو بچانے کی کوشش میں گاڑی دائیں بائیں لہرائی۔ تاہم مجھے اتنی مہلت مل گئی کہ میں نے کلچ دبا کے چوتھا گیئر ڈال دیا۔ گاڑی رک گئی تو میں نے سکون کی سانس لے کر خدا کا شکر ادا۔۔۔ کیا کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا لیکن آزاد صاحب کا خیال یہ تھا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ چلبلی کے بریک تو فیل ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ٹکر اس نے آج تک کسی کو نہیں ماری۔ یا ماری تو وہ کوئی انسان نہیں تھا۔ اس کی زد میں ایک ٹیلی فون کا کھمبا' فیملی پلاننگ والوں کا ایک سائن بورڈ۔ عوامی بیت الخلا کی ایک دیوار اور کارپوریشن کا کچرا لے جانے والا ٹرک آئے۔ دوبارا سے روکنے کے لیے آزاد صاحب نے چلبلی کو فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ پہلی بار چلبلی سے قسمت کا حال بتانے والے سارے لفافے روندے گئے مگر نجومی اور اس کا طوطا محفوظ رہے۔ دوسری بار اس نے فٹ پاتھ پر سجائے جانے والے کلینک کا ملبا کردیا مگر قبلہ حکیم صاحب صاف بچ گئے۔ بعد میں آزاد صاحب نے نجومی اور حکیم دونوں کو ناجائز تجاوزات قائم کرنے کے جرم میں بند کرادیا حالانکہ انہوں نے تو جائے واردات پر آزاد صاحب کے ساتھ جو دست درازی کی تھی' اس پر اقدامِ قتل کا مقدمہ بھی بن سکتا تھا۔

میں نے چلبلی کو دھکیل کر سڑک کے کنارے پر کھڑا کیا۔ آزاد صاحب نے کہا کہ اسے چلبلی کا معالجِ خصوصی مستری دل محمد درد بقلم خود لے جائے گا۔ وہ جتنا بڑا انجینئر تھا' اتنا ہی بڑا آزاد صاحب کا مداح اور شاعر بھی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ٹرکوں اور رکشوں کے پیچھے لکھے ہوئے بیشتر اشعار اس کی پروازِ فکر کا نتیجہ تھے۔

میں جب فیصل ہاشمی کے آفس پہنچا تو شام ہوگئی تھی۔ اس دفتر کا نقشہ بھی عام دفاتر جیسا تھا۔ چند ماتحت وکیلوں کے کیبن' مختصر سا ڈرائنگ روم اور آفس جہاں ٹائپسٹ اور منشی بیٹھتے تھے۔ برسوں پہلے میں نے مرحوم ہاشمی صاحب کے آفس میں قدم رکھا تھا تو حالات بہت مختلف تھے۔ شادو میرے ساتھ تھی اور میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ مجھے اپنی اور شادو کی زندگی کے لیے قانون کا تحفظ درکار تھا۔ ہاشمی صاحب نے وہ تحفظ مجھے فراہم کردیا تھا لیکن شادو کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا اور چاروں کے زخم بھی بھر چکے تھے۔

آج پھر میری زندگی خطرات کے حصار میں تھی لیکن میں خوف زدہ نہیں تھا۔ حادثات اور تجربات کا عطا کیا ہوا اعتماد میرے ساتھ تھا۔ میں بے زر اور لاوارث ناصر تعظیم نہیں تھا۔ میں شاہ عالم کے نام کی شہرت اور اس کے سیاسی اثر رسوخ کی طاقت بھی حاصل کرچکا تھا۔

میں نے اپنا کارڈ بھیجا تو فیصل نے فوراً مجھے اپنے آفس میں بلالیا۔ "میں آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا۔"

میں نے کہا "فرید نے آپ سے میرا تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ سابق سب انسپکٹر فرید عباسی نے؟"

"آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔۔۔ اور میرے لیے بھی نیا نہیں" وہ سپاٹ لہجے میں بولا "آج کیسے زحمت کی آپ نے؟"

میں نے کہا "ابھی تک میرے سارے قانونی معاملات بیرسٹر سلطان محمود کا دردِ سر تھے۔ خواہ وہ نجی ہوں یا سیاسی۔ شاید آپ کو فرید عباسی نے بتایا ہوگا کہ کئی ناگزیر وجوہ کی بنا پر میں ان کا وکالت نامہ منسوخ کرنے پر مجبور ہوگیا۔"

"جی۔ مجھے معلوم ہے۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ملاقات فرید عباسی سے ہوگئی اور اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا" میں نے کہا۔

فیصل نے سرہلایا "میرا خیال ہے کہ ہم اندر بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ یہاں آنے جانے والے ہماری گفتگو میں مخل ہوں گے۔"

اس آفس کے عقبی حصے میں فیصل کی میز کے پیچھے ایک مختصر کمرا تھا۔ کمرے کا دروازہ الماریوں کے بیچ میں بڑی صفائی سے بنایا گیا تھا اور الگ نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے فیصل کا پرائیویٹ ڈرائنگ روم سمجھا جا سکتا تھا جہاں وہ خود بھی آرام کر سکتا تھا اور کسی مؤکل کی وہ بات بھی سن سکتا تھا جو رازداری کا تقاضا رکھتی ہو اور سب کے سامنے کہنا مشکل ہو۔

کمرے میں ایک صوفہ سیٹ تھا اور استراحت کے لیے ایک سیٹی۔ آفس کی پُرہیبت' جرم و سزا کے معاملات کا بوجھل پن رکھنے والی فضا کے مقابلے میں اندر ماحول دوستانہ اور شگفتگی کا عکاس تھا۔ دیواروں کے رنگ اجلے تھے اور میز پر تازہ رنگین پھول سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر آویزاں تصاویر فیصل کے فنکارانہ ذوق کی آئینہ دار تھیں۔

اس نے مجھ سے پوچھ کے کسی سے چائے کے لیے کہا اور پھر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا "فرید کو بھی آنا تھا۔ معلوم نہیں کہاں رہ گیا۔"

میں نے کہا "اس نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔"

"تعریف آپ کی بھی کرتا ہے وہ مگر یہ اس کی خوبی ہے یا خامی کہ وہ صرف تعریف نہیں کرتا" فیصل مسکرایا۔

"شاید اسی لیے پولیس کی ملازمت اسے راس نہیں آئی" میں نے کہا۔

فیصل بولا "مجھے تو معلوم تھا کہ بالآخر یہی ہوگا۔ کچھ اچھے افسر بھی تھے جن کی پشت پناہی سے اس نے اتنا عرصہ گزار لیا لیکن اس نے دوست کم بنائے دشمن زیادہ۔ اس کا خیال تھا کہ قانون کی طاقت سے وہ مجرموں کا صفایا کردے گا اور پولیس کے محکمے کی کایا پلٹ دے گا۔ اپنی مستعدی' ایمانداری اور فرض شناسی سے دوسروں کے لیے ایک قابلِ رشک مثال قائم کرے گا۔ عمر بھی ہماری کم و بیش ایک ہی تھی مگر میں اس کی طرح جذباتیت پرستی میں مبتلا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "مقاصد تو ایک ہی تھے آپ دونوں کے۔ فرق صرف منزل تک پہنچنے والے راستوں کا تھا۔ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے میں سب سے پہلے پولیس کا کردار ہے جو مجرموں کو پکڑتی ہے پھر وکیل ہیں جو انہیں مجرم ثابت کرتے ہیں۔ اس کے بعد جج جو انہیں جرم کی سنگینی اور حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سزا سناتا ہے۔ آخری کردار ہے جیلر کا جو سزا پر عمل درآمد کراتا ہے۔ نظامِ انصاف انہی چار ستونوں پر قائم ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے شاہ صاحب لیکن پولیس اب مل گئی ہے مجرموں کے ساتھ۔ وہ ایک فریق بن گئے ہیں۔ مجرموں کے شریکِ کار اور محافظ۔"

میں نے کہا "بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔ کیا آپ کے پیشے میں سب باضمیر' اصول پرست اور ایماندار ہیں۔ سب وکیل سچ بولتے ہیں؟ جانتے بوجھتے کسی مجرم کا دفاع نہیں کرتے؟ صرف بے گناہوں کو سزا سے بچانے کے لیے عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔"

فیصل نے بے چینی سے پہلو بدلا "میں مانتا ہوں کہ وکالت کے پیشے میں بھی غلط لوگ ہیں۔ فرق تناسب کا ہے۔"

میں نے کہا "یہاں بھی بدعنوان اور بے ضمیر ہی اکثریت میں ہیں۔ حلف اٹھوا کے جھوٹے بیان اور جھوٹی گواہی وکیل ہی دلواتے ہیں۔ واقعات کو توڑ مروڑ کے پیش کرنا۔ قانون کے الفاظ کی گمراہ کن تشریح و تعبیر۔ عدالت کے کام میں رکاوٹ ڈال کے انصاف کے عمل میں تاخیر۔ یہ سب کون کرتا ہے۔۔۔ وکیل کو غرض ہوتی ہے صرف اپنی فیس سے۔"

فیصل کچھ نروس ہوا "بے شک ایسا ہوتا ہے۔۔۔ مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ وکیلوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے۔ چند کالی بھیڑیں۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "پولیس کے اعلیٰ افسران اور وزیرِ داخلہ صاحب بھی یہی فرماتے ہیں کہ چند کالی بھیڑیں ضرور ہیں پولیس کے محکمے میں لیکن آج کسی نے ایک سفید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھیڑ بکڑ کے نہیں دکھائی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہوتا ہے جج جو حقیقت جاننے کے باوجود انصاف کی کرسی پر بیٹھا دیکھتا رہتا ہے اور سنتا رہتا ہے کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کیا جا رہا ہے۔ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ مجبور ہے کہ اپنا فیصلہ دلائل سے زیادہ گواہی اور شہادت کی بنیاد پر صادر کرے۔ خواہ اسے یقین ہو کہ انصاف نہیں ہوا مگر وہ کیا کرے۔ کیسے کہے کہ گواہ جھوٹا ہے۔ شہادت خود ساختہ ہے۔ حقائق بدلے گئے ہیں۔"

"آپ بہت خفا ہیں وکیلوں سے۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں۔ ایک بات آپ نے پولیس کے کردار کے بارے میں کہی کہ وہ مجرموں کے محافظ اور معاون ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وکیل بھی مجرموں کے محافظ اور معاون ہیں۔ ایک فریق جو رقم وصول کرتا ہے وہ رشوت کہلاتی ہے' دوسرے کی فیس ہوتی ہے۔"

"یہ زیادتی کر رہے ہیں آپ۔" وہ کچھ آزردہ ہو گیا۔ "میں ایسے درجنوں نام گنوا سکتا ہوں جو ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔ انتہائی نیک نام وکیل ہیں۔"

"انہیں میں بھی جانتا ہوں۔ آج وہ بہت بڑے نام ہیں۔ کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا ان پر اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا لیکن جو کچھ آج ماتحت عدالتوں میں عام وکیل کر رہے ہیں اس سے انصاف کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا نہیں ہو رہا ہے۔ جس کا نام بڑا وہ فرشتہ نہیں مگر پولیس کے آئی جی اور ڈی آئی جی کو نہ کوئی راشی کہتا ہے اور نہ کرپٹ۔ الزام آتا ہے نچلے درجے کے ان ماتحتوں پر جو پبلک کے سامنے ہوتے ہیں۔ یہی حال بڑے وکیلوں کا ہے۔ لاکھوں میں فیس لے کر وہ آئینی اور سیاسی مقدمات لڑتے ہیں اور اخباروں کے ذریعے خوب نام کماتے ہیں۔"

"یہ بات تو سیاست دانوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔"

"بالکل کہہ سکتے ہیں آپ اور زبانِ خلق کیا نہیں کہتی۔ اگر میں سیاست کے گندے تالاب میں ہوں تو کس منہ سے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں پاک صاف ہوں لیکن۔" میں نے مسکرا کے کہا "اس کے باوجود۔ پولیس میں ایک مثال ہے فرید عباسی کا کردار۔ ایسے اور بھی ہوں گے مگر میں ان سے واقف نہیں۔ میرے قانونی معاملات کی نگرانی کرتے تھے' بیرسٹر سلطان محمود۔ ان کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے۔ میری رائے بدل نہیں سکتی' یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ملاقات فرید سے ہو گئی اور اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا۔ اس نے تمہیں بھی تو بتایا ہو گا میرے بارے میں۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے پر بھروسا کر سکتے ہیں۔"

"فرید میرا کزن ہے اور دوست ہے۔ ہم بچپن سے جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔ جب سے ہوش سنبھالا' ہم ساتھ ہیں۔ میرا اس پر بھروسا کرنا غلط نہیں ہو سکتا لیکن آپ کی اس سے ملاقات ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے۔ آپ نے اسے بھروسے کے قابل سمجھ لیا اور اس کے کہنے پر مجھے۔" اس کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

میں نے کہا "ایک تو آدمی کا تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے جو اس کی مدد کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ میری چھٹی حس ہے جو غلط نہیں کہتی۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں کبھی بیرسٹر سلطان محمود کو نہ چھوڑتا۔ وہ میرے قانونی سرپرست اور بزرگ تھے مگر میری وجہ سے ان پر کوئی آفت آئے' یہ مجھے منظور نہیں تھا۔ شہر میں وکیل بہت۔ میرے ذاتی دوست بھی ہیں وکیل۔ میں کسی بہت بڑی لیگل فرم کو اپنا قانونی مشیر بنا سکتا تھا۔"

"پھر میرا انتخاب ہی کیوں کیا آپ نے؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"فرید عباسی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ باہمت اور بے خوف ہیں۔ کسی لالچ' دھمکی یا دباؤ کی پروا نہیں کرتے۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ یہ بات اسے کہنی چاہیے یا نہیں۔ بالآخر اس نے کہا "مسٹر شاہ عالم۔ یہ بات آپ کہہ رہے ہیں' کمال ہے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا میں نے کوئی غلط بات کی؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آپ کی اس ادا کو کیا سمجھوں۔ آپ کی نظر اور آپ کا حافظہ اتنے کمزور نہیں ہو سکتے۔ یہ اتنی پرانی بات بھی نہیں ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں" میں نے کہا "کھل کے بات کرو۔"

"نام سے آدمی دھوکا کھا سکتا ہوں۔ ایک نام کے دو وکیل اور بھی ہیں مگر مجھے دیکھ کے بھی آپ کو کچھ یاد نہ آئے' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

میں نے پریشانی سے کہا "مسٹر فیصل' کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "آخر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہ آپ پچھلی باتوں کو بھول گئے ہیں

اور بالکل بدل گئے ہیں۔ آپ کو بالکل یاد نہیں کہ آپ نے دھن دھونس اور دھمکی کے کیا حربے آزمائے تھے مجھ پر؟ ٹیلی فون پر مجھے کیسی گالیاں دی جاتی تھیں۔ آپ کے غنڈوں نے میرے آفس آ کے کیا بدمعاشی مچائی تھی اور پھر خود آپ نے کیا فرمایا تھا؟"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اصل شاہ عالم کی بات کر رہا تھا مگر یہ اندازہ میں کیسے کر سکتا تھا کہ وہ معاملہ کیا تھا۔ فرید عباسی نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ شاید خود اسے یہ علم نہیں تھا کہ کسی قانونی معاملے میں شاہ عالم نے فیصل ہاشمی کو ڈرا دھما کے اور بدمعاشی کی طاقت استعمال کر کے' مجبور کیا تھا کہ وہ کسی کیس میں اس کے خلاف پیروی سے دستبردار ہو جائے۔ میں ایک بات کہہ کے پھنس گیا تھا اور اب نہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اقرار۔

میں نے بے خیالی میں کہہ دیا "کیا فرمایا تھا میں نے آخر۔"

فیصل نے تلخ لہجے میں کہا "ذرا مت کریں میرے سامنے شاہ عالم صاحب۔ میں وہ کیس ہار گیا تھا۔ میرے موکل کو آپ نے بے گناہ ہونے کے باوجود جیل بھجوا دیا تھا اور پھر عدالت میں مجھے سب کے سامنے۔۔۔ خیر چھوڑیں۔۔۔ فرید کو یہ سب معلوم ہوتا تو شاید وہ بھی آپ کی سفارش نہ کرتا۔ تعریف تو دور کی بات ہے۔ مختصر یہ کہ میں آپ کا وکیل بننے سے انکار کرتا ہوں۔ اب بے شک آپ مجھے غنڈوں سے پٹوائیں یا میرے گھر کو آگ لگوا دیں۔"

میں نے سخت بے عزتی کے باوجود ضبط سے کام لیا "اگر ایسی ہی بات تھی مسٹر فیصل تو آپ نے مجھے ٹائم کیوں دیا؟"

"میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک آدمی سوری' ایک سیاسی لیڈر کس حد تک دوغلے پن سے کام لے سکتا ہے۔ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول سکتا ہے اور منافقت میں کس انتہا تک جا سکتا ہے۔ شیطان کا کردار ادا کرنے کے بعد فرشتہ بن کے کیسے دکھا سکتا ہے۔ اگر میں انکار کر دیتا تو میرا آپ کا حساب کیسے برابر ہوتا۔ مجھے کم ذلیل نہیں کیا تھا آپ نے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "چلو آج یہ حساب برابر ہو گیا۔ کل میں پھر آؤں گا۔"

"آپ کو مایوسی ہو گی۔۔۔ اور شرمندگی۔۔۔"

میں نے کہا "میں فرید کے ساتھ آؤں گا۔"

اس نے کہا "جب میں فرید کو بتاؤں گا تو وہ خود انکار کر دے گا۔ بے شک آپ اپنی غنڈا فورس کے ساتھ پھر چڑھائی کر سکتے ہیں میرے آفس یا گھر پر لیکن مجھے اپنی وکالت پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری رائے بدل جائے۔"

"میں کینہ پرور اور کم ظرف نہیں ہوں شاہ صاحب!" وہ بولا "اس لیے میں نے آپ کی شکل دیکھتے ہی آپ کو بے عزت کر کے رخصت نہیں کیا۔ میں نے آپ کو چائے بھی پیش کی۔ آپ سے جو کہا' علیحدگی میں کہا۔"

"اس چائے کے لیے شکریہ۔ آج اس سچائی کے اظہار کا موقع نہیں جو نہ تم جانتے ہو اور نہ میں۔" میں نے کہا "اگر آج وقت ہوتا میرے پاس تب بھی یہ مشکل تھا۔"

اس نے میرے لیے دروازہ کھولا "چھوڑیں شاہ صاحب۔ اپنی سچائی اپنے پاس رکھیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں اس کی۔"

باہر آ کے میں نے ایک گہری سانس لی۔ معاملہ اس شاہ عالم کا تھا جو رخشی کا شوہر تھا لیکن یہ بات فیصل کو خود فرید عباسی سمجھا سکتا تھا یا رخشی بتا سکتی تھی کہ میں وہ شاہ عالم نہیں ہوں۔ اپنے قانونی معاملات فیصل کے سپرد کرنے سے پہلے اسے اعتماد میں لینا ضروری ہو گا لیکن کیا اس قانونی جعلسازی کا علم ہو جانے کے بعد بھی فیصل اس جرم کی پردہ داری کے جرم میں شریک ہونا منظور کرے گا؟

شاید نہیں۔ میں نے سوچا' ایک شخص جو قانون کا احترام کرتا ہو اس کی بقا اور بالادستی کے لیے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی توانائی کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہو' وہ اتنے بڑے جھوٹ کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے۔ خواہ اس جھوٹ کو عدالت عالیہ نے سچ کی سند عطا کر دی ہو۔ حالات کے عذر کو یا میری مجبوری کی دلیل کو ایک اصول پرست وکیل کیوں قبول کرے گا لیکن مجھے بھی کیا ضرورت ہے اسے ساری بات بتانے کی۔ میں اسے اتنا ہی بتا سکتا ہوں جتنا شبنم جانتی ہے۔ ساری دنیا مانتی ہے۔ وہ بات جو رخشی کے علاوہ رئیس جانتا ہے۔ چندا اور خان اعظم کو معلوم ہے یا قمر اور ڈاکٹر کمال فاروقی کو۔ وہ کسی اور کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ کم سے کم خود مجھے کسی کے سامنے اعتراف نہیں کرنا چاہیے کہ میں ناصر عظیم تھا جسے حالات کی ستم ظریفی اور بدبختی نے شاہ عالم کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور مجبوری صرف عذر نہیں۔ ناصر عظیم کے لیے یہ ویسی ہی مجبوری تھی جس میں حرام کو بھی حلال سمجھا جا سکتا تھا۔ اگر وہ شاہ عالم نہ بنتا تو زندہ نہ رہتا۔

جہاں تک خان اعظم اور چندا۔ قمر یا ڈاکٹر فاروقی کا سوال تھا تو ان کے لیے میں ناصر عظیم ہی تھا اور جب ناصر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عظیم نہیں رہا تو کچھ بھی نہیں رہا۔ ان کے سب جذباتی رشتے ناصر عظیم کے نام سے وابستہ تھے۔ ان کا کسی شاہ عالم سے نہ پہلے کوئی تعلق تھا اور نہ اب وہ اس سے تعلق کی کوئی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ناصر عظیم نے اپنا نام اپنی شخصیت اپنا گھر اور اپنی زندگی کے ماضی کو کسی شاہ عالم کی شناخت دے کر ایک ناقابلِ معافی جرم کیا تھا۔ اس نے بے وفائی کا مرتکب ہو کے انہیں شدید جذباتی صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ کسی مجبوری کی دلیل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ناصر عظیم ہمارا تھا۔ شاہ عالم کو ہم کیا جانیں۔ وہ ایم پی اے کیا گورنر ہو یا وزیراعظم بن جائے۔ انہوں نے شاہ عالم بن جانے والے ناصر عظیم کو فراموش کر دیا تھا۔ وہ کم ظرف اور کینہ پرور لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے کئی سال ناصر عظیم کو اپنے گھر میں اور اپنے دل میں جگہ اور تحفظ فراہم کیا تھا۔ آج بھی جب وہ ان سے سارے رشتے ناتے توڑ کے ایک اجنبی ہو گیا تھا' وہ اس کے خلاف کوئی عناد نہیں رکھتے تھے۔ انہیں آج بھی ناصر عظیم کی زندگی کی سلامتی عزیز تھی۔ ان سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کبھی کوئی میری جعلی شخصیت کا رازفاش کر دے گا۔

ان کے علاوہ رخشی تھی جو حقیقتِ حال سے اتنی ہی باخبر تھی جتنا میں تھا مگر شاہ عالم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش نے اسے اتنا مغلوب کر لیا تھا کہ وہ میرا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئی تھی۔ اس سے بھی میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ برابر کی شریکِ جرم رہی تھی لیکن آج زیادہ مطمئن اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے آزاد تھی۔ وہ اپنے مستقبل کی خود مالک تھی۔ میں نے اس کا اعتماد اور اس کی عزتِ نفس کا یقین بحال کر دیا تھا مگر بدلے میں اس سے کچھ بھی نہیں لیا تھا اور آزادی کے ساتھ وہ سب بھی اس کے حوالے کر دیا تھا جو شاہ عالم کا تھا۔ شاہ عالم کی موت نے تو رخشی پر خوش قسمتی کے بند دروازے کھول دیے تھے۔ اگر وہ زندہ رہتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ رخشی کے اعصاب اس کے "حسنِ سلوک" سے بالکل ہی جواب دے جاتے اور وہ پاگل خانے پہنچا دی جاتی یا شاہ عالم طلاق کے تین لفظ دہرا کے حق مہر اس کے ہاتھ پر رکھتا کہ یہ ہے تمہارا جسم استعمال کرنے کا معاوضہ۔ اب جاؤ اس حسن و شباب کا کوئی اور خریدار دیکھو۔

فرید عباسی سے بعد میں معلوم کیا جا سکتا تھا کہ آخر فیصل ہاشمی کے ساتھ شاہ عالم نے کیا زیادتی کی تھی پھر فرید کے ساتھ جا کے میں اپنے رویے کی معافی مانگ سکتا تھا اور اسے یقین دلا سکتا تھا کہ میں اب وہ پرانا شاہ عالم نہیں ہوں۔ میرے رویے کی تبدیلی کو شبنم نے سب سے زیادہ محسوس کیا تھا مگر شک کا آخری کانٹا بھی نکل چکا تھا اور اب وہ بھی تسلیم کر چکی تھی کہ میری عادت اور فطرت میں رونما ہونے والا یہ مثبت انقلاب کتنا ہی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین کیوں نہ ہو' ناممکن نہیں۔ سب وقت کی بات ہے۔ خدا کسے کب توفیق دیتا ہے' یہ اس کی مشیت ہے۔

جناب ابوبکر آزاد صاحب کے اخبار کا دفتر اسی سڑک پر تھا جس پر زمیندار ہوٹل تھا اور کسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے شعلۂ آفاق اخبار زمیندار کا دفتر بھی تھا۔ لکشمی سے یہ سڑک لاہور ہوٹل سے گزر کر لکشمی چوک جاتی تھی جہاں ہر قسم کے فلمسازوں اور تقسیم کاروں کے دفاتر پر آنے والی فلموں کے رنگین سائن بورڈ تقریباً ہر عمارت کی بالکونی میں کھڑکی کے سامنے آویزاں دکھائی دیتے تھے۔ فیصل کا آفس بھی اسی سمت میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہاسٹل سے بہت قریب تھا چنانچہ میں اپنے خیالات کی رو میں گرد و پیش کی گہما گہمی سے بے نیاز پیدل چلتا ہوا وہاں تک آ گیا تھا۔

جی پی او کے چوک پر پہنچ کے مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی دیر سے اکیلا ہوں۔ اکیلے پن کا یہ احساس میرے لیے بڑا اجنبی اور تکلیف دہ تھا۔ کہنے کو دنیا میں ہر شخص اکیلا ہے۔ اکیلا آتا ہے اور اکیلا ہی جاتا ہے۔ میرے چاروں طرف پیدل اور سائیکل سوار' موٹر سائیکلوں سے کاروں اور بسوں میں نہ جانے کتنے لوگ تھے جو اکیلے تھے لیکن ان میں اور مجھ میں بڑا فرق تھا۔ ان کا اکیلا پن وقتی اور عارضی قسم کا تجربہ تھا جس میں اذیت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ کچھ دیر میں ان کو اپنے گھر اور اپنوں کے درمیان پہنچ جانا تھا جو دلوں میں اپنائیت اور آنکھوں میں انتظار کے چشم براہ ہوں گے۔ ان کے بیوی بچے' ماں باپ یا بھائی بہن ہوں گے اور گھر تک ہوں گے جن سے وہ جذبات کے گہرے رشتے رکھتے تھے۔ پودوں کی طرح جو درخت بننے تک زمین کے اندر اپنی جڑوں سے زمین کو جکڑتے جاتے ہیں۔ وہ اسی طاقت پر اپنے وجود اپنے احساس اور اپنی شناخت کی بنیادوں کو استوار کر سکتے ہیں اور تحفظ کی یہی ضمانت ان کے ذہنی سکون کی ضامن ہوتی ہے۔

ایسا میرے ساتھ نہیں تھا۔ اس شہر میں میرا نام جاننے والے اور میرے صورت آشنا سیکڑوں نہیں ہزاروں تھے جو میرے دوست تھے اور دشمن تھے اور دوستی کا دم بھرنے والے آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر لیے پھرتے تھے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دشمن نظر آنے والے جن کے دل میرے اکیلے پن کے دکھ سے دکھی تھے۔ میرے پاس خدا کا دیا وہ سب کچھ تھا جس کی کوئی بھی تمنا کر سکتا ہے اور جو دنیا میں کامیابی کی سند سمجھا جاسکتا ہے لیکن اچانک مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ سب کچھ میرا ہونے کے باوجود میرا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

میرا ماضی ناصر عظیم کے اثاثے تھے۔ وہ اثاثے جن میں اس کے لیے کامیابی کے غرور اور خوش قسمتی کی طمانیت کے سارے اسباب شامل تھے' اس کا ایک گھر تھا جہاں خون کے رشتوں سے زیادہ مقدس اور حفاظت کرنے والے رشتے میسر تھے۔ ولدیت کے خانے میں لکھا ہوا نام تو فقط ایک بے تصور خیال تھا۔ ورنہ باپ کے مثالی کردار کی ساری شفقت اور محبت۔ ذمے داری کی سخت گیری اور سرپرستی کا احترام رکھنے والی کرنل خان کی وہ شخصیت تھی جس کی عظمت کے سامنے میرا سر خود بخود جھک جاتا تھا پھر چندا تھی' میری زندگی کے صحرا میں کھلنے والی چاندنی جس کے طلسم نے مجھے پوری طرح اسیر کرلیا تھا۔ ایک بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ڈاکٹر کمال فاروقی تھا۔ ایسے بھائی بھی کسے نصیب ہوں گے اور ایسے دوست کہاں ہوں گے جو شرافت' خلوص اور وضع داری کے مجسم پیکر ہوں' اشرفِ انسانیت ہوں اور اتنے کشادہ دل کہ جان بچانے کو آئے تو بے دام بیچ دی اور پھر ان سب سے بڑھ کر وہ پیار اور معصومیت کا نازک سا احساس رکھنے والی قمر جیسی بہن۔ جذبات کی گہرائی میں سمندر اور خیالوں کی بلندی میں ہمالیہ۔ جو چاکلیٹ کے لیے رونے لگتی تھی اور ناقابلِ یقین خود اعتمادی کے ساتھ اپنا بوتیک چلاتی تھی۔

میرا وہ گھر کہاں رہ گیا تھا؟ اس گھر کو میں نے اپنے پیچھے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح کہ پھر لوٹ کر جانا بھی آج اپنے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔ یوں تو بہت کچھ تھا جو وقت کی راہ گزر پر ایسے رہ گیا تھا جیسے رات کی تاریکی میں سفر کرنے والی ٹرین کے مسافر کے لیے وہ گمنام ریلوے اسٹیشن جہاں سے ٹرین رکے بغیر گزر گئی ہو۔ ایسے اسٹیشن بھی کم نہ تھے جہاں میری زندگی کی گاڑی کسی جنکشن کی طرح کھڑی رہی تھی مگر ہر جنکشن سے میری منزل کی سمت بدل گئی تھی اور میں نے سے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرتے ہوئے سفر جاری رکھا میں کسی احساسِ زیاں سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ کسی کی خلش نے مجھے پریشان نہیں کیا تھا۔ زندگی ایسی ہی راہوں پر نئی منزلوں کا مسلسل سفر ہے۔ خوب سے خوب کی جستجو ہے۔ کامیابی اور اس کے بعد والی بڑی کامیابی کی تلاش ہے۔

خان اعظم کے گھر تک زندگی کی گاڑی میں کتنے جنکشن آئے تھے۔ ایک یتیم خانے سے سفر کا آغاز کرنے والی ٹرین کس کس اسٹیشن پر رکی تھی۔ شادو' ڈاکٹر مشہود' ہیر رانجھا' نیلم۔ کچھ اسٹیشنوں کے نام بھی کتنے عجیب لگتے ہیں مگر لاہور تو لاہور ہے۔ لاہور کبھی کسی کے لیے بھی سنگ جانی یا سنگاپور نہیں ہو سکتا۔ خواہ کوئی ساری عمر لاہور سے باہر گزار آئے لیکن لاہور جو ایک احساس کا نام ہے باقی رہتا ہے کیونکہ ہر جگہ آدمی تو وہی رہتا ہے' پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ میں جو ناصر عظیم تھا' شاہ عالم ہو گیا اور میں نے احساس کے تعلق کو پیچھے چھوڑ دیا جس سے میری شناسائی کا رشتہ ایسا ہی تھا جیسا کسی کا اپنے شہر سے اور شہر کی ایک گلی سے اور گلی کے ایک گھر سے اور گھر کے آنگن میں اگنے اور بڑھ کر تناور درخت بن جانے والے پودے سے اور اس کی گھنی چھاؤں کی خوشبو سے ہوتا ہے۔

وہ سب میں نے کہاں' کیسے اور کیوں گنوا دیا جو ناصر عظیم کا تھا۔ اس کا نام' اس کے رشتے' اس کی کامیابیاں اور اس کا غرور۔ اس کا وہ گھر نہیں رہا' وہ دولت نہیں رہی' وہ کاروبار نہیں رہا۔ قمر اس کی بہن نہیں رہی۔ چندا اس کی راحتِ جاں نہیں رہی۔ فاروقی اس کا دوست نہیں رہا۔ اپنے پرانے چہرے کے باوجود وہ آج کسی کے لیے ناصر عظیم نہیں۔ سب اسے پہچاننے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کسی کو یقین نہیں دلا سکتا کہ وہ ناصر عظیم ہے۔ کوئی اس کی قسم پر اعتبار نہیں کرے گا۔ کوئی اس کی بات ہی نہیں سنے گا۔

میں نے قمر کی پرورش کی تھی۔ اپنی زندگی سے بڑھ کر اس ذمے داری کو عزیز تر جانا تھا مگر آج اس کی زندگی کا سب سے اہم دن تھا جب وہ اپنے خوابوں اور ارمانوں کی منزل مراد پانے والی تھی تو بھائی کے دستِ شفقت سے محروم تھی۔ میں ایک اجنبی تھا جسے اجازت نہ تھی کہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے دعا بھی دے سکوں۔ چندا اور خان اعظم اور فاروقی۔ سب کسی اور گھر کے' کسی اور شہر یا ملک کے رہنے والے تھے۔ کسی دوسری دنیا کے لوگ تھے جو مجھے نہیں جانتے تھے۔ میرے خیالات کی زبان ہی نہیں سمجھتے تھے۔

حالات کی ستم ظریفی نے مجھے شاہ عالم بنا دیا تھا۔ وہ سب کچھ زبردستی مجھے دے دیا تھا جو شاہ عالم کا تھا۔ اس کا نام' اس کا گھر' اس کی بیوی' اس کی دولت۔ سیاسی ساکھ' پارٹی' عہدہ' عزت اور ذلت' نیک نامی اور بدنامی۔ دوستی اور دشمنی' اچھائی برائی' ثواب و عذاب۔

مگر آج شاہ عالم کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ شاہ عالم بھی اپنی دنیا میں اکیلا اجنبی اور UNWANTED ہو گیا تھا۔ ناصر عظیم نے شاہ عالم کے نام سے جو بھی حاصل کیا تھا' سب گنوا دیا تھا۔ اس کا قصرِ عالی شان شاہ عالم ہاؤس' اس کی انقلابی سوچ رکھنے والی پارٹی پی جے ایف جس کا وہ چیئرمین تھا۔ اس کو چیئرمین تسلیم کرنے والے ساتھی' جاں نثار اور نام لیوا۔ اس کی لامحدود دولت اور جائداد۔ اور اس کا کاروبار باقی رہ گئے تھے صرف اس کی جان کے قرض خواہ جو ایک بار اپنے وطن کی ناقابلِ تسخیر سیاسی روایات کے مطابق اسے "شہادت" کے منصب پر بھی فائز کر چکے تھے اور پوری شان و شوکت کے ساتھ اس کے شہید جسم کو ایک شایانِ شان مزار کی جگہ تک پہنچا چکے تھے مگر تقدیر کے مداری ہاتھوں نے ان کا سارا کھیل چوپٹ کر دیا۔ قضا کے تیر کا نشانہ شاہ عالم ہی بنا لیکن دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ وہ زندہ ہے جسے ہزاروں لاکھوں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ ناگہانی اتفاقات سے اپنے وجود کو ثابت کرنے والے دستِ غیب نے ان سب کی آنکھوں کے سامنے وہ پردہ پھیلا دیا تھا کہ ان کی نظریں حقیقت کے فریب کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔

اب شاہ عالم کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا عہد رکھنے والے اس کے نام کو بھی لوحِ جہاں سے مٹانے کے لیے صف بستہ ہو گئے تھے۔ شاہ عالم سے اس کی پارٹی چھین لی گئی تھی۔ شاہ عالم کو چیئرمین کے عہدے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ شاہ عالم پر دہرے قتل کے الزامات تھے۔ شاہ عالم نے از خود اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ خود اعلان کر دیا تھا کہ اس نے اپنی پارٹی کے تمام معاملات سے دستبرداری قبول کر لی ہے۔ اس نے رخشی کو بھی بتا دیا تھا کہ جو شاہ عالم کا تھا وہ سب اسے مل جائے گا۔

ناصر عظیم کے پاس اب شاہ عالم کے نام کے سوا کیا رہ گیا تھا اور اس نام کے ساتھ بھی رسوائیاں تھیں۔ عداوتوں کے جان لیوا سلسلے تھے۔ سیاسی رنجش اور کاروباری رقابت کی خون آشامی تھی۔ پچھتاوا تھا' نفرت تھی اور خوف تھا۔

ناصر عظیم نے شاہ عالم بن کے اپنا ماضی ہی نہیں مستقبل بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور اسے تقدیر کے ہاتھوں دہری مات ہو گئی تھی۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ دھوبی کے کتے' نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ تو پھر اب تم کہاں جاؤ گے؟ اگر تم ناصر عظیم بھی نہیں ہو اور شاہ عالم رہنا بھی تمہارے لیے ممکن نہیں تو پھر تم کیا کرو گے؟

آخر تم ہو کون؟ وہ گدھے جس کے ضمیر پر صرف الزامات کا بار ہے اور شرمندگی و رسوائی کا بوجھ ہے؟ یا ایک عظیم سیاسی راہنما جو اپنی ذہانت' باضمیر سیاست کے انداز سے اس قوم کو انقلابی قیادت فراہم کرنے کا زعم رکھتا تھا۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے' مٹا دو۔ اگر اپنے علامہ اقبال صاحب یہ فرما گئے ہیں تو پھر غالب کی طرح چلاتے کیوں ہو مسٹر پرائم منسٹر کہ' یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے۔ کیوں سوال کرتے ہو کہ میں کون ہوں؟ ایک ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔ ہاہاہا۔ کیا زبردست لطیفہ ہے۔ ارے بابا ہماری طرف سے جہنم میں جاؤ۔

یہ آخری جملہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے کسی نے مجھ سے نہیں کہا تھا مگر میں ایسے چونک پڑا جیسے اس کا مخاطب میں ہی تھا۔

مجھے بے اختیار اختر الایمان کی ایک نظم یاد آئی۔

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھ راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے اوبے او سر پھرے
ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گالیاں دیں' ہنسیں' ہاتھا پائی کریں۔

اس کے آگے مجھے صحیح یاد نہ تھا مگر کچھ یوں تھا کہ "کچھ دیر کے لیے میری یہ تنہا زندگی اپنا رخ موڑ لے۔"

ابھی تک کسی نے بھی مجھے پہچان کے نہیں کہا تھا کہ ارے آپ' شاہ عالم صاحب۔ کسی نے روک کے نہیں پوچھا تھا کہ تم ناصر عظیم ہی ہو نا۔ یار کہاں تھے اتنے دن سے؟ اور تم پیدل جا رہے ہو' کمال ہے یار!

شاہ عالم کی شان' اس کا غرور اور طاقت خوابِ فردا ہو گئے تھے۔ ناصر عظیم نے خود کشی کر لی تھی اور شاہ عالم بن کے دوسرا جنم لیا تھا۔ آدمی کے اعمال اچھے نہ ہوں تو دوسرے جنم میں وہ دھوبی کا کتا بھی ہو سکتا ہے۔ عقیدہ برحق نہ سہی' میری زندگی کا استعارہ اور کیا ہے؟

میں نے گھبرا کے ایک ٹیکسی کو روک لیا "چلو۔"

"کہاں چلوں سر! شاہ عالم ہاؤس؟" ڈرائیور نے کہا۔

میں خوف زدہ ہو گیا۔ "نہیں..... وہاں..... وہاں کیسے جا سکتا ہوں میں۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

اس نے مجھے پلٹ کر دیکھا "اچھا! پھر آپ کون ہیں؟"

"میں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کون ہو تم؟" میں اسے غور سے دیکھا "اور میں جو بھی ہوں' تمہیں اس سے کیا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے گاڑی آگے بڑھادی "آپ نہ بتائیں۔ آپ کی مرضی لیکن آپ پریشان ہیں؟ یا۔۔۔ بہت نشے میں ہیں۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا مگر میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہوگیا۔ پہچاننا کیسا' مجھے اس کا نام بھی یاد آگیا تھا۔ اس کا نام سعید ملک تھا۔ ایک بار اس نے مجھے شاہ عالم ہاؤس پہنچایا تھا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ ' ذہین اور باغیانہ خیالات رکھنے والا نوجوان تھا۔ میں اس کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ میں نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ پھر مجھ سے ملے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میرے لیے ایک قابل اعتماد ساتھی ثابت ہوسکتا ہے۔ میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اسے زبردستی بلوانا میرے لیے مشکل نہیں اور وہ اس وقت میرے ڈر سے مان گیا تھا مگر لوٹ کے نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر پہلے مجھے تقدیر سے گلہ تھا کہ مجھے اس بھرے شہر میں پہچاننے والا بھی کوئی نہیں اور اب ایک شریف آدمی نے بڑے خلوص سے مجھے شناخت کرلیا تھا تو میں مجبور تھا کہ پھر اپنی اجنبیت کے خول میں چھپ جاؤں۔

میں نے پُرسکون ہو کے کہا "یہ بڑی عجیب بات ہے۔"

وہ ٹیکسی چلاتا رہا۔ اس نے پھر سوال نہیں کیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "یہ اتفاق کئی بار ہوا ہے میرے ساتھ۔ لوگ مجھے شاہ عالم سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی سیاست داں ہے وہ۔ کیا میری صورت اس حد تک ملتی ہے اس سے؟"

اس نے پیچھے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مسکرایا "آپ نے تو مجھے شک میں ڈال دیا ہے سر!"

"کیسا شک!"

"مجھے شک ہو رہا ہے کہ میں نشے میں ہوں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" میں نے خفگی سے کہا "اگر میں شاہ عالم ہوتا۔۔۔ تو ایسے کھڑا ہوتا یہاں اکیلا۔ ٹیکسی کی تلاش میں۔"

"ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا سر! بہادر شاہ ظفر کو دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں اور پھر شاہ ایران کو۔۔۔ اس شاہ عالم کا قصہ بھی عجیب ہے۔ یک نہ شد دو شد والا۔ پہلے مرگیا' پھر زندہ ہوگیا۔ میں سب اخباروں میں پڑھتا رہا ہوں۔ دو ہم شکل افراد اس دنیا میں بہت ہیں۔ نہ جانے کتنی فلمیں بنی ہیں اس موضوع پر لیکن آپ نے تو کمال ہی کردیا۔"

میں نے کہا "کیا کمال کردیا میں نے؟"

"آپ تیسرے ہیں۔۔۔ تین ہم شکل۔ ایک کی کار رین کاپی دوسرا اور دوسرے کی تیسرا۔ میں بھی دھوکا کھا گیا۔ آپ برا نہ مانیں تو آپ کا نام پوچھ لوں سر' بڑا عجیب واقعہ ہے۔"

میں نے کہا "چلو تم اپنی سہولت کے لیے مجھے شاہ عالم سوم سمجھ لو اور گاڑی اگلے چوک سے دائیں جانب موڑ لو۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا ہے مگر اس وقت میں نے اسے سچ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کا جو جی چاہے سمجھے۔ اس معاملے میں ابھی خود میں کسی فیصلے پر پہنچنے میں ناکام تھا تو اسے کیا بتاتا کہ میں کون ہوں اور میری حقیقت کیا ہے۔

"رئیس خانے" کی قلعہ نما عمارت کے گیٹ پر ساڑھے چار فٹ قد کے تیس مار خاں نے مجھے ٹیکسی سے برآمد ہوتے دیکھ لیا تھا "او سر جی! آپ کا گاڑی اور شوفر کدھر ہوتی" اس نے اپنی طویل مونچھوں کو عادت کے مطابق بل دیا "آپ ٹیکسی میں آئی۔"

میں نے کہا "شرم سے ڈوب کر مرجانا چاہیے مجھے۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا مگر مجھ سے پہلے تمہیں خودکشی کرنے کی ضرورت ہے۔ نام ہے تیس مار خاں اور قد ہے تیس انچ۔ مونچھوں کی لمبائی اکتیس انچ؟"

صدمے اور احساس ذلت سے اس کا حال خراب ہوگیا مگر اسے جوابی بیان کا موقع دیے بغیر میں اندر گھس گیا۔ ورنہ تیس مار خاں یہ ثابت کرنے کی کوشش ضرور کرتا کہ اس نے قد لمبا کرنے والی جو نئی کرشماتی دوا کھائی ہے اس کا موجد کون ہے۔ یہ طلسماتی نسخہ کیمیا اس نے کسی سے کیسے حاصل کیا جو اس کے ساڑھے چار فٹ قد کو ساڑھے چار ہفتے میں سات فٹ بھی کرسکتا ہے۔ وہ اپنے قد کو لمبا کرنے کے لیے دنیا کی ہر ترکیب آزمانے پر آمادہ رہتا تھا مگر اپنی ساری کوشش کے باوجود اس کی بلندی پانچ فٹ کے نشان سے چھ انچ دور ہی تھی۔ اس کا دوسرا خبط اپنی مونچھوں کو ہیرٹانک لگا کے عالمی ریکارڈ کی لمبائی تک بڑھانے کا تھا اور یہ مجھے ناممکن نہیں لگتا تھا۔

رئیس خانے میں اس وقت صرف رئیس خاں تھے جو جنگل سے پکڑ کر لائے جانے والے لگڑ بگڑ جیسی بے قراری کے ساتھ کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔ رئیس کی تازہ ترین منگیتر نمبر چودہ جو واقعی چودھویں کے چاند جیسی تھی۔ اپنے وزن اور چہرے کے داغ دھبوں کی وجہ سے۔ خاموش بیٹھی ربڑی کا ایک کوزہ اپنے پیٹ کے مٹکے میں خالی کررہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑا "ابے کہاں مرگیا تھا تو۔ قسم

اللہ کی غصے میں آدھا خون جل گیا میرا۔"

"ٹھنڈی ربڑی کھالو تھوڑی سی۔ غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا" خاتون نے کہا جو اپنے تین سو پاؤنڈ وزن کے شرٹ غمزے دکھا دکھا کے رئیس کو دیوانہ کررہی تھی۔

مگر رئیس کا موڈ بدل چکا تھا "دفع ہوجا یہاں سے اُلو کی پٹھی ورنہ تجھے ٹھنڈا کردوں گا قسم اللہ کی۔ یہی کوزہ سر پر مار کے۔ ربڑی کی اولاد۔"

میں نے کہا "یعنی اس کا نام ہے ربڑی۔ خیر' دیکھنے میں تو ربڑ کا پہاڑ لگتی ہے۔۔۔ میں تھا اپنے ابوبکر آزاد کے ساتھ پھر چلا گیا اس وکیل فیصل ہاشمی کے پاس غلطی سے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاہ عالم نے اس کے ساتھ کیا حرامی پن کیا تھا۔ اس نے مجھے چائے پلائی اور خاطر خواہ طریقے پر ذلیل کرکے رخصت کردیا۔ کہتا ہے حساب برابر ہوگیا آج۔ ہاں اسے دیکھنے بھی گیا تھا میں۔ اس پاگل کی بچی آفت کی پرکالہ شبنم کو مگروہ لمبی بات ہے پھر بتاؤں گا' ابھی تو چل میرے ساتھ۔"

رئیس رک گیا تھا اور ایک ہاتھ کمر پر رکھے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا "تجھے معلوم ہے' تین گھنٹے میں کیا ہوگیا ہے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "تو اتنا پریشان کیوں ہے؟"

"بہت پریشانی کی بات ہے پیارے!" اس نے صوفے پر بیٹھ کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "ملک بخش مندرال کا قتل ہوگیا ہے۔"

میں اس کے سامنے والے صوفے پر گر گیا "یار رئیس۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے' ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہوسکتا ہے۔۔۔ مجھے کیسے خبر ہوتی' تو پھر رہا ہے اپنے ہی چکروں میں لیکن بیٹا' اپنا تو اس کے ساتھ براہِ راست معاملہ تھا۔ جیسے گولی کا بندوق کے ساتھ۔ بندوق وہ تھا گولی ہم۔"

میں نے خدا بخش مندرال کو اپنے تصور میں دیکھا۔ اس کے قصر عالی شان کی پریس کانفرنس... جو رسمی قسم کی سیاسی پریس کانفرنس سے زیادہ ایک پُرتکلف ضیافت تھی جو اس نے میرے ساتھ اشتراک کی خوشی میں دی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے بڑی نیازمندانہ شرافت کے ساتھ آزاد صاحب کو پیش کش کی تھی کہ وہ اپنی اڑیل چلبلی کو چھوڑ کے اس کی سفید ہاتھی جیسی شاہانہ سواری والی لینڈ کروزر میں چلے جائیں اور آزاد صاحب نے ایک فارسی کا شعر پڑھا تھا۔

خدا بخش مندرال کے بارے میں میری معلومات محدود تھیں۔ وہ ایک اچھا انسان یا اچھا دوست اور اچھا سیاست داں تھا یا نہیں اور میرا اس کے ساتھ سیاسی اشتراک کوئی دانش مندانہ فیصلہ تھا یا محض میری مصلحت کوشی۔ اب ایسے سارے سوالات بے معنی اور بے مقصد ہوگئے تھے۔ مجھے سخت صدمہ تھا کہ آج تک مسلسل سیاسی ناکامیوں سے دوچار ہونے والے خدا بخش مندرال کے لیے کامیابی کی امید موت کا پیغام ثابت ہوئی تھی۔ وہ پُرامید تھا کہ میرے ساتھ مل کے وہ سیاست کی بازی جیت لے گا مگر وہ زندگی کی بازی ہی ہار گیا۔ اور ایسا صرف میری وجہ سے ہوا ورنہ ہر الیکشن میں اس کا کوئی حریف ضرور تھا۔ کسی نے اسے اپنا دشمن سمجھ کے اسے راہ سے ہٹانے کے لیے اس کی جان لینے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔

میں نے صدمے کی شدت پر قابو پا کے کہا "مجھے کچھ بتاؤ رئیس۔ یہ کب ہوا اور کیسے؟"

"ابھی آدھا گھنٹا پہلے۔" رئیس جتنا افسردہ اور پریشان تھا' اس سے کہیں زیادہ مشتعل تھا۔ "اس کی دوسری بیوی کا فون آیا تو مجھے پتا چلا۔ ملک خدا بخش مندرال دوپہر کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ جب وہ جاگا تو خادم نے اسے ایک گفٹ پیک دیا۔ اس پر تیرا نام لکھا ہوا تھا۔"

میں اچھل پڑا "میرا۔۔۔ میرا نام۔۔۔"

"ہاں' ملازم نے بتایا کہ موٹر سائیکل پر وہ آیا تھا' کیریئر سروس۔"

میں نے کہا "کوریئر سروس۔۔۔"

"ابے ہاں وہی۔ چوکیدار کو دے گیا تھا دستخط لے کر۔"

"مگر میں نے تو اسے کچھ بھی نہیں بھیجا تھا" میں نے کہا۔

"ابے یہ کون۔۔۔ کہہ رہا ہے" رئیس نے گالی بکی "بس بھیجنے والے نے تیرا نام لکھ دیا۔ خدا بخش بہت خوش تھا۔ مجھ سے اس کی بات ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ رئیس۔۔۔ بس اب کمر کس لے پتر۔ رب نے چاہا تو اس بار سب کا بینڈ بجا دینا ہے ہم نے۔"

"پارسل میں کیا تھا؟"

"تیری ساس کا آملیٹ تھا" رئیس دہاڑ کے بولا "ابے بم تھا اور کیا تھا۔"

ربڑی نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کے کہا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

رئیس نے جوتا اتار کے پھینکا جو نشانہ خطا ہونے کے باعث ایک گلدان کو لگا۔ گلدان ٹوٹ گیا "میں نے کہا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو کچھ رئیس نے کہا' سب ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔ ربڑی غائب ہوگئی۔

میں نے کہا "فون تجھے آدھے گھنٹے پہلے ملا تھا۔ واقعہ کس وقت پیش آیا؟"

"شام چار بجے" رئیس نے کہا "خدا بخش نے جیسے ہی رنگین کاغذ میں لپٹے ہوئے فیتے کو کھینچا' ایک دھماکا ہوا۔ خود اس کے تو چیتھڑے اڑ گئے۔ ملازم جو گفٹ پارسل لے کر گیا تھا وہ کچھ دیر بعد گورنمنٹ گون ہوا۔ اس نے بھی پولیس کو بتایا کہ ڈبے پر تیرا نام تھا' چوکیدار نے بھی۔ مارا گیا تو سالے اور تیرے ساتھ اپنا بھی ڈبا گول۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ان کے حرامی پن کو۔ آخر اب کیا چاہتے ہیں وہ رئیس؟ میں نے اپنا راستہ الگ کرلیا۔ شاہ عالم کے ماضی سے لاتعلقی کا اعلان کردیا۔ ان کے لیے چیئرمین کا عہدہ چھوڑ دیا۔ پارٹی ان کے حوالے کردی۔ اور کیا چاہیے انھیں۔"

وہ جھنجھلا کے بولا "ابے یہ کیا ان کہے کے لیے اور انھیں لگا رکھی ہے۔ نام لینے سے کیا نکاح ٹوٹ جائے گا تیرا۔؟"

میں نے کہا "تو جانتا ہے کہ میں شمس اور قریشی کی بات کررہا ہوں۔"

رئیس نے نفی میں سرہلایا "قسم اللہ کی۔ تو وہی ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ مکہ جاکے آئے گا تب بھی گدھا ہی رہے گا۔ حضرت موسیٰؑ کا گدھا۔"

"حضرت عیسیٰؑ کا گدھا" میں نے تصحیح کی۔

"بس تو افلاطون بنا پھر۔ غلطی پکڑتا رہ ہماری۔ ابے عیسیٰؑ موسیٰؑ کا پتا ہے ہمیں مگر تجھے اپنی غلطی کا پتا نہیں۔" رئیس بگڑ گیا "جب شمس اور قریشی کا مقصد تو نے ویسے بھی پورا کردیا۔ تو تیری ان کی کیا دشمنی' صرف پارٹی پر قبضے کے لیے انھوں نے شاہ عالم کو گورنمنٹ گون کرنے کی سازش کی تھی اور پھر مندرالی سے ان کی کون سی ناراضگی تھی۔"

"اسے قتل کیا گیا ہے مجھے پھنسانے کے لیے" میں نے کہا۔

رئیس نے سر پر ہاتھ مارا "ابے تو سمجھتا کیوں نہیں' کیا اب پھانسی ہوجائے گی تجھے؟ اس پارسل پر نام ہوتا میرا تو کیا میں پکڑا جاتا؟"

"مجھ سے سیاسی اتحاد ہی خدا بخش کا جرم بن گیا۔"

"یہ تو سمجھا جائے گا بلکہ خدا بخش کی ساری بیویاں اور سب اولادیں تجھے ہی ذمے دار قرار دیں گی۔ شمس اور قریشی کو کیا کہ تو اب کس سے سیاسی اتحاد کرتا ہے۔ خدا بخش سے یا رسول بخش سے۔"

"مقصد تو مجھے سیاسی منظر سے ہٹانا ہے۔"

"ہاں۔ اب آئی نا صحیح بات تیری کھوپڑی میں۔ کوئی چاہتا ہے کہ تو سیاست ہی چھوڑ دے۔ ایسا کون چاہتا ہے؟"

میں نے کہا "ایسا چاہنے والے کی ایسی تیسی۔ میری مرضی میں سیاست کروں یا تجارت۔ ایک خدا بخش ہی تو نہیں تھا میرے لیے۔"

"ہم ہیں تو دو کوڑی کی عقل رکھنے والے بیٹا مگر بات کرتے ہیں لاکھ روپے کی شرط والی۔ ہمت ہے تو شرط لگا۔"

"کیسی شرط؟"

"تو جس کے ساتھ بھی سیاسی تعاون کرے گا' اللہ کو پیارا کردیا جائے گا وہ اور نیکی پھر تیرے حساب میں لکھی جائے گی۔ اللہ کے بعد بیٹا جس کو خودکشی کرنی ہوگی نا وہی تیرے ساتھ تعاون کرے گا۔"

میں نے کہا "یار آخر کسی کو کیا تکلیف ہے۔"

"تکلیف انھیں ہے جن کا نقصان ہوا ہے تیری وجہ سے۔۔۔ تو وہ پہلے والا شاہ عالم ہی رہتا تو سب پہلے کی طرح چلتا رہتا۔"

میں نے چونک کے کہا "تیرا مطلب ہے۔۔۔ وہ دونوں۔۔۔ خالد عثمان اور خادم مرزا۔؟"

"ان دونوں کے علاوہ نہ جانے اور کتنے ہوں گے بیٹا۔ ان کا بزنس چل رہا تھا تیری سیاست کی آڑ میں۔ شاہ عالم ان کے لیے صرف ایک بزنس پارٹنر تھا جس کے اثر رسوخ سے وہ پورا فائدہ اٹھاتے تھے اور اسے اس کی قیمت ادا کردیتے تھے۔ اب معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا پھڈا ہوا کہ انھوں نے شاہ عالم کے لیے فیصلہ کرلیا کہ اسے گورنمنٹ گون ہوجانا چاہیے۔ کیا پتا سالے نے غبن کیا ہو۔ مال کھا گیا ہو یا کوئی ہیرا پھیری سامنے آگئی ہو اس کی۔"

"مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔"

"ہاں پھر انھوں نے تجھے سمجھانے اور تیرے ساتھ معاملہ کرنے کی کوشش کی لیکن تو نے الٹا ان کا بیڑا غرق کردیا۔ ان کے دھندے کو ہی نہیں' ان سب کو خطرے میں ڈال دیا جو شاہ عالم کو استعمال کررہے تھے۔ اس کے بعد سے وہ تجھے سمجھانے کی کوشش کررہے تھے بیٹا کہ حرامی پن چھوڑ کے شرافت سے پرانی لائن پر آجاؤ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔ ایسی گھٹیا حرکتوں سے کیا فائدہ۔ ہمت ہے تو مجھے گولی ماردیں۔"

"ماردیں گے گولی بھی۔۔۔ انشاء اللہ۔ ابھی تیرے قبضے

میں ان کا ریکارڈ ہے۔ اس میں سارا کچا چٹھا ہے ان کا۔"

میں نے کہا "کہاں ہے وہ کمپیوٹر اور ڈسک وغیرہ؟"

"وہیں بینک کے لاکر میں۔"

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ نکلوا لینا۔"

رئیس نے کہا "یار' نکلوا کے کہاں لے جاتا۔ وہ بینک کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ہوتے توپ کے ساتھ اور توپ کا رخ ہوتا میری طرف پیارے۔"

میں نے افسوس سے کہا "یہ کوئی طریقہ نہیں یار۔ اس طرح وہ مجھے کبھی خوف زدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔"

"ابے رہنے دے۔ طرم خان کی اولاد۔ ابھی وہ تیری طاقت ختم کررہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب تو سیاست سے ہی الگ ہوجائے گا۔ عام آدمی کی طرح اکیلا ہوگا۔ تیری پشت پناہی کرنے والا نہ کوئی سیاست داں ہوگا' نہ بیوروکریٹ تو ایک تھانے دار بھی نمٹ لے گا تجھ سے بیٹا!"

"دیکھ رئیس۔ جب مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ خادم اور عثمان قومی مجرم ہیں۔ وہ صرف اسمگلر نہیں' ڈاکو بھی ہیں۔ وہ اس ملک کے تہذیبی سرمائے اور تاریخی ورثے کو بیرونِ ملک ڈالر اور پاؤنڈ اکٹھے کرنے کے لیے فروخت کررہے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان کا ساتھ دوں اور ساتھ دینے کا کیا سوال۔ میرا تو فرض بنتا ہے کہ ان جیسے سب قومی مجرموں کو بے نقاب کروں۔"

رئیس نے کہا "اوّل تو یہ ناممکن سی بات ہے۔ خالد اور عثمان صرف دو نام ہیں۔ بساط کے دو مہرے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی تو نہیں جانتا کہ وہ محض پیادے ہیں یا گھوڑے۔ باقی مہروں کا تجھے کچھ پتا نہیں اور تو بات کرتا ہے بساط الٹنے کی۔ فرض کر تو نے سب کو بے نقاب کردیا تب بھی کیا ہوگا؟ کچھ ہونے والا نہیں ہے پیارے تیری کوشش سے۔ تو سب کے نام' کالے دھندے اور کالے دھن کے بارے میں پوری رپورٹ شائع کرادے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا کیونکہ وہ چور ہیں تو ان کے منافع میں حصہ بٹانے والے' شریک جرم اور مددگار دس ہیں اور جہاں کوتوال خود چوروں سے ملا ہوا ہو وہاں چوری کی رپورٹ کرنے والے کا کیا حشر ہوسکتا ہے۔"

"یہ میں جانتا ہوں لیکن ایسی باتوں سے میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ میں اپنا کام ضرور کروں گا خواہ اس کی مجھے کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ میں ڈر کے خاموش بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ان کا ساتھ دینا تو دور کی بات ہے' مجھے سیاست کی اس دلدل میں رہنے کا کوئی شوق نہیں جس میں مجھے زبردستی گھسیٹ لیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے جو بھی کیا' اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے ضروری تھا ورنہ میں شاہ عالم کی جگہ مارا جاتا۔"

"قسم اللہ کی۔ ہم سے مت کر ایسی بات۔ ہم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ تیری کھوپڑی میں وزیراعظم بننے کا خناس کب سے سمایا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "یار' وہ ایک بچکانا بات تھی لیکن فرض کر مجھے شوق تھا تو اس میں کون سی شرم کی بات تھی۔ ہر آدمی کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر یا انجینئر' وکیل یا پائلٹ۔ مجھے گردشِ حالات نے ایک موقع فراہم کردیا اور میں نے سوچا کہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں کیا حرج ہے۔ تو کیا غلطی کی میں نے؟"

"کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ سیاست ایک دلدل ہے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ جہاں نصاب کی کتابوں کے اصول والی سیاست نہیں ہے' وہ سیاست نہیں ہے جس نے انگریز کی غلامی سے نجات اور پاکستان کے حصول کا مقصد حاصل کیا تھا۔ وہ بات خوابِ فردا ہوئی۔ سیاسی قیادت کے لیے شرافت ہی شرطِ اوّل تھی۔ پہلے یہ شفاف پانی کی ایک جھیل تھی' پھر اس میں شہیدِ ملت کا خون شامل ہوگیا پھر مارشل لا کی آلودگی آگئی۔ کالے قوانین کی غلاظت بھر گئی۔ علیحدگی پسندی کی تحریکوں کا کوڑا کرکٹ شامل ہوگیا۔ فرقہ پرستی اور لسانیت کی کثافت آگئی۔ آج اس میں صرف لاقانونیت اور بدمعاشی کی طاقت کا راج ہے۔ ایسے ہی تو میں سیاست کو دلدل نہیں کہتا لیکن یار' مایوس ہو کے جدوجہد اور امید چھوڑ دینا بھی تو غلط ہے' کفر کے مترادف ہے۔ کیا مجھے اور میرے جیسے لاکھوں نوجوانوں کو بزدلی' بے حسی اور خودغرضی کا الزام قبول کرکے آج کے آقاؤں کی غلامی کو قبول کرلینا چاہیے۔ جو کچھ ہورہا ہے' اس کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ خاموشی بھی جرم ہے' خاموش رہ کے آپ بزدلی کا پیغام دیتے ہیں اور بدمعاشی کو فروغ دیتے ہیں۔"

"ابے یار' خدا کے لیے مت کر ایسی کتابی تقریریں۔۔۔"

"رئیس یہ حقیقت ہے۔ ہم سب بزدل' بے غیرت اور خودغرض ہوگئے ہیں۔ ورنہ یہ سب ہوسکتا تھا جو ہورہا ہے۔ مشکل سے ہزار ہوں گے جو ساری خرابی کے ذمے دار ہیں اور دس کروڑ سب دیکھ رہے ہیں۔ سن رہے ہیں اور برداشت کررہے ہیں خاموشی سے" میں نے کہا۔

"مجھے صرف اتنا بتادے کہ تو اب کیا کرے گا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "ہاں' یہ ہے اصل سوال۔"

"جس کا تیرے پاس کوئی جواب نہیں" رئیس بولا۔

میں نے آہ بھر کے کہا "سوچے سمجھے بغیر جواب دینے کا فائدہ بھی نہیں۔ میں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تھا تو صورتِ حالات کچھ اور تھی۔ تو اسے بھی میری بے وقوفی کہہ سکتا ہے مگر میں نے سوچا تھا یار' فریب خوردہ عوام مایوس اور بددل ہیں' حوصلہ ہار بیٹھے ہیں۔ اگر ان کے سامنے مٹھی بھر لوگ بھی عملی انقلاب کا نمونہ پیش کریں' صرف نعرہ نہ لگائیں انقلاب کا' کچھ کر کے دکھائیں تو پاکستانی بے شعور نہیں ہیں۔ صرف ان کے شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید میں ایسے لوگوں کو جمع کرلوں گا جو اصول پرستی کی سیاست کے لیے جہاد میں میرا ساتھ دینے کی ہمت رکھتے ہوں گے۔ ہماری قوم مردہ نہیں ہوئی ہے۔ صرف خوابیدہ ہے لیکن اب..."

"اب مایوس ہوگیا ہے تو خود' یہی بات ہے نا؟"

"نہیں۔ مایوس ہونا نہیں سیکھا میں نے۔ اصل بات یہ ہے کہ سیاست کے بازار میں آ کے مجھے پتا چلا کہ یہاں ایک اور بدنام گلی بھی ہے جو سب کی نظر سے اوجھل ہے۔ خود مجھے صرف شبہ تھا' یقین نہیں تھا۔ سیاست کی راہیں وطن فروشی کی راہوں سے بھی ملی ہوئی ہیں۔ اس میں پھر وہی لوگ غالب ہیں جن کے نزدیک ذاتی مفادات اس وطن کی سلامتی سے زیادہ عزیز ہیں۔ انہی لوگوں نے آدھا ملک گنوا دیا اور کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ غدار بھی نہیں پکڑے گئے۔ کسی پر الزام تک نہیں آنے دیا گیا۔ سزا دینا تو دور کی بات ہے۔ یہ ضمیر فروش غدار' رہے سہے پاکستان کے ساتھ بھی دشمنی کر رہے ہیں اور اس وطن دشمنی میں ان سے آگے ہیں جن کو ہم چلا چلا کے اپنا دشمن کہتے ہیں۔ خادم اور عثمان ایسے ہی لوگوں کے نمائندے ہیں۔ انہوں نے شاہ عالم کو اپنے جال میں جکڑ رکھا تھا مگر میں شاہ عالم نہیں۔"

رئیس ہنسنے لگا "تو شاہ عالم نہیں ہے؟"

"ہنسنے کی کون سی بات ہے اس میں رئیس خبیث! کیا تو نہیں جانتا۔"

"ابے میں تو جانتا ہوں مگر تو کہہ سکتا ہے یہ بات سب کے سامنے کسی اسٹیج پر... یا پریس کانفرنس میں۔"

"میں راستے بھر یہی سوچتا رہا رئیس کہ آخر کیا ملا مجھے شاہ عالم بن کے؟"

وہ ناقابلِ بیان ہے جو رئیس کے خیال میں مجھے ملا تھا۔ میں نے کہا "میں خود کو اس عقل سے محروم پاگل گدھے کی طرح محسوس کرتا ہوں جس نے ہوشیار بنتے ہوئے دوسرے گدھے سے کہا تھا کہ بھائی' تھوڑا سا نمک ہے' یہ تم اٹھالو۔ میں اتنا بڑا بھوسے کا ڈھیر اٹھالیتا ہوں۔ جب وہ دریا پار پہنچے تو نمک گھل چکا تھا اور عقلمند بننے والے گدھے کا بھوسا بھیگ کے دگنے وزن کا ہوگیا تھا۔"

"اس میں بھلا گدھا کون ہے اور دوسرا کون؟"

میں نے کہا "یہی تو مشکل ہے۔ پہلا گدھا بھی میں ہوں اور دوسرا بھی۔ میں نے سوچا تھا کہ سیاست کے خارزار پر چلنا مشکل سہی' ناممکن نہیں۔ نمٹ لوں گا اپنے حریفوں سے۔ آخر میرا آئی کیو ایک سو تیس تھا۔"

"بھاڑ میں گیا تیرا آئی کیو۔ اور تو خود۔"

میں نے کہا "اب اندازہ ہو رہا ہے کہ آئی کیو کا تو معاملہ ہی نہیں۔ مقابلہ ہے طاقت اور طاقت بھی پہلوان کی نہیں' عقل اور ذہانت کی نہیں' مقابلہ ہے بدمعاشی کی طاقت کا' ذہانت سے نہیں گولی سے۔ میرے مقابلے پر کوئی روایتی سیاست داں نہیں۔ خالد اور عثمان جیسے لوگوں کی مافیا ہے۔ اب احساس ہوتا ہے کہ شاہ عالم بن کے میں شاہ عالم جیسا ہی رہتا تو شاید بچ جاتا لیکن اندر سے میں ہوں ناصر عظیم۔ شیر کی کھال اوڑھ کے گیدڑ اس کی طرح شکار تو نہیں کرسکتا۔ اس کی طرح دھاڑ نہیں سکتا۔ اب میری حالت یہ ہے کہ میرے چاروں طرف ہیں بھیڑیے اور چیتے۔ اب میں کھال اتار کے بھاگنا چاہوں تو وہ مجھے بھاگنے دیں گے؟"

"بھاگ کے تو جائے گا بھی کہاں پیارے۔ رہے گا تو اللہ میاں کی بنائی ہوئی اسی دنیا میں۔ اللہ کی نظروں سے بچ کر تو کہیں بھی نہیں رہ سکتا۔"

"فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میرے نئے دشمنوں کو میرے پرانے رشتوں کا علم نہیں۔ وہ ناصر عظیم کو نہیں جانتے۔"

"تو یہ بات اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے۔"

"ہاں' ایسا ہوتا تو اب تک وہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ کسی کو بھی میری کمزوری بنا سکتے تھے۔ چندا یا قمر کو۔ فاروقی یا خان اعظم کو۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ ان سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ان کی حفاظت کے خیال سے میں چوری چھپے بھی کسی سے ملنے نہیں گیا اور... اور انہوں نے صاف الفاظ میں لاتعلقی کا اظہار کردیا۔"

رئیس نے سوچ کر کہا "جب تو شاہ عالم ثانی بن کر آیا تھا تو چندا اور خان اعظم نے تیری مدد کی تھی۔"

"یہ بات صرف تیمور جانتا تھا اور وہ مرچکا ہے۔"

"لیکن کیا پتا قتل سے پہلے اس نے مجبور ہو کے کچھ بتا دیا ہو!"

میں نے کہا "اس کو قتل کرانے والے یہی تھے جو شاہ عالم کو مروانا چاہتے تھے۔ اس کی پارٹی اور چیئرمینی پر قبضہ کرنے کے لیے اس کے کاروباری شریک کار بالکل مختلف لوگ تھے اور شاید ان کے بارے میں شاہ عالم نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر خادم اینڈ عثمان کمپنی کو شمس قریشی اینڈ پارٹنرز کے عزائم کا علم ہوجاتا تو وہ خود شاہ عالم کی حفاظت کے لیے مستعد ہوجاتے۔ وہ شاید شمس اور قریشی کو ہی صاف کردیتے کیونکہ کوئی کسی طرح بھی ان کے مالی مفادات کو نقصان پہنچاتے۔ یہ میرے دشمن ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ خادم اینڈ عثمان کمپنی کے سارے مفادات وابستہ تھے' شاہ عالم کی ذات سے۔ اگر اسے شک بھی ہوجاتا تو وہ اپنے کاروباری دوستوں سے کہتا کہ مجھے فلاں سے اپنی زندگی کو خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ چٹکی بجا کے کہتے کہ تو پرابلم۔ تم ہمارے دوست اور تمہارے دشمن' ہمارے دشمن' ان سے نمٹ لیں گے لیکن شاہ عالم نے ہوشیاری کی جو اس کے حق میں کوتاہ اندیشی بن گئی۔ اس نے کاروباری اور سیاسی تعلقات کو ایک دوسرے سے الگ اور مخفی رکھا۔ خادم اینڈ عثمان کمپنی کے لیے اس کی سیاست' سیاسی حالات اور اس کے سارے جھمیلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے اور اسی طرح سیاسی رفیق شاہ عالم کے خفیہ کاروبار کے بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتے تھے۔"

رئیس نے سر ہلایا "اگر تیرے دشمنوں کو اب یہ معلوم ہوگیا کہ تو پہلے ناصر عظیم تھا۔"

"اب کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟"

"کیوں؟ تیرا ارادہ نہیں ہے قمر کو خود رخصت کرنے کا۔"

میں نے کہا "وہ تو ہے۔"

"میری مان تو یہ خیال چھوڑ دے۔ مت جا وہاں۔"

میں نے کہا "یہ ناممکن سے زیادہ ناممکن ہے رئیس۔"

"یعنی تو قمر کے اور کمال فاروقی کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا چاہتا ہے۔ اپنے دشمنوں کو وہ بات بتانا چاہتا ہے جو انہیں ابھی تک معلوم نہیں تھی۔ تاکہ بعد میں وہ انہیں اٹھالیں اور..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "جب کسی کو کچھ نہیں معلوم پیارے۔"

"مگر تو چھپ کر کیسے جاسکتا ہے؟ وہاں تیرا استقبال ناصر عظیم کی حیثیت سے نہیں' شاہ عالم کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ میرے کارڈ پر یہی نام لکھا ہوا ہے اور وہاں نہ جانے کتنے ہوں گے جو تجھے پہچان لیں گے۔ ناصر عظیم ایک گمنام آدمی تھا۔ شاہ عالم آج کل ہر جگہ موضوعِ بحث ہے۔"

"موضوعِ بحث؟ ابو جہل کی اولاد۔ نقطہ نیچے لگا دیا سخن کا اور بحث بنا دیا" میں نے کہا۔

اس نے جھینپ کر کہا "یار' مطلب سمجھ لیا نا تُو نے؟"

میں نے کہا "میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے رئیس۔ قمر انتظار کرے گی میرا۔ مجھے معلوم ہے' وہ رخصتی کے وقت جتنے آنسو بہائے گی نا' سب مایوس ہوں گے اگر میں نہ گیا۔"

"اگر دشمن یا ان کے ایجنٹ تیرے تعاقب میں ہوئے تو تیری یہ جذباتی حرکت ان سب کو بہت مہنگی پڑے گی بیٹا۔"

میں نے کہا "یار رئیس' مجھے بتا میں کیا کروں؟ یہ دلیل کی بات نہیں' دل کی بات ہے۔ میں کیسے نہ جاؤں وہاں۔ میرا دل کٹ رہا ہے اس کے خیال سے۔ وہ دلہن بنی بیٹھی ہوگی اور میرے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔ کتنی دکھی ہوگی وہ۔ میری ننھی منی گڑیا سی بہن..." میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ابے رومت ابھی سے ــــ" رئیس نے مجھے تسلی دی "چل کچھ کرتے ہیں۔"

"فاروقی سمجھ دار ہے۔ وہ اس خیال سے سمجھوتا کرسکتا ہے کہ میں نے مصلحت کے تقاضوں کو سمجھا اور عقلمندی سے کام لیا۔ خان اعظم بھی مطمئن رہیں گے کہ میں نے جذبات کو کنٹرول کیا۔ ان کی ساری زندگی کا ڈسپلن یہی ہے۔ خیال کو کنٹرول کرو لیکن چندا ان کی صحیح جانشین اور شاگرد ہونے کے باوجود ان کی طرح نہیں سوچ سکتی۔ کم سے کم میرے معاملے میں۔ مجھے معلوم ہے' اسے مایوسی ہوگی اگر میں نے کوئی جذباتی حماقت نہ کی۔"

"چندا کے معاملے میں تیری بات اپنے پلے... نہیں پڑی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ سلسلے ہیں رسم عاشقی کے۔ اس میں تقاضائے ناز حسن بھی ہوتا ہے کہ بے خطر کود پڑا... آتشِ نمرود میں عشق۔"

"بس تو بیٹا کود پڑ۔ خود بھی مرا نہیں بھی مروا۔ بھاڑ میں جا" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یار خفا مت ہو۔ کیا تو نہیں جائے گا؟"

"نہیں' مجھے اس نے موت میں کارڈ دے دیا تھا ڈاکٹر کمال فاروقی نے۔ پہلے تیری اور میری دوستی کے بارے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کون جانتا تھا۔ وہی جو میرے اور تیرے دوست تھے اور اپنے تھے مگر اب پرائے بھی جانتے ہیں اور دشمن بھی۔ میں وہاں نظر آیا تو کیا تاڑنے والے تاڑ نہیں جائیں گے کہ میرا قریبی تعلق ہے ان سے اور میرا تعلق ہے تو کیا انہیں شک نہیں ہوجائے گا۔"

"یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ جن کو تو جانتا ہو ان سب سے میرا بھی تعلق ہو؟"

"ابے شک سے ڈر شک سے۔ اگر کسی نے تصدیق کرنے کی ٹھان لی تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ مارے جائیں گے ہم سب۔"

میں نے کہا "اچھا چل اٹھ میرے ساتھ چل۔"

"میں نے کہا نا کہ مجھے اس شادی میں نہیں جانا" اس نے کہا "تجھے شادی کی پڑی ہے مجھے اپنی فکر ہے۔ ملک خدا بخش کے آسرے پر ہم نے اس کے مخالفین کے ساتھ بہت پنگے لیے تھے۔"

میں نے کہا "ڈر مت۔ اللہ پر آسرا کر۔"

"پیارے، جو معاملہ ہے اللہ کے بندوں کا، ملک خدا بخش کے اشارے پر ہم نے اس کے مخالفوں کے جلسے خراب کیے، کارکن اٹھائے۔ اس کے بندوں کی چھینٹی لگائی۔ پوسٹر پھاڑے اور بینر اتارے" رئیس روتی آواز میں بولا "اب وہ چھوڑیں گے مجھے۔ سب گن گن کے بدلے لیں گے۔"

میں نے اسے تسلی دی "یار، اس کام میں تیری گڈول تو ہوگی۔ جاننے والے ضرور جانتے ہوں گے کہ رئیس بڑا خبیث ہے ایسے کاموں میں۔"

"خیر وہ تو ہے۔ اپنی چنڈال چوکڑی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "پھر کیا فکر ہے۔ کوئی اور تیری خدمات حاصل کرلے گا۔ اپنے فیلڈ کا اسپیشلسٹ ہے تو۔ بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ کیا کبھی کسی اور نے نہیں بلایا کہ استاد چھوڑو ملک بخش کو۔ ہمارے لیے کام کرو۔"

رئیس نے سہلایا "بلایا تو کئی بار مگر یار، ایک تو اپن یہ ..... نہیں کرسکتے کہ جو ہڈی پھینکے اسی کی طرف لپکیں۔ اب تجھ سے کیا چھپا ہوا ہے پیارے۔ کہنے والے تو ہمیں مندرال کا کتا کہتے تھے مگر کتے کی ذات میں بھی وفاداری ہوتی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ اچھا تھا اور اپن کو بھی شکایت کوئی نہیں تھی اس سے اس لیے نبھ رہی تھی۔ اس کام میں وفاداری اور جاں نثاری کی بڑی اہمیت ہے۔ قدر اس کی ہوتی ہے جس پر بھروسا ہو کہ ہمارا بندہ ہے تو ہمارا ہی رہے گا۔ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ اگر ہم پیسے کے پیچھے دوڑتے تو بس بدنام ہوتے کہ ہم کسی کے ساتھی نہیں بس پیسے کے ساتھی ہیں اور پیسے کی کون سی کمی تھی کہ ہم وفاداریاں بدلتے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے۔ کوئی نہ کوئی قدر داں فوراً تیری خدمات حاصل کرلے گا" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی تو مجھے فکر ہے ٹھکانا بدلنے کی۔ سالے یہاں نہ پہنچ جائیں اینٹ سے اینٹ بجانے، کچھ دن غائب رہنا ضروری ہوگا۔"

میں نے اسے شرم دلائی "ابے تو بزدل ہوگیا ہے۔ الّو کے پٹھے اتنا ڈرتا ہے مار کھانے سے تو پھر ایسے دھندے چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔"

"ڈرتا کون ہے؟ اپنا شروع سے یہی حال ہے اور آج بھی اپن جو کرتے ہیں، اپنے ان بازوؤں کے دم پر کرتے ہیں بیٹا!" اس نے اپنے بازوؤں کی مچھلیاں دکھا کے کہا۔ "مرد کا بچہ رئیس کوئی سالا زنخا نہیں ہوجائے گا۔ ایک خدا بخش کے مرنے سے۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر اٹھ۔ ابھی تک میں نے طے نہیں کیا کہ اس شادی پر قمر کو کیا تحفہ دوں۔ بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

رئیس نے کہا "ابے ایسے ہی چل پڑوں تیرے ساتھ۔ اپنی ریڑی کو لاوارث چھوڑ جاؤں۔"

"باہر تمیں مار خاں جو ہے" میں نے اسے پکڑ کے باہر کی طرف کھینچا "آخر یہ گلبدن ہے کون؟"

رئیس خان نے اپنی آنکھوں میں عاشقانہ جذبات بھر کے دیکھا "سالے تیری ہونے والی بھابی ہے اور کون۔"

میں نے کہا "یعنی اس سے بھی منگنی کرلی ہے تو نے؟ جیسے پہلے تیرہ بار کرچکا ہے۔ آخر تو چاہتا کیا ہے الّو کے پٹھے۔ تیرا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں آجائے۔ دنیا میں سب سے زیادہ تعداد میں لڑکیوں سے منگنی کرکے شادی نہ کرنے والا ــــ رئیس!"

وہ ہنس پڑا "قسم اللہ کی۔ یہ آخری بار ہے، بالکل فائنل"

"ایسی باتیں بہت سنی ہیں میں نے۔"

رئیس نے کہا "اس بار تو تو دیکھ لے گا اپنے یار کو دولھا بنا ہوا۔ یقین کر شادی کے دعوت نامے بھی چھپ گئے ہیں۔"

میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ "واقعی۔ دعوت نامے بھی چھپوا لیے اور ہمیں خبر بھی نہیں۔"

"وہ ــ میرا مطلب تھا ... بس چھپ کر آجائیں گے

ایک دو دن میں کیونکہ مضمون تو بالکل تیار ہے سمجھ لے۔ اس خدا بخش مندرال کے قتل سے جو بحران پیدا ہوگیا ہے۔"

"بحران نہیں، بکران!"

"ابے ہاں وہی اور پتا ہے اس شادی کے دعوت ناموں کا مضمون کس نے بنایا ہے۔ خود اس نے، تیری بھابی نے پیارے۔"

میں نے طنز سے کہا "اچھا ــ پھر تو بڑی قابل ہوگی۔"

"اور کیا ــ رئیس نے اپنی گاڑی ریورس کی "کئی بار میٹرک کا امتحان دیا۔ ہر بار وہی ایک پرچہ رہ جاتا تھا، انگریزی کا، عربی شریف کا ہوتا تو پاس ہوجاتی۔ میں سناتا ہوں تجھے مضمون۔"

گیٹ کھولنے والے تمیں مار خاں نے "یا علی" کا نعرہ لگا کے جست ماری اور راستے سے ہٹ گیا ورنہ لمبا ہونے کی حسرت میں چپٹا ہوجاتا۔

رئیس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ "سالا روز کوشش کرتا ہے میری گاڑی کے نیچے آکے مرنے کی۔ میں بچالیتا ہوں۔ خیر تو سن مضمون، اوپر ایک شعر ہے۔"

میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے "خدا کے لیے۔ تو بس مجھے تاریخ اور وقت بتادے۔ دن کیا ہوگا؟"

وہ بڑے خوشگوار جذباتی موڈ میں تھا۔ "بڑا مبارک دن ہوگا پیارے مگر پہلے تو شعر سن۔ اس کے مرحوم ابا کا آخری شعر تھا۔ آخری سانس آنے سے پہلے کہا تھا۔"

"اگر نہ کہتے تو اچھا تھا" میں نے ٹھنڈی سانس لی "کیا پتا اسی شعر کی وجہ سے فرشتۂ اجل نے فوراً جان قبض کرلی ہو کہ یہ زندہ رہا تو اور شعر کہے گا۔"

اس نے برا مان کے کہا "بکواس مت کر۔ اپنی تو کوئی بات نہیں۔ یار ہیں اس لیے برا نہیں مانتے مگر کبھی تو نے اپنی بھابی کے سامنے کچھ کہا تو دل ٹوٹ جائے گا اس کا سالے۔"

"بھینس کا دل بہت بڑا ہوتا ہے ــ خیر تو شعر سنا۔"

رئیس بولا "کیا غضب کا شعر ہے پیارے۔ ڈبل پچویشن والا سن!"

اپنی دنیا چھوڑ کر جاتے ہیں سب
ہو کے ڈولی میں یا کندھوں پر سوار
کون دولھا ہے یا عزرائیل ہے
یہ کہے کہ جان چھوڑو میری یار

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "میری مانے تو اسے اپنے یا اس کے کتبے پر لکھوانے کے لیے محفوظ رکھ۔"

رئیس میرے طنز کو بالکل نہیں سمجھا "میں بات کروں گا تیری بھابی سے۔"

"رئیس کیا واقعی تاریخ بھی ٹھہر گئی ہے شادی کی۔"

رئیس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "بس ــ کریں گے طے۔ آپس کی بات ہے پیارے۔ جگہ خالی چھوڑ دی ہے اس کے لیے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا مگر اسی وقت مجھے اچانک میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلانے لگی۔ میں نے سڑک پر دائیں بائیں اور آگے پیچھے جانے والی ٹریفک کو دیکھا تو وجہ فوراً سمجھ میں آگئی۔ ابھی ابھی ایک موٹر سائیکل سوار نے ہمیں اوورٹیک کیا تھا۔ اس کے سر پر ہیلمٹ تھا چنانچہ اس کا چہرہ میری نظر سے اوجھل رہا لیکن اس کے کپڑے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ سوال یہ تھا کہ کب اور کہاں؟

میں نے دماغ پر زور دیا۔ ہیلمٹ پہن کے خطرناک انداز میں موٹر سائیکل چلانے والا بظاہر خودکشی پر آمادہ لگتا تھا لیکن وہ اپنی مہارت کا مظاہرہ کرنے سے زیادہ ہماری گاڑی کی رفتار کو محدود رکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی جینز جیکٹ کے پیچھے نیم دائرے میں زرد رنگ سے لکھا ہوا تھا "لوی بے بی" ایسی فضول باتیں لنڈے بازار سے خریدی ہوئی اسپورٹ شرٹس اور کالے پیلے بنیانوں پر آگے پیچھے عام نظر آتی ہیں۔

رئیس نے کھڑکی سے سر نکال کے اسے گالی دی۔ "اوئے ــ مرنا ہے تو کسی بس کے نیچے مر۔"

رئیس کی بات موٹر سائیکل سوار نے سنی ہی نہیں۔ وہ عین گاڑی کے سامنے کرتب دکھاتے ہوئے تیس چالیس کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے چلتا رہا۔ رئیس سخت مشتعل تھا۔ اسے آگے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا اور اس موٹر سائیکل سوار کو ٹکر لگنے سے بچانے کے لیے خاصی مشکل کا سامنا تھا۔

"یار میں اس ــ کی خواہش پوری کردیتا ہوں۔ سالے کو لمبا لٹا کے نکل جاتا ہوں۔" رئیس کا حوصلہ بالآخر جواب دے گیا۔

اسی وقت مجھے یاد آگیا کہ "لوی بے بی" کو میں نے کہاں دیکھا تھا۔ جب ہم رئیس خانے سے نکلے تھے تو رئیس کی گاڑی ریورس گیئر میں تھی۔ چوکیدار تمیں مار خاں کی زندگی باقی تھی یا وہ جانتا تھا کہ صاحب الٹی گاڑی کیسے چلاتا ہے کہ اس نے بروقت چھلانگ لگا کے اپنی جان بچالی تھی۔ اس وقت میں خود سیٹ پر بیٹھا ہوا پیچھے مڑ کے دیکھ رہا تھا اور میں نے "لوی بے بی" کو ایک سگریٹ پان کی دکان پر دیکھا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے نیلی جینز جیکٹ پر زرد حروف کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھک نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل بھی نہیں دیکھی تھی اور اس کے سوار کا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شاید سگریٹ خرید رہا تھا اور پھر وہیں سے ہمارے پیچھے لگ گیا تھا۔

میں نے رئیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "گاڑی اس کے پیچھے ہی رکھ۔"

"آخر کیوں؟"

میں نے کہا "معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ بہت دیر سے ہمارے پیچھے تھا۔ یہاں اسے ڈر ہے کہ ہم ٹریفک میں گم نہ ہو جائیں اس لیے آگے آگیا ہے۔"

"مگر یہ ہے کون؟" رئیس نے پھر اس کے والد کو گدھا قرار دیا۔

"یہی پتا کرنا ہے" میں نے کہا "تو آرام سے گاڑی چلا۔ میں غور فرماتا ہوں کہ یہ کیوں ہم سے پنگا لینے پر آمادہ ہے۔ ضرور اس کے ساتھ بھی کوئی ہوگا۔"

"ابے یار کیا میں اس کے پیچھے چلتا جاؤں۔ جہاں بھی یہ لے جائے' تو ہی بتا کہ جانا کہاں ہے ہمیں؟" رئیس نے کہا۔

میں نے پیچھے دیکھ کر کہا "ہمارے پیچھے ایک ہائی روف ہے۔ سفید رنگ کی۔ تو اس پر نظر رکھ۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھ' بیک ویو مرر ہے تیرے سامنے۔"

رئیس نے سہلایا "اس کا نمبر تو پڑھ یار۔"

میں نے بیک ویو مرر کا رخ اپنی طرف کیا "پہلا عدد ہے۔۔۔ نو۔ مگر نہیں' یہ فائیو ہے۔ دوسرا ایٹ۔۔۔ تیسرا ہے ون۔ آخری۔۔۔ اسے الٹا پڑھیں۔۔۔ تو یہ ہوگا نائن' سکس نظر آرہا ہے۔ فائیو ایٹ ون نائن۔"

"سالے نے فل بیم پر جلا رکھی ہے ہیڈ لائٹ۔ ڈرائیور کی صورت دکھائی نہیں دیتی" رئیس بولا۔

میں نے کہا "تو ایک دم بریک لگا دے۔"

رئیس نے پیڈل دبا دیا۔ پیچھے آنے والی ہائی روف کے ڈرائیور کے لیے یہ بہت غیر متوقع تھا۔ اس نے کوشش کر کے اپنی گاڑی کو چند انچ کے فاصلے پر روک لیا مگر خود اس کے پیچھے آنے والے نے ہائی روف کو ٹکر مار دی۔ تیسری گاڑی میں چوتھی گھس گئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

بیک وقت دو کاروں کے مشتعل ڈرائیور گاڑی سے اترے اور ہائی روف کے ڈرائیور پر چڑھ دوڑے "اوئے پاگل دے پتر۔ بریک کیوں لگائی ہے؟"

ایک نے کہا' دوسرا چلانے لگا۔ "بیچ سڑک میں گاڑی روک دی۔"

پھر پہلا بولا "نیچے آ تیری تو۔۔"

ہائی روف کا ڈرائیور گرم ہو گیا "اوئے گالی مت دے۔"

"گالی نہ دوں تو انعام دوں تجھے؟" دوسرے ڈرائیور نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ کے باہر کھینچ لیا "دیکھ کتنا نقصان ہوا ہے ہمارا۔"

"اوئے چھوڑ مجھے' پوچھ آگے والے سے۔"

میں نے رئیس سے کہا "اب دوڑ لگا دے یار۔"

مگر میری بات سے پہلے ہائی روف کے ڈرائیور کی بات سنتے ہی رئیس نے ایکسی لیریٹر دبا دیا تھا۔ "مارا گیا سالا۔ وہ چھوڑیں گے نہیں نقصان پورا کیے بغیر۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا "تیری گاڑی کا نمبر۔"

"نمبر۔" اس نے قہقہہ مارا "بہت صاف پڑھا جاتا ہے مگر غلط ہے۔ پانچ کا سفید ٹیپ سے آٹھ بنا رکھا ہے۔ ایک کو سات اور چھ کو پانچ۔"

میں نے کہا "وہ موٹر سائیکل والا کدھر گیا؟"

"پتا نہیں۔ تو نیچے اتر کے ٹیپ کے پیس اتار لے۔"

رئیس نے ذرا سی دیر کے لیے گاڑی روکی تو میں نے آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر چپکے ہوئے سفید پلاسٹک ٹیپ کے ٹکڑے ہٹا دیے۔ گاڑی کا اصل نمبر بالکل مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان پیچھا کرنے والوں سے جان چھٹ گئی۔ رئیس نے میری ہدایات کے مطابق گاڑی کو ہال روڈ اور بیڈن روڈ کا پورا راؤنڈ لگا کے ریگل سے واپس انارکلی کی طرف دوڑایا۔ میں نے اپنی نظر گاڑیوں پر رکھی۔ مجھے نہ کہیں وہ "لومی بے بی" والا دکھائی دیا اور نہ ہمارا پیچھا کرنے والی ہائی روف۔ سفید رنگ کی سوزوکی ہائی روف گاڑیاں بہت تھیں اور میں نے نمبر نہ پڑھا ہوتا تو میرے لیے اصل گاڑی کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ میں ہر سفید رنگ کی ہائی روف پر شک کرتا اور پریشانی ختم نہ ہوتی۔

میں نے کہا "بس اب ایزی ہو جا۔ ہم انھیں ڈاج کرنے میں کامیاب رہے۔"

"یہ سالے کتے کب سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ لومی بے بی کو میں نے کہاں دیکھا تھا "رئیس خانے سے ہمارا تعاقب کیا جا رہا تھا۔"

"مگر کیوں؟" اس نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

میں نے کہا "وہ تجھے گلے لگا کے شادی کی مبارک دینا چاہتا تھا۔ رئیس ربڑی والے اس کے خوش قسمت عاشق

ہوں گے جو شادی سے بچ گئے۔"

"یہ تو بعد میں پتا چلے گا پیارے کہ اس خونخوار کرنل کی بیٹی سے شادی کرنے والا خوش قسمت تھا کہ رئیس خان۔"

"پیارے گر گئی تجھ پر تو زمین پھٹ جائے گی اور تو اس میں سما جائے گا۔ زندہ در گور ہو جائے گا۔"

رئیس نے فوراً جوابی حملہ کیا "اور کسی نے قتل نہ کیا تجھے تو وہ اخبار والی ختم کر دے گی اور گاڑدے گی اصل شاہ عالم کی جگہ۔ میں تو شاید بچ جاؤں' تو نہیں بچے گا۔ سر پر طنبورا مار کے تیرا سر پھاڑ دے گی چندا۔"

میں نے کہا "جاہل کی اولاد۔ وہ طنبورا نہیں..... ستار بجاتی ہے۔"

پہلے میرا ارادہ تھا کہ انارکلی کے کسی اچھے جیولر سے قمر کے لیے کوئی ڈائمنڈ سیٹ لے لوں گا اور ایسا ہی کوئی تحفہ فاروقی کے لیے۔ ضرورت انھیں کسی چیز کی نہیں تھی۔ تحفہ محض محبت کے اظہار کا ایک علامتی ذریعہ ہے۔ اس کے کم قیمت یا بیش قیمت ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

اندیشہ مجھے یہ تھا کہ کہیں میرا تحفہ مسترد نہ ہو جائے۔ ناصر عظیم اگر قمر کو صرف پیار سے ماتھے پر بوسہ بھی دیتا تو اس کا کوئی مول نہ تھا۔ شاہ عالم ہیروں کا نولکھا ہار بھی دے تو قمر اس اجنبی سے کوئی تحفہ کیوں لے گی۔

پھر میں نے سوچا کہ اسے صرف ایک گلدستہ بھیج دوں۔ محبت کے ہر جذبے اور ہر رنگ کی ترجمان پھولوں کی زبان سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ بس ایک کارڈ ہو۔ مجھے ایک جذباتی قسم کا خیال بھی آیا کہ میں اپنے خون سے لکھ کر ایک کارڈ لگا دوں۔ تمہارا بھائی ناصر۔۔۔ یا۔۔۔ ایک بھائی کے خون کا نذرانہ۔۔۔ مگر یہ فنی طریقہ مجھے غیر حقیقت پسندانہ لگا۔ مجھے اتنا میلوڈرامیٹک ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ قمر تو ہے بے وقوف جذباتی لڑکی۔ ویسے ہی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ پتا نہیں کتنے دن اس خون کو دیکھ دیکھ کے روئے گی جس سے اس کا رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا۔

اچانک مجھے چاکلیٹ کا خیال آیا اور اس خیال نے مجھے اتنا اُداس کیا کہ میں پھر رونے کے قریب ہو گیا۔ کیسی دیوانی تھی وہ چاکلیٹ کی۔ کھاتی کیا تھی' چاکلیٹ چرتی تھی۔ کتنا کہتے تھے سب کہ بھینس بن جائے گی پھول کے۔ دانت جھڑ جائیں گے خراب ہو کے۔ شوگر ہو جائے گی۔ اس پر خاک اثر نہیں ہوتا تھا اور اسے کچھ ہوتا بھی نہیں تھا۔ وہ جیسی نازک سی اور منی سی تھی ویسی ہی رہی۔ ہنستی تھی تو دانت موتیوں کی طرح جھلملاتے تھے۔ روتی تھی تو آنکھوں سے موتیوں کی لڑی ٹپکتی تھی۔ بات کرتی تھی تو منہ سے موتی بکھرتے تھے۔

مشکل فیصلہ پل بھر میں آسان ہو گیا۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا اور رئیس سے کہا کہ گاڑی کو کرپارام کمپاؤنڈ میں روک لے۔ وہاں ایک ایسا جنرل پرویژن اسٹور تھا جہاں سے مجھے مطلوبہ چیز ملنے کی امید تھی۔ میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے صرف ایک ریوالور تھا جسے میں چھپا کے رکھتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ ریوالور ممنوعہ بور کا' اسمگل کیا ہوا اور بغیر لائسنس کا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شاہ عالم بن جانے کے بعد میری ذات کو لاحق خطرات سے نمٹنے والے میرے ساتھ چلتے تھے۔ کچھ عرصہ یہ کام ایف اے ایف نے کیا پھر میں ایک پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی خدمت حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

سب حفاظتی انتظامات محض دل کی تسلی کے لیے ہوتے ہیں ورنہ جیسا کہ بہت پہلے شاعر فرما گیا ہے۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت خدا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

ہر چند کہ یہ شعر میرے جیسے حقیر فقیر پُر تقصیر کے لیے نہیں کہا گیا تھا مگر ایک دائمی عالمی سچائی کو اس سے بہتر طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قسمت یا دستِ غیب ہی حادثات اور مرگِ ناگہاں سے بچا سکتا ہے۔ یہ انسان کے انتظامی اختیار میں ہوتا تو نہ امریکی صدر کینیڈی مارا جاتا۔ نہ مصری صدر سادات جسے خود اسے سلامی دینے والے دستے کے ایک فوجی نے پریڈ دیکھنے والے ہزاروں افراد کے سامنے گولی مار دی تھی۔ نہ اندرا گاندھی کو خود اس کا محافظ قتل کرتا اور نہ لیاقت علی خان کو وہی لوگ شہید ملت کے منصب پر فائز کرتے جن پر انھیں اعتماد اور بھروسا تھا۔

میرا ان سب بڑے لوگوں سے کوئی موازنہ نہیں تھا۔ میں بہت چھوٹا اور بہت عام سا آدمی تھا جس کے دشمن اس کی جان لینے کا تہیہ کر لیں تو پھر اسے صرف خدا ہی بچا سکتا ہے ورنہ وقت آجائے تو موقع خود بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود میرے لیے اپنی زندگی کی حفاظت ایک فریضہ تھا کیونکہ یہ خدا کی عطا کردہ نعمت تھی۔

میں نے رئیس سے پوچھا "اسلحہ کیا ہے تیرے پاس؟ ب سے بم بارود۔ بندوق' ت سے تیر تلوار یا توپ۔"

رئیس نے قمیص کو ایک طرف سے اٹھا کے بیلٹ میں اڑسے ہوئے خطرناک ریوالور کا دیدار کرایا "سائلنسر والا ہے۔ قسم اللہ کی جسے گولی لگے اسے بھی بس اپنی ہی ہائے سنائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیتی ہے۔"

میں نے کہا "شہر میں بدمعاش بنا پھرتا ہے اور اس پر اکڑتا ہے۔"

"اور بھی ہے پیارے' یہ دیکھ" اس نے پیچھے والی سیٹ اٹھائی۔

"کلاشنکوف" میں نے کہا "مگر جتنی دیر میں تو اسے یہاں سے نکالے گا' تیری یہ بدروح جو تیرے جسم کی حوالات میں قید ہے۔ جہنم میں زیرِ تفتیش ہوگی۔"

"یار' آج اپنی دوسری باتوں کی پریشانی میں بھول گئے۔ ورنہ اسے تو ہم رکھتے ہیں اپنے قدموں میں۔ بیروں کی جوتی کی طرح۔" اس نے کلاشنکوف اٹھا کے آگے رکھ لی اور پیچھے والی سیٹ برابر کردی۔

"میں ابھی آیا دو منٹ میں" میں نے چٹکی بجائی "تو خیال رکھ کہیں وہ کتے بوسونگھتے ہوئے پیچھے نہ آجائیں۔"

"قسم اللہ کی۔ بھون کے رکھ دوں گا سالوں کو۔" وہ بولا۔

میں نے جنرل اسٹور میں باہر کی جو چاکلیٹ مانگی وہ مجھے مل گئی۔ قمر کو دودھ برانڈ پسند تھے۔ میں نے کہا کہ یہ سب گفٹ پیک کرکے اسی وقت بھجوادی جائے۔ ایک خوش پوش اور خوش اخلاق شخص نے مجھ سے پتا لے لیا۔ وہ مالک تھا یا منیجر۔

"ہم ہوم ڈلیوری سروس نہیں کرتے سر لیکن آپ کو انکار کیسے کرسکتے ہیں۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا "آپ مطمئن رہیں شاہ عالم صاحب' ڈلیوری وقت پر ہوجائے گی۔"

"انشاء اللہ۔" میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی بیوی اپنے شوہر کی اس شرارت آمیز بے ہودگی پر خفگی کا اظہار بھی کررہی تھی اور شرم سے لال بھی ہورہی تھی۔ وہ بہت جلد ماں بننے والی تھی۔ اسٹور کا مالک جھینپ کر اپنی مسکراہٹ کو دبانے لگا۔

میں نے کہا "میں ایکسٹرا چارجز دوں گا اور لے جانے والے کو معقول انعام بھی۔ لیکن یہ بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تحفہ میری طرف سے ہے۔ اس سسپنس میں SURPRISE ہے وہی تحفے کی قیمت ہے۔"

"میں سمجھ گیا سر" وہ بولا "ایکسٹرا چارجز اور انعام کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کا آنا ہی ہمارے لیے عزت افزائی کی بات ہے۔ میں اپنے خاص آدمی کو اپنی گاڑی میں بھیج دوں گا۔"

باہر آکے مجھے احساس ہوا کہ نادانستگی میں مجھ سے ایک بھول ہوگئی ہے۔ مجھے خود نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں رئیس کو بھیج دیتا تو افشائے راز کا کوئی خطرہ ہی نہ ہوتا۔ اب یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ گفٹ پہنچانے والا کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی طرف سے رازداری کا پورا خیال رکھے اور تحفہ صرف دلہن یا دولھا کے ہاتھ میں دے اور پوچھنے پر کان میں بتادے کہ شاہ عالم صاحب خود تشریف لائے تھے۔

میں نے ہاتھ سے رئیس کو اشارہ کیا اور خود پلٹ کے اسٹور میں پہنچا "وہ۔ میرا خیال کچھ بدل گیا ہے۔"

اسٹور کے منیجر کا چہرہ اتر گیا "آپ آرڈر کینسل کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ تحفہ میں خود ہی لے جاؤں گا۔ آپ پیکنگ کرا کے مجھے دے دیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی سر!" وہ بولا "آپ تشریف رکھیں۔ میں گفٹ کی اسپیشل پیکنگ کرا رہا ہوں۔ دس منٹ لگیں گے۔"

تشریف رکھنا زیادہ ضروری نہیں تھا مگر اس شریف آدمی نے مزید مہمان نوازی کا ثبوت یوں دیا کہ ایک ٹھنڈی بوتل بھی میرے ہاتھ میں تھمادی کہ میں انتظار کے دوران میں اس سے شوق فرماؤں۔

معلوم نہیں رئیس نے میرے اشارے کا کیا مطلب لیا تھا۔ وہ اب نیچے اتر کے ہر ٹائر کو ٹھوک مار رہا تھا۔ غالباً یہ دیکھنے کے لیے کہ کسی میں ہوا تو کم نہیں ہے حالانکہ دور سے مجھے سب ٹھیک ہی لگ رہے تھے۔ چونکہ ایک بات ہوئی تھی اس لیے موت میں بوتل قبول کرنا میری دوسری غلطی بن گیا۔ اس سے میرا دھیان تھوڑی دیر کے لیے رئیس کی طرف سے ہٹ گیا۔

میں نے پھر دکان کے بڑے بڑے شیشوں سے باہر دیکھا تو مجھے صرف گاڑی نظر آئی۔ رئیس نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اچانک میں نے اسی موٹر سائیکل والے کو دیکھا جو "عمومی بے بی" کی درخواست اپنی پشت پر لیے پھر رہا تھا۔ میں ایک دم اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"آپ کا پیکٹ سر!" پیچھے سے اسٹور کے منیجر نے کہا۔

میں رک کے واپس ہوا "تھینک یو!" میں نے بوتل کاؤنٹر پر رکھی جو ابھی آدھی سے کم خالی ہوئی تھی اور پیکٹ لے لیا۔ اسے اتنی خوب صورتی سے اتنے کم وقت میں پیک کرنا یقیناً قابلِ تعریف بات تھی لیکن اس وقت مجھے اتنی

فرصت نہیں تھی کہ میں اور کچھ کہتا۔ میں نے پھر دیکھا تو چند سیکنڈ کے لیے باہر کا منظر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ خواتین اور بچوں کا ایک غول اندر آرہا تھا اور دوسرا قافلہ خریداری سے فارغ ہوکے باہر جارہا تھا۔ عین دروازے کے سامنے ان کی ملاقات ہوئی اور رانموں نے حیرت اور خوشی کی غیر ضروری چیخوں کے ساتھ ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور "ارے تم یہاں؟" کہتے ہوئے دو خواتین نے گلے ملنا بھی ضروری سمجھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کی ملاقات میدانِ حشر میں بھی نہیں ہوئی اور وہ ایک دوسرے کو جہنم میں دیکھ کر سخت حیران پریشان ہیں۔ خواہ دل میں یہی سوچ رہی ہوں کہ اسے تو یہاں آنا ہی تھا۔

میں بڑی معذرت اور تھوڑی بہت بدتمیزی کے ساتھ اس ہجوم سے گزر کے باہر پہنچا تو "عمومی بے بی" غائب تھا۔ گاڑی کے چاروں ٹائر بیٹھ چکے تھے اور رئیس کمر پر ہاتھ رکھے ہکا بکا اور بہت غصے میں کھڑا ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

رئیس نے برہمی سے کہا "فلاں کی فلاں کا فلاں ہوا۔ اتنی دیر کی تو نے۔"

"کتنی دیر کی؟" میں نے گھڑی دیکھی "دس منٹ میں واپس آگیا ہوں میں مگر تو کہاں گیا تھا؟ میں نے کہا تھا کہیں جانا نہیں۔"

"تو میں کیا ولایت چلا گیا تھا۔ سامنے دکان سے ایک پان لیا" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا "ایک منٹ میں واپس آگیا۔"

میں نے کہا "اور اسی ایک منٹ میں وہ آیا تھا۔ لومی بے بی۔"

رئیس اچھل پڑا "اچھا؟ تو نے دیکھا تھا اسے؟ مگر یار' یہ کام اس کا نہیں ہوسکتا۔"

رئیس نے اپنے بند ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ اس میں چار ننھے منے چمکیلے تیر نظر آرہے تھے۔ سوئی سے ذرا موٹے۔ دو انچ لمبی کیل جیسے۔ تیر دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا "رئیس۔ یہ تو۔"

رئیس نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں' میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ حرامی ہے کہاں۔ نظر آجائے تو یہی تیر اس کی۔۔۔ میں مار کے بتاؤں کہ حرامی پن کیا ہوتا ہے۔"

جس جگہ کا اس نے نام لیا تھا اسے شرفا کی زبان میں تشریف کہتے ہیں۔

میں نے کہا "اس کا تو اتنے عرصے سے کچھ پتا نہیں۔ یہ مذاق کیا ہے اس نے ہمیں دیکھ کر۔"

"ہاں۔ مذاق کی کوئی بات نہیں لیکن بوبی نے کسی کے کہنے سے پنگا لیا ہے استادوں سے تو اس سالے کی خیر نہیں۔"

میں نے سوچ کے کہا "وہ۔ لومی بے بی۔ محبوب تو نہیں ہوسکتا۔"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "بوبی جانتے بوجھتے ہمارے ساتھ ایسا نہیں کرسکتا۔ دیکھا ضرور ہوگا اس نے مجھے۔"

میں نے کہا "ابے چھوڑ یہ باتیں۔ اسے بھی پیسہ دیا ہوگا کسی نے۔ بوبی یاری کو دیکھے گا تو پیسہ دینے والوں کو کیا جواب دے گا؟ تم سب سالے کون سے شریفانہ کام کرتے تھے۔ جو کچھ تو کرتا رہا' خدا بخش مندرال کے لیے اگر وہی بوبی کررہا ہے تو حیرانی کیسی۔"

"بوبی کے سوا ایسے تیر سے کوئی کام نہیں کرسکتا" رئیس نے افسردگی سے کہا۔ اسے ایک جذباتی صدمہ ہوا تھا کہ دوست کہلانے والے بوبی نے دشمنوں کا ساتھ دینا قبول کیا "مگر صرف پیسے کی خاطر۔"

"رئیس خان۔۔۔ سب تیری طرح یا میری طرح نہیں ہوتے۔"

"ابے یار اسے ضرورت تھی تو اپنے پاس آجاتا۔ پیسہ سالا اپنے لیے ہاتھ کا میل ہے۔"

میں نے کہا "بیٹا' اس بات کو کب تک روئیں گے یہاں کھڑے کھڑے' دیر ہورہی ہے۔"

رئیس نے پھر ایک نظر چاروں طرف دیکھا مگر وہاں سیکڑوں لوگ تھے اور ان گنت کاریں کھڑی تھیں۔ موٹر سائیکل سوار کو میں نے اتفاق سے ایک لمحے میں دیکھ لیا تھا۔ ہمارا تعاقب کرنے والی ہائی روف اگر آس پاس کہیں موجود تھی تو اسے تلاش کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم سفید رنگ کی ہر سوزوکی ہائی روف کا نمبر پڑھیں۔

"اب تو ٹیکسی لینی پڑے گی پیارے۔" رئیس نے کہا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے سیٹ کے نیچے ہاتھ مارا پھر اس نے زور سے کہا "ابے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟ لے گیا کلاشنکوف بھی کوئی۔"

رئیس سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کی صورت پر اب حیرانی اور پریشانی سے زیادہ خوف اور دہشت کے جذبات غالب تھے۔

میں نے کہا "اور جاپان کھانے۔"

"مگر یار' وہ موٹر سائیکل والا لونڈا۔ اسے کیا معلوم کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ایک کلاشنکوف چھپا رکھی ہے۔ پچھلی سیٹ کے نیچے اور ایک منٹ میں۔۔۔"

میں نے بھنّا کے کہا "ایک منٹ نہیں' کم سے کم پانچ منٹ لگے ہوں گے تجھے پان کی دکان تک جانے آنے میں۔"

میں نے اپنی طرف آنے والی ایک ٹیکسی کو روک لیا "اب اپنی گاڑی کو چھوڑ یہیں۔ ٹیکسی میں چلتے ہیں اور سن' ہم میں سے ایک آگے بیٹھے گا اور دوسرا پیچھے۔ اب ہم رسک نہیں لے سکتے۔ ریوالور ہاتھ میں رکھنا۔"

مگر ہونے والی بات کو ہونا تھا چنانچہ میں نے تیسری غلطی کی اور ٹیکسی میں آگے بیٹھ گیا۔ اگر رئیس بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ جاتا تو۔۔۔ لیکن اسی ایک لفظ "اگر" نے دنیا کی تاریخ کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔

رئیس نے صرف اتنی دیر لگائی کہ اپنی گاڑی کے شیشے بند کرنے لگا تاکہ گاڑی کو لاک کر سکے۔ اسے غلطی بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کوئی بھی اپنی گاڑی کو ایسے کھلا چھوڑ کے نہیں جاتا۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے ڈرائیور کی صورت کو بھی غور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ اجنبی صورت والا مظلوم سا شخص تھا اور اس کی ساری توجہ بھی بظاہر رئیس کی طرف ہی تھی۔

میرے بیٹھنے کے بعد دس سیکنڈ کے اندر پیچھے کے دروازے کھول کے دو افراد پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور ابھی انہوں نے دروازے بند بھی نہیں کیے تھے کہ ڈرائیور نے ایک دم گاڑی آگے بڑھا دی۔ بے اختیار میرا ہاتھ دروازہ کھولنے والے ہینڈل کی طرف گیا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا پھر پیچھے سے کسی نے غرّا کے مجھے حکم دیا کہ میں حرکت نہ کروں۔ میں ڈرائیور کو ہاتھ مار کے بیک آؤٹ کر دیتا لیکن اس دباؤ نے جو میری گردن کی پشت پہ محسوس کیا جا سکتا تھا' میرے غصے اور جوش کو ایک دم ٹھنڈا کر دیا۔ میرا ہاتھ اٹھا اور ساکت ہو گیا۔

"پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔" مجھے دوسرا حکم ملا "تم ہمیں نہیں جانتے شاہ جی۔"

"لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے" دوسرا ہکلا کے بولا۔

میں نے سکون کا گہرا لمبا سانس لیا اور خان اعظم کی تربیت کے اصولوں کے مطابق اپنے خیالات کے آتش فشاں کو سرد کیا۔ جب ریوالور کی گولی اور کھوپڑی میں محفوظ دماغ کے درمیان صرف اتنا ہی فاصلہ ہو جتنی ہڈی کی موٹائی تو پھر مارشل آرٹ بھی کام نہیں آتا۔ خود کار ریوالور میری جیب میں ہونے کے باوجود میری دسترس سے بہت دور ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ رئیس کچھ کرے گا۔ وہ مجھے ٹیکسی میں اکیلا جاتا دیکھے گا تو سمجھ جائے گا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اسے فوراً دوسری ٹیکسی نہ نظر آئے تب بھی وہ فائر کر کے اس ٹیکسی کے ٹائر پھاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا لیکن وہ شاید شیشے بند کر کے گاڑی لاک کرنے میں مصروف رہا اور پریشانی میں یہ خیال اسے آیا ہی نہیں کہ ٹیکسی میں بروقت نمودار ہونے والے بھی دشمن ہی ہوں گے۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا' ایک طے شدہ پلان کے مطابق کیا تھا اور وہ اس لیے کامیاب رہے تھے کہ انہوں نے گڑبڑ کے سارے امکانات پر بھی غور کر لیا تھا۔

اب یہ سوچنا بھی لاحاصل تھا کہ اگر رئیس میرے ساتھ ہی پیچھے بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے کیسے روکتے۔ میں نے رئیس کا تصور کیا جس نے پلٹ کے دیکھا ہو گا تو ٹیکسی کو غائب پا کے اس کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ چند سیکنڈ کا فرق بعض اوقات زندگی اور موت کے درمیان اس فصیل کی طرح حائل ہو جاتا ہے جسے عبور نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے ٹیکسی میں اپنے ساتھ لے جانے والے جتنے پُرسکون تھے' اس سے ان کے اعتماد کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ پروفیشنل لوگ تھے جو ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کا تجربہ رکھتے تھے اور کسی مشن کی تکمیل کی ذمّے داری قبول کرنے سے پہلے تمام ممکنات اور مشکلات کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر منصوبہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس خطرناک آتشیں اسلحہ تھا اور وہ عملی طور پر بھی آسانی سے غالب آنے کی پوزیشن میں تھے چنانچہ ان سے لڑ بھڑ کے زندہ سلامت فرار ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا' یہ بات وہ خود بھی جانتے تھے۔

ٹیکسی ایک فرلانگ تک سیدھی گئی پھر ڈرائیور نے اسے جی پی او سے الٹے ہاتھ کی طرف موڑ لیا۔ ٹریفک یہاں بھی کم نہیں تھا۔ میں نے ایک پولیس سارجنٹ کو موٹر سائیکل پر اپنے قریب سے گزرتے دیکھا اور نظرانداز کر دیا۔ اگر میں چاہتا تو چلائے بغیر بھی اسے بتا سکتا تھا کہ مجھے اغوا کیا جا رہا ہے تھانے دار جی مگر مجھے معلوم تھا کہ جواب میں تھانے دار کا ردِعمل یہی ہو گا کہ پھر میں کیا کروں۔ جا کے علاقہ تھانے میں رپورٹ لکھوا دو۔ میں ٹریفک کنٹرول میں ہوں۔ وہ علاقہ تھانے دار ہوتا تب بھی پہلے یہ پوچھتا کہ اغوا ہونے والے کام کیوں کرتے ہو بچو اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں اغوا کنندگان سے بچانے کے لیے کچھ کروں تو یہ بتاؤ کہ کچھ کرنے میں میرا کیا فائدہ ہو گا۔ جتنی رقم اغوا کرنے

والے بطور تاوان طلب کریں گے اس سے آدھے میں سودا کرتے ہو مجھ سے؟

ظاہر ہے سربراہ ایسے مذاکرات ناممکن تھے۔ اس کے علاوہ میں بھی اپنی ظاہری حالت سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ نہ میں خوف زدہ ہوں اور نہ پریشان۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اور وہ تجربہ رکھتے ہیں تو میں بھی سیاست اور بدمعاشی کے معاملات میں کوئی طفلِ نو آموز نہیں۔

اپنے اعتماد سے انہیں مرعوب کرنے کے لیے میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "اب یہ بھگتیوں کی توپ ہٹا لو میرے پیچھے سے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت تمہاری دخل اندازی سے میرا پروگرام ڈسٹرب ہوا۔ مجھے کہیں اور جانا تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ ذرا یہ پیکٹ رکھ لو پیچھے سنبھال کے۔"

پیچھے والے کے لیے پیکٹ سنبھالنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس نے یقیناً یہ سمجھا ہو گا کہ میں انہیں باتوں میں لگا کے ایسی پوزیشن پیدا کر رہا ہوں جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ دوسرے شخص نے اپنا ریوالور میری کنپٹی کے قریب کر دیا مگر میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"یہ ایک تحفہ ہے جو مجھے ایک دوست کی شادی میں دینا تھا" میں نے مسکرا کے کہا "تھینک یو۔ ذرا خیال رکھنا' ٹوٹنے والی چیز ہے اس میں۔ ڈرو نہیں' اس میں بم نہیں ہے۔"

"اب موقع ملا تو کل ہی دوں گا یہ تحفہ۔ معذرت کر لوں گا کہ ایک ضروری کام سے جانا پڑا۔" میں نے کہا "بس کام آگے پیچھے ہو گیا جو آج کا کام تھا وہ کل ہو گا اور کل کا آج۔"

پیچھے سے ایک شخص نے پُرتمسخر لہجے میں کہا "یعنی آج ہم نہ لے جاتے تو کل تم خود آ جاتے۔"

"ہاں۔ میں سوچ رہا تھا کہ رابطے کی کوئی صورت نکل آئے" میں نے اسی اطمینان کے ساتھ کہا۔

"یعنی تمہیں معلوم ہے کہ ہم کہاں لے جا رہے ہیں تمہیں؟"

میں نے سوال کرنے والے کو صرف مسکرا کے دیکھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کا سوال احمقانہ ہے اور جواب جاہلاں باشد خموشی۔

دوسرے نے کہا "اور یہ بھی پتا ہے کہ کیوں۔۔۔؟"

میں نے کہا "جب دو بادشاہ ملتے ہیں یا لڑتے ہیں۔۔۔ تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کسی وزیر کی بھی مجال نہیں جو ان سے پوچھے کہ ظلِ الٰہی' آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ تم تو پیدل فوج کے معمولی پیادے ہو۔ بہت نچلی سطح کے ملازم۔ بہت حقیر معاوضے پر کام اور سلام کرنے والے غلام۔ تم معاملات کو سمجھنے کی کوشش مت کرو' یہ تمہارا کام نہیں۔"

ان میں سے ایک نے مشتعل ہو کے کہا "بکواس بند کرو اپنی ورنہ۔۔۔"

میں نے کہا "ورنہ کیا۔۔۔ تم گولی مارو گے مجھے؟ اور تم کیا سمجھتے ہو' میں اس دھمکی سے ڈر جاؤں گا۔ تم مجھے انگلی تک لگا سکتے ہو مجھے کچھ ہوا تو تمہارے آقا تمہاری کھال کھینچ کے اس میں بھس بھروا دیں گے۔ تم صرف اشارے پر دُم ہلانے والے کتے ہو۔ خود میں نے بھی ایسے بہت سے کتے پال رکھے ہیں۔ یہ بڑے لوگوں کے شوق ہیں۔ کچھ کتے وہ حفاظت کے لیے پالتے ہیں' کچھ شکار کے لیے اور کچھ دل بہلانے کے لیے جو ان کے اشاروں پر مداری کے بندر کی طرح کرتب دکھائیں مگر رہتے وہ کتے ہی ہیں۔"

میں نے جو کہا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ میں نے انہیں صرف ان کی اوقات یاد دلائی تھی مگر انہوں نے ایسی ذلت محسوس کی جیسے میں نے ان کو سربازار ننگا کر دیا ہے اور شاندار کپڑوں کے نیچے سے نمودار ہونے والا ان کا برص کے داغوں والا مکروہ جسم سب کی نفرت کا نشانہ بن گیا ہے۔

میں پیچھے والوں کے چہرے اور ردِعمل کو نہیں دیکھ سکتا تھا چنانچہ میں نے کن انکھیوں سے ڈرائیور کی صورت پر اشتعال کی وحشت کو غالب آتے دیکھا۔ میرا مقصد اور مدعا بھی یہی تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے پانسا پھینکا تھا۔ مشتعل ہو کے پیچھے والا گولی بھی چلا سکتا تھا اور میرے سر پر ریوالور کا بٹ بھی مار سکتا تھا مگر ایک تو وہ ذہنی طور پر احساسِ کمتری کا شکار ہو کے مجھ سے مرعوب ہو گئے تھے۔ دوسرے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے مالکوں کے احکامات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی حدود سے تجاوز کریں اور مجھے اس اشتعال انگیزی کی سزا دے سکیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ میں کون ہوں اور مجھے بلوانے والوں نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا ہو گا کہ مجھے بحفاظت لانا ہے۔ زندہ سلامت لانا ہے۔

اس کے باوجود غصے میں جاہل اور جرائم پیشہ آدمی سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنی تھوڑی بہت عقل پر کنٹرول سے محروم ہو جائے اور گولی چلا دے۔ خواہ بعد میں اس جرم کی سزا میں اسے بھی گولی مار دی جائے۔ تاہم پانسا میرے حق میں رہا۔ پیچھے والوں نے صرف مغلظات کا دریا بہایا مگر ڈرائیور نے گاڑی چلاتے چلاتے اپنا الٹا ہاتھ میرے منہ پر مارنے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور آگے جھک کر خود کو بچانے کے بجائے میں اپنے دائیں جانب اس کے کندھے کی طرف ہوگیا۔ میرا سر اس کی سیٹ اور اس کے پھیلے ہوئے بازو کی کلائی کے درمیان آگیا۔ اسے کہنی پر جھٹکا لگا اور اس سے پہلے کہ وہ پھر اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کرتا' ایک سیکنڈ کے دسویں یا سویں حصے میں میرا پاؤں اس کے پاؤں کو ٹھوکر مار کے بریک پر جم گیا۔

گاڑی کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور اسٹیئرنگ گھوم گیا پھر گاڑی کے اگلے دونوں پہیے فٹ پاتھ سے ٹکرائے مگر اس سے پہلے ہی میں پیچھے کی طرف قلابازی لگا چکا تھا۔

پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد بھی جھٹکے سے آگے گئے تھے۔ میں ان کے اوپر گرا۔ ڈرائیور کا سر دوسری بار ڈیش بورڈ سے ٹکرایا مگر وہ جاندار آدمی تھا۔ ٹیکسی جب اونچی فٹ پاتھ سے ٹکرا کے تھوڑا سا پیچھے آئی تو اس نے دوبارہ اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ٹیکسی کو موڑ کر پھر فٹ پاتھ کے اونچے کنارے کی رگڑ سے بچالیا۔

پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں بدمعاش کسی حادثے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ریوالور لیے بیٹھے ہیں تو ان کے لیے فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔ میں بھی انہیں تھوڑا سا ایزی کررہا تھا۔ یہ وہ کیسے تصور کرسکتے تھے کہ میں آگے سے پلٹ کر ان کے اوپر آگروں گا۔

ڈرائیور نے اپنی ساری مہارت محنت اور توجہ ٹیکسی کو رواں رکھنے میں صرف کردی تھی۔ اگر گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ جاتی تو دو چار بندے ضرور زخمی ہوجاتے یا شاید کوئی بجلی کا یا ٹیلی فون کا کھمبا راہ میں حائل ہوتا تو ٹیکسی کا اگلا حصہ ریڈی ایٹر سمیت SMASH ہوکے انجن میں گھس جاتا۔ ہوا بھرے ٹائروں کے فٹ پاتھ سے ٹکرانے کا نتیجہ REBOUND کی صورت میں نکلا۔ رفتار کم نہ ہوتی تو اگلے حصے کا سسپنشن تباہ ہوجاتا مگر یہ سب نہیں ہوا۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے تو بھاگ کے اِدھر اُدھر ہوگئے تھے اور ٹیکسی والے کو گالیاں دینے کے علاوہ احتجاجی انداز میں چیخ پکار کررہے تھے کہ پکڑو' اس کھوتے دے کھرنوں۔ شراب پی کے گاڑی لے آیا ہے مال پر اور اب بھاگ رہا ہے۔

لیکن ڈرائیور بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور کسی نے اس کا تعاقب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پیچھے مجھے صورتِ حال پر قابو پانے میں بھی دیر نہیں لگی۔ ایک کے سر پر میرا گھٹنا لگا تھا اور اس کا سر درمیان کے اس اونچے ہوئے فولادی حصے سے ٹکرا گیا تھا جس کے نیچے شافٹ گھومتا ہے۔ دوسرے کی گردن پر میں نے کہنی ماری تو وہ گدی سے ذرا نیچے لگ گئی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی قضا آگئی تھی۔ میرا ارادہ ہرگز اس کی جان لینے کا نہیں تھا۔ گدی پر کہنی لگنے سے شاید وہ چکرا جاتا یا ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہوجاتا مگر گردن پر یہی ضرب مہلک ثابت ہوگئی۔ اس کا کوئی مہرہ ٹوٹ گیا اور وہ ایک دم پھڑک کر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کا ریوالور ہاتھ میں آتے ہی میں نے ڈرائیور کے گال پر وار کیا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے اور گاڑی روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ چوٹ اس کی ناک پر لگی۔

وہ بلبلایا "ہائے اوئے میری ناک۔"

میں نے کہا "ناک ابھی تو وہیں ہے جہاں تھی لیکن تم نے گاڑی روکی تو ناک اکھاڑ کے پیچھے لگادوں گا۔"

وہ منمنانے لگا "اچھا جی۔ اچھا جی' جو حکم۔"

جس کا سر فرش پر لگا تھا وہ سر اٹھا کے ڈرائیور کو حکم دینے لگا "اوئے حرامی' ٹھاہ کرکے گولی ماردیں۔"

میں نے بال پکڑے اور اس کا سر ٹھاہ سے فرش پر مارا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ مردے کی طرح بے جان ہوگیا۔ وہ زندہ تھا مگر میں نے افسوس زدہ آواز نکال کے کہا۔ "تت۔ تت تت۔ یہ بھی مرگیا۔"

ڈرائیور کی گھگی بندھ گئی "اوجی۔ مینوں نہ مارو۔"

میں نے کہا "میں تم کو ایک چانس دے سکتا ہوں۔"

اس نے ناک میں گنگنا کے کہا "چانس سے کیا ہوگا۔ آپ چھوڑو گے تو وہ مجھے فوت کردیں گے۔"

میں نے پہلے شخص کی جامہ تلاشی لی جو اپنا سر اگلی سیٹ میں پھنسائے الٹا پڑا تھا۔ اس کی جیب میں ایک ریوالور کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے میں نے باہر اچھال دیا۔ پھر میں نے دوسرے کی جیبوں میں دیکھا مگر اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے ناک کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرے۔ اس نے گاڑی میں رکھی ہوئی پانی کی بوتل انڈیل کر ایک کپڑا بھگویا اور اپنی ناک صاف کی۔ "خون ایسے بند نہیں ہوگا۔ اگر ٹھنڈا پانی یا برف مل جاتی۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "بہت ٹھنڈی سیون اپ کی بوتل سے بھی کام چل جائے گا۔"

اس نے میری بات کا مطلب وہ لیا جو نہیں تھا۔ چند منٹ کے بعد خون بہنا بند ہوگیا تو میں نے کہا "کیا یہ ٹیکسی تمہاری ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے نفی میں سرہلایا "چھینی تھی ہم نے۔"

"گاڑی میں اس کے کاغذات ہوں گے' نکالو۔"

اس نے گلوز کمپارٹمنٹ میں دیکھا اور کاغذات مجھے پیش کردیے۔ وہ غالباً بچ ہی کہہ رہا تھا۔ اس میں سے برآمد ہونے والے روٹ پرمٹ اور ڈرائیونگ لائسنس پر ایک ہی نام تھا مگر تصویر کسی دوسرے ڈرائیور کی تھی۔

میں نے کہا "کیا پروگرام تھا تمہارا؟ مجھے کہاں لے جانا چاہتے تھے تم لوگ؟"

اس نے مجھے گلبرگ تھری کا ایک پتا بتایا۔

"کون رہتا ہے وہاں؟" میں نے پوچھا "خادم یا عثمان؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "کوئی بھی نہیں۔۔۔ لیکن وہ بھی نظر آتے ہیں وہاں۔ کبھی کبھی۔"

"اور تم روز جاتے ہو؟"

"نہیں جی۔ کام ہو تو جاتے ہیں" وہ بولا "جب بلایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اور کون لوگ آتے ہیں؟"

"میں۔۔۔ سب کو نہیں جانتا" اس نے کہا "اندر کیا ہوتا ہے' مجھے نہیں معلوم۔۔۔ میرا کام باہر کا ہے۔"

"یہ اندر کے آدمی ہیں۔۔۔ بلکہ تھے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "ہاں جی۔۔۔!"

"ان کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

اس نے سرہلایا "بس یہی۔۔۔ کہ ایک کا نام سردار حسین تھا۔۔۔ دوسرا راشد علی اور میں کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے گھڑی دیکھی "اچھا۔۔۔ تم کتنا جھوٹ بول رہے ہو اور کتنا سچ' اس کا پتا چل جائے گا۔ تم کو کس کام کے لیے بلایا جاتا ہے؟"

وہ سخت گھبرایا ہوا تھا "ایسے ہی۔۔۔ اکثر ڈرائیونگ کرتا ہوں میں۔ ٹرک بھی چلا سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں نہیں بتا سکتا۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ مار ڈالیں گے مجھے۔"

"نہیں بتاؤ گے تو میں مار ڈالوں گا" میں نے کہا۔

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ کانپنے لگا "آپ کو اللہ رسول کا واسطہ!"

میں نے پیچھے سے اس کے ایک ہاتھ مارا تو اس کا سر اسٹیئرنگ وہیل سے ٹکرایا "ایسے معاملات میں اللہ رسول کا نام لینا بھی گناہ ہے اور اتنا ڈرتے ہو تو ایسے کام کیوں کرتے ہو؟"

"دیکھو جی۔۔۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میرے۔"

"سب کے بچے چھوٹے ہی ہوتے ہیں اور جسے ان کا خیال ہو وہ غلط قسم کے دھندوں میں نہیں پڑتا ورنہ وہ بڑے ہونے سے پہلے ہی یتیم ہوجاتے ہیں پھر ان کی پرورش ہوتی ہے یتیم خانوں' فٹ پاتھوں اور گیراجوں میں۔ گالیاں کھاتے اور ذلت اٹھاتے۔ بڑے ہو کے وہ بھی تم جیسے ہوجاتے ہیں۔ ان کی مائیں رواجی مائیں نہیں ہوتیں جو چکی پیس کے اور کپڑے سی کر انہیں پالتی تھیں۔ وہ خود کو بیچتی ہیں جب تک جسم کی قیمت ملے۔"

"دیکھو جی' میں سچ بتا رہا ہوں آپ کو۔ میں کوئی غلط کام نہیں کرتا تھا۔ صرف تین مہینے پہلے لیکن اب مجبور ہوں۔ میں ان کو انکار نہیں کرسکتا۔ میں اور کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ بڑے ڈاڈے لوگ ہیں۔ پولیس کی مدد سے وہ مجھے جیل بھی بھجوا سکتے ہیں۔ پھانسی بھی چڑھا سکتے ہیں۔۔۔ آپ مجھے جانے دو۔ میں بھاگ جاؤں گا یہاں سے۔ اس شہر کو چھوڑ کے کراچی چلا جاؤں گا۔"

میں نے کہا "کیا کراچی میں تم محفوظ ہوجاؤ گے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسو صاف کیے "پتا نہیں۔ جو نصیب میں لکھا ہوگا وہی ہوگا۔ کبھی سوچتا ہوں کسی چھوٹے سے قصبے یا گاؤں میں جا کے آباد ہوجاؤں۔"

میں نے کہا "اچھا چلو۔"

وہ چونکا "کہاں چلوں جی۔"

"وہیں جہاں تمہیں جانا تھا" میں نے کہا "زندہ رہنا چاہتے ہو اپنے بیوی بچوں کے لیے تو وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ تمہیں بھی مار کے یہ ٹیکسی یہیں چھوڑ جاؤں گا۔" میں نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا "ورنہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں ناک آؤٹ کرکے چھوڑ جاؤں گا ان کے دروازے پر۔ وہ خود سمجھ جائیں گے ساری باتیں۔ جب ہوش آئے تو ان کو سچ بتا دینا کہ کیا ہوا تھا۔"

اس نے آہستہ سے سرہلایا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا۔ فی الحال مجھے اس کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف وہ جگہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں مجھے لے جایا جا رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی تھی اور اب یہ ناممکن تھا کہ میں پہلے واپس جا کے رئیس کو تلاش کروں۔ یہ بعید از قیاس تھا کہ وہ ابھی تک وہیں حیران پریشان کھڑا ہوا یا تو وہ اپنے رئیس خانے لوٹ گیا ہوگا یا شادی میں شرکت کے لیے پہنچ جائے گا۔ اس امید پر کہ شاید میں بھی وہاں مل جاؤں۔ میں اتنی آسانی سے اغوا ہونے والا بندہ نہیں تھا۔

میں نے ڈرائیور سے کہا "ٹیکسی کو ایسے چلاؤ جیسے

تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے کیونکہ تم ان کا حصہ دیے بغیر انہیں چکما دے کر نکل جانا چاہتے ہو۔"

رفتار پہلے بھی کم نہ تھی مگر میری بات کا مطلب سمجھ کے اس نے پیڈل دبا دیا اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اس پر نظر رکھتے ہوئے حادثاتی موت کا شکار ہونے والے کی تلاشی لی مگر اس کے پاس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی۔ دوسرے شخص کی جیب میں بھی بے کار چیزیں تھیں۔ سگریٹ اور لائٹر۔ کچھ نقد رقم۔ ریوالور اس کے پاس بھی تھا جسے میں نے خالی کرکے پیچھے ڈال دیا۔

گلبرگ تھری کے شروع ہوتے ہی ایک ذیلی سڑک پر ڈرائیور نے مجھے دور سے وہ کوٹھی دکھا دی۔ سڑک خالی تھی اور اس کوٹھی تک جاتے ہوئے ٹیکسی کو صرف ایک گاڑی نے اوورٹیک کیا۔ وہ اتنی شاندار کار تھی کہ اس کے مالک نے ٹیکسی کی طرف حقارت سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

کوٹھی کے قریب پہنچ کے میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ رفتار کم کرلے۔ بند گیٹ سے اندر کچھ بھی نظر نہیں آسکتا تھا۔ اس کی گیٹ لائٹس بھی آف تھیں لیکن باہر لٹکا ہوا "کتے سے ہوشیار" کا بورڈ صاف پڑھا جاسکتا تھا۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا اور ایک دروازے کو آہستہ سے کھول کے اس شخص کو باہر لڑھکا دیا جو دنیاوی معاملات کے اور دنیا والوں کے سلوک سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ باہر گرنے کے بعد اس کی ٹوٹی ہوئی گردن زیادہ مضحکہ خیز انداز میں پیچھے کی طرف مڑ گئی۔

ڈرائیور نے یہ سب بڑی دہشت سے دیکھا پھر میں نے اسے بھی ریوالور کا دستہ مار کے ناک آؤٹ کردیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ یہی ہوگا اور ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں مجھے وہ دہشت نظر آئی تھی جو میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ اگر وہ چیخ مار دیتا تو میرا سارا پلان فیل ہوجاتا۔

ڈرائیور کو بھی خاموشی سے باہر دھکیل کر میں نے اس کی جگہ سنبھالی اور دروازہ بند کرکے ہارن دیا پھر میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور ایکسی لیریٹر کو ایسے دبایا کہ گاڑی اس گھوڑے کی طرح دیوانہ وار بھاگی جس کی دُم سے پٹاخہ باندھ کے چلا دیا گیا ہو۔

میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا اور اندھیرے میں بیک ویو مرر نے بھی میری کوئی مدد نہیں کی مگر مجھے پورا یقین تھا کہ ہارن کی آواز سن کے کوئی باہر ضرور آیا ہوگا اور اس نے فرش پر پڑے ہوئے دو تختے اٹھائے ہوں گے جو میں نے بقلم خود ڈیلیور کیے تھے۔

میرے پاس اب ایک پیس رہ گیا تھا جس کی حفاظت ضروری تھی۔ اس سے مجھے تمام ضروری معلومات حاصل ہونے کی امید تھی۔ رات کے نو بج کے چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ ایک بار پھر میرا ارادہ متزلزل ہوا۔ مجھے برات کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچنا چاہیے یا برات کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہونا چاہیے۔

مجھے معلوم تھا کہ رخصتی خان اعظم کے گھر سے ہوگی مگر برات سے پہلے وہاں پہنچنے میں یہ اندیشہ بہرحال تھا کہ مجھے شاہ عالم کی طرح اجنبی مہمانوں میں بٹھا دیا جائے۔ شاید میرا استقبال کوئی بھی نہ کرے۔ میں خود ہی ڈھیٹ بن کے مہمانوں کے ساتھ جا بیٹھوں۔ کیا برات کے ساتھ آنے میں میری عزت کچھ محفوظ ہوجائے گی؟ نہیں۔ شاہ عالم ہو یا شاہ جی کے ڈیرے کا فقیر۔ جو اجنبی ہوگئے تھے ان کے لیے اہمیت صرف ناصر عظیم کی تھی۔ باقی رہے برات کے ساتھ آنے والے اجنبی تو ان کی عزت یا بے عزتی سے چنداں خان اعظم کو کیا۔ اگر قمر کا بھائی ہوتا تو کیا اسے سوچنا پڑتا کہ اسے کہاں ہونا چاہیے؟

اس سوال کے بعد کچھ اور سوچنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ گنجائش رہی۔ میں نے گاڑی کا رخ اپنے۔۔۔ ناصر عظیم کے۔۔۔ اس گھر کی طرف موڑ دیا جسے وہ چھوڑ چکا تھا کسی کو اپنانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چھوڑ کے اپنانا اس سے کہیں زیادہ مشکل شاید ناممکن ہوتا ہے۔ ندامت اور پچھتاوے کا تاوان ادا کرنے سے بھی دل کے آئینے کا بال کہاں جاتا ہے۔ میں نے تو وہ آئینہ ہی توڑ دیا تھا۔

ایک بار پھر میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہوا۔ کیا ملے گا مجھے وہاں جا کے؟ مزید ذلت' مزید ندامت' مزید اذیت۔ وہ سب ناصر عظیم کو بھول چکے۔ ان کی طرح جو مر گئے اور ماضی کی ایک۔۔۔ یاد رہ گئے مگر یہ بھی ناممکن ہے۔ اگر وہ ایسا ظاہر کریں گے تو وہ جھوٹ ہوگا جو وہ خود پر جبر کرکے بولیں گے۔ اجنبیت کی خاموش نقاب کے نیچے ان کی محبت کا زخم کھاتے ہوئے دل کراہ رہے ہوں گے۔ رو رہے ہوں گے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ گل اپنی ہی خوشبو سے ناآشنائی کا رشتہ رکھے۔ آسمان کے لیے ستارے اجنبی ہوجائیں۔ ساز اپنے ہی نغمے کو اپنا نہ سمجھے۔

زبان لاکھ انکار کرے دل کا اقرار معتبر ہے
اور اگر یوں ہے تو یوں سہی۔ جب میں ناصر عظیم ہوں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چندا کے یا قمر کے اور خان اعظم کے انکار سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ سارے زمانے کے سامنے اعتراف نہ کرنے سے کون سی حقیقت بدلتی ہے؟ کوئی کہتا ہے تو زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین کہتا رہے۔ نہ جانے کب سے میں آج کے دولھا میاں ڈاکٹر کمال فاروقی کو بیانگ دہل سؤر کا بچہ کہہ رہا ہوں اور وہ علی الاعلان مجھے اُلّو کا پٹھا قرار دیتا ہے مگر آج تک کسی نے ہم پر یقین کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ واقعی تم دونوں انسان کے بچے نہیں ہو۔

پس ثابت یہ ہوا کہ خواہ کمال فاروقی کے ساتھ مل کر سارا زمانہ مجھے اُلّو کا پٹھا یا شاہ عالم کہنے لگے' کرسی یا آم کا درخت سمجھنے لگے تو اس سے ایک بنیادی حقیقت نہیں بدلتی کہ میں ناصر عظیم تھا' ہوں اور رہوں گا۔

خان اعظم کا گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ گھر کے سامنے والی سڑک کے دونوں جانب قنات سے روک کے شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی ساری گلیوں میں مہمانوں کی کاریں بھر گئی تھیں۔ شاید خیمے کو سامنے سے کھلا رکھا گیا تھا۔ ادھر سے آری جینڈ کی دل کو گرمانے والی اور لہو کی روانی کو تیز تر کرنے والی موسیقی میں سن سکتا تھا۔ بینڈ پانپر مقبول دھن "فار ہی از اے جولی گڈ فیلو" بجا رہے تھے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ برات آچکی ہے یا پہنچنے والی ہے۔ جولی گڈ فیلو اور کون ہو سکتا تھا دولھا میاں کے سوا۔

ٹیکسی کا صرف ڈرائیور کی سائڈ والا دروازہ اندر سے کھلتا تھا۔ اغوا پیشہ لوگ یہ تکنیک نہ جانے کب سے استعمال کر رہے ہیں کہ گاڑی کے اندر والے سب ہینڈل نکال دیے جاتے ہیں تاکہ مغوی دروازہ کھول کے چلتی گاڑی سے باہر کودنے کی یا شیشہ اتار کے المدد پکارنے کی کوشش بھی کرے تو محض ناکامی اور مایوسی کا سامنا ہو۔ میرے کیس میں ٹیکسی استعمال کر کے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیا گیا تھا۔ کار کا رنگ باؤل میک نظر آتا ہے۔ ٹیکسی انتہائی غیر نمایاں رہتی ہے۔ ایک جیسی وردی والے ویٹرز میں اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے جس نے آپ کو سرو کیا تھا۔ ایک ہی طرح کے کوارٹرز ہوں تو غلط گھر میں داخل ہو جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ٹیکسی کا رنگ ہی اسے غیر اہم کر دیتا ہے۔ ورنہ کار تو وہ بھی ہے۔

میں ٹیکسی کو کھلا چھوڑ کے بھی جا سکتا تھا مگر اس گفٹ کے علاوہ جو میں نے قمر کے لیے لیا تھا' میرے پاس خادم اینڈ عثمان کمپنی کا ایک تحفہ بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے سر کی چوٹ میری توقع سے زیادہ سخت اور بھاری پڑی ہے ورنہ اتنی دیر میں اس کی بے ہوشی ختم ہو جاتی۔ راستے بھر میرے کان پیچھے کی آواز پر تھے۔ آنکھیں سامنے دیکھ رہی تھیں اور تصور کہیں اور تھا لیکن ہوش میں آنے سے پہلے وہ ذرا بھی کراہتا یا غوں غاں کرتا تو میری ساری توجہ فوراً اسی کی طرف ہو جاتی۔ ایسی آوازیں آدمی نیم بے ہوشی سے ہوش کی طرف لوٹتے ہوئے غیر ارادی طور پر نکالتا ہے پھر یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ہوش میں آکے مکر کیے خاموش پڑا رہتا اور پھر اچانک حملہ کر کے مجھے لٹا دیتا۔

وہ بدستور بے ہوش تھا۔ میں نے ٹیکسی کی ڈکی کھول کے دیکھا تو مجھے اس میں رسی مل گئی۔ بہت کم ایسے عقلمند ٹیکسی والے ہوتے ہیں جو ڈکی میں کوئی رسی بھی رکھتے ہوں جس سے باندھ کر وہ کسی خراب گاڑی کو ورکشاپ تک پہنچا دیں یا اپنی ٹیکسی خراب ہو تو کسی گاڑی کے پیچھے باندھ کر لے جائیں۔ یہ ٹیکسی دیگر نیک مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی چنانچہ داشتہ آید بکار کے مصداق رسی میرے کام آگئی۔

میں نے ٹیکسی کو ایک درخت کے سائے میں دو گاڑیوں کے درمیان اس طرح کھڑا کیا کہ ڈکی پیچھے کی طرف رہی۔ ٹیکسی کا رخ سامنے آگیا۔ باقی کاریں ایسے کھڑی کی گئی تھیں کہ انہیں ریورس کر کے ہی نکالا جا سکتا تھا۔

اس بے ہوش شخص کو ٹیکسی کے اندر مضبوطی سے باندھ کر گٹھڑی بنانا مشکل کام تھا۔ مجھے اس کے گلے کا اسپیکر بند کرنے کے لیے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسنا پڑا اور اس کے بعد آخری مرحلہ آیا جب میں نے اسے ڈکی میں بند کر کے لاک کر دیا۔ یہ کام دس منٹ سے کم وقت میں ہو گیا مگر مجھے اچھی خاصی مشقت کرنی پڑی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی نے میری کارروائی کو رک کے نہیں دیکھا اور یہ نہیں پوچھا کہ شاہ جی' میں آپ کی مدد کروں؟ کوئی پولیس مین ادھر سے ٹہلتا ہوا یہ پوچھنے نہیں آیا کہ او بئی! یہ کیا ہو رہا اے۔

اپنا لباس درست کر کے بال سنوار کے اور پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کے میں شامیانے کی طرف گیا تو مجھے یوں لگا جیسے کمزوری سے میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ یہ کمزوری جسمانی نہیں تھی۔ خوف اور تذبذب کے باعث میرا حوصلہ جواب دے رہا تھا۔

ایک راستہ مہمانوں کے لیے وقف تھا۔ میں آگے بڑھا اور رک گیا۔ مجھے اس دوسرے گیٹ کا خیال آیا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ جس کے زنگ خوردہ فولادی ڈھانچے کو زمین کے خودرو پودوں نے جکڑ رکھا تھا اور جس میں لگا ہوا پرانا قفل جام ہو کے کنڈی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اسے نہ کوئی قفل

ساز کھول سکتا تھا اور نہ آسانی سے توڑا جا سکتا تھا۔

خان اعظم کے خان ہاؤس کا ایک ہی گیٹ آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس کے سامنے ان کی پرانی ملٹری ماڈل کی جیپ کھڑی رہتی تھی۔ اگر آج خاص طور پر شادی کی تقریب کے لیے دوسرا گیٹ کھولنا ضروری سمجھا گیا ہو گا تو اس کے نیچے سے اور آگے پیچھے سے بہت سا جھاڑ جھنکاڑ بھی صاف کیا گیا ہو گا اور برسوں دھوپ' بارش اور گرد سے ناکارہ ہو جانے والے قفل کو توڑنے کے بعد بھی گیٹ مشکل سے کھلا ہو گا۔

اگر وہ گیٹ نہیں کھولا گیا ہو گا تو میں ادھر سے بہ آسانی کود کے سیدھا اندر جا سکتا ہوں۔ اس کمرے میں جہاں قمر عروسی جوڑا پہنے اور گھونگھٹ نکالے گٹھڑی بنی بیٹھی ہو گی' وہاں چندا بھی ہو گی۔

لیکن یہ کتنی غیر اخلاقی اور غلط حرکت ہو گی مسٹر شاہ عالم۔ یُو فول! اتنا ہنگامہ کر کے تم نے خود کو شاہ عالم تسلیم کرایا ہے۔ اب تم ناصر عظیم نہیں ہو لیکن بے عزتی ہو گی تمہاری اگر تمہیں اندر دیکھ کے دلہن کی سہیلیوں نے چیخ ماری یا خان اعظم نے تمہیں ناک آؤٹ کر کے باہر پھکوا دیا۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں داخل ہونے کی؟ کون ہو تم؟

بے شک بعد میں سارا زمانہ کہے گا کہ کرنل خان' آپ ان کو نہیں جانتے۔ یہ شاہ عالم صاحب ہیں۔ چیئرمین پی جے ایف۔ پہلے بھی اسمبلی کے ممبر تھے اور اب پھر صوبائی امیدوار ہوں گے۔ کیا یہ نشے میں تھا کہ اندر چلا گیا؟ اس کی عقل ماری گئی تھی کہ ایک ایسے گھر میں گھس گیا جہاں اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔۔۔ از ہی میڈ؟

اور یہ سب آنے والی صبح کے اخبارات کی زینت بنے گا۔ بہت سی نمک مرچ والی چٹپٹی سرخیوں کے ساتھ۔ خیر ایسی خبروں سے اب کیا ڈرنا۔ بہت کچھ شاہ عالم کے بارے میں پہلے ہی چھپ چکا ہے لیکن ایسے بے عزت ہو کے نکالے جانے سے تو بہتر ہے میں خاموشی سے مہمانوں میں بیٹھ جاؤں اور میزبانوں کا موڈ دیکھوں۔ کیا پتا خان اعظم کا دل پسیج جائے۔ فاروقی کی سفارش کام کر جائے اور مجھے قمر سے ملنے کا موقع مل جائے۔

جیسا کہ میرا اندازہ تھا برات وہاں چند منٹ پہلے ہی پہنچی تھی۔ تمام مہمان پہلے پہنچ چکے تھے اور ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ سب ملا کے وہاں دو ڈھائی سو افراد تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ تقریب میں خاص خاص اور قریبی تعلق رکھنے والوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ خان اعظم جو پہلے برات کے استقبال کے لیے دروازے پر موجود ہوں گے اب اسٹیج کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ آج بھی وہ سفید پتلون اور سفید ٹی شرٹ میں ہی تھے اور اپنے گھنے سفید بالوں کے ساتھ نفاست سے تراشی ہوئی سفید داڑھی میں بہت باوقار لگ رہے تھے۔

کمال فاروقی گلے میں صرف ایک ہار ڈالے بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے اس نے مجھے دیکھا مگر اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ رہا۔ اگر میں پرانا ناصر عظیم ہوتا تو وہ خوشی سے کھِل اٹھتا اور خود آگے بڑھ کے مجھے گلے لگاتا اور پھر پوچھتا کہ اُلّو کے پٹھے اتنی دیر سے اجنبی مہمانوں کی طرح کیوں آیا ہے۔

فاروقی کے انداز بے رخی نے میرے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دی۔ میں سمجھ گیا کہ میری پذیرائی کسی بن بلائے مہمان کی طرح ہو گی۔ شاید اس سے بھی بدتر۔ بن بلائے مہمانوں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جن کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ انہیں برداشت کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے مہمان ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں اور بے عزت کر کے نکالے نہ جائیں تب بھی ان کے ساتھ ایسا توہین آمیز جارحانہ اور بے مروتی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ برداشت نہ کرتے ہوئے خود ہی تشریف لے جائیں۔ غالباً میرا شمار انہی دوسری قسم کے مہمانوں میں تھا۔

میں آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک اگلی صفوں سے تین چار افراد اٹھ کھڑے ہوئے۔ خان اعظم نے پلٹ کے مجھے دیکھا اور ان کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اخباری نمائندے اور فوٹوگرافر تھے۔ انہیں دیکھ کے میری ساری امیدوں نے دم توڑ دیا۔ خان جی نے بڑی ہوشیاری سے پیش بندی کی تھی اور میرے لیے ناصر عظیم بن کر شریک ہونے کے سارے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔

دو چار فلش چمکانے کے بعد ایک رپورٹر آگے آیا "شاہ عالم صاحب' یہاں آپ کے سوا کوئی سیاسی شخصیت نظر نہیں آرہی ہے۔"

میں نے کہا "اس میں آپ کی نظر کا قصور نہیں' فکرمند نہ ہوں۔"

دوسرے رپورٹر نے کہا "اس تقریب میں بہت قریبی دوست شامل ہیں۔ آپ کس کے دوست ہیں؟"

میں نے کہا "میں کسی کا بھی دشمن نہیں ہوں۔"

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ آپ کو کس نے مدعو کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں بن بلایا مہمان بھی تو ہو سکتا ہوں۔"

یہ بات میں نے کمال فاروقی کے اور کرنل خان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قریب پہنچ کر اتنی بلند آواز میں کہی تھی کہ وہ بھی سن لیں۔

کرنل خان نے بڑی متانت سے کہا "شاہ جی صحیح فرما رہے ہیں۔ یہ کہیں بھی جائیں' انہیں کون روک سکتا ہے؟"

کچھ لوگ اسے بھی مذاق سمجھ کے ہنسے' میں نے کہا۔ "آپ نے مجھے کارڈ بھیج کے بڑی عزت بخشی کرنل خان۔!"

خان اعظم نے اتنی ہی سنجیدگی سے کہا "مگر میں نے کوئی کارڈ نہیں بھیجا۔"

صورتِ حال کو کمال فاروقی نے سنبھال لیا "شاہ عالم صاحب کو میں نے مدعو کیا تھا۔ تشریف رکھیے شاہ جی!"

کرنل خان نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ انہیں ڈاکٹر کمال فاروقی کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی تھی۔ خان اعظم کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ مجھے باقاعدہ دعوت نامہ ارسال کیا گیا ہے۔ انہوں نے محض ایک اندیشے کو ذہن میں رکھتے ہوئے چند اخبار والوں کو بلا لیا تھا اور شاید دعوت نامہ نہ ملا ہوتا تو وہ بڑی شائستگی سے مجھے بے عزت کر کے رخصت کر دیتے کہ تقریب میں بہت محدود حلقے میں شامل عزیز و اقارب اور دوست احباب شریک ہیں۔ آپ نے بڑی عزت بخشی غریب خانے کو مگر میں معذرت چاہتا ہوں۔ آپ شریک ہوں گے تو بہت سے آپ جیسے لوگوں کو شکایت ہوگی۔ آپ تشریف لے جائیں یہاں سے تو بڑی عنایت۔

اس کے بعد مجھے جانا پڑتا اور میری عزت افزائی کا یہ واقعہ بڑے دلچسپ پیرائے میں اخبارات کے کالم میں آتا۔ بڑے بے آبرو ہو کے ___ آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔ فاروقی کی وجہ سے میری عزت بچ گئی تھی مگر خان جی کے رویے سے مجھے رنج ہوا تھا۔ وہ بڑے وضع دار آدمی تھے اور اپنے دشمن کے ساتھ بھی عداوت میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ مہمان بن کے آیا ہو مگر ایسا لگتا تھا کہ ان سے لاتعلق ہو کے اور شاہ عالم بن کے میں نے ان کے نقطۂ نظر سے ناقابلِ معافی جرم کیا تھا۔ میں نے انہیں سخت مایوس کیا تھا اور ان کی امیدوں کے شیش محل کو چکنا چور کر کے انہیں ایسا دکھ پہنچایا تھا کہ ان کے صبر و ضبط کا حوصلہ بھی جواب دے گیا تھا اور ان کے لیے عفو و درگزر سے کام لینا ممکن نہیں رہا تھا۔

میں ان کے دکھ کی اصل وجہ سمجھتا تھا۔ اگر میں نے خان اعظم کو دھوکا دیا ہوتا' ان کا سب کچھ چھین لیا ہوتا۔ ان کی دولت' جائداد ہتھیالی ہوتی تب بھی وہ اپنا غم کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔ وہ کم ظرف اور کینے' احسان فراموش اور بے ضمیر ناصر عظیم کو معاف کر دیتے اور بھول جاتے۔

لیکن میں نے چندا کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ یہ صدمہ خان جی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چندا انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں آنسو تو کیا چہرے پر اداسی تک نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر باپ کی طرح وہ اس کی طرف سے متفکر تھے۔ خان اعظم عمر کے اس حصے میں تھے جہاں اس دنیا کی ذمّے داریوں کا بوجھ اتار کے آدمی حیاتِ جاودانی کی راہ پر روانگی کے لیے تیاری کرتا ہے۔

چندا اگر ایک عام لڑکی ہوتی تو وہ کب کا اسے رخصت کر چکے ہوتے مگر انہیں انتظار تھا اس کا جو چندا کا ہمسر ہو۔ جو چاندنی کے اجالے میں اپنی محبت کی روشن دھوپ اس طرح پھیلا دے کہ اس کی زندگی کے روز و شب میں تاریکی کہیں نہ رہے۔ وہ جانتے تھے اور مانتے تھے کہ خدا جب جوڑے آسمانوں پر بناتا ہے تو سب کے لیے بناتا ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے چاند کو کسی سورج کی تابانی نہ ملے۔

جب میں دربدر ہوتا پناہ کے لیے ان کے گھر کی دہلیز تک پہنچا تو انہیں معلوم نہ تھا کہ خدا نے ان کے یقین کی لاج رکھ لی ہے۔ انہوں نے مجھے سنبھالا' پالا پوسا' پڑھایا لکھایا' تراش خراش کے ایک سنگِ بے مایہ کو ہیرا بنایا اور میری صلاحیت کو صیقل کیا۔ دن مہینے اور برس گزرتے گئے اور معلوم نہیں کب اور کیسے انہیں احساس ہوا کہ اب وہ چاندنی کی طرف سے بے فکر ہو کے فرشتۂ اجل کا کسی بھی وقت خندہ پیشانی سے خیرمقدم کر سکتے ہیں کہ چلو بھئی' اب میں فارغ ہوں۔

لیکن شاہ عالم نے ان کی امیدوں کے تاج محل کو اچانک ایک خود غرضانہ سفاکی اور محسن کشی' اعلانِ لاتعلقی کا بم گرا کے کھنڈر کر دیا تھا۔ اس صدمے نے انہیں اندر سے بھی توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ اچانک بوڑھے اور بے ہمت ہو گئے تھے۔ خان اعظم نہیں رہے تھے۔ وہ اپنے قاتل کو معاف کر سکتے تھے مگر چندا سے بے وفائی کے مرتکب ہونے والے مجرم کو نہیں۔ انہیں یقین تھا کہ میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور ہے تو غلط ہے۔

جب میں بیٹھ گیا تو صحافیوں نے پھر مجھے گھیرنے کی کوشش کی۔ میں ان کے سوالوں کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ ان کو شادی سے زیادہ دلچسپی خدا بخش مندرال کے قتل کی خبر سے تھی۔

"سر۔ آپ کے خیال میں یہ قتل ایک سیاسی سازش ہے؟ یا ذاتی دشمنی کا شاخسانہ ہے۔"

دوسرے نے کہا "کیا ان حالات کے پس منظر میں جو آپ کی پی ایف جے سے علیحدگی کا سبب بنے۔ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا بخش مندرال کا قتل درحقیقت آپ کو نقصان پہنچانے کی سازش ہے۔"

تیسرا بولا "ملک صاحب سے سیاسی اتحاد کے آغاز سے پہلے ہی انجام ہو گیا۔ کیا ایسی صورت میں۔"

میں نے کہا "پلیز۔۔۔ کم سے کم آدابِ محفل کا تو خیال رکھیے۔ یہ ایک نجی نوعیت کی تقریب ہے جیسے آپ شادی میں آئے ہیں ایسے ہی میں آیا ہوں' یہ کوئی سیاسی میٹنگ یا پریس کانفرنس نہیں ہے۔"

مگر وہ صحافی ہی کیا جو حوصلہ ہار دے۔ کرنل خان کے رویے سے میں پہلے ہی دل برداشتہ اور مایوس تھا۔ جب انہوں نے مزید سوالات کیے تو میں نے زیادہ درشت لہجے میں کہا "آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں؟ یہاں میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ پلیز لیو می الون۔"

"بس ایک سوال۔ اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں۔۔۔۔"

میں نے دہاڑ کے کہا "شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔"

ایک دم سارے مہمان میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے باتوں کا شور تھم گیا پھر کرنل خان نے ایک قدم آگے بڑھا کے کہا "مسٹر شاہ عالم۔ یہ میرا گھر ہے اور آپ میرے مہمانوں کو ایسے بے عزت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ یہ میرے لیے اتنے ہی معزز ہیں جتنے آپ۔"

ان کے لہجے کی بے رحم اجنبیت محسوس کر کے میں نے اپنے آپ کو بہت بے عزت محسوس کیا۔ خان اعظم یہی چاہتے تھے۔ وہ سب کو بتانا چاہتے تھے کہ میں ناصر عظیم نہیں شاہ عالم ہوں جس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر کمال فاروقی کا خیال نہ ہوتا تو وہ بھی دہاڑ کے مجھ سے کہتے کہ گیٹ لاسٹ۔ یہاں بن بلائے مہمان تم ہو۔

ذرا سی دیر کے لیے مجھے پسینہ آ گیا۔ کمال فاروقی اس صورتِ حال میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے التجا کی کہ میں ضبط سے کام لوں اور بدمزگی پیدا نہ کروں۔ اس خوشی کے موقع پر ناصر عظیم کے نہ ہونے سے خان اعظم پہلے ہی کم آزردہ نہ تھے کہ وہ شاہ عالم بن کے ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے آ گیا تھا۔ اعصابی دباؤ کے باعث وہاں سب ہی ناصر عظیم کی غیر موجودگی کو بہت زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ میں نے شاہ عالم کے روپ میں نمودار ہو کے صورتِ حال کو خطرناک حد تک دھماکا خیز کر دیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب میرا وہاں رکنا کسی صورت مناسب نہیں مگر میں نہ بے عزت ہو کے جانا چاہتا تھا اور نہ خان اعظم کو بے عزت کر کے۔

میں نے مسکرا کے کہا "آئی ایم سوری کرنل خان۔ مجھے یہاں اخبار والوں سے اس قسم کے سوالات کی امید نہیں تھی۔ یہ لوگ موقع محل دیکھے بغیر بات کرتے ہیں' خیر ___ آپ کو بیٹی کی شادی مبارک ہو۔"

انہوں نے بے رخی سے کہا "میری ایک ہی بیٹی ہے شاہ صاحب۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ورنہ آپ ایسی بات نہ کہتے۔ آج اس کی شادی نہیں ہے۔"

"اچھا!" میں نے انجان بن کے ان کا وار خالی جانے دیا "مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ رخصتی آپ کر رہے ہیں اپنے گھر سے ___ تو وہ بھی بیٹی سے کم نہیں ہو سکتی۔"

"قمر نام ہے دلہن کا" خان جی نے طنز سے کہا "اس کا دنیا میں کوئی نہیں۔"

میں نروس ہونے لگا کیونکہ خان جی عمداً مجھے اپنی نفرت اور عناد کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ "جی اب چلتا ہوں۔ یہ میری طرف سے دلہن کے لیے تحفہ۔"

خان جی نے بے مہری سے کہا "غالباً کارڈ ملاحظہ نہیں فرمایا جناب نے۔ اس میں صاف لکھا ہوا تھا کہ تحائف قبول نہیں کیے جائیں گے۔"

آہستہ آہستہ میرا احساسِ خجالت خان اعظم کے رویے کے خلاف غصے میں ڈھلنے لگا۔ یہ سب کچھ قمر کے ساتھ صرف اس لیے ہو رہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے اس سے دور اور لاتعلق رکھنا چاہتے تھے۔ یہ ایک انتقامی ردِّعمل تھا جو کمال فاروقی اور قمر کی خوشی کے سارے رنگ خراب کر رہا تھا۔ اگر وہ تھوڑی سی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تو مجھے خاموشی سے ایک موقع فراہم کر دیتے کہ میں قمر سے اکیلے ہی مل کے اسے اپنی نیک تمناؤں اور دعاؤں کا وہ نذرانہ پیش کر سکوں جو ایک بدبخت بھائی کی حیثیت سے میں سب کے سامنے نہیں دے سکتا تھا مگر اچانک خان جی تنگ دل اور کینہ پرور ہو گئے تھے۔ وہ سب کے سامنے مجھ پر غیریت کا لیبل لگا کے' مجھے احساس دلا کے کہ وہ کسی شاہ عالم کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھتے اور میری دوغلی شخصیت سے نفرت کا اظہار کر کے ایک پُرآزار خوشی حاصل کر رہے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس طرح وہ کمال فاروقی' چندا اور قمر کو خوشی نہیں دے رہے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے مجبور سمجھ کے انہیں پھر معاف کردیا۔ شاید چندا کا دکھ کئی گنا ہو کے ان کے اپنے دکھ پر غالب آگیا تھا اور خان اعظم جو سب کے لیے زندگی کا ایک فلسفہ رکھتے تھے کہ خیال کو کنٹرول کرو۔ خود اپنے جذباتی خیالات کے آگے بے بس تھے۔

اس وقت میں نے اپنی خفت کو مہمانوں سے چھپالیا مگر کچھ دیر بعد نکاح شروع ہوا تو صحافی پھر میرے گرد جمع ہوگئے۔

ایک صحافی نے سوال کیا "کیا ڈاکٹر کمال فاروقی آپ کے دوست ہیں؟"

میں نے کہا "وہ ساری دکھی انسانیت کے دوست ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ کا کوئی ذاتی تعلق تھا؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں" میں نے کہا "اس وقت ڈاکٹر کمال فاروقی ایک فری کلینک چلاتے ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ اب وہ ایک رفاہی اسپتال پلان کررہے ہیں۔ یہ ایک CHARITABLE ٹرسٹ ہوگا۔ معلوم نہیں کیوں وہ مجھے اس کا چیئرمین بنانا چاہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ میرا بھی سوشل ورک کا بیک گراؤنڈ رہا ہے۔ سیاست سے پہلے سوشل سروس میرا شوق تھا اور اسی لیے میں نے ان سے وعدہ بھی کرلیا تھا۔"

"کیا اب آپ کا ارادہ بدل گیا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ اور اس کی وجہ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ پہلے شاید میں ان کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا تھا۔ ویسے آج بھی میرے جذبات وہی ہیں اور میری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں لیکن میں یہ اندیشہ محسوس کرتا ہوں کہ کہیں ان کے نیک مقاصد کی راہ میں میرے ذاتی اور سیاسی حریف حائل نہ ہوجائیں۔ خدا بخش مندرال کے قتل کے بعد یہ CRISIS زیادہ سنگین ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر کمال فاروقی کو مبارک باد دینے کے ساتھ ہی ان سے ذاتی طور پر معذرت بھی کرلوں۔ آپ نے دیکھا کرنل خان تو میرے یہاں آنے سے بھی خوش نہیں۔ اتنا ناپسند کرتے ہیں وہ سیاست دانوں کو۔ کہ ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔"

اس وقت ایک صحافی نے بڑا نازک سوال کیا "کہیں اس کی کوئی ذاتی وجہ تو نہیں؟"

میں نے کہا "ذاتی وجہ۔۔۔؟ میرا ان کا کون سا ذاتی رشتہ ہے؟ انہوں نے شاید میرا نام سنا ہو مگر میں تو یہاں آنے سے پہلے صرف ڈاکٹر کمال فاروقی کے نام سے واقف تھا۔ آپ نے سنا ہوگا۔ میں نے غلطی سے کرنل کو مبارک باد دے دی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ڈاکٹر کمال فاروقی کی شادی انہی کی بیٹی سے ہورہی ہے اور ڈاکٹر کمال کو جتنا آپ لوگ جانتے ہیں اتنا ہی میں بھی جانتا ہوں۔"

ایک صحافی نے مذاق کیا "فوج اور سیاست دانوں کا رشتہ سوکنوں جیسا ہے اس ملک میں۔ ان کی کبھی آپس میں نہیں بنتی۔"

میں نے کہا "دراصل کج فہمی سے ساری خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ عام تاثر بالکل غلط ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ ایک سازش ہے۔ نہ سیاست داں ملک کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ فوج اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

"مگر ساری خرابیوں کا ذمے دار تو سیاست دانوں کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھیے، جیسے سب طوائفیں ڈانسر نہیں ہوتیں۔ ایسے ہی سب ڈانسرز طوائفیں نہیں ہوتیں۔ اس کے باوجود رقاصہ، ایکٹریس یا ماڈل کو ہمارا معاشرہ بری نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ بھی ایک معاشرتی منافقت ہے۔ لوگ انہی کے پیچھے لپکتے ہیں۔ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جمع ہوجاتے ہیں لیکن۔۔۔ انہیں اپنی بیوی یا بہو بنانا پسند نہیں کرتے۔ اس رویے میں قصوروار کون ہے؟"

یہ ساری گفتگو آف دی ریکارڈ نہیں تھی۔ اخبار والے پوری کوشش کرتے ہیں کہ ایک لفظ سے سرخی نکال لیں۔ اس کے لیے وہ ہر لفظ کو ریکارڈ بھی کرتے ہیں۔ یہ ایک غیر رسمی گفتگو جو "سنی" پریس کانفرنس بن گئی، میں نے صرف اس تاثر کو دور کرنے کے لیے کی تھی کہ میرا اس فیملی سے کسی بھی فرد سے کوئی ذاتی تعلق ہے۔ میں نے تو ڈاکٹر کمال فاروقی سے بھی اپنے تعلق کو غیر ذاتی قرار دے دیا تھا۔ ان سب کے تحفظ اور سلامتی کے لیے سرِعام یہ وضاحت ضروری تھی۔

بظاہر خان اعظم اسٹیج کے نزدیک تقریبِ نکاح میں شریک تھے مگر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے میری باتیں ایک کان سے ضرور سنی ہوں گی۔ نکاح کے فوراً بعد جب بہت سے لوگ انہیں مبارک باد دینے اور دولھا سے گلے ملنے آگے بڑھے تو میں بھی اسٹیج پر چلا گیا۔

فاروقی سے گلے ملتے ہوئے میں نے اس کے کان میں کہا۔ "اُلو کے پٹھے۔ اگر کبھی تو نے قمر کو دکھی کیا تو تیرے سری پائے الگ کردوں گا۔"

اس نے کہا "سؤر کے بچے۔ وہ تیری بہن تھی اب میری

بیوی، میرے پاؤں کی جوتی۔"

میں نے کہا "ایک تحفہ لایا تھا میں اس کے لیے۔"

اس نے الگ ہو کے کہا "یہاں نہیں۔ گھر بھیج دے۔"

کچھ دیر بعد لوگ ادھر جانے لگے جہاں کھانے کا انتظام تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ حصہ خالی ہوگیا جہاں میں خود اپنے لیے ہی اجنبی تھا کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں میں کس نام سے اور کس حیثیت سے آیا ہوں۔ اگر میں شاہ عالم تھا تو میرا ان سب سے کیا تعلق جو شادی میں دوست یا عزیز بن کے شریک تھے اور میں ناصر عظیم تھا تو شاہ عالم کی زبان کیوں بول رہا تھا۔

کسی نے مجھے مدعو نہیں کیا۔ میں اپنے خوبصورتی سے پیک کیے ہوئے ارمانوں بھرے تحفے کے ساتھ اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ میں نے سخت سبکی محسوس کی۔ رئیس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شاہ عالم کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اچھا ہوتا اگر میں شادی سے ایک ہفتے پہلے یا ایک دن پہلے ہی ناصر عظیم بن کے خان جی کے پاس پہنچ جاتا۔ چندا سے مل لیتا۔ منت سماجت کرکے رو دھو کے انہیں منالیتا کہ وہ مجھے قمر کی شادی تک ناصر عظیم مان لیں۔ ایک ہفتہ نہ سہی صرف ایک دن کے لیے مجھے اپنے ماضی کی گم گشتہ جنت میں رہنے دیں۔

لیکن وہ ماضی کے سب دروازے مجھ پر بند کرچکے تھے اور اب کسی جذبۂ ترحم، شرافت یا انسانیت کے نام پر مجھے ناصر عظیم کی زندگی کا ایک دن مستعار دینے پر بھی تیار نہ تھے۔ وہ مجھے سزا دینے کے فیصلے میں متحد اور متفق تھے۔ تم شاہ عالم سے اقتدار کی سیڑھی چھین کر سیاست کی منزلِ مقصود تک۔ شہرت اور عزت کے عروج تک اور حکومت کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچنا چاہتے تھے۔ صرف محبت اور اخلاص کے رشتے تمہیں کافی نہ تھے۔ ہم تمہارے عزائم کی راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتے وزیرِ اعظم صاحب۔ ہم معمولی لوگ ہیں۔ تمہارے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم اپنے گھر میں خوش ہیں کیونکہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ مسرور اور مطمئن۔

تم اکیلے ہو۔ تمہارا دل محبت کے افلاس پر شرمسار اور دکھی ہے اور تم خالی ہاتھ ہو۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ وہ تم سے بھی بڑا شاہ عالم، فاتحِ عالم تھا۔

تم داماں تہی دست و تہی دل۔ تم اپنی نظر میں بھی اپنی شناخت کھو بیٹھے ہو۔

عالی شان مندر میں اونچے طاق پر رکھا ہوا سونے کا بت اکیلا ہوتا ہے۔

اپنی قبر میں ہر مردہ اکیلا ہے۔

اور شاہ عالم اکیلا ہے کیونکہ وہ جعلی ہے۔

ناصر عظیم کے پاس سب کچھ تھا جو ہمارا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اپنا تھا اور اپنائیت سے محروم نہیں تھا۔ وہ موت کے خوف سے کسی سیکیورٹی ایجنسی کے محافظوں کا محتاج نہیں تھا کیونکہ وہ عام آدمی کی طرح جس کا ایمان کامل اور یقین بے ریا ہو، موت کے بارے میں سوچنا بھی غیر ضروری سمجھتا اور کیونکہ وہ اپنی ہی زندگی جیتا تھا اس لیے جانتا تھا اور مانتا تھا کہ موت جب آنا ہے آئے گی تو کسی اور کی نہیں ہوگی۔

میں ایک دم گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چلا کے کہا۔ "نہیں۔ میں اکیلا بھی نہیں ہوں اور جعلی بھی نہیں ہوں کیونکہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں ناصر عظیم ہوں۔ ہاں، میں ناصر عظیم ہوں۔"

کمال یہ ہوا کہ میرے چلانے پر کوئی بھی متوجہ نہیں ہوا لیکن وہ آواز جو اندر کی آواز تھی، باہر سے سنائی دینے لگی۔ "ہاہاہا، یہاں کوئی ہے تمہیں ناصر عظیم ماننے والا؟ یہاں یا کہیں اور۔"

"مسٹر ناصر عظیم۔ اس عدالتِ عالیہ کی نظر میں تم توہین عدالت کے جرم کا ارتکاب کررہے ہو جو ناقابلِ تردید ثبوت اور شواہد کے پیشِ نظر تم کو شاہ عالم قرار دے چکی ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ یہ غلط ہے۔ میں ناصر عظیم ہوں۔"

"آرڈر، آرڈر" عدالت میں سب ہنسنے لگے تھے۔ وکیل، صحافی، جج اور قریشی "یہ عدالت حکم دیتی ہے کہ مسٹر شاہ عالم کو لاحق ذہنی امراض کا پتا چلانے کے لیے کسی نفسیاتی معالج کے پاس رکھا جائے۔"

میں چلانے لگا "نہیں۔۔۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

ایک دم کسی نے میرا بازو پکڑ لیا "شاہ جی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

میں نے چونک کے دیکھا۔ بیشتر لوگ رخصت ہوگئے تھے۔ باقی رہ جانے والے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

سوائے چندا کے۔ وہ بے داغ سفید لباس اور اپنے ملکوتی حسن کے ساتھ اسٹیج پر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی اور دکھ اس کی آنکھوں میں تڑپ رہا تھا۔

میں ماضی اور حال کے درمیان ایک بے وجود لمحے کی قید میں معلق آدمی اور صرف چندا میرا سارا عذاب جھیل رہی تھی۔

جیسے وہ عورت جس کا شریکِ حیات اچانک تختۂ دار سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غائب ہو کے موت کے اندھے کنوئیں میں اکیلا رہ گیا ہو اور سکون اور نجات کے لیے صدیوں پر محیط ایک لمحے سے ہارنے کے لیے لڑ رہا ہو۔

میں ایک دم بھاگا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

○☆○

میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ رئیس بڑے مزے سے ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ جو شخص اس کے سامنے سے ریڑھی پر سوٹ کیس لیے جا رہا ہے مجھے اس کا پیچھا کرنا ہے لیکن میں وسیم احمد عرف گلزار کی طرف سے بھی فکرمند تھا کہ کہیں وہ خبردار کرنے والے سائرن کی طرح نہ بجنے لگے اور خطرے کی بو پاتے ہی اصل مجرم فرار ہو جائیں۔

گلی کا موڑ دور تھا اور دروازے سے جھانک کر نہ میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ سبزی فروش کی ریڑھی کا ناقہ لیلیٰ کی طرح بے قراری سے انتظار کرنے والا کون ہے اور نہ انسپکٹر محمد نذیر عرف جیرا بلیڈ کی سواری نظر آئی تھی۔

بالآخر مزید انتظار ناممکن ہو گیا۔ میں نے ایک نظر پیچھے دیکھا اور گلی میں چل پڑا۔ سبزی فروش اپنی ریڑھی دھکیلتا مجھ سے پچاس ساٹھ گز آگے جا رہا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ سارا دن کدو کریلے بیچنے کے لیے گلی گلی پھر کے تو اس نے مشکل سے پچاس روپے کمائے ہوں گے مگر اسے جس معمولی سے کام کے دو سو ملے ہیں وہ کتنا جان لیوا ہے۔ وہ بم بارود جیسی چیزوں کو بھی کدو کریلے کی طرح لے جا رہا تھا۔

رئیس سے چار قدم کے فاصلے پر میں نے دانت پیس کے کہا "نواب سراج الدولہ کی اولاد۔ جلدی سے جا کے سنبھال اسے۔"

رئیس صرف مسکرایا "اپنا انسپکٹر نذیر ڈیوٹی پر حاضر ہے۔"

"تو وسیم کو روک کے رکھنا۔" میں نے کہا اور ایک ریوالور اسے پکڑا دیا۔

گلی ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے جیرے بلیڈ کو وردی میں مستعد دیکھ لیا۔ وہ سڑک پر ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے بہت فرض شناس پولیس افسر کھڑے ہوتے ہیں جن کی جیب خالی ہو۔ آتے جاتے لوگ ان کی نظر میں مرغے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو بھی پھانس سکتے ہیں مگر خدا سے دعا کرتے ہیں کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی بھیج دے۔ دس بیس یا... سو پچاس کے بجائے ہزار دو ہزار کی اسامی ہاتھ لگ جائے۔

اس کے قریب ہی وہ بدقسمت ٹیکسی والا بھی تھا جو قانون کے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں آ جانے کے بعد مظلوم صورت بنائے بے بسی سے گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا اور شاید وہ بھی دل میں جیرے بلیڈ کو وہ سب گالیاں دے رہا تھا جو ہر تھانے کی سرکاری زبان کا حصہ ہوتی ہیں۔

سبزی فروش اپنی ریڑھی کے ساتھ مین روڈ...... پر دائیں جانب چلنے لگا۔ مجھے وہاں دوسری کوئی بھی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر میں اس کے پیچھے چلتا جاتا تو کسی نہ کسی کی نظر مجھے تاڑ لیتی جو ابھی میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ اس ان دیکھے شخص کے شکوک رفع کرنے کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا ڈراما کیا۔ جیرے کی طرف دیکھے بغیر میں دروازہ کھول کے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

شاید رئیس نے جیرے بلیڈ کو صورتِ حال اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ میرے اظہارِ لاتعلقی کے جواب میں اس نے کسی حیرانی یا ناراضی کا اظہار نہیں کیا اور مجھ سے دوستانہ مصافحے کے لیے ہاتھ بھی آگے نہیں بڑھایا۔

اب میرا ٹیکسی ڈرائیور سے وہ جھگڑا شروع ہوا جو پبلک کے ساتھ ہر جگہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا "سنت نگر چلو۔"

ٹیکسی ڈرائیور غضبناک ہو گیا "نہیں جانا سنت نگر۔"

"اچھا تو ائرپورٹ چلو۔ جہانگیر بادشاہ کے مقبرے چلو' میرے سسرال چلو۔"

"او یار اتر نیچے۔ نہیں جانا مجھے کہیں بھی" ٹیکسی والا آگ بگولا ہو کے بولا "خالی نہیں ہے ٹیکسی۔"

میں نے کہا "جب تک میں نہیں بیٹھا تھا خالی تھی۔"

ٹیکسی والا نیچے اترا "او جی تھانے دار صاحب۔ یہ کیا بلا چمٹ گئی ہے مجھ سے۔ اس کو باہر نکالو۔ سمجھتا ہی نہیں کہ ٹیکسی آپ نے پکڑ رکھی ہے۔"

جیرے بلیڈ نے ایک اصلی تھانے دارانہ متانت سے اس کو اپنے پاس بلایا اور پھر اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "سڑک پر کھڑے ہو کے شور کرتے ہو کہ میں نے پکڑ رکھی ہے ٹیکسی۔ لاٹھی ہے اندھے کی جو میں نے پکڑ رکھی ہے؟ گوا چی گاں ہے؟"

ٹیکسی والا اس غیر متوقع سلوک پر بھونچکا رہ گیا "او جی۔ مائی باپ' میرا تو مطلب یہ تھا۔"

"چل یہ سو کا نوٹ پکڑ" جیرے نے بڑی ہوشیاری سے اور رعب سے بات کو سنی ان سنی کر دیا "دیکھ سامنے گلی میں ایک دکان ہے سگریٹ کی۔ سیدھے ہاتھ پر۔ اس سے گولڈ لیف کی ڈبی لے آ۔ بتا دینا باہر کہ چاہئیں تھانے دار صاحب

کے لیے۔"

ٹیکسی والے نے اس کا مطلب یہ لیا کہ مسافر پر لعنت بھیجو۔ اس سے میں نمٹتا ہوں۔ اس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا ہو گا کہ تھانے دار نے صرف حکم نہیں دیا۔ وہ فوراً سو کا نوٹ پکڑ کے گلی میں داخل ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کافی آگے صرف ایک پرچون کی دکان ہے اور وہاں امپورٹڈ تو کیا دیسی گولڈ فلیک سگریٹ بھی مشکل سے دستیاب ہوں گے۔

ریڑھی والا کافی آگے نکل گیا تھا مگر ابھی تک نہ کوئی گاڑی اس کے پاس آئی تھی اور نہ کسی نے اس سے سوٹ کیس لینے کی کوشش کی تھی۔ ریڑھی والے نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ اسے بھیجنے والا گلی کے موڑ پر موجود ہے۔ شاید یہ جھوٹ بھی اس نے اپنی مرضی سے نہیں بولا ہو گا۔

ٹیکسی والے کے جاتے ہی جیرا اس کی سیٹ پر آ بیٹھا۔ "او جی خیر ہووے پرائم منسٹر صاحب کی۔ آج پولیس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

میں نے نظر سامنے رکھی۔ "جیرے۔ تجھے رئیس نے سب بتا دیا ہے نا۔"

"آہو۔ بتایا تو تھا۔"

میں نے کہا "وہ آگے ریڑھی والا۔ اس کے پیچھے چل ورنہ وہ نکل گیا تو۔"

جیرا ہنسا اور اس نے گاڑی میں لگی ہوئی چابی گھما دی "نکل کے کدھر جائے گا۔"

جیرے نے ٹیکسی کو آگے بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک ٹرک بڑی تیزی سے آیا اور اس نے ٹیکسی کو زبردست سائڈ ماری۔ ٹیکسی کا دائیں ہاتھ والا حصہ اودھڑ گیا۔ جیرے نے بڑی کوشش کی مگر وہ ٹیکسی کو سنبھال نہ سکا۔ ٹیکسی کے پچھلے حصے نے ٹیکسی کے اگلے حصے کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور ٹیکسی خود بخود اچھل کے بائیں جانب کے فٹ پاتھ پر چڑھی پھر سائڈ پر الٹ گئی۔

چند سیکنڈ کے لیے دہشت سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں جھٹکے سے ٹیکسی کے ساتھ ہی الٹ گیا اور میں اس کے اندر ایسے پھنس گیا جیسے چوہا کسی چوہے دان میں۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ مجھے کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی ہے اور میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں' میں نے جیرے کو آواز دی۔

اس نے کراہ کے کہا "او یار' سب خیر ہے۔ باہر نکل پہلے پھر دیکھیں گے نقصان کتنا ہوا ہے۔"

باہر نکلنا آسان نہیں تھا۔ وہ دروازے جن کو کھول کے

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان دولتوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر
دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم باہر آسکتے تھے اندر دب کے جام ہوگئے تھے اور اوپر کی طرف تھے۔ دوسری طرف کے دروازے الٹی ہوئی ٹیکسی کے نیچے تھے۔ یعنی ٹیکسی ایک سائڈ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی کھڑکیوں کا شیشہ بکھر گیا تھا اور اندر بھی پھیلا تھا۔ میں شیشے کے ذرات کی چبھن اپنے کپڑوں کے اندر جسم پر بھی محسوس کر سکتا تھا جو کالر کے راستے اندر داخل ہوگئے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ان خطرناک اڑتے ہوئے تیز دھار والے شیشے کی کرچیوں سے ہماری آنکھیں محفوظ رہی تھیں۔

اِدھر اُدھر سے دوڑ دوڑ کے جمع ہوجانے والے اپنی اپنی کوشش میں مصروف تھے۔ کچھ صرف چلا رہے تھے اور غیر ضروری ہدایات یا مشورے دیتے ہوئے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کچھ ٹیکسی کو سیدھا کرنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ وہ بالآخر کامیاب ہوئے اور ٹیکسی پھر اپنے چاروں پیروں پر کھڑی ہوگئی۔

کھڑکی کے ٹوٹ جانے والے شیشوں نے درمیان میں ایک خلا چھوڑ دیا تھا۔ کونوں میں اور ربر لائن کے ساتھ ساتھ بکھرے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے منجمد برفانی قطروں کی طرح لٹک رہے تھے۔ ان میں سے ہمارا گزرنا محال تھا۔

ایک عقلمند شخص نے مجھے اور جیرے کو بہ آوازِ بلند خبردار کیا "بچ کے جی۔ سرتے اکھاں نوں بچاؤ" پھر اس نے ونڈ اسکرین پر کسی چیز سے وار کیا۔ ایک دھماکے سے سامنے کا حصہ بھی گزرگاہ میں تبدیل ہوگیا۔

"آرام سے۔۔۔ آرام سے۔" ونڈ اسکرین توڑنے والے عقلمند آدمی نے کہا اور باقی شیشے ہٹانے لگا۔ اس کی مدد دوسرے لوگوں نے کی اور کپڑے مار مار کے بونٹ پر سے شیشوں کے ذرات جھاڑ دیئے۔

کسی گاڑی سے ایسے برآمد ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے ہی میں نے ہجوم کے اوپر سے سڑک کا جائزہ لیا۔ میں اس ریڑھی والے کو دیکھنا چاہتا تھا جس کے نظر آنے کی اب کوئی امید نہ تھی۔

ہمارے جسموں پر آنے والی خراشوں سے خون رس رہا تھا لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ ٹیکسی کا ایک سائڈ سے بچومر نکل گیا تھا اور ایک نظر میں میرے اندازے کے مطابق یہ چار چھ ہزار کا نقصان ضرور تھا۔ وردی دیکھ کے لوگ مجھ سے زیادہ تھانے دار کے ساتھ ہمدردی جتا رہے تھے لیکن تھانے دار صاحب مجھ سے زیادہ وہاں سے رفوچکر ہونے کے چکر میں تھے۔ جیرے کو معلوم تھا کہ حادثے اور ہجوم کو دیکھ کے کوئی بھی ادھر سے گزرنے والا ٹریفک سارجنٹ یا عام تھانے دار ضرور رک جائے گا اور اپنے جیسے وردی والے تھانے دار کو دیکھ کر اس کی ہمدردی اور فرض شناسی کی اصلی رگ پھڑک اٹھے گی۔

جیرے نے ایک ڈانٹ لگائی تو مجمع چھٹ گیا "اوئے ہٹو راستے سے۔ کیا بھیڑ لگا رکھی ہے۔ کدھر گیا وہ ٹرک؟ کسی نے نمبر دیکھا اس کا؟"

ایک شخص نے عوامی ترجمان کی حیثیت سے کوتاہی کا اعتراف کیا "نمبر تو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ٹرک بھاگ گیا۔"

جیرے نے فوراً ایک اور ٹیکسی کو روک لیا "میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔ چلو اوئے' اس ٹرک کو پکڑنا ہے" اس نے حکم دیا۔

مجبور ٹیکسی والے نے ایک نظر حادثے کا شکار ہونے والی ٹیکسی کو اور لوگوں کو دیکھا "ٹیکسی والا تو بچ گیا نا؟"

میں نے کہا "اوئے میری ٹیکسی تھی۔"

ٹیکسی والے نے گاڑی کو دوڑانا شروع کیا "بڑا نقصان ہوگیا تیرا یار۔"

میں نے جیب سے رومال نکال کے ہاتھوں اور چہرے پر سے خون صاف کیا "شکر ہے جان بچ گئی۔ ٹیکسی کا کیا ہے' پھر بن جائے گی۔"

"پھر بھی نقصان تو ہوا۔ چھ سات کی ڈز لگ گئی۔"

ریڑھی والا سوٹ کیس سمیت غائب تھا۔ کرنے والے اپنا کام کر گئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ٹیکسی کو ٹکر مارنے والے ٹرک میں انہی کے آدمی تھے۔ اس سے یہ خطرناک حقیقت بھی واضح ہوئی تھی کہ شاید میں اور رئیس بھی ان کی نظر میں آچکے ہیں۔ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ ہم نے وسیم یعنی گلزار احمد سے پنگا لیا ہے اور شاید ہم جان چکے ہیں کہ سوٹ کیس میں کیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ کیسے؟ کیا وہ باہر موجود تھے اور سب دیکھ اور سن رہے تھے یا کوئی اور بات تھی؟ جہاں تک وسیم کا تعلق تھا تو اسے موقع ہی کہاں ملا تھا کہ کسی سے رابطہ کرتا اور ہمارے بارے میں بتاتا۔ بظاہر ٹرک ڈرائیور کی غلطی نہیں لگتی تھی۔ اس نے جان بوجھ کے ہمیں ٹکر ماری تھی۔

اگر اس کو میں اپنی غلط فہمی سمجھتا تو خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ شاید چھوٹی آفت کا شکار ہوکے ہم بڑی مصیبت سے بچ گئے تھے۔ وہ سوٹ کیس کسی کی دخل اندازی کے بغیر ان لوگوں تک پہنچ گیا تھا جو اس کی ملکیت کے دعوے دار تھے۔ اب وسیم احمد عرف گلزار کو تخریب کاری کا یہ سامان

لانے کا بھاری معاوضہ ادا کرچکے تھے۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وسیم ان کے ہاتھوں پہلی بار استعمال ہوا تھا یا انہی میں سے ایک تھا۔

میں نے کہا "چوہدری نذیر صاحب' ٹرک تو نکل گیا۔"

"پھر اب کیا کریں۔۔۔ بول۔"

میں نے کہا "واپس چلو جی۔ پہلے میں اپنے گھر والوں کو بتادوں پھر آپ کے ساتھ تھانے جاکے رپورٹ لکھوانی ہے۔"

"اوئے تو فکر مت کر۔ تیرا خرچہ پورا ہوجائے گا۔ گڈی ایک دم ٹائٹ ہوجائے گی پہلے کی طرح۔"

"بڑی مہربانی جناب آپ کی۔ میں تو غریب آدمی ہوں۔ اسی سے گھر کی دال روٹی چلتی تھی" میں نے مظلوم لہجے میں کہا "میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ گاڑی آپ نے ہی پکڑی تھی۔"

جیرے نے مجھے ڈانٹا "اوئے جب ایک بار بول دیا کہ نہیں ہوگا تیرا کوئی نقصان تو پھر رولا کیوں ڈالتا ہے؟"

دوسرے ٹیکسی ڈرائیور نے تھانے دار کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا "او یار' جب تھانے دار صاحب فرما رہے ہیں تو بس چپ کرجا۔ یہ بادشاہ لوگ ہیں۔ جس گیراج والے کو پکڑیں گے وہ تیری گڈی بنادے گا اور دیکھ' موقع اچھا ہے۔۔۔ پچھلا سارا کام بھی کرالینا۔"

جیرے نے کہا "بس یار۔ آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تو گاڑی موڑ لے۔"

ڈرائیور نے فوراً تعمیل کی۔ آدھے راستے میں مجھے اس شکستہ ٹیکسی کا لاوارث ڈھانچا نظر آیا جس کا بدقسمت مالک نہ جانے کہاں اپنی قسمت کو رو رہا ہوگا۔ وہ اسپورٹیڈ گولڈلیف کی تلاش میں ناکام ہوکے لوٹا ہوگا تو اسے پتا چلا ہوگا کہ نہ تھانے دار ہے اور نہ اس کی ٹیکسی۔ یہ شبہ فوراً کوئی نہیں کرسکتا کہ تھانے دار جعلی تھا یا ٹیکسی چوری کرکے فرار ہوگیا۔ یا تو وہ وہیں انتظار میں جلا ہوگا یا تھانوں کی خاک چھاننے نکل کھڑا ہوا ہوگا۔ اس کی ٹیکسی کس تھانے میں ملتی ہے' یہ اس کی قسمت مگر وہ کیا بتائے گا کہ تھانے دار کا نام کیا تھا اور کیا وہ اسے صورت دیکھ کے پہچان لے گا؟ پورے شہر کے تھانے داروں کا دیدار کرنے سے پہلے ہی اسے معلوم ہوجائے گا کہ اس کی ٹیکسی کا ملبا کہاں پڑا ہے۔

دوسرے ٹیکسی ڈرائیور نے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی کو دیکھ کر صدمے سے سر ہلایا "اوئے ہوئے' اس داتے خانہ خراب ہوگیا۔"

جیرے بلیڈ نے کہا "ٹیکسی روک ذرا۔ دیکھ کے بتا کتنا خرچہ ہوگا اس کو پھر پہلے جیسا بنانے میں۔"

ٹیکسی والے نے ایک ماہر کی طرح ٹیکسی کو ہر طرف سے ملاحظہ فرمانے کے بعد کہا "ستر ہ پچاسی۔۔۔ بائیس۔۔۔ ستر ہ پینتیس۔"

جیرے نے کہا "اوئے ایک بات کر۔ ستر ہ ہزار کہ پینتیس ہزار۔"

مگر میں نے ڈرائیور کی بات سمجھ لی تھی "ستر ہ پینتیس کس کی ٹیکسی ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے سر کھجایا۔ جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے پھر ایک دم بولا "اوئے ہوئے۔ مارا گیا غریب واچتر۔ یہ تو حسین بخش کی گاڑی ہے۔ تقدیر کے چکر میں آیا ہوا ہے بے چارہ۔ پہلے بیوی بیمار تھی' چار بچے چھوڑ کے فوت ہوگئی پھر خود لیٹ گیا۔ مہینے بعد گاڑی نکالی تھی۔۔۔ یہ تمہارے پاس کیسے آئی؟"

میں نے کہا "اس نے مجھے ٹھیکے پر دی تھی۔ سو روپے روز پر تم جانتے ہو وہ کہاں رہتا ہے؟"

"وہ تو پتا چل جائے گا کسی نہ کسی سے۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر تم جاؤ۔ اسے یہاں بھیج دو۔۔۔ اور دیکھو' اس سے یہی کہنا کہ معمولی حادثہ ہوا ہے' باقی بات میں کرلوں گا۔"

دوسرا ٹیکسی ڈرائیور اپنے ہم پیشہ کے لیے بہت مغموم تھا "صرف بات کرنے سے تو بات نہیں بنتی نا یار۔"

میں نے کہا "اس کے سارے نقصان کا ذمّے دار میں ہوں۔"

جیرے نے کہا "تو زیادہ اوکھا مت ہو۔ اس بندے نے کہا ہے کہ یہ ڈھانچا خرید لے گا۔ اسے ایسی ہی دوسری گاڑی دلادے گا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلا کے تھانے دار صاحب کے بیان کی توثیق کی تو ٹیکسی والا کچھ مطمئن نظر آنے لگا اور فوراً روانہ ہوگیا۔ ہم نے باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ جہاں سے ہم روانہ ہوئے وہاں پہلی ٹیکسی کا مالک ابھی تک پریشان کھڑا تھا۔ سو کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکا اور مجھے تھانے دار کے ساتھ دیکھ کے کچھ حیران ہوا۔ "او جی سگریٹ تے نہیں ملی لیکن آپ کدھر چلے گئے تھے۔"

جیرے بلیڈ نے ایک ہاتھ میری گدی پر مارا "گیا تو تھا میں اس کی کھال اتارنے کیونکہ یہ ٹیکسی سے نہیں اترتا تھا۔ الٹا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے دھمکی دے رہا تھا وردی اتروانے کی۔"
میں نے غرا کے کہا "خبردار جو پھر دست درازی کی مجھ پر۔۔۔ میری کھال اترتی یا تمہاری وردی۔ پتا چل جاتا تھانے جا کے۔ شکر کرو ایکسی ڈنٹ ہوگیا۔"
ڈرائیور پٹاخے کی طرح اچھلا "ایکسی ڈنٹ۔۔ میری گاڑی کا؟"
اصل بات ڈرائیور سمجھ ہی نہیں سکتا تھا مگر انسپکٹر نذیر عرف جیرا بلیڈ اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہوگیا کہ حادثہ معمولی تھا ورنہ ہم زندہ سلامت اپنے پیروں پر چل کے واپس کیسے آتے۔ اس نے مجھ سے پوچھا اور میں نے ڈرائیور کو ایک ہزار ڈالر دے کر جان چھڑانا بہتر سمجھا۔ اس کا نقصان اگرچہ چھ سات ہزار کا تھا تو ایک ہزار ڈالر پاکستانی کرنسی میں تقریباً سولہ سترہ ہزار روپے بنتے تھے۔ ڈالر دیکھ کے ڈرائیور تذبذب میں پڑگیا تھا "یہ۔۔ اصلی ہیں نا جی۔۔۔ کوئی چکر تو نہیں ہے۔"
جیرے نے اسے ڈانٹ لگائی "اوئے ہمیں جعلساز سمجھتا ہے تو؟ ہم جعلی ڈالر دیں گے تجھے۔ لینے ہیں تو لے ورنہ چل پھٹ ادھر کھڑی ہے تیری ٹیکسی۔"
ڈرائیور نے فوراً نوٹ کو جیب میں رکھ لیا۔ چھ سات ہزار کے نقصان کا اندازہ ہمارا تھا۔ وہ تو خوش تھا کہ ہزار روپے کا نقصان ہوا ہوگا اور مل رہے ہیں بیس ہزار۔ وہ فوراً جائے حادثہ کی طرف روانہ ہوگیا۔
رات کا وقت تھا اس لیے کسی نے بھی ہمارے چہرے کی خراشوں کو غور سے نہیں دیکھا۔ اندھیرے کی آڑ میں رہتے ہوئے ہم نے وسیم کے گھر تک کا فاصلہ طے کیا۔
"میں آکھیا' خیر ہووے یاروں کے یار کی" جیرے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "آج تو سارے سودے فارن کرنسی میں ہو رہے ہیں۔۔ یہ امریکن ایڈ کدھر سے ملی؟"
میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کے متانت سے کہا "تم کیوں تفتیش کر رہے ہو؟"
اس نے کہا "کچھ پتا تو چلے' کیسے کمائے ڈالر؟"
میں نے کہا "یار' کبھی میں نے تم سے پوچھا' سب کی کمائی کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ تمہارا اپنا طریقہ ہے' چاچا چنگ باز کا اپنا۔"
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "بس یار۔ سارے کھیل نصیب کے ہیں۔ دس ہزار کا گھاٹا ہوگیا اس وقت مجھے۔ پتا ہے کیسے' اگر میرے پاس ہوتے تا پانچ چھ ہزار نقد جیب میں۔۔ تو ٹیکسی والے کو بہت کافی تھے۔ ہزار ڈالر رکھتا میں اپنی جیب میں۔"
میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری جیب میں اس وقت بھی ستائیس ہزار ڈالر تھے جن کے بارے میں شاید رئیس نے بھی جیرے بلیڈ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ دھوکے اور دھونس سے دو چار سو اینٹھنے کا ماہر تھا اور خود کو بہت ہوشیار سمجھتا تھا کہ تھانے دار کی وردی میں اس نے ہر کام کیا مگر آج تک پکڑا نہیں گیا۔ میری جیب سے نکلنے والے ڈالر دیکھ کر وہ خاصا مرعوب ہوگیا تھا۔
دستک پر دروازہ خود وسیم نے کھولا۔ پولیس کی وردی میں جیرے کو دیکھ کے اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ اس نے شاید یہی سمجھا کہ میں نے اسے ڈبل کراس کیا ہے۔ پہلے اس سے سب کچھ چھین لیا اور پھر پولیس کو ساتھ لے آیا۔
اس کے پیچھے سے رئیس نے چلا کے کہا "اوئے کیا ہوا ہے تمہیں۔ تم تو خونم خون ہو رہے ہو؟"
میں لڑکھڑا کے آگے بڑھا "یار رئیس' کہا سنا معاف کرنا۔ یہی کہنے آیا ہوں میں۔۔۔ اور۔۔ رجو سے شادی کرلینا۔ شادو سے کہنا کہ اب اگلے نمبر میں۔"
"ابے بات کر سیدھی طرح۔ کس نے مارا ہے؟"
رئیس بگڑ کے بولا "یار انسپکٹر صاحب' آپ بھی زخمی ہو۔"
"بہت گہرے زخم ہیں رئیس۔ دل جگر سب زخمی ہے۔ بڑا زبردست دھماکا تھا۔ سب پھٹ گیا۔" میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا "ایک دھماکے میں سب ختم!"
وسیم کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا "دھماکا؟"
میں نے سر ہلایا "یہ جو تیرے جاننے والے ہیں۔ تھانے دار صاحب' یہ بھی بال بال بچ گئے ورنہ جہنم رسید ہوجاتے۔۔۔ کل کے جاتے آج ہی پہنچ جاتے ٹھکانے پر۔"
رئیس نے بے یقینی سے کہا "قسم اللہ کی' سچ بتا۔ دھماکا کیسے ہوگیا۔ یہاں سے تو سب ٹھیک ہی گیا تھا۔"
میں نے کہا "بس یار۔۔۔ ہونی کو انہونی کون کر سکتا ہے۔۔۔ وہ ریڑھی والا سبزی فروش۔۔۔ وہ مارا گیا بے چارہ۔"
وسیم نے کانپتی آواز میں پوچھا "وہ۔۔۔ وہ کیسے مارا گیا؟"
میں نے کہا "میرا خیال ہے۔۔۔ اسے سوٹ کیس اچھا لگا۔۔۔ اس نے دیکھا کہ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔۔۔ وہ سوٹ کیس لے کر نکل جائے گا مگر دوسرے بھی بے وقوف اور پاگل تو نہیں تھے۔ وہ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ آگے پتا نہیں کیا ہوا' ان میں سے کسی نے سبزی والے پر گولی چلا دی ہوگی اور گولی شاید سوٹ کیس میں لگی۔ بس اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بقول شاعر۔"

رئیس نے کہا "سب اڑ گیا دھماکے سے۔"
میں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی "سب تو نہیں' سبزی فروش' اس کی ریڑھی' ریڑھی پر رکھا ہوا سوٹ کیس۔ سوٹ کیس میں بھرے ہوئے بم اور مال اٹھانے والے۔۔۔ یہ سب اڑ گئے۔"
"تو باقی کون بچا؟" رئیس بولا "صرف تم دونوں؟"
"وہ بچ گئے نا یار جن کا مال تھا۔ جنہوں نے ایک کی جگہ دس خرچ کیے تھے اپنے حریفوں اور دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے۔ اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے اس وقت بھی مگر وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔" میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔
رئیس نے بوکھلا کے کہا "کیا۔۔۔ وہ یہاں آگئے پھر؟"
"پھر کیا۔۔ ہمیں تو وہ جانتے نہیں' گلزار احمد سے ہے ان کا معاملہ مگر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ اس لیے میں تو یہاں رک نہیں سکتا" میں نے کہا۔
"اچھا یار۔ ہم بھی رک کر کیا کریں گے اب" جیرے نے کہا اور ہاتھ ہلا کے باہر نکل گیا۔
رئیس نے پیچھے سے کہا "جیرے۔۔۔ پیر صاحب کے ڈیرے پر انتظار کرنا میرا۔"
"تم نے دھوکا دیا ہے مجھے۔ میرا پیسہ بھی لے لیا اور۔۔۔ وہ مال بھی۔۔۔ میں کیا جواب دوں گا انہیں۔۔۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے" وسیم چلانے لگا۔
میں نے اس سے اتفاق کیا "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ایسا تو ہوتا ہے کبھی نہ کبھی۔ مارنے والے کو مرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ تم نے ناصر کی ماں کو مارا پھر ناصر کو مارا۔ پھر ان کے مال پر لمبا ہاتھ مارا۔۔۔ اپنے بیوی بچوں کا حق مارا۔"
"مگر۔۔۔ میرا کیا قصور تھا اس میں۔" وسیم کی حالت غیر ہونے لگی۔
میں نے کہا "قصور تو ان کا بھی کوئی نہیں تھا جو تمہاری ہوس کا شکار ہوئے۔"
"لیکن۔۔۔ وہ۔۔۔ تمہارے سامنے میں نے وہ سوٹ کیس دے دیا تھا۔ تم نے دیکھا تھا۔۔۔" وسیم ہکلانے لگا "آگے جو کچھ ہوا۔۔۔"
میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "جب قضا آتی ہے تو بہانے خود بن جاتے ہیں۔ تمہاری ہر بات سچ ہے لیکن ہماری گواہی سے تم بچ نہیں سکتے۔"
"ابے یار چھوڑ گواہی کے انتظار میں بیٹھے رہے تو ہم خود بھی مارے جائیں گے۔ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں ایسے لوگ۔۔۔" رئیس بولا۔
میں نے کہا "خطرناک کام کرنے والے شریف لوگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو سمجھیں گے کہ سب جھوٹ ہے۔"
وسیم بولا "کیوں؟ تم انہیں بتا سکتے ہو کہ دھماکا کہاں ہوا تھا۔۔۔ اور کیسے۔۔؟"
میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کچھ دیکھا نہیں۔ صرف ایک دھماکا سنا اور خوش قسمتی تھی کہ ہم کچھ فاصلے پر تھے۔ خدا معلوم وہ سبزی کی ریڑھی والا کون تھا اور اس کا تعاقب کرنے والے کون تھے؟ ان کے درمیان کیا بات ہوئی اور کوئی جھگڑا ہوا یا کس کی غلطی سے دھماکا ہوا۔ اصل لوگ آکے پوچھیں گے ضرور۔"
وسیم نے لرزتے ہوئے کہا "اچھا۔۔۔ تم میرے پیسے تو واپس کرو۔ اٹھائیس ہزار ڈالر۔ تاکہ میں انہیں واپس کردوں۔۔۔ ان کا نقصان پورا ہوجائے تو شاید وہ مجھے چھوڑ دیں۔"
میں نے حیرانی سے رئیس کو دیکھا "کیا یہ پاگل ہوگیا ہے۔ یہ کون سے اٹھائیس ہزار ڈالر کی بات کر رہا ہے؟"
رئیس نے کہا "سوٹ کیس میں ہوں گے شاید۔"
وسیم چلایا "وہ میں نے تمہیں دیے تھے۔"
"مجھے دیے تھے' کس کے سامنے؟" میں نے کہا۔
رئیس بولا "کوئی رسید لی تھی؟"
وہ کرسی پر گر گیا اور دہاڑیں مار مار کے رونے لگا "تم سب حرام زادے ہو۔ دھوکے باز ہو۔ ذلیل ہو' تم نے مجھے پھنسا دیا ہے۔"
میں نے قہقہہ مارا "ہم نے نہیں' تمہاری تقدیر نے تمہیں پھنسا دیا بالآخر۔ تم بڑے چالاک اور عیار بنتے تھے نا۔۔۔ اب دیکھو تم کس چوراہے پر کھڑے ہو۔ ایک طرف میں ہوں' تمہارا دشمن نمبرون۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تم کو بہت پہلے قتل کرچکا ہوتا لیکن تمہیں مار کے میں خود پھانسی چڑھتا تو کوئی عقل مندی نہ ہوتی۔ دوسری طرف ہے تمہارا دوسرا دشمن۔ تمہاری بیوی کا بھائی انسپکٹر بشیر۔ وہ بھی تمہیں کسی قتل کے مقدمے میں کب کا پھانسی چڑھوا چکا ہوتا یا پولیس مقابلے میں مروا دیتا مگر اپنی بہن کی بیوگی کے خیال نے اسے روکے رکھا۔ اب تیسری طرف آگئے ہیں تمہارے نادیدہ دشمن جو قتل عام کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ ایک قتل تو ان کے نزدیک پرچون کا کام ہے۔ دستی بم اور ٹائم بم جیسی چیزوں کے یہ سوداگر تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گے۔ ان کا مالی نقصان لاکھوں کا ہوا مگر وہ زیادہ اہم نہیں۔ اصل غصہ انہیں ہوگا اپنی ناکامی کے احساس کا۔ وہ جس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ضرورت کی چیز ضرورت پڑنے پر ان کے پاس نہیں ہوگی۔ چنانچہ اب چوتھا راستہ باقی رہ جاتا ہے۔"

وسیم نے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکالی "کون سا چوتھا راستہ؟"

میں نے جیب سے قلم نکالا پھر ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا "اس پر لکھ دو کہ میں خودکشی کر رہا ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ بیوی بچے میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ میں ایک قاتل اور مجرم ہوں۔ میں نے اپنی بھابی کا اور اپنے بھتیجے کا قتل کیا تھا۔ میں ضمیر کی ملامت برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے دشمن میری جان کے درپے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے نیچے اپنے دستخط کر کے تاریخ ڈالو اور وقت لکھو پھر ہم تمہیں گولی مار کے چلے جائیں گے۔"

وہ دہشت سے بولا "نہیں۔ نہیں۔"

میں نے کہا "کیا نہیں؟ گولی سے ڈر لگتا ہے۔ چلو دوسری گولی کھا لینا۔ میں لادوں گا۔ نہ خون بہے گا نہ تکلیف ہوگی۔ نیند سے تم موت کی آغوش میں چلے جاؤ گے۔"

"میں۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر چوتھا راستہ یہ بھی ہے کہ تم اپنے ایک دشمن کو دوست بنا لو۔ اس کی پناہ میں چلے جاؤ۔" میں نے کہا "ابھی میرے ساتھ چل کے اپنی بیوی سے معافی مانگ لو۔ اس کے پاؤں پکڑ لو۔ وہ کیے ناک سے زمین پر لکیریں لگا لو تو فوراً شروع ہو جاؤ۔ انسپکٹر بشیر، تمہارا سالا تمہیں بچا سکتا ہے۔ کل پرسوں کسی وقت میرے ساتھ جا کے اپنا پرانا مکان واپس لے لو اور اس میں پھر ویسے ہی رہو جیسے رہتے تھے۔"

"مجھے۔۔۔ منظور ہے۔" وہ بولا۔

مجھے بھی خیال نہیں رہا تھا کہ گلی کی طرف صحن کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایک دم دو افراد اندر آ گئے۔ وہ صورت سے ہی جرائم پیشہ اور خطرناک لگتے تھے اور ان کے قاتلانہ عزائم ان کی خون آشام آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔ اندر آتے ہی ایک نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کیا اور دوسرے نے ریوالور کا رخ ہماری طرف کر دیا۔ ریوالور کی نال پر لگا ہوا سائلنسر زیادہ ڈراؤنا تھا۔ ←

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں